چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کراچی

جلد نمبر 16 شمارہ نمبر 4 جنوری 2015ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

قیمت -/70 روپے

سالانہ قیمت -/1080 روپے

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391
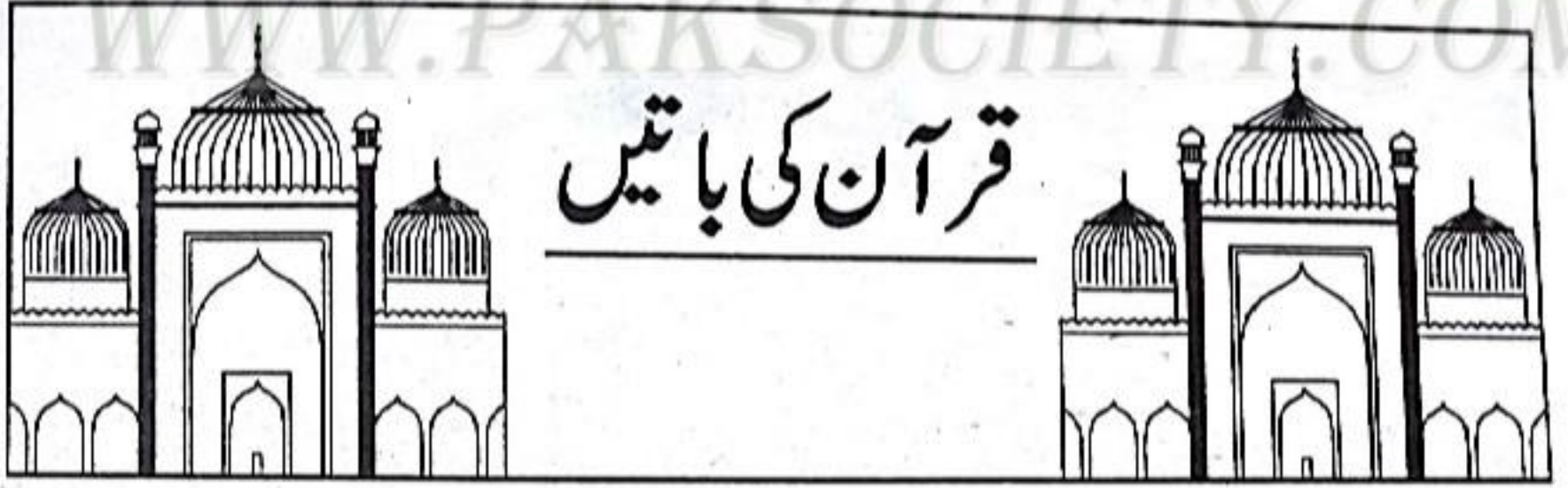
قرآن کی باتیں

☆ اور کسی شخص میں طاقت نہیں کہ اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے۔ اس نے موت کا وقت مقرر کر کے لکھ رکھا ہے۔
(سورۃ آل عمران 3 آیت 145)

☆ اے جہاد سے ڈرنے والو تم کہیں رہو موت تو تمہیں آ کر رہے گی خواہ بڑے بڑے محلوں میں رہو۔
(سورۃ نساء 4 آیت 78)

☆ اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے اور تم پر نگران مقرر کیئے رکھتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو ہمارے فرشتے اس کی روح قبض کر لیتے ہیں اور کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔ (سورۃ انعام 6 آیت 61)

☆ بھلا تمہارے پاس ابراہیمؑ کے معزز مہمانوں کی خبر پہنچی ہے جب وہ ان کے پاس آئے تو سلام کہا انہوں نے بھی جواب میں سلام کہا۔ دیکھا تو ایسے لوگ کہ نہ جان نہ پہچان تو اپنی گھر جا کر ایک بھنا ہوا موٹا بچھڑا لائے اور کھانے کے لئے ان کے آگے رکھ دیا کہنے لگے کہ آپ تناول کیوں نہیں کرتے؟ اور دل میں ان سے خوف معلوم ہوا۔ انہوں نے کہا کہ خوف نہ کیجیے اور ان کو ایک دانش مند اسحاقؑ لڑکے کی بشارت بھی سنائی۔
(سورۃ ذاریات 51 آیت 24 سے 28)

☆ تو ان لوگوں کے عہد توڑ دینے کے سبب ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا یہ لوگ کلمات کتاب کو اپنے مقامات سے بدل دیتے ہیں، اور ان جن باتوں کی ان کو نصیحت کی گئی تھی ان کا بھی ایک حصہ فراموش کر بیٹھے اور تھوڑے آدمیوں کے سوا ہمیشہ تم ان کی خطائیں معاف کر دو اور ان سے درگزر کرو کہ اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور جو لوگ اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے ان سے بھی عہد لیا تھا مگر انہوں نے بھی اس نصیحت کا جو ان کو کی گئی تھی، ایک حصہ فراموش کر دیا، تو ہم نے ان کے باہم قیامت تک کے لئے دشمنی اور کینہ ڈال دیا اور جو کچھ وہ کرتے رہے، اللہ عنقریب ان کو اس سے آگاہ کرے گا۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 13 سے 14)

☆ اور قسم نفس انسانی کی اور اس ذات کی جس نے اس کے اعضا کو برابر کیا پھر اس کو بدکاری سے بچنے اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی کہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا، وہ مراد کو پہنچا اور جس نے اسے خاک میں ملایا، وہ خسارے میں رہا۔ (سورۃ شمس 91 آیت 7 سے 10)

☆ ہم کو روز قیامت کی قسم اور نفس لوامہ کی کہ سب لوگ اٹھا کر کھڑے کیئے جائینگے۔ (سورۃ قیامہ 75 آیت 1 سے 2)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی"، بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

قارئین کرام السلام علیکم !

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایماں کے حرارت والوں نے...... من اپنا پرانا پاپی برسوں میں نمازی بن نہ سکا۔

قارئین کرام! علامہ اقبال کے اس شعر پر جتنا غور کیا جائے تو یہ مفہوم سامنے آتا ہے کہ ہم مسلمانوں کے عمل کیا ہیں؟ ہم اپنے اسلاف کے طرز عمل کو بھول بیٹھے ہیں، چلئے ہم مان لیتے ہیں کہ ہمارے اسلاف موجود نہیں لیکن ہم میں ''احکام خداوندی، قرآن اور احادیث نبوی'' موجود ہے۔ اگر ان کے مطابق ہم اپنا عمل صالح کرلیں تو ہم بھی سکھ شانتی سے خوشحال زندگی گزاریں گے۔ اگر ہم خود غرض، مطلب پرستی اور الگ الگ سوچ کو بالائے طاق رکھ دیں اور آپس کے اتفاق اتحاد کو اپنالیں، اور ایک دوسرے کے دکھ درد کو محسوس کرنے لگیں تو ہم بھی خوشیوں کے گہوارہ میں جھولنے لگیں گے۔ جب تک ہم آپس میں اتفاق واتحاد اور انسانیت پر عمل نہیں کریں گے اس وقت تک ہم اپنی پریشانیوں پر قابو نہیں پاسکتے کیونکہ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی، اور ہمیں انہی باتوں پر عمل کرتے ہوئے قدم آگے بڑھانا چاہئے تاکہ ہماری آنے والی نسلیں معاشرہ میں خوش وخرم زندگی گزار سکیں...... قارئین کرام! آپ سب کو نیا عیسوی سال 2015ء مبارک ہو۔ زیر نظر جنوری کا خاص نمبر ڈرڈائجسٹ 70 روپے کا ہے اس کے بعد کا ہر شمارہ اپنے سابقہ ریٹ یعنی 60 روپے کا ہی ہوگا۔ میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ہر ماہ ڈرڈائجسٹ لگن ومحبت سے خریدتے ہیں اور اپنی اچھی اچھی کاوشیں ارسال کرتے ہیں، آپ سب کی چاہت خلوص اور پسند کے سہارے ڈائجسٹ اپنی ترقی کی منزلیں طے کررہا ہے، میری دعا ہے کہ قارئین کرام! آپ سب پر اللہ تعالیٰ اپنا فضل وکرم رکھے اور ڈھیر ساری خوشیوں سے نوازے (آمین)

خالد علی، مینیجنگ ایڈیٹر

ساحل دعا بخاری بصیر پور سے، السلام علیکم! دسمبر کا ڈر بائیس نومبر کو ملا۔ ٹائٹل اچھا رہا۔ قرآن کی باتیں اچھی لگیں۔ شبانہ حنیف اور سحرش ویلکم ان ڈر...... ہم بھی ڈر کے ''فیملی ممبر'' ہیں۔ سو آپ لوگوں کا اضافہ اچھا لگا۔ پیا سحر! شکریہ کہ لفٹ پسند آئی۔ ساجدہ راجہ، آپ کے چوتھے چچا بھی اس دار فانی کو خیرباد کہہ گئے...... بہت دکھ ہوا اور ناصر فرہاد بھائی کے والد کا بھی...... ہمارے ہاں بھی گزشتہ دنوں ناگہانی اموات بہت ہوئیں۔ ایک شخص ''حسن'' تو محض آدھ گھنٹہ قبل ٹھیک ٹھاک تھا اور محض آدھ گھنٹہ بعد اس کی موت کی خبر...... بے شک ہمیں لوٹ کر اللہ کے پاس جانا ہے۔ یہ زندگی تو عارضی ہے۔ پتہ نہیں کب موت کی سرحدوں کو چھولیں۔ مگر ہم ہیں کہ اسی میں مگن ہو کررہ گئے ہیں۔ عداوتیں، نفرتیں، بغض، حسد، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں، اور فلاں نے ہمیں یہ کہا، اب اس سے بات نہیں کرنی، اس نے یہ کیا، اب اس کے ساتھ یہ کرنا ہے، وغیرہ وغیرہ...... حالانکہ ہمیں یہ بھی نہیں پتہ کہ ہم اگلا سانس بھی لے سکیں گے یا...... لیکن ہم اس فانی دنیا کو دائمی سمجھے ہوئے ہیں۔ خیر اللہ آپ کے چچا اور ناصر بھائی کے والد کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ اور اہل خانہ کو صبر عظیم عطا فرمائے۔ اپنوں کو کھونے کا دکھ بلاشبہ احاطہ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔ ان کا کوئی ''نعم البدل'' نہیں۔ مگر ہمارے پاس صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا مگر یہ بھی سچ ہے کہ ''ہزار ریاضتیں ہوں صبر کی مگر اس کے باوجود، کبھی کبھی کوئی ملال بھولتا نہیں۔ ہم ''سہ'' اس لئے جاتے ہیں کہ مجبور ہوتے ہیں۔ مگر دکھ قیامت تک ''تازہ'' رہتا ہے اور ہر سانس کو ''قیامت'' بنائے رکھتا ہے۔ چار جنوری کو ہمارے انکل ''شاہ حسین'' کی برسی ہے۔ پلیز دعاؤں میں یاد رکھئے گا کہ اللہ تعالیٰ دعائیں رد نہیں کرتا اور حضرت محمدؐ کا فرمان ہے کہ ''اپنے مردوں کے لئے دعا کیا کرو۔ کیونکہ تمہاری دعا مردے اور عذاب کے بیچ پہاڑ بن کر کھڑی ہوجاتی ہے۔'' لہٰذا ہمیں اہل جمیع اسلام کے لئے دعائیں کرنی چاہئیں۔ شگفتہ سسٹر! شادی مبارک ہو۔ مٹھائی......؟ اور لکھنا جاری رکھیں، عامر بھائی! دعاؤں کے لئے ''جزاک اللہ خیر!'' ہم سے کہیں اچھا لکھتے ہیں آپ۔ ایس امتیاز اس بار بھی اپنے پرانے ''مشینی انداز'' میں نظر آئے اور تبصرہ ہضم...... مجبوری آپ نے اچھی لکھی۔ مدثر بخاری کی یقینی موت بھی اچھی رہی۔ اجر صبر اور خاموش ارسال خدمت ہیں۔ امید ہے...... آخر میں سب کے لئے دعائیں کہ اللہ برتر ہر مسلمان کی ہر قسم کی پریشانی دور کرے اور ہر جائز حاجت پوری کرے۔ والسلام۔

☆☆ ساحل صاحبہ: آپ کی تمام باتیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ اگر ہم مطلب پرستی کو چھوڑ کر آپس میں اتحاد اتفاق قائم کریں اور دوسروں کے دکھ

درد کا احساس کرنے لگیں تو ہماری ساری پریشانیاں دور ہو جائیں، دونوں کہانیاں مل گئی ہیں، کہانیاں لیٹ موصول ہوئیں ورنہ اس شمارے میں ضرور شامل اشاعت ہوتیں، اگلے شمارے میں کہانی ضرور شامل اشاعت ہوگی۔ آپ کے انکل کے لئے ہم اور قارئین دعا گو ہیں۔

سحرش حنیف کراچی سے، السلام علیکم! دسمبر کا ڈائجسٹ پا کر بہت خوشی ہوئی۔ بہت بہت شکریہ میرا اور میری والدہ کا خط شائع کرنے کا۔ امید ہے میرا یہ خط جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا اور ''خاص نمبر'' کی زینت بنے گا۔ تمام کہانیاں عمدہ ہیں، خاص کہانیاں واقعی بہت خاص تھیں، ''دختر آتش'' سب پر سبقت لے گئی۔ ''ابلتا لہو'' اور ''درندہ صفت'' سے مجھے یہ ڈائجسٹ ''خونی نمبر'' لگا، لیکن ''مجبوری'' کے اختتام نے میرے اس خیال کو پاش پاش کر دیا۔ درج بالا کہانیوں کے علاوہ ''نحوست، شہر خموشاں، یقینی موت اور عقرب بھی بہت عمدہ تھیں۔ ''الگ تلوق'' معصومیت سے بھرپور تھی۔ ''خونی مسیحا'' نہ بہت اچھی تھی نہ بہت گئی گزری...... تمام کہانیاں بہت عمدہ تھیں۔ خاص نمبر کا بہت شدت سے انتظار ہے۔ امتحانات کی مصروفیات زیادہ ہیں۔ امتحانات میں اعلیٰ نمبروں سے کامیابی کے لئے محنت شرط ہے لیکن آپ تمام قارئین سے التماس ہے کہ مجھے میری بہن اور میری تمام کلاس کے لئے اچھے نمبروں سے کامیابی کے لئے دعا کیجئے گا۔ امتحانات سے فراغت کے بعد ایک کہانی تحریر کرنے کا ارادہ ہے، امید ہے کہ اپنے اس ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکوں۔ مہربانی فرما کر اس سوال کا جواب دیجئے گا کہ یہ کہانیاں صرف کہانیاں ہی ہوتی ہیں۔ یا ان میں کچھ حقیقت پنہاں ہوتی ہے؟ اس امید کے ساتھ کہ میرا یہ خط بھی شائع ہوگا۔ خدا حافظ!

☆☆ سحرش صاحبہ: ویری ویری تھینکس کہ امتحان کی مصروفیت کے باوجود آپ نے خط لکھا۔ ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ، آپ کی بہن اور تمام کلاس فیلوز کو اچھے نمبروں سے کامیاب کرے، لیکن محنت شرط ہے، آپ کی کہانی کا شدت سے انتظار رہے گا، کہانی میں کہانی کے علاوہ یقیناً حقیقت بھی پنہاں ہوتی ہے۔ اکثر لوگوں کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے ہیں۔

سیدہ عطیہ زاہرہ لاہور سے، السلام علیکم! امید کرتی ہوں ادارہ ڈر ڈائجسٹ کا اسٹاف بخیریت ہوگا۔ اس کے علاوہ میں ڈر ڈائجسٹ کے تمام نئے اور پرانے قارئین کے لئے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو بھی خوش و خرم رکھے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں آپ سب کو نئے سال کی مبارک باد بھی دیتی ہوں۔ اور دعا کرتی ہوں کہ آنے والا سال ہم سب کے لئے خوشیوں سے بھرا ہو۔ پرانا سال جو کہ اب اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مجھے ڈر ڈائجسٹ کا ایک حصہ بنا لیا۔ اس سال شاید دو یا تین ماہ ایسے گزرے۔ جس میں میری کہانی شامل نہ تھی۔ باقی پورا سال میری تحریروں کو جگہ دی گئی۔ میں اس کے لئے ادارے کی شکر گزار ہوں۔ میں ان تمام دوستوں کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے میری تحریروں کو پسند کیا۔ اب میں دسمبر کے پرچے کا ذکر کروں، تو سب تحریریں شامل جو کی گئی تھیں بہترین تھیں۔ میری کہانی کو سرورق پر جگہ دینے کے لئے دوبارہ شکریہ! اب میں ایک اور کہانی ارسال کر رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں پسند آئے گی۔ ڈر ڈائجسٹ کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

☆☆ عطیہ صاحبہ: طویل کہانی بیس سال بعد اور اس کے بعد نئی کہانی بھی موصول ہوئی۔ اس کے لئے ویری ویری تھینکس، اور آپ نے چاہت و خلوص اور لگن سے پورے سال کہانی ارسال کی۔ امید ہے کہ آپ یہ خلوص جاری رکھیں گی۔ اس کے لئے ایک مرتبہ پھر شکریہ۔ کہانی شامل اشاعت ہے۔

فلک زاهد لاہور سے، السلام علیکم! پہلی بار ڈر کی محفل میں شامل ہو رہی ہوں، امید ہے حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ ڈر سے میرا لگاؤ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ پہلی بار ڈر اگست 2014ء کا شمارہ پڑھا جس میں میرے فیورٹ رائٹر عثمان غنی بھیا کی کہانی ''پس منظر'' شائع ہوئی تھی جو کہ دلفریب کہانی تھی۔ نام پڑھ کر ہی رسالہ خرید لیا اور پورے ڈر کو اچھا اور معیاری رسالہ پایا۔ ایم اے راحت اور ایم الیاس صاحب کو ڈر میں دیکھ کر خوشی ہوئی، ڈر میں جن رائٹرز حضرات کی کہانیوں نے مجھے متاثر کیا ان میں ایس حبیب خان قابل ذکر ہیں۔ ان کی کہانیاں ''روح کی تلاش اور آخری اچھا لا جواب تحریریں تھیں۔ ایس امتیاز احمد آپ کی کہانیاں ''نئی قبر، سرد جہنم اور مجبوری'' قابل تعریف کہانیاں تھیں۔ عطیہ زاہرہ خوب تو نہیں۔ پھر بھی ڈر میں چھائی ہوئی ہیں۔ ''نقاب اور لفٹ'' ساحل دعا بخاری کی زبردست کہانیاں تھیں۔ عمران قریشی آپ کی کہانیاں ''ڈمی اور نادیدہ مجرم'' پڑھ کر دل بے اختیار عش عش کر اٹھا۔ کالی چڑیل شہزادہ چاند زیب، دلہن شگفتہ ارم درانی، غیبی آواز ملک فہیم ارشاد، جناتی کہانیاں فرحان احمد نصیب اور خونی دنیا نور محمد اسلم کی یہ سب خوب صورت کہانیاں تھیں، باقی دسمبر کا شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے اس لئے تبصرہ محفوظ...... جبکہ ''قبر کی چوری'' ناصر محمود فرہاد آپ نے تو میرا دل ہی جیت لیا وجہ میرے فیورٹ، انگلش کرداروں پر اتنی خوب صورتی سے جو لکھی گئی تھی۔ اپنی پہلی کہانی ''شراب'' بھیج رہی ہوں۔ امید ہے مایوس نہیں

کرے گی۔ پلیز! حوصلہ افزائی ضرور کیجئے گا۔اس کے علاوہ اپنی اگلی کہانی بھی جلد بھیج دوں گی جو کہ مکمل ہونے کو ہے۔

☆☆ فلک صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا نامہ پڑھ کر خوشی ہوئی، کہانیوں کی تعریف اور نئی کہانی بھیجنے کے لئے ڈھیروں شکریہ۔خط بہت ہی لیٹ موصول ہوا، لہٰذا کہانی شامل اشاعت نہ ہوسکی۔اس کے لئے معذرت۔

پیا سحر مدینہ سیداں گجرات سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ادارے کے سارے لوگ خیریت سے ہوں گے۔اب آتے ہیں دسمبر کے شمارے کی طرف قرآن کی باتیں کے بعد سب سے پہلے اپنا خط پڑھا، کبھی کبھی کانٹ چھانٹ بہت اچھی چیز ثابت ہوتی ہے۔اس کے بعد ساجدہ راجہ کا خط پڑھا، ساجدہ بہن آپ کے چچاؤں کا پڑھ کر دلی دکھ ہوا، آپ کو اللہ نے یہ رشتے دے کر واپس لے لئے، مجھے اللہ نے ان تمام رشتوں کی مٹھاس سے محروم رکھا ہوا ہے۔اللہ آپ کے چچاؤں کو جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کے والد صاحب کو صحت کاملہ عطا فرمائے آمین۔عقرب کاوش بھائی ویل ڈن مجموعی طور پر کہانی کا تاثر بہت اچھا تھا۔دختر آتش واقعی کچھ لوگ اس طرح محبت کی انمٹ مثال چھوڑ جاتے ہیں جو رہتی دنیا تک قائم رہتی ہے۔ساجدہ راجہ صاحبہ کی نحوست بھی اپنے آپ میں ایک اچھوتی اور سنسنی خیز کہانی تھی۔مدثر بھائی کی یقینی موت اچھی تھی مگر سسپنس کہاں گیا؟ مجبوری بھی بلاشبہ بہترین تحریر تھی، باقی کہانیاں بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں، اشعار بھی اچھے تھے۔مگر غزل کی محفل میں حکیم خان حکیم کی غزل دل کی گہرائیوں میں اتر گئی، نظموں میں فریدہ خانم کی غزل کمال کی تھی۔پیا سحر کی نظم میرے خیال میں اچھی تھی۔اب تو صرف "ماہی" کا انتظار ہے۔اس کے ساتھ کچھ تحریریں اور حاضر خدمت ہیں۔ہم تو ڈر کے سحر میں جکڑے ہوئے ہیں۔اللہ سے دعا ہے کہ ڈر اتنی ترقی کرے کہ ہر دل پر ڈر کا جادو چھا جائے ہر دل پر ڈر کی حکمرانی ہو۔آمین۔اس کے ساتھ ہی اگلے ماہ تک کے لئے اجازت، اللہ نگہبان۔

☆☆ پیا صاحبہ: قلبی نوازش نامہ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ہر ماہ اگر کہانی نہ ارسال کیا کریں تو اپنی رائے ضرور ارسال کردیا کریں۔ چلئے "ماہی کی جگہ درد دل" حاضر ہے۔آپ کی رائے کا شدت سے انتظار رہے گا۔Thanks۔

بلقیس خان پشاور سے، السلام علیکم! امید محکم ہے کہ پورا اسٹاف خیر و عافیت سے ہوگا اور زندگی کی رنگوں میں اپنے اپنے حصے کا رنگ ڈالنے کا بھرپور اہم کردار ادا کر رہا ہوگا۔نومبر کا ڈر ڈائجسٹ کا بہترین ٹائٹل تھا۔ڈری سہمی، حسینہ بہت معصوم لگ رہی تھی، سب دوستوں کے تبصرے پسند آئے، آپ سب کا بہت بہت شکریہ! کہ آپ کو میری کہانیاں پسند آرہی ہیں۔تمام کہانیاں بہترین اور عمدہ رہیں۔نئی کہانی زندہ صدیاں بھی زبردست ہے۔ہر رائٹر کا اپنا ایک مقام ہے۔سب لوگ محنت سے آگے بڑھ رہے ہیں۔میری کہانی شہر شکار اور شکاری، بھی تو سالگرہ نمبر کے لئے تھی، ابھی تک لگ نہیں سکی۔پھر بھی میں ناراض نہیں ہوں۔کوشش تو بہت کرتی ہوں، کہ ریگولر ہوجاؤں، مگر مصروفیات آڑے آجاتی ہیں، باقی شگفتہ ارم درانی، ایس حبیب، عطیہ زاہرہ، ساحل دعا، صبا محمود اسلم اور شائستہ سحر، ساجدہ راجہ اچھا لکھ رہی ہیں۔اور بیسٹ جارہی ہیں۔آپ سب مجھے بھول نہ جائیں کہیں کیونکہ میں اپنی دعاؤں میں ہمیشہ آپ سب کو یاد رکھتی ہوں۔رولوکا، اچھی جارہی ہے۔عشق ناگن، کبھی کبھی بالی ووڈ اولڈ، فلموں ناگن، نگینہ، ناگا ہیں، کا سا اسٹائل اپنالیتی ہے۔خیر باقی ایم الیاس صاحب کا صرف نام ہی کافی ہے۔پلیز، نئے رائٹروں کو بھی موقع دیجئے کہ وہ بھی اپنی صلاحیتیں نکھار کر سامنے لاسکیں، ادارے سے ہمیں کوئی شکوہ شکایت نہیں ہے، ہم نئے رائٹر ہیں۔ہماری کہانیاں لگ رہی ہیں۔خوشی کی بات ہے ہمارا اشارہ سلسلے وار تحریروں کی جانب ہے۔یقیناً آپ غور کریں گے۔والسلام۔

☆☆ بلقیس صاحبہ: قلبی لگاؤ سے تحریروں کی تعریف کے لئے شکریہ۔آپ اور اکثر رائٹروں سے کہا جاتا ہے کہ زیادہ تر چھوٹی کہانیاں لکھیں کیونکہ چھوٹی کہانیاں زیادہ شامل اشاعت ہوتی ہیں۔بڑی کہانیاں نمبر میں لگ جاتی ہیں۔آپ کی امتحانی مصروفیات زیادہ ہیں، خیر ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب و کامران کرے۔

ایس حبیب خان کراچی سے، السلام علیکم! سب سے پہلے ڈر کی ٹیم، تمام رائٹرز اور اس کے پڑھنے والوں کو میری طرف سے نیا سال مبارک! دعا ہے کہ نیا سال ہم سب کے لئے امن و سلامتی کا پیغام لے کر آئے۔(آمین) ڈر دسمبر 2014ء کا شمارہ ملا، سال کا آخری رسالہ ہونے کی وجہ سے دلچسپی خاص تھی، نئے سال کے "خاص نمبر" کا شدت سے انتظار ہے۔سب سے پہلے خطوط کی محفل میں پہنچے، جہاں پر ساجدہ راجہ کے چچا کی وفات کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے والد کو صحت و تندرستی اور عمر دراز عطا کرے۔(آمین) باقی کافی لوگ غیر حاضر تھے، کہانیوں میں ابلتا لہو، درندہ صفت، الگ مخلوق، نحوست اور مجبوری پسند آئیں۔شائستہ سحر اور بلقیس خان کی کمی محسوس ہوئی یہ دونوں اچھا لکھتی ہیں اور آج کل خاص طور سے سیدہ عطیہ زاہرہ کی تحریریں زبردست جارہی

ہیں۔خاص نمبر کے لئے تحریر ارسال کررہی ہوں۔آپ اسے خاص نمبر میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیں گے۔آخر میں ڈ کے لئے دعا ہے کہ آنے والے دنوں میں ڈ مزید کامیابیاں حاصل کرے۔(آمین)

☆☆ایس حبیب صاحبہ: نئی تحریر کے لئے تھینکس، جس طرح آپ کسی کی شمارہ سے غیر حاضری کو تہہ دل سے محسوس کرتی ہیں تو اسی طرح اور بھی آپ کی غیر حاضری کو محسوس کرتے ہیں، امید ہے غور فرمائیں گی۔نئی تحریر دیر سے موصول ہوئی، اس لئے اس شمارے میں نہ شائع ہوسکی، اس کے لئے بہت بہت معذرت، آپ تو کراچی کی ہیں یعنی گھر کے افراد ہی غیر حاضر ہیں تو......پلیز!

راحل بخاری محبوب شاہ سے، السلام علیکم! امید ہے سب بخیریت ہونگے۔قرآن کی باتیں ایمان کی تازگی کا سبب بنیں۔کہانیوں میں یقینی موت مدثر بخاری، ہتھیار اضرغام محمود اور مجبوری اچھی لگیں......ایس امتیاز احمد اچھا ہی لکھتے ہیں۔ساجدہ سسٹر! آپ کے چچا کا سن کر بہت دکھ ہوا۔اللہ پاک ان کو جوار رحمت میں جگہ دے، آپ لوگوں کو صبر دے اور آپ کے ابو کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔آمین......ویسے میرا بہت دل کرتا ہے کہ جب ڈر ڈائجسٹ شائع ہوتا ہے، تیار ہوکر باہر نکلتا ہے تو دیکھوں......واہ......کیا منظر ہوتا ہوگا......کاش! میں دیکھ سکتی۔شگفتہ ارم آپ کو شادی کی مبارکباد، پلیز لکھتی رہیے گا۔اس بار عامر ملک کی تحریر کو مس کیا۔بشیر احمد بھٹی! ڈر ڈائجسٹ تو کب کا دیہاتوں میں جا نکلا ہے۔ہم لوگ بھی گاؤں میں رہتے ہیں۔مگر ڈرتے نہیں ہیں۔ڈرانا اور بات ہے۔شبانہ آنٹی اور سحرش سسٹر ویلکم ان ڈر......ڈر کسی کی حوصلہ شکنی نہیں کرتا......تمام لوگوں کو نیا عیسوی سال مبارک ہو۔آخر میں سب کو سلام اور ڈر کی ترقی کے لئے دعائیں۔آئندہ ماہ تک کے لئے خدا حافظ۔

☆☆راحل صاحبہ: خط لکھنے کے لئے شکریہ قبول کریں، کیا یہ اچھا نہیں کہ آپ ہر ماہ قلبی خلوص ارسال کیا کریں، آپ کی پسندیدہ کہانی ''نقاب'' زبردست تھی۔اب نئی آئی ہے ''سایہ'' دیکھتے ہیں کیا رنگ دکھلاتی ہے۔جب آپ کو پتہ تھا کہ یہ جملے سنسر ہوجائیں گے تو پھر......خیر امید ہے شکریہ کا موقع ہر ماہ دیں گی۔

پری لاہور سے، السلام علیکم! کسی بھی ڈائجسٹ میں میرا یہ پہلا خط ہے۔امید ہے حوصلہ افزائی ہوگی۔دسمبر کا ڈر ڈائجسٹ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔اب اپنے خط کو ڈر ڈائجسٹ کی تعریف سے سجانا پسند کروں گی۔جی تو جیسا کہ یہ میرا پہلا خط ہے۔تو آپ کو یہ بتادوں کہ دسمبر کا شمارہ مجھے بہت اچھا لگا۔اس کا ٹائٹل بہت ہی اچھا ہے۔اس میں مجھے جو کہانی حقیقت سے بالکل قریب لگی۔وہ کہانی ''دختر آتش'' ہے۔اس کے علاوہ ''عقرب'' بھی بہت اچھی ہے۔اس کے علاوہ باقی تمام کہانیاں بہت اچھی لگیں۔لیکن دختر آتش کا جواب نہیں۔قوس قزح بھی بہت ہی اچھا ہے۔ڈر ڈائجسٹ کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں کہ یہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔بھائی جی، آپ سے اور تمام قارئین سے درخواست ہے کہ میرے لئے خصوصی دعا کیجئے گا تاکہ میں اپنے ہر کام اور ہر مقصد میں کامیابی حاصل کروں اور اپنی پڑھائی میں بھی زبردست کامیابی حاصل کروں۔انشاءاللہ جیسے ہی فرصت ملے گی دوبارہ خط ضرور لکھوں گی۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے امان میں رکھے۔آمین!

☆☆پری صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، چلئے آپ کی حوصلہ افزائی ہوگئی۔اب امید ہے کہ ہر ماہ آپ خط لکھ کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گی۔اس بات کو ذہن میں بیٹھالیں کہ مسلسل محنت ہی آدمی کو کامیاب کرتی ہے۔اگر آپ بھی متواتر محنت سے کہانی لکھیں تو ایک اچھی رائٹر بن سکتی ہیں۔ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جائز مقاصد میں کامیاب و کامران کرے۔

آویشہ نیازی بٹہ موڑی بٹگرام سے، السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ ڈر ڈائجسٹ کا اسٹاف اور قارئین کرام بخیریت ہوں گے، کچھ مصروفیات کی وجہ سے کافی عرصہ غیر حاضر رہی، اس لئے سوری، دسمبر 2014ء کا شمارہ کزن سے لے کر پڑھا۔ڈر ڈائجسٹ کا جواب نہیں۔مجموعی طور پر تمام کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں اور قوس قزح کے رنگ بھی کچھ کم نہیں۔دل تو چاہتا ہے کہ ہر ماہ کچھ نہ کچھ اس میں لکھوں، مگر وقت نہیں ملتا، خیر اب کوشش کروں گی کہ ریگولر ہوجاؤں۔سلسلے وار کہانیاں بہت اچھی ہیں، رولو کا بھی اچھی جارہی ہے۔سوچ رہی ہوں کہ اپنی کہانی بھیجوں، مگر ڈر بھی لگ رہا ہے کہ حوصلہ افزائی ہوگی بھی کہ نہیں، جنوری کے خاص نمبر میں میرا خط ضرور شامل اشاعت کیجئے گا تاکہ میرا حوصلہ بڑھے۔ڈر ڈائجسٹ کی ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

☆☆آویشہ صاحبہ: ایک مرتبہ پھر ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، اس دور میں کسی کے پاس فالتو ٹائم نہیں۔مگر ٹائم نکالنا پڑتا ہے۔لکھتے لکھتے آدمی لکھاری بن جاتا ہے۔آپ کہانی بصد شوق لکھیں، لکھتے لکھتے آپ کو بھی لکھنا آجائے گا، کہانی لکھ کر اسے دوبارہ پڑھئے گا، اس میں غلطیاں ہوں گی تو اسے اصلاح کرکے دوبارہ فیئر کرنے کے بعد ارسال کیجئے گا، لیکن ایک لائن چھوڑ کر کہانی لکھئے گا تاکہ اصلاح کے لئے جگہ نکل سکے۔

قاضی حماد سرور اوکاڑہ سے، سلام محبت! آج کل کے دور میں جہاں موبائل، انٹرنیٹ اور کیبل وغیرہ نے نہ صرف خلوص ومحبت اور سچے جذبوں کو مجروح کردیا بلکہ رشتوں کے تقدس کو بھی بری طرح پامال کیا ہے۔ ان حالات کے باوجود "ڈر ڈائجسٹ" پڑھتے وقت یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس نفسا نفسی کے عالم میں بھی "ڈر" نے بے لوث جذبوں اور رشتوں کی سچائیوں کو قائم رکھا ہوا ہے۔ اور یہی بات ڈر ٹیم کی محنت، خلوص نیت اور کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وگرنہ تو...... یہ محبت ان دنوں کی بات ہے فراز...... جب لوگ سچے اور مکان کچے ہوا کرتے تھے! ایک بات میں تمام رائٹرز حضرات سے پیشگی معذرت کے ساتھ گوش گزار ضرور کرنا چاہوں گا کہ یہ "ڈر ڈائجسٹ" والوں کا اعلیٰ ظرف ہے کہ وہ ہر لکھنے والے کی بہت حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور موقع بھی دیتے ہیں جبکہ میں نے وہ کہانیاں بھی پڑھی ہیں جو "ڈر" کے معیار کے مطابق نہ تھیں۔ مگر یہ ڈر ٹیم کا بڑا پن ہے کہ وہ بھی صفحات کی زینت بنیں۔ میرا مقصد کسی بھی رائٹر/کہانی کی دل شکنی کرنا نہیں مگر میری تمام رائٹر حضرات سے یہ التماس ہے کہ کوئی بھی کہانی لکھنے اور بھیجنے سے پہلے صرف ایک دفعہ دل سے ڈر ڈائجسٹ کی مقبولیت اور معیار کو مدنظر رکھنے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ضرور سوچنے گا کہ ہمارے لئے پوری ڈر ٹیم کی نیک نیتی اور خلوص میں کوئی شک نہیں۔ ماہ دسمبر 2014ء کے ڈائجسٹ میں "شیبا، ہتھیار اور عقرب بہترین اور اچھی کہانیاں تھیں مگر جس کہانی نے دل ودماغ پر اپنا نقش ثبت کیا وہ "دختر آتش" رہی۔ آخری بات یہ کہ اللہ غفور الرحیم نے ہم کو ہر چیز بن مانگے عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے مگر دو چیزیں ایسی ہیں جو صرف اس ذات اقدس سے مانگنے پر ہی انسان کو ملتی ہیں۔ اللہ کی محبت، اللہ کی ہدایت اور میرا ایمان ہے کہ یہ دونوں چیزیں اللہ کے فضل سے ہی حاصل ہوسکتی ہیں اور وہ ہے "عاجزی، احکام خداوندی پر عمل۔" اللہ پاک ڈر ٹیم اور آپ سب کو خوش رکھے۔ دعاؤں میں یاد رکھیں اس ناچیز کو بھی...... والسلام۔

☆☆ حماد صاحب: خوب بلکہ بہت خوب لکھا، قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا خلوص نامہ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، آپ نے تہہ دل سے محسوس کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا کہ واقعی ڈر ڈائجسٹ اپنے چاہنے والوں کی عزت کرتا ہے اور بعض اوقات ایسی کہانیاں بھی رائٹر حضرات کی شائع کرتا ہے جو کہ ڈر کے موضوع سے ہٹ کر ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ کسی کا دل نہ ٹوٹے، اور اسے قلبی خوشی وسکون ملے، آپ کے خلوص نامہ کا ہر ماہ شدت سے انتظار رہے گا۔ امید ہے شکریہ کا موقع دینا بھولیں گے نہیں۔ Thanks۔

عثمان غنی پشاور سے، السلام علیکم! دسمبر کا شمارہ 21 کو ملا، جلدی مل جانے پر دل خوشی سے بھر گیا، اندرونی صفحات، قرآن کی پاک باتوں سے دل کو نور کی روشنی سے منور کیا، پھر کہانیوں پر سرسری نظر دوڑائی، اپنی کہانی ڈھونڈی، نہیں ملی، خیر اگلے ماہ سہی۔ سارے خطوط زبردست پسند آئے، خطوط سے ہمیں تقویت ملتی ہے کہ اچھا اور نیا نہیں لکھ سکیں۔ نئی کہانی مسکراہٹ خاص شمارہ جنوری کے لئے لکھی ہے۔ کیونکہ جنوری میرے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جی جناب! جنوری میں میری سالگرہ ہے۔ سالگرہ کے دن، دوست وش کردیتے ہیں۔ دوست، کزن، تحفے بھی دے دیتے ہیں۔ اب آپ کی باری ہے۔ کہانی شائع کردیں تو یہی میرا تحفہ ہوگا! میں ڈن سمجھوں جی۔ میں اپنی برتھ ڈے، سادگی سے منانا پسند کرتا ہوں، جن دوستوں کی جنوری میں برتھ ڈے آرہی ہے، میں انہیں پیشگی مبارک دیتا ہوں۔

☆☆ عثمان صاحب: خوش ہوجائیں آپ کی مسکراہٹ بطور تحفہ منظر عام پر آگئی۔ ہماری اور قارئین کی طرف سے سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ ڈھیروں خوشیوں سے نوازے۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! نیک دعاؤں اور خیر وعافیت کے ساتھ حاضر ہوں۔ موسم بدل گیا ہے اور سردی کا آغاز ہوچکا ہے، ماحول خوشگوار تھا کسی کام کے سلسلے میں شہر جانا پڑا، وہاں بک اسٹال پر ماہ دسمبر 2014ء کے تازہ پرچے سے ملاقات ہوگئی، سرورق پہلے سے زیادہ دیدہ زیب تھا ایسا سرورق میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، اس سال کا یہ سرورق اپنی مثال آپ تھا، پرچہ پہلے سے زیادہ دلکش اور کامیابی سے ہمکنار ہے، پرچہ دیکھ کے میرا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ خط اور غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ ہر کہانی اپنی اپنی جگہ پر کامیاب تھی، کسی ایک کی تعریف کرنا مناسب نہیں ہے، قوس قزح کے تمام اشعار اچھے، غزلیں بھی کی لاجواب تھیں، آپ کا خلوص ہمارے لئے بہت اہم ہے، اگر دیکھا جائے سال 2014ء میں بے شمار زخم لگے، افراتفری، دہشت گردی، بے قصور لوگوں کا خون زیادہ بہا، شہید ہونے والوں میں ہمارے فوجی جوان بھی شامل ہیں۔ آئندہ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم وکرم کرکے ہمیں تمام پریشانیوں سے دور رکھے۔ ہم پر اپنا فضل وکرم رکھے، آنے والا نیا سال ہمارے لئے خوشیاں ہی خوشیاں لے کر آئے۔ نیا سال تو آتا ہے اور پرانا ہوکر چلا جاتا ہے۔ مگر اصل میں عمل ہمارا نیک ہونا چاہئے اور یہی ہم لوگوں کو سوچنا چاہئے۔ جب تک ہم خود کو نہیں سدھاریں گے اس وقت تک ہم خوشحال زندگی نہیں گزار سکتے۔ میں تمام دوستوں کے لئے دعا گو ہوں کہ اللہ سب پر اپنا کرم کرے۔ (آمین)

☆☆ اسلم صاحب: قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا نوازش نامہ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، آپ کی تمام باتیں حقیقت پر مبنی ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو بھی خوشیوں سے نوازے۔

عابد علی جعفری کندیاں سے، السلام علیکم! ڈر کی محفل میں پھر سے حاضری دے رہا ہوں، کافی عرصہ کے بعد امید ہے ضرور پرانے اور نئے دوست خوش آمدید کریں گے۔ ڈر ڈائجسٹ دسمبر 2014ء کا شمارہ 23 نومبر کو ملا، بہت خوشی ہوئی، ٹائٹل بہت زبردست تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ایم اے راحت کی زندہ صدیاں پڑھی ابھی تک پچھلی دونوں اقساط کا سحر باقی تھا۔ یہ قسط بھی پڑھ کر اگلی قسط کا سحر جاگ گیا ہے۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ جن میں ابلتا لہو بہت زبردست تھی، اس کے علاوہ عقرب، دختر آتش، مجبوری، ہتھیارا اور یقینی موت اچھی کاوش تھی، قسط وار کہانیاں، رولوکا اور عشق ناگن بھی ٹھیک تھیں جو مسلسل قاری کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں۔ مسلسل سزا شائع اشاعت کرنے کا بہت بہت شکریہ اور قارئین کا بھی کہانی پسند کرنے کا شکریہ۔ اس خط کے علاوہ چند اشعار اور غزل بھیج رہا ہوں، امید ہے کہ ان کو بھی پرچے میں جگہ ملے گی۔

☆☆ عابد صاحب: خط لکھنے، کہانیوں کی تعریف اور نئی کہانی ارسال کرنے کے لئے بہت بہت شکریہ، آپ کی کہانی لیٹ موصول ہوئی اور شامل اشاعت ہونے سے رہ گئی، اس کے لئے معذرت، آئندہ بھی نوازش نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! ماہ دسمبر 2014ء کا ''ڈر ڈائجسٹ'' ہمارے سامنے ہے۔ وعدہ کے مطابق تجزیہ حاضر خدمت ہے۔ ☆ ٹائٹل پر خوب صورت حسینہ کو بدصورت ڈھانچے کا گھورنا اچھا نہیں لگا مگر وہ کیا ہے کہ دل تو دل ہے ناں!۔ ☆ ''قرآن کی باتیں'' ہم سب کے لئے مشعل راہ ہے، پڑھنے کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے۔ ☆ ''خطوط'' ڈر کی محفل میں طرح طرح کے خوب صورت وویورز کے خوب صورت خطوط دل موہ لیتے ہیں۔ ☆ ''ابلتا لہو'' خوف و ہراس میں ڈوبی تحریر جسے ''سیدہ عطیہ زاہرہ لاہور'' سے لے کر آئیں لکھنے کا خوب صورت انداز خدا کرے اور ہو زور قلم زیادہ۔ ☆ ''درندہ صفت'' گوجرانوالہ سے صبا محمد اسلم کی تحریر آج کل آپ اچھا لکھ رہی ہیں۔ ☆ ''تڑپتی روح'' نعیم بخاری آکاش، اوکاڑہ، سے مطلب پرستی پر خوب صورت تحریر لائے۔ جواب نہیں آپ کا......؟ ☆ ''رولوکا'' پراسرار قوتوں کے مالک کی کرشمہ سازیاں جسے مدبر قلم کار ''اے وحید'' نے تحریر کیا۔ 115 ویں قسط میں، خوب صورت انداز سے داخل ہوگئی ہے، ویلڈن......ویلڈن......اے وحید صاحب۔ ☆ ''شہر خموشاں'' ہری پور سے محمد قاسم رحمان لے کر حاضر ہوئے۔ سسپنس اور ہارر کا خوب صورت امتزاج کے ساتھ اچھی تحریر ہے۔ ☆ ''مجبوری'' ہماری اپنی تحریر جس کے بارے میں پڑھنے والے بتائیں گے کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔ ☆ ''الگ مخلوق'' لاہور سے ''آصفہ سراج'' کی عشق و محبت، چاہت و خلوص اور دیدہ دلیری سے بھرپور تحریر......اچھی رہی۔ ☆ ''زندہ صدیاں'' ایم اے راحت کی دل آویز تحریر، سوچ کے نئے دریچے کھولتی لاجواب سلسلہ وار اسٹوریز، راحت صاحب کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ ☆ ''نحوست'' ساجدہ راجہ ہنڈواں، سرگودھا سے اچھی تحریر لائیں، واقعی جی! ''نحوست پھر نحوست'' ہی ہے۔ آپ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ ☆ ''خونی مسیحا'' مسیحائی میں بھی خوف شامل ہوگیا ہے۔ اسٹوری کو پڑھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ☆ ''دختر آتش'' محبت کے نام پر جادو ٹونا، اور بہت کچھ بلکہ بہت کچھ اس کہانی کو پڑھنے والے پڑھ کر سمجھ سکتے ہیں۔ ''طاہرہ جی'' اچھا لکھ لیتی ہیں آپ......! ☆ ''شیبا'' فرحان احمد نصیب کراچی سے لے کر براجمان ہیں۔ کبھی تحریر حقیقت سے قریب لگتی ہے اور کبھی بہت زیادہ حقیقت......فرحان صاحب بہت خوب صورت انداز ہے آپ کا لکھنے کا۔ گڈ...... ☆ ''ہتھیارا'' ضرغام محمود کراچی سے بہت خوب لکھا، آپ کی تحریر اچھی رہی، مگر نام ذرا تبدیل کر دیتے تو......؟ ☆ ''یقینی موت'' شہر سلطان سے مدثر بخاری کی خوب صورت تخلیق، ظلم و ستم اور پراسراریت کو آپ نے جس طرح اپنی اسٹوری کا حصہ بنایا۔ جواب نہیں آپ کا جی! ☆ ''عشق ناگن'' بہت خوب الیاس صاحب لکھ رہے ہیں۔ خوب صورت اور حسین تحریر اپنے سلسلے کی، 15 ویں دروازے پر کامیابی سے دستک دے رہی ہے۔ محبت کو خوب صورت لفظوں میں بیان کیا ہے۔ ویلڈن الیاس صاحب، جواب نہیں آپ کا! ☆ ''قوس قزح'' ڈر کے وویورز کے لئے خوبصورت اشعار جو آپ کو بھی اچھے لگے ہوں گے۔ ☆ ''غزل'' قارئین اور وویورز کی حسین غزل جو آپ کے دلوں کا احاطہ کرلے گی۔ ☆ ''عقرب'' نور محمد کاوش سلانوالی سرگودھا سے جناتی اسٹوریز لے کر آئے جو یقیناً آپ کے دلوں کو بھی اچھی لگے گی۔ تو یہ تھا دسمبر 2014ء ''ڈر ڈائجسٹ'' پر تجزیہ انشاءاللہ اس خاص نمبر جنوری 2015ء میں خوب صورت تجزیہ کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ ہماری اسٹوری لگانے کا شکریہ۔ نئے سال کی دلی مبارک باد آپ کو اور ''ڈر'' کے تمام وویورز اور رائٹرز کو ''ہیپی نیو ایئر مبارک'' ہو۔ پلیز اپنا خیال رکھئے گا!

☆☆امتیاز صاحب: لکھا اور خوب لکھا، دل خوش کر دیا، امید ہے اس طرح ہر ماہ کا تجزیہ ارسال کرتے رہیں گے۔Thanks۔

بشیر احمد بھٹی فوجی بستی بہاولپور سے، السلام علیکم! دسمبر 2014ء کا آخری شمارہ سامنے ہے۔ یہ سال بھی رخصت ہونے کو ہے۔ نیا سال 2015ء کی آمد آمد ہے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ پہلی کہانی ابلتا لہو، دوسری درندہ صفت اچھی رہیں۔ تڑپتی روح بھی لاجواب ہے۔ مجبوری، الگ مخلوق، ہتھیارا، نحوست، خونی مسیحا، یقینی موت کے بعد آخری طویل کہانی عقرب بھی قابل تعریف ہے۔ عقرب زیر مطالعہ ہے۔ طویل کہانی کو ذرا ٹھہر ٹھہر کے پڑھنا پڑتا ہے تاکہ تصوراتی مناظر کا تسلسل نہ ٹوٹے۔ دسمبر کے شمارے میں آپ نے مجھے یہ اشارہ دے کر حیران کر دیا ہے کہ بس ایک ہی کہانی...... میں نے واقعی ابھی تک ڈر میں ایک ہی کہانی شائع کرائی ہے۔ اس قدر زیادہ کہانیوں کے درمیان الجھے رہنے کے باوجود آپ کو یہ یاد رہتا ہے کہ کس نے کتنی کہانیاں بھیجی ہیں۔ آپ کی یادداشت کو داد دیتا ہوں، خدا آپ کے ذہن کو اور طاقت بخشے۔ عنقریب ایک ڈراؤنی کہانی ارسال کردوں گا۔ شکریہ۔

☆☆بشیر صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، پرانا رخصت ہوا اور نئے سال کی آمد ہے۔ ہم تمام لوگوں کو سوچنا چاہئے کہ ہم نے گزشتہ سال میں کیا کھویا اور کیا پایا، ہمارا اصلاح عمل کتنے فیصد رہا۔ خیر نئی کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔

محمد اسحاق انجم کنگن پور سے، السلام علیکم! امید ہے ادارے کے سارے لوگ خیریت سے ہوں گے! خطوط کی محفل میں شامل ہونا بھی ایک مشغلہ ہے۔ دوستوں کے شکوے شکایت اپنی جگہ اور ذاتی مصروفیات الگ! کسی ڈائجسٹ کے لئے یہ بات خوشی کی ہوتی ہے کہ لوگ اس ڈائجسٹ کا انتظار کرتے ہیں، اور وہ ہے "ڈر ڈائجسٹ" جس کا ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔ اور آنے والے شمارے کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے، میری طرف سے تمام دوستوں کو نیا سال مبارک، بلکہ ایڈوانس مبارک باد، کہ یہ سال ہمیں اور آپ سب کو خوشیاں دے اور ہمارے پاکستان کے لئے ترقی و خوشحالی کا سال ثابت ہو! سب کے لئے دعا گو!

☆☆اسحاق صاحب: نوازش نامہ ارسال کرنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے تھینکس، آپ تمام دوستوں کی چاہت کا ثبوت ہے کہ آپ سب ڈر ڈائجسٹ سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ اس کے لئے بہت بہت شکریہ۔

طارق محمود کامڑہ کلاں سے، السلام علیکم! امید کرتا ہوں اور اللہ سے دعا ہے کہ ڈر کے ادارہ سے تعلق رکھنے والے حضرات، لکھاری حضرات اور ڈر ڈائجسٹ سے محبت کرنے والے قاری سب خیریت سے ہوں گے، تین ماہ بعد ڈر کی بزم میں حاضر ہو رہا ہوں، کچھ ذاتی پروبلم کی وجہ سے کوئی خط لکھ سکا اور نہ ہی اپنی کہانی و غزل وغیرہ ارسال کر سکا۔ لیکن ہر ماہ کا رسالہ باقاعدگی کے ساتھ پڑھتا رہا۔ نومبر میں "محبت کی بازی، حسد، پرانا قبرستان، سرد جہنم، جادوئی بساط" بہت اچھی کہانیاں تھیں، باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں اور اس ماہ دسمبر کا رسالہ "ابلتا لہو" بہت خوب، عطیہ زاہرہ صاحبہ "عقرب" نور محمد کاوش "مجبوری" ایس امتیاز احمد، "دختر آتش" طاہرہ آصف باقی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں، یقیناً وہ بھی بہت اچھی ہوں گی۔ پچھلے تین ماہ میں اپنی کہانی اور غزل ڈر میں دیکھنے کی حسرت ہی رہی۔ چلیں خیر ہو سکتا ہے اگلے ماہ کوئی آجائے، رسالہ کی زینت بن کر۔ ایک غزل ارسال ہے، برائے مہربانی ضرور شائع کیجئے گا اور انشاء اللہ کہانی اگلے ماہ بھیجوں گا، میری دعائیں رسالہ کی ترقی کے لئے۔

☆☆طارق صاحب: نوازش نامہ اور کہانیوں کی تعریف کے لئے دلی شکریہ، آپ کی دو کہانیاں موجود ہیں۔ مگر چھوٹی بلکہ بہت چھوٹی کہ ڈر کے دو صفحات بھی نہیں بنیں گے، امید ہے غور کریں گے، کہانی کے صفحات مزید بڑھائیں، نئی کہانی کا انتظار رہے گا۔ شکریہ۔

سید عبادت کاظمی ڈیرہ اسماعیل خان سے، السلام علیکم! دسمبر کا ڈر پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، تمام کہانیاں بہت اچھی اور زبردست ہیں۔ ویسے ڈر ڈائجسٹ سے میرا رشتہ کافی پرانا ہے، دسمبر کے شمارے میں آپ نے میری غزل شائع کر کے کرم کیا، اس امید پر کچھ اور بھیج رہا ہوں اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈر ڈائجسٹ کو مزید عروج بخشے۔

☆☆عبادت صاحب: نوازش نامہ ارسال کرنے کے لئے شکریہ، ہر ماہ علیک سلیک کرنے سے قلبی رشتہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے، پلیز! ہر ماہ ڈر ڈائجسٹ کے لئے بھی ایک گھنٹہ نکال لیا کریں۔ امید ہے غور فرما کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

نعیم بخاری آکاش اوکاڑہ سے، السلام علیکم! میں خیریت سے ہوں اور امید ہے ادارے کے سارے لوگ بخیر ہونگے۔ ماہ دسمبر کا شمارہ خریدا تو اپنی کہانی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، بہت شکریہ، آپ کی نظر کرم کی بدولت میرے دل کے آنگن میں نئے پھول کھل گئے اور ان کی خوشبو سے میں باغ باغ ہو گیا، اس خوشی کے ساتھ تھوڑا سا شکوہ بھی ہے کہ سال 2011ء میں تین کہانیاں

میں نے ارسال کی تھیں۔ جن میں سے تڑپتی روح شائع جبکہ ''اغوا'' اور ''ڈیڈ مین'' شائع نہیں ہوئی ہیں۔ اگر ہو چکی ہیں تو مجھے اس ماہ کے ڈائجسٹ بھجوا دیں میں آپ کو ان کی قیمت ادا کردوں گا۔ میں اچھے اور نئے نئے موضوع کی تلاش میں گامزن رہتا ہوں تاکہ ڈر کے لئے اچھا اور نیا لکھ سکوں۔ اب آتے ہیں ڈر دسمبر کی طرف سب سے پہلے ''ابلتا لہو'' پڑھی، سیدہ عطیہ زاہرہ نے ایک قصائی پر بہت اچھی کہانی لکھی ہے۔ مجبوری، رولوکا، الگ مخلوق بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ اور ''یقینی موت'' بھی مدثر بخاری نے اچھا لکھا ہے۔ اب اجازت اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ڈر ڈائجسٹ کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دے۔

☆☆ نعیم صاحب: بہت بہت شکریہ کہ آپ نے نئی کہانی بھیجی، اکثر آپ کی کہانی ہارر اور موضوع سے ہٹ کر ہوتی ہے۔ جو کہانی آپ کی شائع ہوئی ہے یقیناً پڑھی ہوگی، اینڈ میں کہانی کو بڑھا کر ہارر موضوع کیا گیا ہے امید ہے آپ غور فرما کر آئندہ ہارر موضوع کو زیر قلم لائیں گے۔ thanks۔

دلکش امیر پوری کہروڑپکا سے، السلام علیکم! کے بعد عرض ہے کہ بندہ بڑے عرصے بعد خط لکھ رہا ہے۔ امید ہے ردی کی ٹوکری کی نذر نہ ہوگا۔ خداوند کریم سے امید کرتے ہیں کہ ڈر کا اسٹاف، پڑھنے والے اور لکھنے والے خیر و عافیت سے ہوں گے۔ جناب کہانیاں ابھی پڑھی نہیں چونکہ رسالہ ابھی خریدا ہے، امید ہے پہلے کی طرح تمام کی تمام کہانیاں بہترین ہوں گی۔ چونکہ یہی ڈر کا خاصہ ہے۔

☆☆ دلکش صاحب: بڑے عرصے کو بھول کر ذرا جلد [illegible] خط ارسال کر دیا کریں، مہربانی ہوگی، کیوں ٹھیک ہے ناں اور ہاں کہانیاں پڑھنے کے بعد اپنی رائے ارسال کرنا بھولئے گا نہیں۔

محسن عزیز حلیم کوٹھا کلاں سے، السلام علیکم! امید ہے سب خیریت سے ہوں گے۔ خدا کرے سب خوش رہیں، Soo Said ساجدہ آپی کے چچاؤں کا سن کر بہت افسوس ہوا اور آپ کے ابو کے لئے ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صحت کامل عطا فرمائیں اور ان کا سایہ ہمیشہ آپ کے سر پر رکھے۔ دسمبر کے شمارے میں ساجدہ راجہ، عطیہ زاہرہ، طاہرہ آصف، صبا محمد اسلم، فرحان احمد، آصفہ سراج، نور محمد کاوش، نعیم بخاری آکاش، ان سب رائٹر حضرات نے بہت اچھا لکھا۔ اچھی کہانیاں خود ہی اپنا لوہا منوالیتی ہیں۔ ہاں یاد آیا۔ میری دونوں کہانیاں مظلوم روحیں اینڈ ویرانے کا جن۔ دیکھیے جلد از جلد ان میں کسی ایک کو تو؟ اگر ایسا نہ ہوا تو ہم روٹھ جائیں گے۔ اور ہاں سب کو Happy New Year مبارک ہو، ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ۔

☆☆ محسن صاحب: وقت آنے پر آپ کی کہانی بھی ضرور چھپے گی، فکر نہ کریں، خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس، روٹھنا اچھا نہیں اور ویسے بھی ہمیں روٹھے ہوؤں کو منانا آتا ہے۔

محمد نوید قمر کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے آپ اور ''ڈر'' ڈائجسٹ کی پوری ٹیم خیر و عافیت سے ہوں گے۔ ہمیشہ کی طرح اپنی ایک الگ پہچان کے ساتھ ڈر ڈائجسٹ ہر عمر کے لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے اور اس کی یہی انفرادیت اسے ہر خاص و عام میں مقبول کئے ہوئے ہے، چاہے وہ سنسنی خیز کہانیاں ہوں، یا قوس قزح کے رنگ ہوں یا خطوط کی محفل، آپ لوگ جس محنت اور لگن سے اس کی آبیاری کرتے ہیں وہ قابل ستائش ہے اور خاص کر نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بہت ہی لائق تحسین جذبہ ہے، میں بھی کئی بار آپ کی بزم میں بازیابی کا شرف حاصل کر چکا ہوں اور اب کافی ٹائم بعد اپنی کچھ شاعری آپ کو ارسال کر رہا ہوں، اگر آپ کے معیار کے مطابق ہو تو شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں، انشاءاللہ آئندہ بھی قلمی ملاقات کا سلسلہ جاری رہے گا۔ شکریہ۔

☆☆ نوید صاحب: ایک مرتبہ پھر ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، یہ حقیقت ہے کہ ڈر ڈائجسٹ اپنے پڑھنے والوں کا خیال رکھتا ہے، چلئے شکریہ کا موقع فراہم ہوگیا اور اب امید ہے کہ آپ حسب وعدہ قلمی ملاقات کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ Thanks۔

قاسم رحمان ہری پور سے، السلام علیکم! سال کا آخری مہینہ آ ہی گیا۔ 2014ء اختتام پذیر ہونے کو ہے۔ جانے والا سال کچھ لوگوں کے دامن میں خوشیاں اور کچھ کے دامن میں غموں کی برسات چھوڑ کر جا رہا ہے۔ رب العزت سے دعا ہے کہ آنے والا نیا سال امت مسلمہ کے لئے بہترین سال ثابت ہو۔ اور وطن عزیز کے حالات بہترین ہو جائیں۔ دسمبر کا ڈر اب تک نہیں ملا۔ امید ہے کہ ''شہر خموشاں'' کو شمارہ میں جگہ ضرور مل جائے گی۔ عطیہ زاہرہ کی نومبر میں شائع ہونے والی کہانی پہلے بھی شائع ہو چکی ہے۔ عطیہ صاحبہ خوب بلکہ بہت خوب لکھتی ہیں، مگر یہ تحریر...... آج کل شمارے کی تمام کہانیاں بہت اچھی ہو رہی ہیں۔ رائٹر حضرات کی سوچ اور محنت خوب سے خوب تر نظر آ رہی ہے۔ ڈر ڈائجسٹ کی ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

☆☆ قاسم صاحب: اللہ تعالیٰ آپ اور ہم سب کی دعا قبول کرے کہ آنے والا سال میں ہمارے ملک میں خوشحالی کا دور دورہ شروع ہوجائے۔آپ نے جس کہانی کی نشاندہی کی، بالکل صحیح ہے، کئی سال پہلے یہ کہانی ڈر میں شائع ہوچکی ہے، دراصل ایسی کہانیاں ترجمہ ہوتی ہیں، اب ہر رائٹر ہر رسالہ تو پڑھتا نہیں، اکثر ہمارے ذہن سے بھی کہانی نکل جاتی ہے، ویسے آپ کی کہانی شہر خموشاں دسمبر کے شمارے میں شائع ہوچکی ہے۔

محمد ابو ہریرہ بلوچ بہاولنگر سے، السلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ سب خیریت سے ہوں گے، میں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں، گزارش سے پہلے ایک چھوٹا سا واقعہ سناتا ہوں، پچھلے دنوں میں رسالہ خریدنے مارکیٹ گیا، وہاں ایک لڑکی سے میری بحث ہوگئی، بحث اس بات پر تھی کہ لڑکیاں بہتر ہیں یا لڑکے، میں کہتا کہ لڑکے بہتر ہیں اور وہ کہتی کہ لڑکیاں، پھر اس نے دلیل دینے کے لئے مجھ سے پوچھا کہ آپ کون کون سے رسالے پڑھتے ہیں۔ میں نے اسے چار پانچ رسالوں کے نام گنوائے تو وہ بولی کہ ان سب رسالوں میں لڑکیاں لڑکوں سے زیادہ شمولیت کرتی ہیں۔آپ پاکستان کا کوئی بھی مشہور رسالہ اٹھالو اس میں لڑکیوں کی شمولیت ضرور ہوگی اس کے برعکس آپ صرف ایک ایسا رسالہ بتاؤ جس میں صرف لڑکے ہوں، میں نے کہا کہ اکیلے لڑکے تو کسی بھی ڈائجسٹ میں نہیں ہیں، تو پھر لڑکیاں لڑکوں سے بہتر ہوئیں ہاں اس نے اپنے دعوے پر دلیل دی، جس پر مجھے خاموش ہونا پڑا۔ستمبر 2014ء کے رسالے میں شامل کہانیوں میں مجھے اچھی لگیں وہ سب سے بیسٹ ہیں زندہ صدیاں، دختر آتش، عقرب، باقی کہانیاں مجبوری، تڑپتی روح، نحوست اور الگ مخلوق بھی عمدہ تھی۔اشعار اور غزلیں بھی عمدہ تھیں۔کہانی مکمل ہوگئی ہے۔انشاءاللہ اگلے خط کے ساتھ روانہ کردوں گا۔میرے دوستوں عمر فاروق، پروفیسر محمد اختر اور ابوذر غفاری کو ڈھیر سارا سلام۔

☆☆ ابو ہریرہ صاحب: زن و مرد کے معاملے میں اگر بحث چھڑ جائے تو بات بہت لمبی ہوجاتی ہے۔اس معاملے میں خاموشی اچھی بات ہے اور عقلمند آدمی بحث کے بجائے خاموشی کو ترجیح دیتا ہے۔اور یہ حقیقت ہے کہ ''وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ'' لیکن اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ''مرد'' کو تخلیق کیا۔امید ہے آپ آئندہ بحث نہیں کریں گے۔شکریہ۔

کاشف عبید کاوش بٹہ موڑی بٹ گرام سے، السلام علیکم! دسمبر کا یعنی سال کا آخری شمارہ ایبٹ آباد سے بھائی نے بھیجا تھا۔ بہت خوب صورت تھا۔قرآن کی باتیں پڑھ کر ایمان تازہ ہوا۔تمام کہانیوں پر سرسری نظر ڈالی تو سب ہی اچھی لگیں۔دوستوں کی محفل بھی زبردست رہی اور پھر قوس قزح کے صفحات نے تو دل موہ لیا۔میری غزل شائع کرنے کے لئے شکریہ۔اپنی کہانی بہت جلد ارسال کردوں گا۔میری کوشش تو تھی کہ میری کہانی جنوری کے خاص نمبر میں شائع ہو مگر کبھی کبھی سوچا ہوا پورا نہیں ہوتا، خیر دیر آئے درست آئے کو سوچ کر دل کو سمجھالیا۔قارئین کو نیا سال مبارک ہو اور خدا کرے یہ سال ہم پاکستانیوں کے لئے خوش حالی کا سال ثابت ہو۔

☆☆ کاشف صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ۔کوشش، کوشش اور پھر کوشش سے آدمی اپنے کام میں ماہر اور کامیاب ہوجاتا ہے۔کہانی لکھ کر اسے پڑھیں اور پھر اصلاح کرکے دوبارہ لکھ کر ارسال کریں لیکن ایک لائن چھوڑ کر لکھئے گا۔امید ہے غور فرمائیں گے اور اگلا قدم اٹھائیں گے۔یقیناً کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔خط لیٹ موصول ہوا، آئندہ ذرا جلدی کا خیال رکھئے گا۔Thanks۔

مدثر بخاری شہر سلطان سے، سب کو دل سے سلام اور آداب......سردیاں عروج کے لئے کوشاں ہیں، جب یہ تبصرہ چھپے گا، یکم جنوری میری پیدائش کا دن......اور 2015ء کا آغاز......سوچنا صرف اتنا ہے کہ ہم نے اس سال کیا کھویا کیا پایا......کتنے لوگوں کی مدد کی اور کتنوں کا دل توڑا......کچھ غلط ہوگیا تو اس سال نہ ہو۔ایک مثبت سوچ، ایک اعلیٰ تربیت کے ساتھ سچائی اور اخلاقی مروت کے ساتھ معاشرے کو گہوارہ امن بنانا ہے، انشاءاللہ......کچھ باتیں دسمبر کے جریدہ کی......اس دفعہ ٹائٹل زبردست تھا......جو ہر دفعہ ہی کمال کا ہوتا ہے۔ ویلڈن۔ اگر تبصرہ کیا جائے تو میری نامکمل عقل کہتی ہے کہ سیدہ عطیہ زاہرہ لاہور سے ابلتا لہو لے کر جلوہ گر ہوئیں، طاہرہ آصف ساہیوال سے تشریف لائیں اور دختر آتش بھی تحفہ میں لائیں۔دوسرے نمبر پر رہی۔امید ہے طاہرہ آصف اس طرح قلمی سفر کو جاری رکھیں گی......سرگودھا سے نور محمد کاوش عقرب لے کر آئے، عقرب بھی کمال کی کہانی رہی۔خیر، میری تحریر جادوئی چکر کو قارئین نے پسند کیا۔بہت شکریہ تمام دوستوں کا......

☆☆ مدثر صاحب: قلبی نوازش نامہ کے لئے Thanks۔آپ کی سوچ مثبت ہے، کاش کہ ہم سب کوشش کریں تو ہمارا ملک خوشیوں کا گہوارہ بن جائے، خود غرض، مطلب پرست اور دہشت گرد راہ راست پر آجائیں تاکہ ان کی بھی آخرت سنور جائے۔نئی کہانی کے لئے شکریہ، کہانی شامل اشاعت ہے۔

☆☆☆

موت کے گھاٹ

عبدالحمید ساگر-کندیاں

اچانک ایک دھماکہ ہوا، دھماکہ اتنا شدید تھا کہ کان بند ہوگئے اور پھر ایک دیوھیکل مہیب شکل شخصی نمودار ہوا جس کے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے اور پھر جو منظر نظر آیا......

پل پل حیران کرتی جناتی وادیوں میں سرگرداں خیروشر کی ناقابل فراموش سنسنی خیز کہانی

"آج ہمیں فتح ضرور نصیب ہوگی۔" سردار خیام جن نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے دو جنوں سے کہا۔

"ہاں سردار آج ہم ضرور جیت جائیں گے۔ آپ دیکھ تو رہے ہیں کس طرح ہمارے ساتھی جن ان بے دین اور شیطانی مذہب رکھنے والے جنوں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔" ایک جن نے سردار جن خیام کو جواب دیا۔

"ہاں...... ہاں بالکل شیطان مٹنے والا ہے اور انشاء اللہ مٹ کر ہی رہے گا۔" سردار جن خیام نے کہا۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں۔ اگر ضرورت ہو تو مجھے بلا لینا۔" سردار نے کہا۔ اور پھر وہ ایک طرف چلنے لگے۔

سردار جن کے جانے کے بعد دونوں جن بے دین مخالف جنوں اور اپنے مسلمان جنوں کے درمیان ہونے والی لڑائی کو دیکھنے لگے۔ یہ دونوں جن میدان جنگ سے دور ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھے تھے۔ مسلمان جن بڑی تیزی کے ساتھ شیطان کے پجاریوں کا خاتمہ کررہے تھے کہ اچانک ایک دھماکہ ہوا اور مسلمان جنوں کی تلواریں گرنے لگیں۔ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ دونوں جن جو کہ ریت کے ٹیلے پر بیٹھے تھے ان کے کان بھی بند ہوگئے۔ دھماکے کے فوراً بعد ایک دیوہیکل نما جن میدان میں نمودار ہوا۔ اس کے منہ سے آگ نکل کر چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ اس کا منہ

ایسا تھا جیسے دو مگرمچھ آپس میں مل کر بیٹھ جائیں۔ اس کے بال کانٹوں کی طرح سیدھے لیکن چھوٹے تھے اور اس کے سر سے ایک لمبی سانپ جیسی چوٹی نکل کر اس کی کمر پر لٹک رہی تھی۔ البتہ اس میں کوئی بال نظر نہیں آرہے تھے بلکہ وہ ایک سانپ کی سخت کھال جیسی سخت اور لمبی تھی۔ اس کی دو آنکھوں کے بجائے تین آنکھیں تھیں۔ تیسری آنکھ اس کے اوپر ماتھے پر تھی۔

اس جن کے میدان میں آتے ہی مسلمان جنوں کی تلواریں گرنے لگیں اور بے دین جن تیزی سے مسلمان جنوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس جن کے منہ سے نکلنے والی آگ نے بھی بڑی تعداد میں مسلمان جنوں کا خاتمہ شروع کردیا۔

"چنڈال......"

"کیا یہ چنڈال ہے؟ لیکن اس نے تو وعدہ کیا تھا کہ وہ آئندہ شیطانی چیلوں اور مسلمان جنوں کی جنگ کے درمیان نہیں آئے گا۔" دونوں جن نے آپس میں گفتگو کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بڑا دھوکے باز ہے۔ لیکن تم اب جاؤ سردار جن کو بلا لاؤ جلدی کرو......" ایک نے دوسرے سے کہا۔

چنڈال بڑی تیزی سے مسلمان جنوں کو قتل کررہا

تھا۔اس کے منہ سے نکلی ہوئی آگ بے دین جنوں پر کوئی اثر نہیں کر رہی تھی۔ بہت سے مسلمان جنوں نے چنڈال کو دیکھ کر میدان ہی چھوڑ دیا تھا جبکہ کچھ لڑ رہے تھے۔

سردار جن کے آتے ہی دوسرا جن مستعدی سے کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا۔"سردار ہماری فتح شکست میں بدل گئی۔ چنڈال نے ہمیں دھوکہ دیا ہے۔"

"مجھے اس کے بارے میں شک تھا۔اس لئے تو تم سے کہا تھا کہ مجھے بلا لینا۔ خیر فی الحال تم جا کر اپنی فوج کے ہر جن سے بات کرنے کی کوشش کرو کہ وہ میدان جنگ سے باہر نکل آئیں اور ایک سائیڈ پر جمع ہو جائیں۔" سردار نے کہا۔

وہ دونوں جن تقریباً بھاگتے ہوئے میدان تک پہنچے۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک تمام مسلمان جن میدان سے باہر نکل آئے اس دوران بہت سے جن زخمی حالت میں بھی میدان میں پڑے ہوئے تھے۔

چنڈال نے سردار جن خیام کو بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ سردار جن کی طرف دیکھ کر بہت زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔

سردار نے اپنے تمام جنوں کو ایک سائیڈ پر کر کے اپنے ہاتھ فضا میں بلند کر لئے اور منہ کے اندر آہستہ آہستہ کچھ پڑھنے لگا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد جب سردار نے چنڈال اور مخالف جنوں کی طرف ہاتھ کیا تو ان کے اور مسلمان جنوں کے درمیان ایک دیوار نکل آئی، دیوار بہت اونچی اور تانبے کی تھی۔ تب سردار جن خیام کے کہنے پر تمام مسلمان جن واپس چلنے لگے۔

☆......☆......☆

شہر کی پکی آبادی میں بڑی بڑی عمارتوں کے درمیان ایک درمیانے درجے کا نفیس اور صاف ستھرا مکان واضح دکھائی دے رہا تھا۔ مکان کے دروازے پر "دلشاد عمر" کی موٹے حروف میں واضح تختی لگی ہوئی تھی۔ اس محلے میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ لیکن زیادہ تعداد ہندوؤں کی تھی۔ چند لمحے گزرے تھے کہ اس مکان کے دروازے پر ایک بوڑھی عورت جس کی عمر تقریباً ستر سال تھی اس نے دستک دی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔

دوسری دستک پر ایک بوڑھے آدمی نے دروازہ کھولا۔"جی کس سے ملنا ہے آپ کو......؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"کیا دلشاد کا گھر یہی ہے......؟"

"جی ہاں بالکل۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"ہمیں انہی سے ملنا ہے۔" بوڑھی عورت نے کہا۔

"آپ اندر تشریف لائیں......" بوڑھے شخص نے دروازہ مزید کھولتے ہوئے کہا۔

بوڑھا انہیں ایک صاف ستھرے کمرے میں بیٹھا کر اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک جوان آدمی جس کی عمر تقریباً تیس برس تھی اور اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی بھی تھی اندر داخل ہوا۔ جوان کے چہرے پر کافی رونق تھی۔ اور اس کے چہرے سے سفیدی جھلک رہی تھی۔ "السلام علیکم" جوان آدمی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام" بوڑھی عورت نے جواب دیا۔

"جی میرا نام دلشاد عمر ہے۔ کہیے کیا کام ہے آپ کو مجھ سے......؟"

"وہ جی دراصل میں اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی ہوں، لیکن......"

"لیکن کیا......؟" دلشاد نے کہا۔

"لیکن میری بیٹی دونوں آنکھوں سے نابینا ہے۔ جس کی وجہ سے جو بھی رشتہ آتا ہے میری بیٹی کو دیکھتے ہی ٹھکرا دیتے ہیں اور اب تو رشتے بھی آنا بند ہوگئے ہیں۔ میں نے اپنی بیٹی کا بہت علاج کروایا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔"

"کیا آپ کی بیٹی پیدائشی نابینا ہے......؟" دلشاد نے پوچھا۔

"جی نہیں میری بیٹی پیدائش کے وقت ایسی نہیں تھی بلکہ اس کی آنکھیں اتنی خوب صورت تھیں کہ سب لوگ ہر وقت دیکھنے کو کہتے تھے۔ لیکن بعد میں جب یہ پندرہ سال کی ہوئی تو ہم اپنے گاؤں کے قریب ہی ایک اور گاؤں سے واپس آ رہے تھے کہ رات کے وقت سڑک

پراچانک ایک بڑے ٹرک کی ہیڈ لائٹس روشن ہوئیں اور میری بیٹی کومل کی آنکھوں پر پڑیں۔ اس وقت تو کومل کی آنکھیں معمولی چندھیا سی گئیں لیکن بعد میں آہستہ آہستہ کامل کو دکھائی دینا بند ہوگیا اور وہ مکمل طور پر نابینا ہوگئی۔" بوڑھی عورت نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی بوڑھی عورت رونے لگی۔

"آپ روئیں مت آپ مجھے بتائیں کہ آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔ نہ ہی میں کوئی ڈاکٹر ہوں اور نہ ہی حکیم تو میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟" دلشاد نے کہا۔

بوڑھی عورت آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ "علاج کراتے کراتے جب ہم مختلف حکیموں، ڈاکٹروں کے پاس گئے تو ایک ہفتہ پہلے ہماری ملاقات ایک بہت بڑے حکیم سے ہوئی جو کہ تقریباً نوے سال کی عمر کا تھا۔ اس نے کومل کی آنکھیں دیکھتے ہوئے ہم سے کچھ پوچھے بغیر ہی بتادیا۔" کومل کی آنکھیں ٹرک کی ہیڈ لائٹس کے اچانک آنکھوں پر پڑنے سے خراب ہوئی ہیں اور ٹرک کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں لیزر شعاع ہوتی ہے اور لیزر شعاع کا ایک ہی توڑ ہے اور وہ ہے چوڑے پتوں والی سبز بوٹی ہسیرا، جو کہ افریقہ کے گھنے جنگلات کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتی اور افریقہ کے بھیانک اور خوفناک جنگلات میں جانا بہت جان جوکھوں کا کام ہے لیکن پھر بھی کسی طرح اگر ان جنگلات سے ہسیرا سے بوٹی حاصل ہوجائے اور اس کا رس نکال کر اسے گلاب کے عرق کے ساتھ ملا کر آنکھوں میں ڈالا جائے تو خدا کے حکم سے پیدائشی نابینا بھی ٹھیک ہوجاتا ہے۔"

"تو آپ چاہتی ہیں کہ میں افریقہ کے گھنے اور بھیانک جنگلات میں جا کر آپ کی بیٹی کے لئے وہ جڑی بوٹی ہسیرا لے آؤں......" دلشاد نے بوڑھی عورت کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔

"جج......جی ہاں۔" بوڑھی عورت نے بمشکل کہا۔

"اس کے بدلے آپ مجھے کیا دیں گی؟" دلشاد نے پوچھا۔

"جی...... میرے پاس تو آپ کو دینے کے لئے دعاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی میں...... میں زندگی بھر آپ کی احسان مند رہوں گی، آپ کی غلام رہوں گی۔" بوڑھی عورت نے کہا۔ اس دوران اس کی بیٹی خاموش بیٹھی تھی۔

دلشاد عمر بہت گہری سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اچانک بولا۔ "آپ کیا سمجھتی ہیں کہ اس کام میں میرا کوئی مفاد نہیں ہے تو میں اسے کروں گا......؟ اور کیا کر بھی پاؤں گا......؟ افریقہ جانے کے لئے بہت سے روپوں کی ضرورت ہوتی ہے......؟"

دلشاد بیٹا ہم نے آپ کے بارے میں بہت زیادہ سنا ہے کہ آپ بہت نیک آدمی ہیں۔ آپ نے ہمیشہ غریبوں، مسکینوں کی مدد کی اور کسی کو اپنے در سے خالی نہیں لوٹایا۔ ہم آپ کے پاس بڑی امیدیں لے کر آئے ہیں۔ اس دنیا میں ہمارا اک دوجے کے سوا کوئی نہیں ہے......" بوڑھی عورت نے غمزدہ آواز میں کہا۔

"اگر آپ کے کہنے کے مطابق میں نے اپنے در سے کسی کو خالی نہیں لوٹایا تو آپ کو خالی کیسے لوٹا سکتا ہوں۔ جایئے اور ایک مہینے کے بعد آ کر اپنی جڑی بوٹی ہسیرا لے جایئے گا۔" یہ کہہ کر دلشاد اندر دوسرے کمرے میں جانے لگا تو بوڑھیا نے کچھ زیور دیتے ہوئے کہا۔ "بیٹا اگر یہ میری طرف سے تھوڑے سے زیور ہیں یہ میں نے کومل کی شادی کے لئے رکھے تھے تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔"

"ارے ماں جی آپ یہ زیور کومل کی شادی کے لئے رکھیں اور بے فکر ہوجائیں، خدا جنہیں اتنے بڑے نیک کام کے لئے روانہ کرتا ہے ان کا خرچ اور رزق بھی بھیج دیتا ہے۔ اور ہاں میری باتوں کا برا نہ مایئے گا میں ویسے آپ کو چیک کررہا تھا۔" دلشاد نے کہا اور اس کے ساتھ ہی دلشاد واپس چلا گیا۔ تو بوڑھیا اور اس کی بیٹی بھی وہاں سے اپنے گھر کے لئے روانہ ہوگئیں۔

☆......☆......☆

ایک بڑے اور خوب صورت کمرے میں رنگین قالین پر ایک بوڑھا جن بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ اس کے تقریباً تمام بال سفید ہوچکے تھے۔ چند

فاصلے پر قبیلے کا سردار جن خیام بھی اس بوڑھے جن کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بوڑھے جن کو مسلسل دیکھ رہا تھا جبکہ بوڑھا جن شاید کسی عمل میں مصروف تھا۔ کچھ دیر بعد بوڑھا جن بولا۔ ''خیام جیسا کہ تم جانتے ہو کہ میں ایک نجومی جن ہوں اور نجومی کا کام ہے مستقبل کے لئے پیشین گوئی کرنا، ایک اندازہ لگانا اور میں نے جو اندازہ لگایا ہے وہ یہی ہے کہ تم چنڈال کو ایک مہینے کے اندر اندر ختم کردو ورنہ اس کا وجود تمہارے حق میں بہتر نہ ہوگا۔''

''لیکن بیکال جی، آپ تو جانتے ہیں کہ چنڈال شیطان کا پجاری ہے اور ہم مسلمان جن ہیں ہم اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے پاس روشنی کی کئی طاقتیں ہیں۔ لیکن چنڈال شیطان کا پجاری ہے۔ اور اس نے شیطان کی ہزاروں سال پرستش کی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ایسی شیطانی طاقتوں کا مالک ہوگیا ہے کہ ہم اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے اور ویسے بھی ہماری اس سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ لیکن جب ہم اپنے مخالف قبیلے ریخان کے ساتھ مذہب کی بنا پر جنگ کرتے ہیں تو یہ حرام زادہ چنڈال بیچ میں آجاتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ریخان بھی ہندو اور شیطانی قبیلہ ہے اور چنڈال بھی شیطان کا پجاری ہے۔ اس لئے چنڈال آجاتا ہے۔'' سردار خیام نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''وہ سب ٹھیک ہے۔ خیام لیکن جب تک اس چنڈال کی موت نہیں واقع ہوجاتی تم لوگوں کو واقعی سکون نہیں ملے گا اور اگر تم نے قبیلہ ریخان کے ساتھ مزید جنگ کی تو چنڈال ہمارے مسلمان قبیلے کو مکمل طور پر نیست ونابود بھی کرسکتا ہے۔ اور ہاں تم سمجھ رہے ہو کہ محض شیطان کا پجاری ہونے کی وجہ سے چنڈال قبیلہ ریخان کی مدد کررہا ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ریخان قبیلے کے جن چنڈال کو ہر ماہ کئی جوان خوب صورت لڑکیاں دیتے ہیں۔ اور چنڈال ان میں سے کچھ کے ساتھ جنسی ملاپ کرتا ہے۔ اور کچھ کو شیطان کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے جس کی وجہ سے شیطان چنڈال کو خاص شکتیاں عطا کرتا ہے اور اس طرح روز بروز چنڈال کی شکتیوں میں اضافہ ہورہا ہے اور میں جانتا ہوں کہ تم اور تمہارے قبیلے کے جنات چنڈال کو ختم نہیں کرسکتے۔ لیکن اس کا حل بھی میرے پاس ہے۔'' بیکال جن جو کہ نجومی تھا۔ اس نے خیام جن سے کہا۔

''وہ کیا حل ہے بیکال جی......؟'' خیام جن نے پوچھا۔

نجومی بیکال بولا۔ ''اس کا واحد اور ممکن حل یہی ہے کہ تم کسی انسان کے ذریعے چنڈال کا خاتمہ کروادو۔''

''جی۔'' خیام۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایک انسان ایک شیطان جن کا کیسے خاتمہ کرسکتا ہے۔'' خیام حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''کرسکتا ہے......

بالکل کرسکتا ہے ایک انسان، جن سے بہت زیادہ طاقتور ہوتا ہے کیونکہ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ اس کے پاس دماغ ہے، عقل ہے، شعور ہے، وہ سوچنے سمجھنے اور اپنا دفاع کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لئے وہ مناسب کوشش کرکے کسی بھی مشکل کو نہ صرف حل کرسکتا ہے بلکہ ناممکن کو ممکن بنادیتا ہے۔'' نجومی جن نے کہا۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے بیکال جی لیکن جو طاقتیں ایک جن کے پاس ہوتی ہیں وہ ایک انسان کے پاس تو نہیں ہوتیں تو پھر کیسے ایک انسان ایک جن کا مقابلہ کرسکتا ہے۔'' خیام نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

''تمہیں یہ سب سمجھ نہیں آئے گا تم یوں کرو کہ تم سیدھا اجمیر شریف پہنچ کر مزار پر حاضری دو اور سلام کرو، پھر وہاں موجود بابا کمال الدین شاہ کے پاس پہنچو، میں بھی تمہیں اسی جگہ ملوں گا۔ مزید بات ادھر ہی ہوگی۔'' نجومی بیکال نے کہا اور اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر ایک پردے کی اوٹ میں غائب ہوگیا، جبکہ خیام جن بھی کچھ سوچتے ہوئے اٹھ کر وہاں سے ایک طرف کو چل دیا۔

☆......☆......☆

ایک بہت بڑا غار تھا۔ جس کے اندر اندھیرا ہونے کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے دیئے جل رہے تھے۔

غار کے اندر ایک خوب صورت جگہ پر ایک پتھر کی بنی ہوئی خوب صورت اور نفیس کرسی پڑی ہوئی تھی۔ جلتے ہوئے دیوں کے درمیان میں ریحان قبیلے کا سردار جن شاتو بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مسلسل پتھر کی بنی ہوئی کرسی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک زوردار دھماکے کی آواز آئی اور پورا غار جیسے ہلنے لگ گیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی ہاتھی غار کے اوپر دوڑ رہا ہو...... پھر اچانک غار کے اندر شاتو سے ذرا فاصلے پر زمین پھٹی اور چنڈال ایسے باہر نکلنے لگا جیسے وہ خلا میں اڑ رہا ہو۔ باہر نکلتے ہی چنڈال پتھر کی بنی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا جبکہ اس دوران شاتو جن ادب سے کھڑا ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب چنڈال نے اپنی درمیانی آنکھ سے سردار شاتو کو دیکھا تو شاتو کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ بالآخر ساری ہمت اکٹھی کر کے شاتو بولا۔ ''چنڈال جی آپ نے مجھے یاد کیا تھا، میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں۔ فرمایئے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی......؟''

''ارے تو میری کیا خدمت کرے گا شاتو...... تو، تو ایک حقیر جن ہے۔ تو میرے برابر نہیں ہو سکتا میں چاہوں تو ایک جھٹکے میں تجھے جلا کر بھسم کر دوں......''

''چچ...... چا...... چن...... چنڈال گرو کیا خطا ہو گئی مجھ غریب سے......'' شاتو نے بمشکل کہا۔

''ارے خطا نہیں تو نے پاپ کیا ہے۔ جب تو وعدہ نبھا نہیں سکتا تو کیوں کیا تھا تو نے مجھ سے وعدہ...... ہاں بول...... منحوس جن۔'' چنڈال چنگھاڑ کر بولا۔

''گرو جی مجھے صاف صاف بتائیں...... مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا......'' شاتو نے ہکلا کر کہا۔

''یہ تجھے بھی معلوم ہے شاتو کہ اس مہینے پانچ تاریخ ہو گئی ہے لیکن تو ابھی تک جنی ناریاں نہیں لایا اور الٹ بھولا بن رہا ہے۔'' چنڈال نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''گرو جی...... بات یہ ہے کہ اس دفعہ میں نے بہت کوششیں کیں لیکن آپ کے مطلب کی ناریاں نہیں ملیں۔ تمام ناریاں جو میں نے مختلف قبیلوں میں ڈھونڈی تھیں ادھیڑ عمر ہی تھیں اور آپ کو تو جوان اور پرکشش خوب صورت ناریاں چاہئے تھیں۔ اس لئے میں انہیں نہیں لایا، آپ تھوڑا اور صبر کریں، میں آپ کے لئے نئی حسین ناریاں ڈھونڈ کر لے آؤں گا۔''

''کتنا صبر کروں میں اور مجھ سے اور صبر نہیں ہوتا...... تو یوں کر کہ ناریوں کی تعداد کم کر دے یعنی کچھ کم لے کر آ جا۔'' چنڈال نے کہا۔

''اوہ گرو جی...... آپ کا بہت شکریہ چند ناریاں میں جلد اور آسانی سے ڈھونڈ کر اٹھا لاؤں گا آپ کی بہت مہربانی گرو جی...... بہت مہربانی......'' شاتو نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہاہا...... ہاہا...... زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں شاتو پھر بھی ناریاں نہ ملیں تو تو اپنی بیویوں کو اٹھا کر لائے گا، ...... اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو انجام بخیر نہ ہوگا۔''

چنڈال نے غصے سے کہا اور اس کے ساتھ ہی دوبارہ غار ہلنے لگا زمین پھٹی اور چنڈال اڑتا ہوا اس کے اندر گیا اور پھر غائب ہو گیا جبکہ خود بخود زمین برابر ہو گئی۔

☆......☆......☆

دہلی کے ایئرپورٹ پر دلشاد سفید رنگ کے کپڑوں میں ملبوس ایک بریف کیس اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی کھڑا تھا۔ وہ دونوں نرم لہجے میں باتیں کر رہے تھے کہ ایک خوب صورت حسینہ کی آواز لاؤڈ اسپیکر سے ابھری۔ ''افریقہ جانے والی فلائٹ مکمل طور پر تیار ہے مسٹر دلشاد سے گزارش کی جاتی ہے کہ وہ پلین میں سوار ہو جائیں، دھنیواد۔''

''اچھا بھئی رؤف پھر مجھے اجازت۔'' دلشاد نے اپنے ساتھ کھڑے دوسرے آدمی سے کہا۔ ''ہاں دلشاد جاؤ اپنا خیال رکھنا خدا تمہارا حافظ و ناصر ہو۔'' دوسرے آدمی نے کہا جو کہ رؤف تھا اور دلشاد پلین کی طرف جانے لگا۔ ہوائی جہاز میں بیٹھتے ہی تمام مسافروں کو بیلٹ باندھنے کا حکم دے دیا گیا۔ دوسرے لمحے جہاز اڑا اور چند لمحوں بعد فضاؤں میں اڑ رہا تھا۔ دلشاد سیٹ نمبر انیس پر بیٹھا ایک اسلامی کتاب پڑھ رہا تھا کہ اچانک اس کے پیٹ میں گدگدی ہوئی۔ اور وہ ہنسنے لگ گیا۔ فوراً اس نے پیٹ پر دونوں ہاتھ رکھے وہ حیرانی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس

نے جیسے ہی ہاتھ اٹھائے دوبارہ کسی نے اس کے پیٹ میں گدگدی کی "ارے کون...... کیا ہے بھئی...... اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ساتھ میں بیٹھے ہوئے دوسرے مسافر نے کہا۔ "کیوں بھئی کیا ہوا؟"

"بھائی جان کوئی میرے پیٹ میں گدگدی کررہا ہے۔ اور مجھے نظر نہیں آرہا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" دلشاد کی بات سن کر دوسرا مسافر بولا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ کوئی بھوت یا جن آپ کے پیٹ میں گدگدی کررہا ہے اور آپ کو نظر نہیں آرہا...... ناممکن یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔"

"بھائی صاحب آپ میرا یقین کیجئے...... اوئے ایسا نہ کر" دلشاد نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھے مختلف آوازیں نکالیں۔ دوسرا مسافر اسے حیرانی سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک دلشاد اپنی جگہ سے یوں غائب ہوگیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ "ارے...... یہ آدمی کہاں غائب ہوگیا۔ ارے بھائیو، سنو...... پلیز سنئے مس......" اس نے ایک ایئرہوسٹس سے کہا۔

"جی۔" خوب صورت ایئرہوسٹس نے جواب دیا۔

"ابھی میرے سامنے اس سیٹ نمبر انیس سے ایک آدمی غائب ہوگیا۔ وہ بڑی دیر سے مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اسے کوئی بھوت تنگ کررہا ہے اور پھر اچانک وہ غائب ہوگیا۔"

"کیا آدمی غائب ہوگیا۔" ایئرہوسٹس چلائی۔

پورے جہاز کے مسافروں نے یہ بات سنی تو ان میں کھلبلی مچ گئی۔ مسافر شور مچارہے تھے کہ اچانک ایک حسینہ کی آواز ابھری۔ "تمام مسافروں سے التماس ہے کہ وہ اپنی سیٹ بیلٹ باندھ لیں ہم اچانک ایک آدمی کے غائب ہونے کی وجہ سے جہاز کو قریبی ہوائی اڈے بالم آباد پر اتار رہے ہیں۔ دھنیواد۔" تمام مسافروں نے سیٹ بیلٹ باندھ لیں اور جہاز آہستہ آہستہ لینڈ کرنے کے لئے نیچے جانے لگا۔

☆......☆......☆

ایک درمیانے درجے کا خوب صورت کمرہ تھا۔ کمرے کے درمیان میں سنگ مرمر کی بنی ہوئی ایک خوب صورت میز رکھی ہوئی تھی۔ میز کے اردگرد خوب صورت لکڑی کے تراشے ہوئے صوفے رکھے ہوئے تھے۔ ان صوفوں میں سے ایک صوفے پر دلشاد بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اس کے اوپر دو خوب صورت پریاں پنکھا جھل رہی تھیں کہ اچانک دلشاد کو ہوش آگیا۔ "اونہہ...... او...... میں کہاں ہوں؟" ہوش میں آتے ہی دلشاد نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ پریوں میں سے ایک پری بھاگی اور کمرے کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔

"شہون...... شہون ...... اس کو ہوش آگیا ہے...... آقا۔"

"اچھا چلو چلتے ہیں...... لیکن تم جاؤ...... میں سردار کو خبر کرتا ہوں۔" شہون جن نے کہا۔

پری کے کمرے میں آتے ہی چند لمحوں بعد سردار خیام اور شہون کمرے میں داخل ہوئے۔

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" سردار خیام اور شہون جن نے بیک وقت کہا۔ یہ دونوں اس وقت انسانی شکل میں تھے، اس لئے دلشاد کو ذرا بھر بھی کچھ محسوس نہ ہوا۔ "وعلیکم السلام...... لیکن بھائی صاحب آپ کون لوگ ہیں اور میں کہاں ہوں......؟" دلشاد نے کہا۔ "بتاتے ہیں دلشاد صاحب، آپ ذرا صبر تو کریں۔" شہون نے جلدی سے کہا۔ اتنے میں سردار جن خیام اور شہون جن دلشاد کے قریب ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ "کاجل تم دلشاد کی خاطر مدارت کا بندوبست کرو جاؤ......" سردار خیام نے کاجل پری سے کہا۔ جو کہ دلشاد پر پنکھا جھل رہی تھی۔

"اچھا بھئی دلشاد اب میں آپ کو سب کچھ تفصیل سے بتاتا ہوں۔" سردار خیام نے کہا۔ دلشاد ان دونوں کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ ہم لوگ انسان نہیں ہیں بلکہ جن ہیں۔"

"کیا آپ لوگ جن ہیں لیکن......" دلشاد نے سردار خیام کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہم جن ہیں تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہم اس وقت انسانی شکل میں ہیں اور ہم ایک مسلمان قبیلے کے جن ہیں۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانے والے، بلکہ تمہیں خود ہماری مدد کی ضرورت

ہے۔'' سردار خیام نے کہا۔

دلشاد انہیں حیران کن آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

''دلشاد صاحب آپ غور سے میری بات سنیں۔'' سردار خیام نے کہا۔ ''جس طرح انسانوں کی دنیا میں مختلف گروہ ہوتے ہیں یعنی کچھ ہندو کچھ مسلمان اور کچھ عیسائی وغیرہ۔ یہ جس طرح مختلف نسلوں اور مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں بالکل اسی طرح جنات میں بھی مختلف گروہوں کے لوگ ہوتے ہیں اور یہ مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں اور مختلف مذاہب کو ماننے والے ہوتے ہیں۔ البتہ یہ بات الگ ہے کہ جنات میں گروہوں کے بجائے قبیلے ہوتے ہیں۔ جس کا مطلب انسانوں کے نزدیک وہی ہے۔ خیر ہم ایک مسلمان قبیلے سے تعلق رکھنے والے جن ہیں اور جس طرح مسلمان انسان نماز پڑھتے ہیں۔ روزے رکھتے ہیں اور قرآن پڑھتے ہیں۔ ہم بھی بالکل ویسے ہی خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ جبکہ ہمارے علاقے کی سرحد سے آگے ایک جنات کا قبیلہ ریخان ہے جو کہ ہندو اور شیطان کو ماننے والا قبیلہ ہے۔ وہ اکثر ہمارے علاقے میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے جن ہمارے مسلمان جنوں کو ہندو بنانے کے خواب دیکھتے رہتے ہیں ہمارے پاس روشنی کی طاقتیں ہیں اور ہمارے پیچھے اپنے بزرگوں کی دعائیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے جنگ کے دوران ہم ان کی شیطانی طاقتوں کو ختم کرلیتے ہیں اور آخر کار شکست ان کو ہی ہوتی ہے۔

لیکن مسلسل شکست کی وجہ سے ان کے سردار جن نے ایک بہت بڑی شیطانی قوت چنڈال کو دس لڑکیاں ہر مہینے لاکر دینے کا لالچ دے کر ہمارے مقابل کھڑا کردیا اور ہماری مزاحمت کے بدلے میں چنڈال مزید ہمارا دشمن ہوگیا، ہم نے اسے مٹانے کی بہت کوشش کی لیکن ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ وہ شیطان کا پجاری ہے۔ اس نے کئی سال شیطان کی پوجا کی اور شیطان نے اسے بہت سی شکتیاں دیں۔ اب چنڈال ہمارا کھلا دشمن ہوگیا ہے اور مجھے اپنے قبیلے کے نجومی جن بیکال نے بتایا ہے کہ چنڈال مکمل طور پر ہماری ریاست پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور ہم تمام مسلمان جنوں کو ہندو مذہب میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس لئے اگر ہمیں صحیح سلامت رہنا ہے تو چنڈال کا خاتمہ ضروری ہے جو کہ ہم نہیں کرسکتے اور نہ ہی دنیا کا کوئی جن ایسا کرسکتا ہے۔

لیکن بیکال نے پیشین گوئی کی ایک انسان چنڈال کو ختم کرسکتا ہے۔ اس کے لئے ہم اجمیر شریف میں بابا کمال الدین شاہ کے پاس حاضر ہوئے اور انہیں تمام باتوں سے آگاہ کیا۔ انہوں نے بیکال جی کی تائید کی اور اس کام کے لئے آپ کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہا کہ ''آپ یہ کام ہمارے لئے نہیں بلکہ ان کے لئے کریں گے'' اور پھر انہوں نے بتایا کہ ''آپ افریقہ جارہے ہیں۔''

تب ہم نے آپ کے پاس شہون جن کو آپ کو بلانے کے لئے بھیجا، لیکن اس وقت آپ جہاز میں سوار ہوچکے تھے اس لئے مجبوراً شہون جن آپ کو اٹھا کر یہاں لے آئے۔''

''لیکن وہ گدگدیاں......'' دلشاد نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ دراصل شہون کو مذاق کرنے کی عادت ہے اس لئے اس نے آپ کو حیران کرنے کے لئے آپ سے مذاق کیا ہوگا۔'' سردار خیام نے مسکراتے ہوئے کہا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دلشاد بولا۔ ''میں نے تو دیکھا اور سنا ہے کہ ہم انسان خودغرض ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں تو جنات بھی......''

''کیا مطلب ہم سمجھے نہیں......'' شہون جن پہلی بار بولا۔ ''مطلب یہ ہے کہ میں ایک بوڑھی ماں کی بیٹی کی آنکھوں کے علاج کے لئے افریقہ سے ایک جڑی بوٹی لینے جارہا تھا اور آپ نے مجھے محض اپنے کام کے لئے غائب کرکے یہاں پہنچادیا۔ اب اس بوڑھی ماں کا کیا ہوگا، اس کی بیٹی کی آنکھوں کا علاج کون کرے گا؟......''

''دلشاد جی آپ فکر مت کریں۔ ہم جنات ہیں ہمیں انسان کی نیت کا پتہ چل جاتا ہے اور ہمیں تو بابا کمال الدین شاہ نے بھی بتادیا تھا کہ آپ افریقہ کیوں جارہے ہیں۔ اس لئے میں نے آپ کو یہاں لانے سے پہلے ہی

اپنے ملازم جن بطش کو افریقہ کے جنگلات سے وہ جڑی بوٹی لانے کے لئے بھیج دیا تھا۔" سردار خیام نے کہا۔

"او خدا کا شکر ہے کہ آپ نے ایسا کیا ورنہ شاید میں آپ کی کوئی بات نہ مانتا۔"

"تو کیا آپ ہمارا کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔" سردار نے دلشاد کی بات سن کر جلدی سے کہا۔ "جی ہاں میں بالکل تیار ہوں کیونکہ یہ کام نیکی کا ہے اور دوسرا میرے مرشد نے مجھے اس کام کے لئے چنا ہے..... لیکن میں یہ کام شروع کرنے سے پہلے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہوں گا.....“

"کیسی معلومات؟....." خیام نے حیران ہو کر کہا۔

"اس وقت تو نہیں کیونکہ اب میں پہلے اجمیر شریف میں حاضری دوں گا اور اپنے مرشد کمال الدین شاہ سے بھی ملوں گا وہاں سے واپسی کے بعد آپ سے بات چیت ہوگی۔" دلشاد نے کہا۔

"ٹھیک ہے جس طرح آپ کی مرضی..... اگر آپ نے ہمیں اس مشکل سے نکال دیا تو ہم زندگی بھر آپ کے احسان مند رہیں گے۔" خیام نے کہا۔ اتنے میں کاجل پری آ گئی اور بولی۔ "شہون آقا کھانا دستر خوان پر لگ چکا ہے۔"

"ٹھیک ہے ہم آ رہے ہیں۔" شہون نے جواب دیا۔ اور وہ دلشاد کو لے کر دوسرے کمرے میں جانے لگے۔

☆......☆......☆

آگرہ شہر میں ایک تاریخی محلے میں ایک لال رنگ کی کوٹھی کے مین گیٹ پر راجیش نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے اندر کے ایریا میں بہت زیادہ رقبے پر مشتمل زمین ویران پڑی ہوئی تھی۔ جس میں خشک گھاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ کوٹھی صدیوں سے ویران پڑی ہو۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہ تھا۔ کوٹھی میں ایک شخص رہتا تھا جس کا اصل نام راخون تھا لیکن لوگ اسے راجیش کے نام سے جانتے تھے۔ راخون کے پاس ایک پرانے ماڈل کی لمبی کار تھی جو کہ کوٹھی کے اکلوتے گیراج میں کھڑی تھی۔ راخون اس وقت کوٹھی کے سب سے چھوٹے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ یکا یک لکڑی کے میز پر پڑے ہوئے ایک پرانے طرز کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

"ہیلو راجیش بول رہا ہوں۔" راخون نے فون اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہیلو میں سونیا بول رہی ہوں۔ ہیلو راجیش کیا تم آج گھر پر رہو گے؟" دوسری طرف سے سونیا نے تیزی سے کہا۔

"ہاں...... لیکن کیوں تم کیوں پوچھ رہی ہو......؟" راخون نے کہا۔

"وہ میں تمہیں وہیں آ کر بتاؤں گی بس تم رکو میں آ رہی ہوں......" سونیا نے کہا۔ "لیکن" راخون نے کچھ کہنا چاہا لیکن سونیا نے فون بند کر دیا۔

راخون اس وقت مین گیٹ کے سامنے ایک کمرے کے اندر بیٹھا ہوا کھڑکی سے گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا ہو۔ اچانک اس نے مین گیٹ کی طرف پھونک ماری تو گیٹ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک کار گیٹ سے اندر آتی ہوئی دکھائی دی۔ کار میں ایک خوب صورت لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا نیم عریاں لباس پہنا ہوا تھا۔ جو کہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ کار سے اترتے ہی وہ لڑکی راخون کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک درمیانے درجے کا ٹشو پیپر جتنا ڈبہ تھا۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو راجیش۔" وہ اونچی آواز میں بولی اور راخون کے گلے سے لگ گئی۔ بوسہ دینے کے بعد وہ بولی۔ "کیسا لگا میرا سرپرائز راجیش۔"

"واقعی تمہارا حافظہ بہت تیز ہے مجھے تو یاد ہی نہیں تھا کہ آج میرا جنم دن ہے۔" راخون نے اس کی کمر کے گرد ہاتھ حمائل کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یاد نہیں ہے ناں، مجھے تو یاد ہے...... اور بھول بھی کیسے سکتی ہوں تم سے پیار جو کرتی ہوں۔" اس لڑکی نے کہا۔

"ہاں سونیا تم مجھ سے واقعی بہت پیار کرتی ہو اور میری یہ خواہش ہے کہ تم مجھ سے ہمیشہ اسی طرح پیار کرتی

رہو۔" راخون نے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچتے ہوئے کہا۔ "اوکے مائی ڈارلنگ۔" سونیا نے کہا۔ اور پھر وہ دونوں وہیں پر ایک دوسرے میں کھو گئے۔ راخون اس وقت اس کے سرخ اور نرم و نازک ہونٹوں کا رس پی رہا تھا کہ اچانک ایک دھماکہ ہوا اور کمرے کا فرش پھٹ گیا۔ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ راخون کے کان بند ہو گئے اور سونیا بے ہوش ہو گئی۔ فرش کے پھٹتے ہی نیچے سے کالے رنگ کا دھواں نکلنے لگا۔ دھواں اتنا زیادہ پھیل گیا کہ کمرے میں کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ دھواں ختم ہوا اور پھر ایک سیاہ رنگ کا کتا فرش میں موجود گڑھے سے باہر نکلا اس کے بال بالکل کانٹوں کی طرح کھڑے تھے اور شکل بالکل ایک شکاری کتے جیسی تھی۔

"نارنگ تم...... تم اور اچانک اس طرح...... خیریت......" راخون نے گھبراتے ہوئے کہا۔ اور پھر کتے کے منہ سے انسانی زبان میں آواز نکلی۔

"مجھے چنڈال آقا نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ آپ کو کالی شکتیاں دیتے وقت چنڈال آقا نے عہد لیا تھا کہ آپ تین مہینے تک کسی ناری کو ہاتھ نہیں لگائیں گے بلکہ اس کی شکل بھی نہیں دیکھیں گے لیکن آپ نے دوسرے مہینے کے اندر ہی یہ عہد توڑ ڈالا اور ناری کے بدن کو چھولیا۔ اب مجھے چنڈال آقا نے بھیجا ہے کہ میں آپ کو خبر کردوں کہ آپ کو اس کی کڑی سزا ملے گی۔ اور اس کے لئے چنڈال آقا نے آپ کو شاغان کی کالی پہاڑیوں پر بلایا ہے۔ بس اب میرا کام ختم۔ اس لئے مجھے اجازت۔" نارنگ نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ایک دفعہ پھر دھماکے کی آواز آئی اور فرش کے اندر نارنگ غائب ہو گیا اور فرش کی سطح برابر ہو گئی۔

راخون کو پسینے چھوٹ رہے تھے۔ نارنگ کی بات سن کر وہ کانپنے لگ گیا تھا کہ پتہ نہیں چنڈال اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے ایک نظر بستر پر ڈالی جہاں ابھی تک سونیا بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ پھر وہ مسلسل بستر کو گھورنے لگ گیا۔ اسی لمحے اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی اور اس کے آگے کے دو دانت لمبے ہو گئے پھر وہ ہلکی ہلکی آوازوں کے ساتھ سونیا کی طرف بڑھنے لگا۔ کمرہ سونیا کی بھیانک چیخوں سے گونج اٹھا۔ اس نے دونوں دانت سونیا کی شہ رگ میں گاڑ دیئے تھے۔ جیسے ہی سونیا کا جسم ساکت ہوا۔ راخون نے اسے چھوڑ دیا اور اپنا منہ صاف کر کے باہر صحن میں نکل آیا۔ اب اس کے دانت اپنی اصلی حالت میں آچکے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی پرانی ماڈل کی کار میں بیٹھا اور دوسرے ہی لمحے اس کی کار ایک ویران سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد کار ایک پہاڑی علاقے میں داخل ہوئی جہاں چاروں طرف خشک پہاڑ تھے۔ پھر آہستہ آہستہ کار نے ایک موڑ موڑا، پھر کار ایک ویران کالے رنگ کے پہاڑ کے ساتھ رک گئی۔ راخون کار سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ ایک سمت چلنے لگا۔ چند لمحوں بعد اسے ایک غار نظر آئی اور وہ اس میں داخل ہو گیا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی غار کا منہ ایک بھاری پتھر سے بند ہو گیا۔

راخون نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہی تھا کہ اچانک غار کی چھت سے ایک بھیانک آواز آئی۔ "بس راخون آج سے اپنی موت تک تم اس غار میں بند رہو گے اور جب تم مر جاؤ گے تو پھر تمہارا نیا جنم ہوگا، تمہاری آتما کو ایک نیا شریر ملے گا۔ اور اس جنم میں تمہارا نام بلجان ہوگا اور لوگ تمہیں یشونت کے نام سے پکاریں گے، یہی تمہارے پاپ کی سزا ہے۔ میں آج ہی کالے شیطان آقا کے سامنے منکا دیوی کو یہ وچن دوں گا کہ ناری کو چھو لینے کے بعد اب تمہارا جسم منکا دیوی کے قابل نہیں ہے۔ اس لئے منکا دیوی آزاد ہے اور تمہیں تمہارے پاپوں کی سزا ضرور ملے گی۔" اور اس کے ساتھ ہی آواز آنا بند ہو گئی۔

"نہیں چنڈال آقا مجھ پر دیا کیجئے، مجھے شما کر دیجئے میں بہک گیا تھا۔ اس لئے آپ کے ساتھ کئے ہوئے وچن کو نبھا نہ سکا۔ لیکن آپ تو مہا پرش ہیں دیالو ہیں۔ مجھے شما کر دیجئے منکا دیوی کو وچن مت دیجئے۔ چنڈال آقا مجھے بس آپ کا سہارا ہے۔" راخون نے گڑگڑا کر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ لیکن بدلے میں کوئی ردعمل نہ ہوا۔ "چنڈال آقا میں نے آپ پر وشواس کیا ہے

آپ میرے ساتھ اس طرح نہ کریں آپ کو شیطان آقا کا واسطہ.....'' راخون نے چیختے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے راخون میں تجھے قید نہیں کروں گا اور تجھ سے تیری شکتیاں بھی نہیں چھینوں گا لیکن منکا دیوی اب تیری نہیں ہوسکتی۔ اس لئے تو اسے بھول جا اور وہاں تجھے اپنے پاپ کا ازالہ بھگتنا پڑے گا۔''

''آپ دیالو ہیں آقا..... آپ شکتی مان ہیں۔ آپ نے مجھے شما کردیا، مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔'' راخون نے گھٹنے ٹیکتے ہوئے کہا۔

''وہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن تو اب میری بات غور سے سن۔'' چنڈال کی بھاری آواز غار میں گونجی۔ ''ایک شخص دلشاد ہے، جس کا تعلق دہلی سے ہے۔ اسے آج کل مجھ سے ٹکر لینے کے لئے تیار کیا جارہا ہے۔ اور یہ کام روشنا قبیلے کا سردار جن خیام کررہا ہے کیونکہ اسے مجھ سے خطرہ ہے کہ میں اس کے قبیلے کو ختم کردوں گا۔ وہ براہ راست مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا اس لئے حرام خور اب معصوم انسانوں کا سہارا لے رہا ہے۔ لیکن یہ دلشاد بہت نیک انسان ہے اس کے پاس روشنی کی بے شمار طاقتیں ہیں اور اس کے سر پر بزرگوں کی دعائیں ہیں اس نے آج تک کوئی کام اپنے مفاد کے لئے نہیں کیا اس لئے مجھے اس شخص سے خطرہ ہے۔ تو یوں کر کہ اسے مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم کردے۔ تاکہ بعد میں پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔''

''لیکن آقا کیا وہ اتنا طاقتور ہے کہ آپ کو اس سے خطرہ ہے.....'' راخون نے معصومیت سے کہا۔

''تجھ سے جو کہا ہے اس پر عمل کر یہی تیرے پاپ کا ازالہ ہے اور ہاں اگر تو اسے ختم کرنے میں ناکام رہا تو تیری سزا صرف موت ہے۔'' اور اس کے ساتھ ہی چنڈال کی آواز آنا بند ہوگئی اور غار کا منہ اب کھل گیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی راخون باہر نکل آیا اور اپنی کار کی طرف چلنے لگا۔

☆......☆......☆

''بولئے دلشاد آپ مجھ سے کیسی معلومات چاہتے ہیں۔'' سردار خیام نے دلشاد سے کہا۔ وہ دونوں اس وقت سردار خیام کی ذاتی بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ اجمیر شریف میں حاضری دینے اور اپنے مرشد سے ملنے کے بعد دلشاد واپس آگیا تھا اور اس وقت وہ سردار جن خیام سے کچھ ضروری معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

''خیام تم سے میرے تین اہم سوال ہیں جبکہ باقی یونہی چھوٹی موٹی غیر ضروری باتیں ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ ''تم جانتے ہو کہ ایک جن کے پاس ماورائی طاقتیں ہوتی ہیں۔ وہ پل میں غائب ہوسکتا ہے اور پل میں حاضر ہوسکتا ہے، اس کے علاوہ وہ اڑ سکتا ہے۔ غرضیکہ اس کے لئے وہ تمام کام جو انسان کے لئے ناممکن ہوتے ہیں، ممکن ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک انسان یک جن کو کیسے ہلاک کرسکتا ہے۔''

دوسرا سوال یہ ہے کہ ''میں نے سنا ہے کہ ایک جن پر پستول، بندوق وغیرہ کی گولیاں اثر نہیں کرتیں لیکن اگر ایک جن کو آگ یعنی روشنی دکھائی جائے تو وہ بھاگ جاتا ہے۔ اس بات میں کہاں تک سچائی ہے۔''

اور تیسرا اہم سوال یہ ہے کہ ''اگر لڑائی کے دوران جن نظروں کے سامنے سے غائب ہوکر وار کرے تو اسے کیسے دیکھا جاسکتا ہے۔'' دلشاد نے تفصیل سے کہا۔

''دلشاد میں سب کچھ تمہیں بتادیتا ہوں۔ جو مجھے ابھی تک معلوم ہوا ہے۔'' سردار خیام نے کہنا شروع کیا۔

''ایک انسان کسی جن کو واقعی اس طرح ختم نہیں کرسکتا جس طرح ایک ہتھیار سے آسانی کے ساتھ دوسرے انسان کو ختم کردیتا ہے لیکن انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے۔ وہ اپنے دماغ سے ایسی ترکیب آخر نکال ہی لیتا ہے کہ وہ جن پر بھاری پڑتا ہے اور چونکہ تمہیں چنڈال کو ختم کرنے کے لئے ہم بھیج رہے ہیں۔ اس لئے ہم تمہیں کچھ ایسی طاقتیں بخشیں گے جس سے تم دوسرے انسان اور جن دونوں کا ذہن پڑھ سکو گے اور صدیوں کا فاصلہ چند گھنٹوں میں طے کرو گے اور اس کے علاوہ چھوٹے موٹے کام جو ایک انسان نہیں کرسکتا تم کرسکو گے اور اس کے علاوہ تمہارے اپنے پاس بھی تو بے شمار روحانی علم ہے تم اسے بھی استعمال کرو گے۔''

''اور میرا دوسرا سوال۔'' دلشاد نے سوالیہ نگاہوں

سے خیام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ
"واقعی ایک جن کسی گولی سے نہیں مر سکتا۔ اور نہ ہی اس کا کوئی اثر جن پر ہوتا ہے۔ البتہ اگر کوئی لوہے کی چیز ہاتھ میں ہو تو جن بھاگ جاتا ہے اور انسان کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا اور ہاں لوہے کے علاوہ روشنی کو بھی دیکھ کر جن انسان کے نزدیک نہیں آتا۔ اور تمہارے تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر لڑائی کے دوران جن چھپ کر وار کرے تو اسے میرے علم کے مطابق نہیں دیکھا جا سکتا۔ ہاں شاید کسی دانا کو یہ بات معلوم ہو۔ لیکن یہ بات میرے علم میں نہیں ہے۔" خیام جن نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے خیام تمہاری بہت مہربانی اب میں چلتا ہوں تم میرے لئے دعا کرنا کہ میں کامیاب لوٹوں۔" دلشاد نے اٹھتے ہوئے کہا۔
"مہربانی تو آپ کی ہے۔ دلشاد جی آپ ہماری خاطر اتنی مشکل میں پڑ رہے ہیں۔" خیام جن نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اٹھے ہی تھے کہ اچانک خیام نے سر پر ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "دو منٹ دلشاد جی آپ بیٹھ جائیں۔"
"کیوں کیا ہوا؟" دلشاد نے بیٹھتے ہوئے کہا۔
"مجھے یاد آ گیا ہے کہ ایک جن کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔"
"کیسے بتائیں؟" دلشاد نے جلدی سے پر جوش لہجے میں پوچھا۔
"یہ تجربہ مجھے مصر کے ایک جادوگر پرتام نے کرایا تھا۔ اس کے مطابق اگر جن کو کالی ڈوری یا بوٹوں کے تسمے سے کسی دیوار یا کرسی یا کسی بھی چیز کے ساتھ باندھ دیا جائے تو اس کی تمام طاقتیں ختم ہو جاتی ہیں اور جب تک وہ بندھا رہتا ہے ایسا ہوتا ہے لیکن جونہی وہ آزاد ہوتا ہے اس کی طاقتیں پھر لوٹ آتی ہیں۔ لیکن......"
"لیکن کیا......" دلشاد نے کہا۔
"لیکن اس کی ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ اس وقت جب جن کو باندھا جائے، جن انسانی شکل میں ہونا چاہئے، ورنہ دوسری صورت میں وہ باندھا ہی نہیں جا سکتا اور ہاں جب جن کو انسانی شکل میں باندھ دیا جائے تو وہ اپنی شکل بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔" سردار خیام نے کہا۔
"خیام صاحب، بہت بہت شکریہ آپ نے میری ایک مشکل تو آسان کر دی۔" دلشاد نے کہا۔
"دلشاد صاحب جانے سے پہلے آپ میرے ساتھ آئیں تاکہ میں آپ کو کچھ اور ضروری اشیاء دوں جو کہ آپ کے بہت کام آئیں گی۔" سردار خیام نے کہا تو دلشاد اور خیام دروازے سے نکل کر ایک طرف چل پڑے۔

☆......☆......☆

راخون اپنی کوٹھی کے ایک تہہ خانے میں فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے پاس فرش پر ایک ڈبہ پڑا ہوا تھا۔ جس میں سیندور تھا۔ سامنے آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ اس نے ایک کالا لفافہ کھولا جس میں بوسیدہ ہڈیاں تھیں۔ پھر ایک موٹی ہڈی پر کچھ پھونک کر اسے سیندور کے ڈبے میں ڈالا۔ جب ہڈی سیندور کی تہہ سے اچھی طرح بھر گئی تو اس نے اسے سامنے جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیا۔ پھر لفافہ بند کر کے آگ کی طرف دیکھنے لگا اور منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔
اچانک ایسی آواز آئی جیسے کسی نے آگ پر پانی پھینک دیا ہو اور پھر واقعی آگ بجھ گئی اور کالے رنگ کے دھوئیں نے آتش دان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دھواں ختم ہوتے ہی ایک بھیانک آواز آئی۔ "ابلاشا حاضر ہے آقا راخون۔" اور پھر سامنے آتش دان میں ایک لمبے منہ والی بہت چھوٹی سی لومڑی بیٹھی دکھائی دی جس کا کالا رنگ تھا۔
"حکم دیجئے آقا۔" لومڑی کے منہ سے دوبارہ آواز آئی۔
"ابلاشا دہلی شہر میں ایک بہت نیک شخص دلشاد رہتا ہے جانتی ہو اسے۔" راخون نے کہا۔
"دلشاد، دو منٹ معلوم کرنا پڑے گا آقا۔" ابلاشا نے کہا۔ اور پھر وہ غائب ہو گئی۔ واقعی دو منٹ بعد لومڑی ایک دفعہ پھر حاضر ہو گئی۔ "راخون آقا میں نے سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔" ابلاشا نے کہا۔
"بتاؤ کیا جانکاری ملی......" راخون نے کہا۔
"دلشاد واقعی ایک نیک شخص ہے۔ اس نے آج تک کوئی

کام اپنے فائدے کے لئے نہیں کیا۔ وہ صرف دوسروں کے لئے سوچتا ہے۔ دوسروں کے مسائل حل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے پیچھے لاکھوں لوگ دعائیں کرتے ہیں اور وہ کامیاب رہتا ہے۔ اور آج کل وہ مسلمان جنات کے قبیلے روشنا کو چنڈال آقا سے نجات دلانے کے لئے چنڈال کو مارنے کے مشن پر روانہ ہو چکا ہے اور اس کام کے لئے اسے بابا کمال الدین شاہ نے چنا ہے۔'' ابلاشا نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''بس ابلاشا تمہیں اور کچھ بتانے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تم سب کچھ جان گئی ہو اور اب تمہارا کام یہ ہے کہ تم دلشاد کو چنڈال آقا تک تو کیا وہاں کی سرحد تک پہنچنے سے بھی پہلے ختم کردو۔ یہ میرا حکم ہے اور اگر اس میں تم ناکام ہوگئیں تو میری موت ہے اور اگر میں مروں گا تو تمہارا کیا حال ہوگا تم اچھی طرح جانتی ہو۔ اب جاؤ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔'' راخون نے کہا۔ اور لومڑی غائب ہوگئی جبکہ آتش دان میں دوبارہ آگ جلنے لگی۔

☆......☆......☆

چاروں طرف پہاڑ تھے۔ جن کے اوپر کالے رنگ کے چھوٹے قد والے بے شمار درخت اگے ہوئے تھے۔ پہاڑوں کے درمیان ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔ یہاں ایک بڑا پتھر تھا جس کے ساتھ دلشاد ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اچانک ایک آواز سنائی دی۔ ''بچاؤ...... بچاؤ...... بھگوان کے لئے مجھے بچاؤ۔'' یہ آواز کسی لڑکی کی تھی جو کہ مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ دلشاد اٹھا اور آواز کی سمت چل پڑا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اسے درختوں کے جھنڈ میں ایک مرد اور ایک سفید رنگ کے کپڑے پہنے لمبے بالوں والی حسین لڑکی دکھائی دی۔ مرد نے لڑکی کو ایک ہاتھ سے پکڑا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ میں تلوار اٹھا رکھی تھی۔ دوسرے لمحے دلشاد ان کے پاس موجود تھا۔ ''بھائی صاحب آپ لڑکی کو کیوں قتل کر رہے ہیں، چھوڑ دیں اسے۔'' دلشاد نے کہا۔ ''بھگوان کے لئے مجھے بچالیں......'' لڑکی نے دلشاد کی طرف امید بھری آنکھوں سے دیکھا۔

''تو کون ہے منحوس اور اس سمے یہاں کیوں آیا ہے۔ دفعہ ہو جا یہاں سے ورنہ۔'' دوسرے لمحے دلشاد کی آنکھوں سے ایک شعاع نکلی اور اس آدمی پر پڑی۔ وہ ہوا میں اڑنے لگا۔ اس کی تلوار گر چکی تھی۔ ''آ...... آ...... مجھے معاف کردو۔ میں پھر ایسا نہیں کروں گا۔'' اس نے ہوا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے کہا۔ ''وعدہ کرتے ہو۔'' دلشاد نے کہا۔ ''ہاں...... ہاں میں وچن دیتا ہوں میں پھر کسی لڑکی پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔'' اس آدمی نے ہانپتے ہوئے کہا۔ پھر دلشاد کی آنکھوں سے ایک اور شعاع نکلی اور اس پر پڑی وہ آدمی سیدھا ہوا اور کھڑے ہوتے ہی ایسے بھاگا جیسے اس کے پیچھے جنگلی کتے لگے ہوئے ہوں۔ دلشاد وہاں سے واپس جانے کے لئے مڑا ہی تھا کہ لڑکی نے کہا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ آپ نے میری جان بچائی۔''

''ارے جان لینا دینا تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ بس اس نے آپ کی مدد کے لئے مجھے بھیج دیا۔'' دلشاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن آپ نے تو جادو کردیا کیا آپ کوئی جادوگر ہیں؟''

''جی نہیں میں کوئی جادوگر نہیں بلکہ ایک عام سا انسان ہوں۔'' دلشاد نے دھیرے سے جواب دیا۔

''میرا نام پلوشا ہے اور میں یہیں ایک جنات کے قبیلے میں رہتی ہوں۔ آپ کا کیا نام ہے۔''

''کیا کہا تم نے تم جنات کے قبیلے میں رہتی ہو کون سا قبیلہ ہے تمہارا؟''

دلشاد نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہمارے قبیلے کا نام چنڈال قبیلہ ہے۔''

''کیا؟...... چنڈال۔'' دلشاد حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

''ہاں بابو جی چنڈال ہی ہمارے قبیلے کا نام ہے۔ لیکن آپ اتنا حیران کیوں ہو رہے ہیں۔'' پلوشا نے پوچھا۔

''پلوشا کیا تمہارے سردار کا نام چنڈال ہے؟'' دلشاد نے کہا۔

''ہاں بابو جی چنڈال ہمارے قبیلے کے سردار کا نام

ہے اور اسی کے نام پر قبیلے کا نام چنڈال رکھا گیا ہے۔'' پلوشا نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ میں ٹھیک جگہ پر پہنچا ہوں۔'' دلشاد نے خود سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''پلوشا تم تو انسان ہو، پھر تم اس جنات کی وادی میں کیوں رہتی ہو؟'' دلشاد نے اچانک سوال کیا۔

''کیا بتاؤں بابو جی...... کیا آپ میرا یقین کریں گے......'' دلشاد سے پلوشا نے کہا۔

''ہاں پلوشا بولو۔'' دلشاد نے ایک گہری نگاہ پلوشا پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی آپ کی طرح انسانوں کی دنیا میں رہتی تھی۔ لیکن کب اس چنڈال کی نظر مجھ پر پڑی اور یہ مجھے اٹھا کر یہاں لے آیا اور مجھے ہمیشہ کے لئے قید کر دیا۔ آج بھی میں بڑی مشکل سے یہاں سے بھاگی تھی کہ پتہ نہیں کیسے اس جن کو خبر ہو گئی اور وہ مجھے مارنے لگ گیا اگر آپ نے میری جان نہ بچائی ہوتی تو......'' اور پھر پلوشا رونے لگی۔

''لیکن پلوشا وہ جو تمہیں مار رہا تھا وہ تو انسان تھا۔'' دلشاد نے کہا۔

''نہیں بابو جی وہ مجھے دھوکہ دینے کے لئے انسانی شکل میں آیا تھا۔ وہ اصل میں جن تھا۔'' پلوشا نے جواب دیا۔

''پلوشا کیا تم مجھے اس چنڈال کی شکتیوں کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو۔ مجھے اسے ختم کرنا ہے اس طرح تم بھی آزاد ہو جاؤ گی بولو کیا کہتی ہو۔''

''بالکل بابو جی ضرور بتاؤں گی قبیلے میں رہ کر مجھے اس کی کالی شکتیوں کا علم ہو گیا ہے۔ لیکن بابو جی یہاں نہیں وہاں سامنے برگد کا جو درخت دکھائی دے رہا ہے ناں، وہاں چلتے ہیں، یہاں ہمیں کوئی دیکھ لے گا۔'' پلوشا نے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔'' دلشاد نے آہستہ سے کہا اور پھر وہ دونوں برگد کے درخت کی طرف چلنے لگے۔ پلوشا آگے چل رہی تھی جبکہ دلشاد پیچھے پیچھے تھا کہ اچانک دلشاد نے پلوشا کی گردن میں کوئی سیاہ رنگ کی ڈوری دیکھ لی۔ اور پھر دلشاد دھیرے سے مسکرا دیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اسے کسی بات کا یقین آ گیا ہو۔ برگد کے درخت کے موٹے تنے کے ساتھ ایک لمبی سیٹ نما پتھر پڑا ہوا تھا۔

وہاں پہنچتے ہی پلوشا پتھر پر بیٹھ گئی اور دلشاد سے بھی بیٹھنے کو کہا۔ لیکن دلشاد نے کہا کہ وہ کھڑا ہی ٹھیک ہے۔ اس دوران دلشاد منہ میں کچھ چبا رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ پان کھا رہا ہو اور واقعی وہ پان تھا۔ ''یہ تم کیا کھا رہے ہو؟'' پلوشا نے سوال کیا۔

''یہ...... یہ مدراس کا پان ہے۔ اسے ربڑی پان بھی کہتے ہیں۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ جب لمبی گفتگو کرنی ہو تو اس کے کھانے سے نیند نہیں آتی اور باتوں کا مزہ آتا ہے۔ اس لئے میں اسے کھا رہا ہوں۔ لو تم بھی کھاؤ'' دلشاد نے جیب سے ایک سبز پتے میں لپٹا ہوا پان نکالا۔

''نہیں...... میں نے کبھی پان نہیں کھایا رہنے دو۔''

''ارے کیسے رہنے دوں نہیں کھایا تو آج کھا لو۔ یقین کرو بڑا مزہ دے گا اور گھبراؤ نہیں چکر وکر نہیں آئیں گے۔'' دلشاد نے زور دیتے ہوئے کہا۔ اور مجبوراً پلوشا کو پان لینا پڑا۔ ''ہاں اب بتاؤ چنڈال کن شکتیوں کا مالک ہے؟'' دلشاد نے پلوشا کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔

''چنڈال ...... چنڈ......ال...... ہاں...... اونہہ......'' اور اس کے ساتھ ہی پلوشا برگد کے درخت کے ساتھ لڑھک پڑی۔ پان اپنا اثر دکھا چکا تھا۔ دلشاد نے جلدی سے اپنی سائیڈ والی جیب سے ایک کالی لمبی ڈوری نکالی اور اس کے ساتھ پلوشا کو برگد کے تنے کے ساتھ باندھنے لگا۔ پلوشا کو باندھتے ہی پلوشا کی گردن سے ایک کالے رنگ کی ڈوری میں موجود مالا دلشاد نے نکال لی۔ اب وہ پلوشا کے چہرے پر لگاتار تھپڑوں کی برسات کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہی پلوشا ہوش میں آ گئی۔ ''آنکھیں کھولتے ہی وہ کراہ اٹھی...... ''تم نے مجھے...... اس طرح باندھ کیوں رکھا ہے؟''

''خاموش ہو جا خبیث چڑیل تو مجھے مارنا چاہتی تھی ناں...... اب دیکھ میں تیرے ساتھ کیا کرتا ہوں۔'' دلشاد نے کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو، میں تمہیں کیسے مار سکتی ہوں...... مجھے تو خود تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' پلوشا

نے ہلکی آواز سے کہا۔

"اب مزید ناٹک مت کر۔ میں نے تیرا ذہن پڑھ لیا تھا تو مجھے ختم کرنا چاہتی تھی۔ تیرا پلان تھا کہ جب تو مجھے اس پتھر پر بیٹھائے گی تو اوپر درخت میں بندھا ہوا پتھر جو کہ کئی ٹن وزنی ہے مجھ پر گرادے گی اور مجھے مار دے گی اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تو ایک انسان نہیں چڑیل ہے.....شیطانی چڑیل ابلاشا..... بول کس کے کہنے پر تو مجھے مارنے آئی تھی ورنہ....."

"جب تجھے سب پتہ چل چکا ہے تو تجھے میری طاقت کا اندازہ بھی ہوگا۔ میں تجھے جلا کر بھسم کردوں گی۔" پلوشا نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"تجھے معلوم نہیں چل میں بتادیتا ہوں۔ اس وقت تیری کوئی شیطانی طاقت تیرے ساتھ نہیں ہے۔ میں تجھے اس درخت کے ساتھ باندھ چکا ہوں اور میں نے تیری مالا بھی اتارلی ہے۔ اب تو بالکل ایک معمولی انسان کی طرح ہے۔ چل اب جلدی سے بتادے تو کس کے کہنے پہ مجھے مارنے آئی تھی۔ ورنہ تجھے آج کوئی نہیں بچاسکتا۔"

"میں..... میں بتاتی ہوں..... تمہیں مارنے کے لئے مجھے راخون نے بھیجا تھا....." پلوشا نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"کیوں.....؟" دلشاد نے پوچھا۔

اور پھر پلوشا نے چنڈال اور راخون کے بارے میں تمام تفصیل بتادی۔ "سنو میں نے تمہیں تمام سچ بتادیا ہے۔ اب تم مجھے چھوڑ دو۔" پلوشا نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"نہیں تم جیسی طاقتوں کو چھوڑ دینا بہت بڑی بے وقوفی ہے۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔" دلشاد نے کہا۔ اور پھر ایک زوردار اور بھیانک چیخ سنائی دی۔ دلشاد نے پلوشا کا سر اس کے دھڑ سے تلوار کے ذریعے جدا کردیا تھا۔ اور پھر دلشاد ایک طرف چلنے لگا وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

راخون اپنے کمرے میں بیٹھا ایک پرانے طرز کا ستار بجا رہا تھا کہ اچانک کمرے میں بے شمار دھواں نکلنے لگا۔ پھر اچانک ایک پتھر کی بنی ہوئی سرخ کرسی کمرے میں ظاہر ہوئی اور پھر چند لمحوں بعد جب دھواں ختم ہوا تو اس کرسی پر چنڈال بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ چنڈال کی آنکھیں غصے سے سرخ تھیں اور پھر وہ چنگھاڑ کر بولا۔ "راخون میں نے تجھ سے کہا تھا ناں کہ اگر تو دلشاد کو مارنے میں ناکام ہوگیا تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بس آج وہ دن آگیا ہے۔ آج تجھے اپنے پاپ کی سزا ضرور ملے گی۔"

"آقا..... چنڈال آقا۔" راخون نے چنڈال کے پاؤں پڑتے ہوئے کہا۔

"میں نے دلشاد کو مارنے کے لئے ابلاشا کو بھیجا ہے آقا....."

"خاموش نمک حرام تیری اس ابلاشا کو دلشاد نے ختم کردیا ہے۔ اور اب تجھے میں ماروں گا۔"

کیا..... ابلاشا ختم ہوگئی ہے.....تو پھر آقا مجھے ایک موقع اور دو میں خود دلشاد کو مارنے جاؤں گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ چیز کیا ہے۔ آقا مجھے ایک موقع اور دو...... تمہیں تمہارے شیطان آقا کا واسطہ....." راخون بدستور چنڈال کے قدموں میں پڑا رہا۔ "راخون میں تجھے ہرگز معاف نہ کرتا لیکن چونکہ دلشاد خود میرے لئے راستے کا پتھر بنا ہوا ہے۔ اور وہ میری جان لینا چاہتا ہے اس لئے اس کا ختم ہونا بہت ضروری ہے اور اس کام کے لئے میں تجھے آخری موقع دیتا ہوں۔ لیکن اب یہ کام تو میرے پلان کے مطابق کرے گا۔" چنڈال نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

"چنڈال آقا میں آپ کا غلام ہوں ...... آپ جیسے کہیں گے، میں ویسے کروں گا۔ لیکن دلشاد کو میں موت کے گھاٹ ضرور اتاروں گا۔" راخون نے کہا۔

"اب خاموش ہوجا، نمک حرام اور میری بات غور سے سن۔" چنڈال نے گرجدار آواز میں کہا۔

"تو ایسے دلشاد کو نہیں مار سکتا اس کے پاس نیکی کی بے شمار طاقتیں ہیں اور دوسرا اسے اس کام کے لئے بابا کمال الدین شاہ نے بھیجا ہے ہم اسے آسانی سے ختم نہیں کرسکتے۔ تو یوں کر کہ اسے کسی طرح معبد کے کالے غار

میں لے جا اور وہاں اس سے مقابلہ کر، تو ضرور اسے ختم کردے گا۔ کیونکہ وہاں شیطانی معبد کا سایہ ہے اس لئے وہاں نیکی کی طاقتیں کام نہیں کرتیں اور جب اس کی نیک طاقتیں اس کا ساتھ چھوڑ دیں گی تو وہ ایک حقیر انسان ہوگا۔ جسے تو جس طرح چاہے گا مار دے گا۔"

"ٹھیک ہے آقا جس طرح آپ کا حکم......" راخون نے کہا۔

"راخون یہ تیرے لئے آخری موقع ہے۔ اگر تو دلشاد کو مارنے میں ناکام ہوا تو میں تجھے زندہ کالے پہاڑوں کی کالی دلدل میں پھینک دوں گا۔ جہاں سے تیری آتما بھی واپس نہیں آسکے گی۔" چنڈال نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

"جی آقا......" راخون نے کانپتے ہوئے کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی چنڈال کرسی سمیت چند لمحوں بعد غائب ہوگیا اور فرش کی سطح برابر ہوگئی۔

☆......☆......☆

دلشاد لمبی گھاس کے اوپر بیٹھا گہری سوچ میں غرق تھا۔ وہ مسلسل جدوجہد کے بعد چنڈال قبیلے کی سرحد کے قریب تھا۔ لیکن وہ یہ سوچ رہا تھا کہ چنڈال کو کس طرح ختم کرے۔ چنڈال ایک بہت بڑی شیطانی قوت تھی۔ اس کے پاس ہزاروں ایسی شکتیاں تھیں۔ جن سے وہ ایک پل میں دلشاد کو ختم کرسکتا تھا۔ دلشاد کو اس بات کی بھی بڑی فکر کھائے جارہی تھی کہ "اسے اس کام کے لئے بابا کمال الدین شاہ نے بھیجا ہے اور وہ اپنے مرشد کے سامنے شرمندہ اور شکست خوردہ ہوکر واپس نہیں جاسکتا۔" دلشاد انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک جیسے وہ اچھل پڑا۔ اس نے فوراً اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی والی انگلی میں موجود ایک پیتل کی چمکتی ہوئی انگوٹھی کو دیکھا۔ اور پھر دھیرے سے مسکرایا۔ دوسرے لمحے وہ لمبی لمبی گھاس پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس نے منہ میں دھیرے دھیرے کچھ پڑھا اور پھر زور سے کہنے لگا۔ "میرے پاس آؤ میرے بلیک پال دوست...... ہاں میں...... میں دلشاد تمہیں پکار رہا ہوں...... دلشاد جسے تم پیار سے راگونا کہتے تھے۔ آج مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تمہیں یاد ہوگا جب افریقہ کے گھنے جنگلات میں، میں نے ماسٹر انگو سے تمہاری جان بچائی تھی۔ تب تم نے کہا تھا کہ مجھے جب تمہاری ضرورت ہوگی اس انگوٹھی کو چومنے سے تم میرے پاس دوڑے چلے آؤ گے۔" یہ کہہ کر دلشاد نے ایک بار آنکھیں بند کرکے انگوٹھی کو چوم لیا۔ انگوٹھی کو چومنا تھا کہ اچانک ایک بھاری رعب دار آواز آئی۔ "میرے دوست راگونا تمہارے بلانے پر افریقہ کے کالے جنگل کا وچ ڈاکٹر ڈاکٹر بلیک پال تمہارے سامنے حاضر ہے۔"

"لیکن تم مجھے نظر کیوں نہیں آرہے۔ تم کہاں ہو؟" دلشاد نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"میرے پیارے دوست راگونا، ابھی تمہارے سامنے آجاتا ہوں۔" وچ ڈاکٹر پال کی آواز آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی دلشاد کے سامنے بے شمار دھویں کے ساتھ اس میں سے ایک کالے رنگ کا آدمی نکلا۔ اس کا تمام رنگ بالکل افریقہ کے حبشیوں کی طرح سیاہ تھا۔ وہ گول گول گھومتا ہوا دلشاد کے قریب پہنچ گیا۔ "تم کو سلام ہو، میرے مسلمان دوست۔" وچ ڈاکٹر بلیک پال نے دلشاد سے کہا۔ "وعلیکم السلام...... عظیم وچ ڈاکٹر کہو کیسے ہو......"

"میں بالکل ٹھیک ہوں پیارے راگونا...... لیکن تم بتاؤ تم کو میری کیسی ضرورت پڑگئی کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ......؟" وچ ڈاکٹر نے کہا۔

"عظیم وچ ڈاکٹر مجھے ایک بہت بڑی شیطانی طاقت چنڈال کو ختم کرنا ہے اور اس کا طریقہ تم سے پوچھنا ہے کہ چنڈال کو کیسے ختم کیا جائے، وہ بہت بڑی شیطانی قوت ہے اور مجھے اچھی طرح اس کی شکتیوں کا بھی علم نہیں ہے اس لئے میں آسانی سے اس کے قریب بھی نہیں جاسکتا۔" دلشاد نے کہا۔

"کیا...... چنڈال کو...... تم چنڈال کو مارو گے...... ارے وہ تو شیطانی دنیا...... کا سب سے بڑا بے تاج بادشاہ مانا جاتا ہے...... اس کی اتنی شکتیاں ہیں کہ ان کی کوئی حد نہیں...... تم اسے نہیں مار سکتے...... تم جانتے

ہو مجھ سے پہلے کے عظیم وچ ڈاکٹر گرمالا کو بھی اسی چنڈال نے مار دیا تھا۔ جس کے بعد میں وچ ڈاکٹر بن گیا...... اس کے پاس بے حساب کالی شکتیاں ہیں۔ وہ اتنا طاقتور شیطان جن ہے کہ افریقہ کے سیاہ فام حبشی قبیلے کے سردار دیوانگا جو کہ بہت سی کالی شکتیوں کا مالک ہے۔ جس سے کالے سمندر کا راجہ گوپال بھی پناہ مانگتا ہے۔ وہ بھی چنڈال کی غلامی کرتا ہے۔ اور اسی کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کرتا ہے۔ اب بھلا تم چنڈال کو کیسے مار سکتے ہو۔'' وچ ڈاکٹر پال نے کہا۔

''مجھے اپنے خدا پر یقین ہے عظیم وچ ڈاکٹر۔ تم مجھے صرف اسے مارنے کا طریقہ بتاؤ...... میرا مقصد نیک ہے اور انشاء اللہ مجھے کامیابی حاصل ہوگی۔'' دلشاد نے کہا۔

''لیکن تم اسے مارنا کیوں چاہتے ہو؟'' وچ ڈاکٹر پال نے دلشاد کی بات کا جواب دیئے بغیر کہا۔ اور پھر دلشاد نے اسے سردار جن خیام، اپنے مرشد اور ابلاشا کے مارنے تک کی تمام تفصیل بتادی۔

''سنو پیارے دوست راگونا...... جہاں تک چنڈال کو ختم کرنے کا سوال ہے تو وہ مجھے نہیں معلوم...... لیکن مجھے اس کی شکتیوں کا علم ہے۔ جن میں سے تمہیں ایک واقعے کے بارے میں بتادوں تو تم باقی اندازہ خود لگالوگے۔ تم نے جارج نیلسن اور کلاڈیا کے نام تو سنے ہونگے۔''

''ہاں...... یہ وہی ہیں ناں جو پوری دنیا میں کالی دنیا کے سب سے طاقتور انسان جانے گئے تھے۔''

''ہاں یہ وہی ہیں اور انہوں نے ہی جادوگر ہری ناتھ کو انڈیا میں شکست دی تھی۔ جارج اور کلاڈیا مغربی دنیا کے دو انسان تھے۔ انہوں نے روس کے سفید برفیلے پہاڑوں میں جادوگری اور دیوی دیوتاؤں کے ماحول میں ہی اپنی زندگی گزاری تھی اور پھر وہ شادی کرکے دوسری بڑی طاقتوں کا مقابلہ کرنے روس سے نکل آئے تھے۔ انہوں نے کئی علاقوں کا دورہ کیا اور بہت سے علاقوں کو اپنے جادو اور کالی شکتیوں سے فتح کرلیا۔ مصر کے پہاڑوں میں فرعونہ کی بے قرار روح کو بھی انہوں نے اپنے قبضے میں کرلیا۔ وہ پوری دنیا میں مشہور ہوگئے تھے۔ دنیا کے عام لوگ تو ان کے نام سے بھی تھر تھر کانپتے تھے۔ وہ ان دنوں انڈیا کے ایک گاؤں ناگ پور میں تھے کہ اچانک غائب ہوگئے۔ تمہیں پتہ ہے ان دونوں کو کس نے غائب کیا تھا...... اس چنڈال نے...... اور وہ آج تک چنڈال کی قید میں ہیں۔ اتنی زیادہ شکتیاں رکھنے والے اور کالی دنیا کے عظیم جادوگر جارج نیلسن اور جادوگرنی کلاڈیا کو چنڈال نے آسانی کے ساتھ غائب کردیا اور اپنی آگ کی بنی ہوئی سرخ کوٹھی میں ہمیشہ کے لئے قید کردیا۔ اب تم خود اندازہ لگاسکتے ہو کہ چنڈال کتنا طاقتور ہے اور کتنی شکتیوں کا مالک ہے۔ میری مانو تو اسے ختم کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔'' وچ ڈاکٹر پال نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''عظیم وچ ڈاکٹر میں چنڈال کی شیطانی شکتیوں سے آگاہ ہوگیا ہوں...... لیکن تم نے مجھے اسے مارنے کے طریقے کے بارے میں نہیں بتایا۔ بقول تمہارے کے تم کچھ نہیں جانتے...... لیکن تم مجھے اسے مارنے کا کلیو تو بتاسکتے ہو...... کہیں کوئی ایسا راستہ تو ہوگا جس سے مجھے اپنی منزل مل سکے...... کوئی اندازہ...... کوئی ایسی ترکیب...... کہیں کوئی اور بڑی طاقت جو چنڈال کی موت کا طریقہ جانتی ہو......'' دلشاد نے کہا۔

''ہاں...... پیارے دوست۔ راگونا...... مجھے واقعی ایک بڑی طاقت یاد آگئی ہے۔ وہ بہت بڑی طاقت ہے۔ وہ چنڈال کو ختم نہیں کرسکتی۔ لیکن اس کی موت کا طریقہ ضرور جانتی ہے۔''

''کک...... کون ہے وہ؟......'' دلشاد نے خوشی سے اٹکتے ہوئے کہا۔

''سردار بالکے کی آتما...... ہاں سردار بالکے کی آتما...... صدیوں سے افریقہ کے کالے جنگلوں میں سردار بالکے کی روح بے چینی سے پھر رہی ہے...... چنڈال نے اسے اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش کی تھی لیکن سردار بالکے کی آتما نے چنڈال کو زخمی کردیا تھا۔ پھر چنڈال نے ہمیشہ کے لئے سردار بالکے کی روح کا پیچھا چھوڑ دیا۔ کالے شیطان نے بھی اسے منع کردیا تھا۔ میں ابھی سردار

بالکے کی آتما کو بلاتا ہوں...... تم...... تم یوں کرو کہ اپنی آنکھیں اور کان کسی کپڑے سے بند کرلو...... سردار بالکے کی آتما کی بہت بھیانک آواز ہے اور اس کی شکل اس کی آواز سے بھی زیادہ بھیانک ہے۔'' وچ ڈاکٹر نے کہا۔ پھر دلشاد نے اپنے موٹے رومال کے ذریعے اپنے کان بند کرلئے اور آنکھیں بھی بند کرلیں۔ کچھ لمحے خاموشی رہی۔ پھر تقریباً بیس منٹ تک وچ ڈاکٹر اور کسی دوسری نادیدہ ہستی کی کھسر پھسر کی آوازیں سنائی دیں۔ ''کھول دو کان اور آنکھیں۔'' وچ ڈاکٹر پال نے کہا۔

''میں نے سردار بالکے کی بے چین آتما سے چنڈال کو مارنے کا طریقہ پوچھ لیا ہے۔'' وچ ڈاکٹر نے کہا۔

''کیا طریقہ ہے مجھے جلدی بتاؤ......''

دلشاد نے بے چینی سے کہا۔

''یہ طریقہ بہت مشکل ہے۔ پیارے دوست راگونا...... اس میں جان بھی جاسکتی ہے...... لیکن میں پھر بھی تمہیں بتادیتا ہوں...... تم...... اگر چنڈال کے بالوں کی لمبی چوٹی سے تین بال جو کے لمبائی میں برابر ہوں کاٹنے میں کامیاب ہوگئے تو تم چنڈال کو آسانی کے ساتھ ختم کرسکتے ہو......''

''لیکن کیسے......؟'' دلشاد نے پوچھا۔

''کسی بھی طرح اگر تم نے چنڈال کی چوٹی کے تین بال حاصل کرلئے تو پھر ان کو خورس کے پتوں میں لپیٹ کر آگ لگادوگے تو چنڈال اپنی کالی لنکا سمیت جل کر راکھ ہوجائے گا۔ اس کا کالا شیطان بھی اسے نہ بچا پائے گا۔'' وچ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''لیکن یہ خورس کا درخت کون سا ہے۔ اس کے پتے کہاں ملیں گے......؟'' دلشاد نے کہا۔

''کمال ہے تم کو خورس کے درخت کا نہیں پتہ...... اوہو...... مجھے معلوم نہیں تھا...... مجھے معاف کردینا دوست...... دراصل ہم جسے خورس کا درخت کہتے ہیں تم لوگ اسے اپنی زبان میں پیپل کا درخت کہتے ہو اس لئے میرے خورس کہنے پر تم حیران ہوگئے تھے۔'' وچ ڈاکٹر نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''واہ بھئی کمال ہے پیپل کے درخت کا اتنا بڑا کرشمہ ہے اور ہمیں معلوم نہیں۔'' دلشاد نے کہا۔

''ہاں بعض اوقات کچھ چیزوں کا بہت زیادہ فائدہ ہوتا ہے لیکن ہم اسے نہیں جانتے......'' وچ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔

''اچھا یہ بتاؤ ڈاکٹر تم نے اتنی جلدی سردار بالکے کی آتما سے رابطہ کیسے کرلیا......؟'' دلشاد نے پوچھا۔

''تم نہیں سمجھوگے، آتماؤں کے لئے فاصلہ طے کرنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا...... اس لئے میرے بلانے پر سردار بالکے کی آتما دوڑی چلی آئی......؟'' ڈاکٹر نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ عظیم وچ ڈاکٹر۔ تمہارا بہت شکریہ...... اگر تم نہ ہوتے تو میں بڑی مشکل میں ہوتا۔ تم نے میری مشکل آسان کردی۔ میں تمہیں اپنی زندگی میں فراموش نہیں کروں گا۔'' دلشاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم میرے دوست ہو...... راگونا۔ اور دوست کے لئے وچ ڈاکٹر جان بھی دے سکتا ہے...... لیکن چنڈال کو دھیان سے ختم کرنا وہ بہت مکار جن ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں...... تمہارا خدا حافظ...... اور میرا گاڈ......'' وچ ڈاکٹر نے کہا اور اس کے ساتھ ہی وچ ڈاکٹر ہوا میں تحلیل ہوگیا۔ دلشاد اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

☆......☆......☆

راخون کی کار ایک ویران سڑک پر فراٹے بھرتی ہوئی جارہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر راخون جبکہ ساتھ والی سیٹ پر ایک دوسرا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ جب کار جنگل کے بیچ ایک ویران جگہ پر آئی تو رک گئی۔ راخون گاڑی سے اترا اور اس نے اشارے سے دوسرے آدمی کو کہا۔ ''تم گاڑی لے کر اب واپس جاؤ۔''

دوسرے آدمی کے واپس جاتے ہی راخون جنگل میں ایک طرف جانے لگا۔ وہ مسلسل گھنے جنگل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آخر کار وہ ایک جگہ رک گیا اور گھور گھور کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہاں چاروں طرف سایہ دار گھنے درخت تھے۔ اور درمیان میں جنگلی گھاس تھی۔ دوسرے لمحے وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں بند

کرلیں اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنے ارد گرد ایک پھونک ماری۔ پھونک کا مارنا تھا کہ راخون کے ارد گرد دائرے کی شکل میں آگ لگ گئی۔ راخون آگ کے دائرے میں بیٹھا مزید کچھ پڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک گرجتی ہوئی آواز آئی۔

''کیوں بلایا مجھے راخون...... کیوں بلایا...... میں نے تجھے منع کیا تھا کہ مجھے دوبارہ مت بلانا...... روجن کو دوبارہ مت بلانا۔'' پھر تو نے اپنا وچن کیوں توڑا۔ کیوں بلایا مجھے۔'' روجن نے کہا۔

''مجھے تمہاری بہت اشد ضرورت ہے روجن۔ اس لئے میں نے اپنا وچن توڑا۔ چنڈال آقا کی زندگی کو خطرہ ہے۔ ہماری دنیا کا ایک انسان اس کے پیچھے پڑا ہے۔ چنڈال آقا نے مجھے اس کو مارنے کو کہا ہے۔ اگر میں اسے نہ مار سکا تو میری موت چنڈال آقا کے ہاتھوں لازم ہے۔'' راخون نے روجن جن کی نظر نہ آنے والی صورت سے کہا۔

''کیا...... چنڈال کی زندگی کو خطرہ ہے؟ یقین نہیں آتا کہ ایک معمولی انسان سے چنڈال کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔'' روجن کی آواز آئی۔

''تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔ تم آگ کی پرستش میں مصروف ہو ناں۔ تم بس مجھے یہ بتاؤ کہ دلشاد جو کہ چنڈال کی تلاش میں نکلا ہے، کہاں ہے تاکہ میں وہاں پہنچ کر اسے ختم کر سکوں۔ اسی کام کے لئے میں نے تجھے یہاں بلایا ہے۔'' راخون نے کہا۔

''ٹھہرو مجھے معلوم کرنا ہوگا......'' روجن کی آواز آئی۔ ''وہ چنڈال قبیلے کی سرحد کے قریب پہنچ گیا ہے۔ تمہاری بھیجی ہوئی طاقت ابلاشا کو ختم کرنے کے بعد اس نے افریقہ کے شکتی مان اور نامور وچ ڈاکٹر بلیک پال کو بلا کر اس نے چنڈال کو مارنے کا طریقہ بھی پوچھ لیا ہے۔ سردار بالکے کی آتما نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔''

''اوہ...... یہ کیا ہو گیا...... یہ تو انرتھ ہو گیا۔ اگر میں بروقت وہاں نہیں پہنچا تو وہ چنڈال کو ختم نہ کر دے...... مجھے جانا ہوگا۔ تمہارا بہت شکریہ روجن، تم اب جاؤ۔'' راخون نے کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی راخون نے اپنے ارد گرد ایک پھونک ماری۔ پھونک مارنے سے ارد گرد کی آگ ختم ہو گئی اور راخون نے اپنے ہاتھ تیزی سے آسمان کی طرف بلند کر لئے اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ دوسرے ہی لمحے وہ غائب تھا۔

☆......☆......☆

دلشاد جیسے ہی چنڈال قبیلے کی سرحد میں داخل ہوا۔ اچانک دو پہرے دار جن تلواریں لے کر سامنے آئے اور انہوں نے دلشاد کو ایک طرف چلنے کا اشارہ کیا وہ دلشاد کو لے کر ایک ہال نما بڑے کمرے میں آئے۔ کمرے میں ہر طرف اندھیرا تھا۔ اتنے میں ایک جن آگے بڑھا اور اس نے لوہے کی بھاری زنجیر سے دلشاد کے ہاتھ باندھ کر اسے ایک موٹے ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ ''ہاہا...... ہاہا...... ہمارے آقا چنڈال کو مارنے آیا تھا...... خود ہی شکار ہو گیا...... اب بتا کیسے مارے گا چنڈال آقا کو......'' ایک جن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''چنڈال کو تو میں ماروں گا۔ مگر یہ سوچو اس وقت تمہارا کیا ہوگا۔ تم میری منتیں کرو گے کہ مجھے چھوڑ دو۔ اس لئے میری بات مانو مجھے کھول دو اور چنڈال کا ٹھکانہ بھی بتا دو......''

''ہا...... ہاہا، یہ تو بڑا بہادر ہے بھئی...... ہماری قید میں ہو کر بھی چنڈال آقا کی موت کی بات کرتا ہے۔ واہ بھئی واہ۔ کیا بات ہے۔'' پہریدار جن نے دوبارہ قہقہہ لگایا۔ ''ارے دیکھنے دو اسے خواب، لیکن اس کا یہ خواب، خواب ہی رہے گا، کبھی پورا نہیں ہوگا، میں چنڈال آقا کو خبر کرنے جا رہا ہوں وہ اسے موت کے گھاٹ اتار دے گا۔'' دوسرے جن نے باہر جاتے ہوئے کہا۔

لیکن تھوڑی دیر میں ہی وہ واپس آ گیا۔ اور دوسرے جن سے بولا۔ ''میں تو اس کی موت کا انتظام کرنے جا رہا تھا۔ لیکن چنڈال آقا کو شاید خبر ہو گئی ہے اس لئے انہوں نے اس کے لئے راخون کو بھیج دیا ہے وہ ہی اس کا کام تمام کریں گے۔'' دلشاد خاموشی سے سب کچھ سن رہا تھا۔

اتنے میں راخون اندر داخل ہوا۔ ''کھول دو اسے

اور تم سب جاؤ یہاں سے......'' راخون نے کہا۔ انہوں نے دلشاد کو کھول دیا اور باہر چلے گئے۔ ''آؤ دوست آؤ میرے ساتھ، میں تمہارا دوست ہوں اور تمہیں یہاں سے بچانے آیا ہوں۔'' راخون نے کہا۔

''لیکن ابھی تو میں نے سنا ہے کہ تم چنڈال کے آدمی ہو اور مجھے مارنے آئے ہو......'' دلشاد نے کہا۔

''نہیں دوست۔ وہ میں نے جھوٹ بولا تھا تمہیں بچانے کے لئے تاکہ یہ جن تمہیں کھول کر میرے حوالے کردیں۔ میں واقعی تمہیں بچانا چاہتا ہوں۔ مجھے سردار جن خیام نے بھیجا ہے تاکہ جہاں بھی تم مشکل میں پھنسو تو میں تمہاری مدد کروں۔'' راخون نے اپنی صفائی بیان کی اور دلشاد خاموش ہوگیا۔

اس کے ساتھ ہی وہ دونوں واپسی کے راستے پر چلنے لگے۔ جلد ہی وہ چنڈال قبیلے کے باہر تھے۔ ''دلشاد بابو چنڈال کو تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہوگیا ہے۔ اس لئے اب وہ تمہاری تلاش میں ضرور اپنے چیلوں کو روانہ کرے گا۔ اور تمہیں مارنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن اگر ہم کالے معبد کے غار میں چھپ جائیں تو چنڈال تو کیا اس کا باپ بھی نہیں ڈھونڈ سکے گا اور بعد میں موقع آنے پر تم چنڈال کے قبیلے میں پھر گھس جاؤ گے۔'' راخون نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔ آخر آپ کو ہماری حفاظت کے لئے سردار خیام نے بھیجا ہے۔'' دلشاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن دلشاد کی مسکراہٹ عجیب تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے راخون کو پہچان لیا ہو۔ اور پھر واقعی جب وہ دونوں کالے معبد کے غار کی طرف جانے لگے۔ راخون آگے چل رہا تھا جبکہ دلشاد پیچھے چل رہا تھا کہ اچانک دلشاد نے زوردار آواز میں کہا۔

''رک جاؤ راخون عرف یشونت......''

''کیا...... تم میرا یہ نام کیسے جانتے ہو۔'' راخون نے گھبرا کر کہا۔

''ارے بھئی تم بھی کمال کرتے ہو۔ انڈیا میں تم اسی نام سے مشہور ہو۔ اور اب پوچھتے ہو کہ میں یہ نام کیسے جانتا ہوں۔'' دلشاد نے کہا۔

''اچھا...... اچھا میں سمجھا کہ...... چلو چھوڑو جلدی کرو چلتے ہیں۔'' راخون نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''لیکن جانے سے پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے دو نام کیوں...... یہاں تم راخون ہو اور وہاں ہندوستان میں یشونت...... یہ کیوں؟'' دلشاد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''بھئی ایک آدمی کے دو نام نہیں ہو سکتے کیا......؟ دنیا میں کتنے آدمی ہیں جن کے چار، چار نام ہوتے ہیں اور میرے دو ہیں تو کیا ہوا۔'' راخون نے جلدی سے کہا۔

''لیکن کتنے عجیب نام ہیں ناں......'' دلشاد نے معصومیت سے کہا۔

''لگتا ہے تمہیں حقیقت بتانی ہی پڑے گی۔ دراصل چنڈال کا ایک آدمی ہے۔ راخون وہ ہندوستان میں یشونت کے نام سے مشہور ہے اور چنڈال نے اپنی جناتی دنیا میں اسے راخون کا نام دیا ہے۔ میں نے اسی راخون کا بھیس بدلا ہوا ہے۔ اور شکل وصورت بھی ویسی ہی بنائی ہے۔ اس لئے تم مجھے پہچان نہیں رہے اور مجھے راخون سمجھ رہے ہو۔ حالانکہ میں سردار خیام کا آدمی ہوں اور میرا نام سامون جن ہے۔'' راخون نے تیزی سے کہا۔

''جھوٹ بولتے ہو تم...... تمہارا نام سامون نہیں راخون ہے۔ ہندوستان میں تم یشونت کے نام سے مشہور ہو۔ اور چنڈال کے پاس راخون کے نام سے، حقیقت یہ ہے کہ تم ہی چنڈال کے خاص آدمی ہو۔ چنڈال نے تمہیں کالی شکتیاں عطا کر رکھی ہیں۔ تم نے کئی سال چنڈال کی پوجا پاٹ میں گزارے ہیں۔ ہندوستان میں تمہاری ایک لال رنگ کی کوٹھی ہے۔ جہاں تم دنیا کی نظروں سے محفوظ اور کالے دھندوں میں مصروف ہو۔ مجھے مارنے کا حکم بھی تمہیں چنڈال نے دیا ہے۔ کیونکہ تم نے چنڈال کے حکم کے خلاف ایک کنیا کو ہاتھ لگا دیا تھا اور چنڈال نے سزا کے طور پر تمہیں مجھے ختم کرنے کا حکم دے دیا۔ بعد میں تم نے اس کنیا کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور خود میرے پیچھے اپنی ماورائی طاقت ابلاشا کو لگا دیا لیکن جب میں نے ابلاشا کو موت کے گھاٹ اتار دیا تو چنڈال تمہارے پاس

آیا اور اس نے تمہیں ایک پلان بتایا۔ اس نے تمہیں بتایا کہ تم مجھے کسی طرح معبد کے کالے غار میں لے جاؤ اور وہاں مجھ سے مقابلہ کرو۔ کیونکہ میرے پاس نیکی کی طاقتیں ہیں اور نیکی کی طاقتیں معبد والے کالے غار میں نہیں آتیں۔ کیونکہ وہاں شیطانی طاقتوں کا اثر ہے اور نیکی ہمیشہ شیطانی پلید جگہ سے دور رہتی ہے۔ ہاں کبھی ایک مقصد سامنے ہو تو مقابلہ ضرور کرتی ہے۔" دلشاد نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔

"یہ...... یہ...... سب تمہیں کیسے پتہ چلا...... تم تو مجھے کوئی نجومی لگتے ہو...... لیکن میں پھر بھی تمہیں ضرور ماروں گا کیونکہ تمہاری موت ہی میری زندگی ہے۔" راخون نے کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی راخون کوئی منتر پڑھنے لگا۔ اس نے جیسے ہی دلشاد کی طرف پھونک ماری تو حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ منتر کا دلشاد پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ "یہ...... یہ کیا! تم پر میرے منتر کا اثر کیوں نہیں ہو رہا۔ حالانکہ یہ کالی ماں کا منتر تھا۔ اس کے مطابق تمہیں جل کر راکھ ہو جانا چاہئے تھا۔" راخون نے گھبرا کر کہا۔

"راخون تمہارے کسی منتر کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت میرے مرشد بابا کمال الدین شاہ اور اجمیر شریف کے دو کبوتر میرے اوپر فضاؤں میں گھوم رہے ہیں اور تمہارے منتروں کی طاقت کو بے اثر کر رہے ہیں۔ تم چاہے دنیا کے کوئی بھی کالے منتر پڑھ لو۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" دلشاد نے کہا۔

"لیکن...... مجھے تمہیں مارنا ہے، میں تمہیں مار کر رہوں گا۔" راخون نے کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی راخون ایک طرف بھاگنے لگا۔

"رک جاؤ راخون مجھے معلوم ہے کہ تمہاری جان خطرے میں ہے۔ کیونکہ اگر تم نے میری جان نہ لی تو چنڈال تمہاری جان لے لے گا اور تمہیں ہمیشہ کے لئے کالی دلدل میں گاڑ دے گا۔ جہاں سے تمہارا زندہ لوٹنا ناممکن ہے۔ اس لئے اگر تم میری مدد کرنے کا وعدہ کرتے ہو تو میں تمہاری جان کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔" دلشاد نے کہا۔

"دلشاد میں کمزور ہوں۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ تم میری جان کی حفاظت کرو اور تم جو چنڈال کو مارنے کا خواب دیکھ رہے ہو اسے دیکھنا چھوڑ دو۔ چنڈال واقعی تمہیں مار دے گا وہ چنڈال ہے، کوئی راخون نہیں جو تم اس کے منتر بے اثر کر دو گے۔" راخون نے کہا۔

"تم چنڈال کی بات چھوڑو راخون تم اپنی بات کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تم خود بھی چنڈال کے ستم سے تنگ ہو۔ لیکن کچھ کر نہیں سکتے۔ چنڈال ہی وہ بھیانک شیطان جن ہے جس نے مصر کے پہاڑوں میں تم سے مقابلہ کر کے تمہیں مار دیا تھا۔ پھر اس نے تمہاری روح کو ایک نیا جسم اور دو نئے نام دیئے یعنی راخون اور یشونت۔"

"ت...... تو...... تم یہ سب کچھ آخر کیسے جانتے ہو؟" راخون نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

"تم یہ سب چھوڑو اور آگے سنو۔ اس وقت تمہارا نام قیصر تھا۔ تم نے مصر کے عجائب گھر میں رہ کر سونالی جو کہ ایک جادوگرنی تھی اس سے روحانی علم سیکھا تھا۔ تمہارے پاس اتنی طاقتیں تھیں کہ تم ایک جادوگر کہلا سکتے تھے۔ پھر چنڈال کا ٹکراؤ تم سے ہوا۔ اور اس نے تمہیں دو نئے نام دینے کے ساتھ ساتھ کالی ماں کی طاقتیں دیں اور تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنا لیا، اس نے تم سے ہندوستان کی سرزمین پر کئی ناجائز کام کروائے۔ اس نے تمہیں صرف ایک ہی بات سے منع کیا تھا کہ تم کبھی کسی کنیا کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔ کیونکہ اس کے بعد وہ تمہیں ایک خاص مدت پوری ہونے پر منکا دیوی جیسی خوب صورت عورت کو انعام میں عطا کر دیتا۔ لیکن جب تم نے اس کے ساتھ کیا ہوا وعدہ توڑا تو اس نے سزا کے طور پر تمہیں میرے پیچھے لگا دیا۔ کیونکہ اسے مجھ سے خطرہ تھا۔" دلشاد نے تمام تفصیل بتائی۔

"دلشاد...... مجھے یقین ہے تم واقعی چنڈال کو ختم کر لو گے۔ لیکن تم بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟" راخون نے سہمے سہمے سے انداز میں کہا۔

"راخون جیسا کہ تم جانتے ہو کہ میں نے وچ ڈاکٹر بلیک پال سے چنڈال کو مارنے کا طریقہ پوچھ لیا ہے۔ لیکن

چونکہ تم اتنے عرصہ سے چنڈال کے ساتھ رہ رہے ہو۔اس لئے تم اس کی موت کا سامان اچھی طرح جانتے ہوگے۔ مجھے معلوم ہے کہ چنڈال جیسی شیطانی طاقتوں کی جان ایک جگہ نہیں ہوتی اس لئے تم مجھے مزید کچھ بتاؤ چنڈال کے بارے میں اس کی شکتیوں کے بارے میں اوراس کے علاوہ اس کے محافظ جن بھی تو ہونگے۔ ان کے بارے میں بھی تفصیل بتاؤ" دلشاد نے کہا۔

"دلشاد میں واقعی چنڈال کی موت کے بارے میں جانتا ہوں۔ کیونکہ میں نے اس کے ساتھ پورے پندرہ سال گزارے ہیں۔ لیکن میرے بتانے کے بعد تم اسے مارضرور دینا۔ کیونکہ اگر تم نے کسی وجہ سے اسے چھوڑ دیا تو وہ مجھے ہر حال میں کالی دلدل میں پھینک دے گا۔" راخون نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"تم اس بات کی بالکل فکر مت کرو، میں اسے مار کر ہی دم لوں گا" دلشاد نے جواب دیا۔

"دلشاد بابو" راخون نے کہا۔ "وچ ڈاکٹر نے آپ کو چنڈال کی موت کا جو طریقہ بتایا ہے وہ ضرور پیپل کے پتے میں چنڈال کے تین بال کاٹ کر لپیٹنے کا ہوگا۔ یہ طریقہ ہر طرح سے چنڈال کی موت کے لئے موزوں ہے۔ لیکن چنڈال کی موت کا ایک اور طریقہ بھی میرے علم میں ہے۔ اس طریقے کے مطابق اگر کالے رنگ کی بلی کو مار کر اس کی کھال میں سو سال کے مگرمچھ کے ایک دانت کو لپیٹ کر تعویذ بنالیا جائے۔ اوراسے کسی طرح دھاگے کے اندر ڈال کر چنڈال کی گردن میں ڈال دیا جائے تو چنڈال اتنی تیزی سے ہلاک ہوجائے گا کہ جتنی تیزی کے ساتھ انسان تھوک منہ سے باہر نکالتا ہے۔ لیکن اس طریقے میں ایک ہی مشکل ہے کہ مگرمچھ کا یہاں ملنا ناممکن ہے۔ اور وہ بھی سو سالہ مگرمچھ۔ البتہ اس طریقے کا ایک فائدہ اور یہ ہے کہ اگر مگرمچھ کے دانت کے بجائے زرکون کا ایک پتھر بلی کی کھال میں لپیٹ دیا جائے اور تعویذ بنا کر چنڈال کے گلے میں ڈال دیا جائے تو چنڈال تقریباً دو گھنٹوں کے لئے بے ہوش ہوجائے گا۔ اوراسے بے ہوش کرنے کے بعد آپ آسانی سے اس کے بال کاٹ سکتے ہیں اور پھر وچ ڈاکٹر کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اسے موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں۔"

"واقعی...... یہ عمل تو درست رہے گا۔ اس طرح تو مجھے بڑی آسانی ہوگی۔ چنڈال کو مارنے میں۔ لیکن تم اس کی مزید شیطانی طاقتوں کے بارے میں تو کچھ بتاؤ" دلشاد نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"دلشاد بابو، چنڈال ایک بہت بڑی شیطانی قوت ہے۔ اس نے پیدا ہونے کے بعد ایک تنکے کے برابر بھی نیکی کا کام نہیں کیا۔ اس لئے اس کی تمام محافظ طاقتیں شیطانی ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو اس کے پاس اتنی زیادہ شکتیاں ہیں کہ جیسے صحرا میں ریت۔ لیکن اس کی سب سے بڑی شکتی جو کہ چنڈال کی محافظ ہے۔ شولما چرن ہے۔ شولما چرن چنڈال کا دایاں بازو ہے۔ شولما کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کارستان کے بڑے شمشان گھاٹ کی بے چین آتما ہے۔ جس نے کبھی بھی کارستان کے باشندوں کو چین سے نہیں رہنے دیا۔ پھر چنڈال نے اسے قابو کر کے اپنا غلام بنالیا۔ پھر چنڈال نے شولما کو اتنی شکتیاں بخشیں کہ وہ چنڈال کا دایاں بازو بن گئی۔ اس کے علاوہ چنڈال کی قید میں لاکھوں، کروڑوں ایسی آتمائیں موجود ہیں جن سے چنڈال اپنی مرضی کے کام لیتا ہے۔ اگرچہ چنڈال خود ایک ہندو جن ہے وہ یہ سب کام خود کرسکتا ہے۔ لیکن اسے حکومت کرنے کا شوق ہے۔ اس لئے وہ ہر کسی کو اپنا غلام بنانے کا خواب دیکھتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی ایک لنکا بنا رکھی ہے۔" راخون نے بتایا۔

"تم فکر مت کرو، راخون میں چنڈال کی لنکا میں آگ لگادوں گا۔" دلشاد نے کہا۔

"مگر وہ شولما......" راخون نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ارے اس سے میرا ٹکراؤ ہوچکا ہے۔ ایک دفعہ اگر سمجھدار روح ہوگی تو مجھے دیکھتے ہی میرے راستے سے ہٹ جائے گی۔" دلشاد نے کہا۔

"کیا...... آپ شولما سے پہلے ایک دفعہ مقابلہ کرچکے ہیں۔ مجھے تو...... یقین......"

"نہیں آرہا ناں یقین...... آجائے گا ایک دفعہ

شولما کو میرے سامنے تو آنے دو۔" دلشاد نے راخون کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اگر شولما تمہارے راستے میں نہیں آئی تو تم ضرور چنڈال کو ماردو گے۔ کیونکہ آج کل اس نے اپنی حفاظت کے لئے شولما کو ہی مقرر کر رکھا ہے۔ باقی عام طاقت والے جن ہوں گے جو کہ فی الحال چنڈال کی حفاظت پر مقرر نہیں ہوں گے۔ لیکن تمہیں ادھر ادھر نظر آئیں گے۔" راخون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، راخون تم اب جاؤ اور اجمیر شریف جا کر بابا کمال الدین شاہ کے ہاتھوں کلمہ پڑھ لینا۔ اس کے بعد تم وہیں رہنا وہاں تمہیں چنڈال کا باپ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔" دلشاد نے کہا۔

"بہت، بہت شکریہ دلشاد بابو لیکن میں آپ کو چنڈال کی رہائش گاہ کے بارے میں بتادوں۔ یوں تو وہ ایک جگہ نہیں ٹکتا۔ لیکن جہاں کہیں بھی اس کے ٹھکانے ہیں۔ وہاں بہت پرانا اور بہت بڑا برگد کا درخت ہوگا اور اس کے تنے پر ایک کالے ناگ کی تصویر بنی ہوئی ہوگی۔" راخون نے کہا۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میرے دوست۔ بس تم جاؤ تا کہ میں اگلا قدم اٹھا سکوں۔" دلشاد نے راخون سے کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی راخون سلام کر کے جانے لگا۔ جبکہ دلشاد اسے دور تک جاتے دیکھتا رہا۔

☆......☆......☆

ایک بہت بڑا غار تھا۔ غار کے اوپر برگد کا ایک درخت تھا جس کے تنے کے اوپر ایک کالے ناگ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ غار کے اندر پتھر کی کرسی پر چنڈال بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے ایک تیس برس کی خوب صورت عورت ڈھیلے کپڑے پہنے ادب سے کھڑی تھی۔ اچانک چنڈال رعب دار آواز میں بولا۔ "شولما میں نے کہا تھا ناں کہ یہ بازی میں جیت ہی جاؤں گا۔ تم نے دیکھا ناں کہ کل میرے قبیلے کے جنوں نے کس طرح سردار خیام اور اس کے ساتھیوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ اور اس بار سردار خیام نے بھی ڈر کے مارے کوئی مزاحمت نہیں کی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے آقا...... لیکن وہ آدمی جسے سردار خیام نے آپ کو مارنے کے لئے روانہ کیا ہے۔ وہ اگر آپ تک پہنچ گیا تو......" شولما نے پیشین گوئی ظاہر کی۔

"سنو شولما...... تمہیں تو میری شکتیوں کا اندازہ ہے پھر تم میری توہین کیوں کر رہی ہو۔ میرا نام چنڈال ہے...... اول تو وہ آدمی مجھ تک پہنچ ہی نہیں پائے گا کیونکہ راخون اسے کالے معبد کے غار میں لے جا کر ماردے گا اور اگر وہ کسی طرح راخون کے ہاتھوں بچ گیا تو میں راخون کے ساتھ ساتھ اسے بھی کالی دلدل میں زندہ گاڑ دوں گا۔" چنڈال نے غصے میں کہا۔

"مجھے شما کر دو آقا...... میرا مطلب آپ کی توہین کرنا نہیں تھا۔" شولما نے کہا۔

"ٹھیک ہے لیکن آئندہ احتیاط کرنا، اور ہاں اب تم جاؤ اور سردار شانیخ کو میرے پاس بلا کر لاؤ۔ مجھے اسے کچھ ہدایات دینی ہیں۔" چنڈال نے کہا۔

"جو حکم میرے آقا" شولما نے اونچی آواز میں کہا اور اس کے ساتھ ہی وہ باہر جانے لگی۔ اور چنڈال نے اپنی آنکھیں سکون لینے کے لئے بند کرلیں۔

☆......☆......☆

چاروں طرف لمبی لمبی کانٹے دار جھاڑیاں تھیں اور دلشاد ان جھاڑیوں کے درمیان سے نکلتا ہوا جا رہا تھا۔ اس نے اب چنڈال قبیلے میں داخل ہونے کے لئے دوسرا راستہ چنا تھا۔ دنیا کی نظروں میں یہاں جنگل تھا۔ کانٹے دار جھاڑیوں اور ایک گندے پانی کا جوہڑ تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ یہاں جنوں کا چنڈال قبیلہ آباد تھا۔ اور یہ سائیڈ قبیلے کی پچھلی سائیڈ تھی۔ دلشاد جونہی کانٹے دار جھاڑیوں سے نکلا اسے گندے جوہڑ کے ساتھ ایک بڑا سوراخ نظر آیا جو کہ نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ سوراخ اتنا بڑا تھا کہ اس میں سے بیک وقت دو آدمی اندر جا سکتے تھے۔ دلشاد دھیرے دھیرے سوراخ میں داخل ہوگیا۔ دوسرے لمحے اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی بادشاہ کے محل میں آ گیا ہو۔ باہر سے سوراخ نظر آنے والی یہ تنگ جگہ اندر سے بہت کھلی صاف اور کشادہ تھی۔ سوراخ کے اندر زمین

کی تہہ میں سنگ مرمر لگا ہوا تھا۔ دلشاد دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک اس نے دیکھا آگے صاف میدان تھا۔ جس سے آگے بہت سے درخت نظر آرہے تھے۔ دلشاد چند لمحے وہاں دیکھتا رہا پھر اس نے کچھ سوچتے ہوئے اپنی جیب سے ایک خنجر نکالا اور پھر اس پر کچھ پڑھنے لگا۔ اب دلشاد نے خنجر ہاتھ میں ایسے پکڑا جیسے کسی کو مارنے جارہا ہو۔

دوسرے ہی لمحے دلشاد اپنی جگہ سے اٹھا اور اڑنے لگ گیا۔ وہ بہت تیزی سے کسی عقاب کی طرح اڑ رہا تھا۔ پلک جھپکتے میں وہ میدان کو کراس کرتا ہوا درختوں تک پہنچ گیا۔ اب اس نے خنجر کو پکڑنے کا انداز بدلا۔ دوسرے لمحے وہ زمین کی طرف آنے لگا اور آخر کار زمین پر اتر گیا۔ زمین پر اترتے ہی وہ گھنے درختوں میں ایک طرف چلنے لگا۔

اچانک اس نے دیکھا تھوڑے سے فاصلے پر چار آدمی کھڑے تھے۔ دلشاد نے ان کا ذہن پڑھ لیا اور پھر ان کی طرف بڑھ گیا۔ ''اے کون ہو تم؟'' ان میں سے ایک آدمی نے دلشاد کو اپنی طرف آتا دیکھ کر کہا۔

''میں کون ہوں یہ چھوڑو۔ تم لوگ اپنی فکر کرو۔'' دلشاد نے کہا۔

''کیا مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ میں کون ہوں۔ لیکن میں تم سے پوچھے بغیر بتا سکتا ہوں کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔'' دلشاد نے کہا۔

''اچھا بتاؤ ذرا ہم بھی تو سنیں کہ ہم کون ہیں؟'' ایک آدمی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم میں سے ایک آدمی پالم پور کا غریب کسان ہے جو کہ تم ہو۔'' دلشاد نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا نام خیر دین ہے تمہاری ایک بہت خوب صورت بیٹی کلثوم ہے جسے چنڈال اٹھا کر یہاں لے آیا ہے تم اس کی تلاش میں یہاں آئے ہو اور تمہاری مدد ایک نیک بخت پنڈت نارائن نے کی ہے۔ اس نے تمہیں یہاں پہنچانے کا انتظام کیا ہے۔ لیکن یہاں آتے ہی چنڈال نے تمہیں چھ مہینے تک قید کر لیا اور پھر تم سے اپنے قبیلے کے کام کروانے لگا۔ آج بھی تم یہاں صفائی کر رہے تھے کہ میں ادھر آ نکلا اور ہاں یہ تمہارے ساتھی ہیں۔ یہ تمہارے ساتھ پالم پور سے یہاں آئے ہیں۔ ان کا نام......''

''بس کرو بابو جی۔ بس ہمیں یقین آ گیا ہے۔ آپ واقعی جادوگر ہیں، جادوگر۔'' خیر دین نے دلشاد کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''میں کوئی جادوگر نہیں ہوں۔ بس عام سا انسان ہوں۔ لیکن مجھے تم لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے۔'' دلشاد نے کہا۔

''کیسی مدد......؟'' خیر دین نے کہا۔ پھر دلشاد نے کچھ دیر انہیں کچھ سمجھایا۔ تھوڑی دیر بعد دلشاد بولا۔ ''تم چنڈال کی رہائش گاہ تو جانتے ہو ناں۔''

''جی بابو جی چنڈال آج کالی ماں کے مجسمے کے سامنے والے غار میں موجود ہوگا۔ اس کے ساتھ محافظ جادوگرنی شولما بھی وہیں موجود ہوگی۔'' خیر دین نے کہا۔

ابھی وہ یہی باتیں کر رہے تھے کہ اچانک انہیں دور سے بہت سے آدمی آتے ہوئے دکھائی دیئے وہ ان کی طرف تیزی سے آرہے تھے۔ ''دلشاد بابو یہ انسان نہیں جن ہیں۔ آج منگل وار ہے اور ہفتے کے ہر منگل کے دن چنڈال قبیلے کے جن اپنی طاقت بڑھانے کے لئے انسانی شکل میں آتے ہیں۔'' خیر دین نے کہا۔

''تو پھر دیکھتے کیا ہو۔ اپنے ان صفائی والے اوزاروں سے ٹوٹ پڑو ان پر، انسانی شکل میں ان کی طاقتیں بھی عام انسانوں کی طرح ہوتی ہیں۔'' دلشاد نے کہا۔

دوسرے لمحے دلشاد سمیت وہ تمام اپنے بیلچوں، کلہاڑیوں کے ساتھ تمام جنوں پر ٹوٹ پڑے۔ وہ انہیں بیلچوں اور کلہاڑیوں سے ایسی ضربیں لگا رہے تھے کہ وہ دوبارہ اٹھنے کے قابل نہ رہتے۔ دلشاد نے ایک بڑے آدمی جو کہ ضرور ان جنوں کا سردار تھا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''سردار جن تم ستاروں میں گردش کر رہے ہو۔ تم ہواؤں میں تیر رہے ہو۔ تم...... بولو...... تم ستاروں میں ہو ناں۔''

"ہاں میں ستاروں میں گھوم رہا ہوں۔" اس آدمی نے جواب دیا۔ "اچھا اب میں جو کہوں گا تم وہ کرو گے۔ ٹھیک ہے۔"

"ہاں بالکل ٹھیک ہے۔" اس نے دلشاد کی بات سن کر کہا۔ "تم چنڈال کو جانتے ہو...... کون ہے، چنڈال۔" دلشاد نے پوچھا۔

"چنڈال میرا آقا ہے۔ جناتی دنیا کا بے تاج بادشاہ۔"

"اب میرا حکم سنو...... تم چنڈال کے پاس جا کر کہو گے کہ اس سے ملنے مصر سے جادوگر کرشن راج آیا ہے اور اس کے پاس دریائے نیل کا وہ سانپ ہے جسے آپ نے برسوں پہلے منگوایا تھا چونکہ یہ سانپ چنڈال کی رہائش گاہ کے قریب یا نزدیک لے جانے سے مرجائے گا۔ اس لئے چنڈال کو مجھ سے ملنے یہاں بلاؤ۔" دلشاد نے اس سردار جن پر ہپناٹائز کا علم کیا تھا۔ اور اس طرح چنڈال کو بلایا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" اس آدمی نے کہا۔ اور تیزی سے چنڈال کی رہائش گاہ کی جانب جانے لگا۔ جبکہ دلشاد ایک کلہاڑی سے چنڈال کے مختلف جنوں سے لڑنے لگا۔ شور کی آواز سن کر قبیلے کے دوسرے جن بھی ادھر آ نکلے تھے۔ وہ تمام انسانی شکل میں تھے۔ وہ بھی مختلف ہتھیاروں سے دلشاد، خیر دین اور اس کے ساتھیوں سے لڑنے لگے۔ لڑائی بہت زور و شور سے جاری تھی۔ لڑائی میں خیر دن کے آئے ہوئے ساتھی بھی مارے گئے۔ پورے قبیلے میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ ہر طرف شور شرابہ تھا۔ دلشاد کے پاس چونکہ روحانی طاقتیں تھیں اس لئے اس پر چنڈال قبیلے کے جنوں کی تلواروں کا کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ دلشاد نے دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے جنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ "خیر دین تمہیں تمہاری بیٹی کا پتہ ہوگا کہ وہ کہاں قید ہے۔ تم جاؤ اسے چھڑواؤ میں انہیں دیکھتا ہوں اور ویسے بھی قبیلے کے تمام جن ادھر آ نکلے ہیں۔" دلشاد نے خیر دین سے کہا۔ دلشاد کی بات سن کر خیر دین اپنا منہ چھپا کر ایک طرف بھاگنے لگا۔

جبکہ دلشاد ایک تلوار اٹھائے مختلف جنوں کے سر قلم کرتا جا رہا تھا۔ دلشاد کو اپنے اوپر بھاری دیکھ کر بہت سے جن واپس بھاگ گئے۔ دلشاد بھی ان کے پیچھے بھاگتا گیا اور ایک ایک کو تلوار سے مارتا گیا۔ جنوں کو مارتے مارتے آخر کار وہ درختوں کی اوٹ میں ایک طرف جھکتے ہوئے بھاگنے لگا۔ راستے میں اسے دو آدمی ملے جو کہ دلشاد سے ڈر کے مارے چھپے ہوئے تھے۔ دلشاد نے ایک کا سر تلوار سے قلم کر دیا اور دوسرے سے کہا۔ "بتاؤ کہ چنڈال نے کلثوم کو کہاں قید کر رکھا ہے۔ بتاؤ ورنہ تیرا حشر بھی تیرے ساتھی جیسا ہوگا۔"

"بتاتا ہوں...... چنڈال آقا نے کلثوم کو یہاں سے تھوڑی دور ہی ایک غار میں آہنی پنجرے میں قید کیا ہوا ہے۔ پہلے وہ کسی اور جگہ پر تھی۔ لیکن اب چنڈال آقا اسے یہاں لے آیا ہے۔" اس نے دلشاد سے کہا۔ دوسرے لمحے دلشاد نے اسے ایک زوردار دھکا دیا اور خود اس طرف بھاگنے لگا جہاں غار میں کلثوم قید تھی۔

تھوڑی دیر میں دلشاد وہاں پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا وہاں خیر دین بہت سے جنوں سے لڑ رہا تھا۔ اس کی تلوار لڑتے لڑتے ٹوٹ چکی تھی۔ دلشاد نے زمین سے مٹھی بھر مٹی اٹھائی اور اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔ اور وہ مٹی ان جنوں کی طرف اچھال دی۔ وہ اندھے ہوگئے اور آپس میں ٹکریں مارنے لگے۔

دوسرے لمحے دلشاد غار کے اندر رکھے ہوئے پنجرے کی طرف بڑھ گیا۔ پنجرے کا کوئی تالا یا دروازہ نہ تھا۔ پنجرہ ہر طرف سے بند تھا۔ دلشاد نے اپنے دونوں ہاتھ پنجرے میں داخل کر کے سلاخوں کو پکڑا اور انہیں ایک دوسرے سے دور کھینچتے ہوئے دور کرنے کی کوشش کی، دوسرے لمحے پنجرے کی سلاخیں خود بخود کھلتی گئیں اور ان میں اتنا خلا پیدا ہوگیا کہ دو آدمی آسانی سے داخل ہو سکتے تھے۔ دلشاد اندر داخل ہوا۔ پنجرے کے ایک کونے میں کلثوم جو کہ واقعی بہت خوب صورت تھی۔ بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ دلشاد نے اسے اٹھایا اور خیر دین کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''خیر دین تم کلثوم کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ تمہیں نکلتے ہوئے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ تمام جن اب کھلے میدان کی طرف جائیں گے۔ تم یہیں سے کسی راستے سے نکل جاؤ۔''

دلشاد بابو تمہارا بہت شکریہ۔'' شکریہ کی بات نہیں۔تم جاؤ میرے پاس وقت کم ہے۔'' اور دلشاد یہ کہہ کر واپس کھلے میدان کی طرف بھاگنے لگا۔ بھاگتے ہوئے جب وہ درختوں کے قریب آیا تو اس نے جیب سے ایک لمبی ڈوری نکالی۔ جس میں ایک بلی کے چمڑے سے بنا ہوا کالے رنگ کا تعویذ لٹک رہا تھا یہ وہی تعویذ تھا جس کے بارے میں راخون نے اسے بتایا تھا۔ دلشاد زور زور سے عربی زبان میں کچھ پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس نے اپنے سینے پر پھونک ماری تو اس کی شکل تبدیل ہونے لگی۔ آخر کار اس کی شکل بالکل جادوگر کرشن کی طرح ہوگئی۔ اس کا لباس بھی مصری بن گیا۔ تب اچانک وہ اپنی جگہ سے اڑا اور ہوا میں معلق ہوگیا۔ اڑتے اڑتے وہ وہاں پہنچا۔ جہاں بہت سے جن انسانی شکل میں جمع تھے۔ ان کے درمیان میں وہ اوپر سے ایسے اترا جیسے فوجی پیراشوٹ لے کر زمین پر اترتے ہیں۔ نیچے اترتے ہی اس نے دیکھا۔ سرخ رنگ کی پتھر کی بڑی کرسی تھی۔ جس کے اوپر ایک موٹے جسامت کا آدمی بیٹھا ہوا تھا اس کی لمبی چوٹی پیچھے لٹک رہی تھی۔ جو کہ کسی سانپ کی طرح لگ رہی تھی۔

''آؤ...... آؤ...... جادوگر راج کرشن تمہیں مبارک ہو کہ تم نے میرا مطلوبہ سانپ پکڑ لیا۔''

''ہاں چنڈال آقا میں اس کوبرا سانپ کو پکڑنے میں کامیاب ہوگیا ہوں...... اب آپ آسانی سے اپنا عمل مکمل کرسکیں گے۔'' دلشاد نے اونچی آواز میں کہا۔ تمام جن دلشاد کو حیران نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

''راج کرشن تم جلدی سے یہ سانپ مجھے دے دو لیکن تمہارا انعام میں تمہیں بعد میں دوں گا کیونکہ اس وقت میرا ایک انسان دشمن میرے قبیلے میں گھس آیا ہے۔ مجھے اسے ختم کرنا ہے۔ اس نے میرے قبیلے میں بھگدڑ مچادی ہے۔'' چنڈال بولا۔

''ٹھیک ہے آقا'' دلشاد نے کہا۔ اور جیب سے کچھ نکالنے لگا تھا کہ اچانک ایک آواز آئی۔ ''دلشاد...... دلشاد...... تم۔'' یہ آواز شولما کی تھی جو کہ چنڈال کے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''کیا دلشاد......'' چنڈال نے گرجدار لہجے میں کہا۔ ''تو...... تو نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی حرام خور...... لیکن اچھا ہوا جو تو یہاں آ گیا۔ آج میں تجھے یہاں زندہ جلادوں گا۔''

تمام قبیلے میں بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ جن تو یہ نام سن کر بھاگنے لگے۔ چنڈال نامعلوم زبان میں کچھ پڑھ رہا تھا۔

اچانک دلشاد نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا کاغذ نکال کر چنڈال کی طرف پھینک دیا۔ کاغذ کے چنڈال کے پاس سے گرتے ہی کاغذ کو آگ لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ چنڈال کے اردگرد پھیل گئی۔ آگ کو دیکھ کر چنڈال گھبرا گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے چنڈال نے ایک زوردار پھونک آگ کی طرف ماری۔ وہی آگ ہوا میں اڑتی ہوئی دلشاد کے اردگرد بھڑکنے لگی۔ دلشاد آگ کے گول دائرے میں پریشان کھڑا تھا کہ اچانک چنڈال بولا۔ ''حقیر انسان دلشاد میں نے تجھے تیری ہی لگائی ہوئی آگ میں پھنسا دیا ہے۔ اب تو چند لمحوں میں جل کر راکھ ہوجائے گا...... حرام خور مجھے مارنے آیا تھا۔''

دلشاد یونہی پریشان تھا کہ اچانک اوپر آسمان سے آگ کے اوپر بارش کی طرح پانی گرنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ بجھ گئی۔ دلشاد نے جیسے ہی اوپر دیکھا دو سفید کبوتر کافی اونچائی پر اڑ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر دلشاد مسکرانے لگا۔ دوسرے لمحے ایک دھماکے کی آواز آئی اور زمین پھٹ گئی۔ دلشاد کی آنکھوں کے سامنے چنڈال زمین میں اتر گیا اور پھر زمین برابر ہوگئی۔ تمام قبیلے کے جن بھی بھاگنے لگے کہ اچانک دلشاد کی نظر شولما پر پڑی۔

''رک جاؤ شولما...... تم نہیں بھاگ سکتیں۔ آج تمہاری وجہ سے چنڈال میرے ہاتھوں سے نکل گیا۔ آج میرے

ہاتھوں تمہاری موت پکی ہے۔'' دلشاد نے کہا۔

''دلشاد......'' شولما نے گھبراتے ہوئے کہا۔''میں نے تمہارے کام میں مداخلت تو نہیں کی ناں۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ چنڈال کو مارنے والے آدمی تم ہو۔ ورنہ میں تمہارا نام اس طرح سے نہ لیتی۔''

''ٹھیک ہے شولما میں تمہاری بات پر یقین کرتا ہوں...... لیکن اب چنڈال کہاں گیا ہے۔ یہ مجھے تم بتاؤ گی۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اس کے سب ٹھکانوں کا علم صرف تمہیں ہے۔'' دلشاد نے کہا۔

''ٹھیک ہے دلشاد میں تمہیں چنڈال کا ٹھکانہ ضرور بتاؤں گی کیونکہ میں نے ایک غلطی کی ہے کہ دوبارہ تم سے ٹکرلی ہے۔ لیکن یہ بات بھی سنتے جاؤ کہ اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں چنڈال کا پتہ ہرگز نہ دیتی۔ خیر اس بات کے بدلے میں تمہیں میری حفاظت کی ذمہ داری لینی پڑے گی۔'' شولما نے کہا۔

''مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔'' دلشاد نے کہا۔ پھر شولما نے دلشاد کو چنڈال کا پتہ بتادیا اور خود دلشاد کی بتائی ہوئی جگہ پر جانے لگی۔ جبکہ دلشاد چمڑے کے تعویذ سے یوں کھیل رہا تھا۔ جیسے اسے اپنی فتح کا یقین ہو۔

☆......☆......☆

چاروں طرف سبز درخت تھے۔ درمیان میں ایک بڑی سفید پانی کی آبشار بہہ رہی تھی۔ دلشاد نے ہاتھ منہ دھولئے تھے اور اب وہ پاؤں دھو رہا تھا کہ اچانک اسے اپنے پیچھے کوئی آواز سنائی دی۔ دلشاد نے جیسے ہی مڑ کر دیکھا۔ اسے سردار جن خیام دکھائی دیا۔''خیام تم لیکن اس طرح یہاں''

''دلشاد شاید آپ بھول گئے ہیں کہ ہم جن ہیں اور ہمارے لئے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔'' خیام نے کہا۔

''اور ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا۔ لیکن آپ اس وقت انسانی شکل میں ہیں ناں۔ اچھا بتائیں خیریت ہے۔'' دلشاد نے کہا۔

''ہاں دلشاد خیریت ہی ہے۔ آپ کو ایک ضروری خبر دینے آیا ہوں۔ خبر یہ ہے کہ آپ کے ساتھ بڑا دھوکا ہونے والا ہے۔'' سردار جن خیام نے کہا۔

''دھوکہ کیسا دھوکہ تفصیل سے بتائیں خیام۔'' دلشاد نے کہا۔

''دلشاد بات یہ ہے کہ شولما نے آپ کے ساتھ تعاون کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ آپ کو دھوکے سے مروانا چاہتی ہے۔ اس نے آپ کو یہی کہا ہے ناں کہ چنڈال ملک شام کے پہاڑی علاقوں میں موجود لال غار میں ہے اور شولما آپ کی بتائی ہوئی جگہ یعنی بابا خیر دین کے گھر چلی جائے اور ان کی مدد بھی کرے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شولما پہلے آپ کے بتائے ہوئے گھر یعنی خیر دین کے گھر جائے گی اور ان کی مدد کرنے کے بجائے الٹا خیر دین کی بیٹی کلثوم کو اٹھالے گی اور اس کے بعد شولما ناگ پور میں موجود پنڈت کرشن لال پونا والے کے پاس جائے گی اور اسے دو سو من سونا دے کر وہ مالا خریدے گی جس پر کوئی بھی منتر یا جادو اثر نہیں کرتا۔ اور جس کو پہننے کے بعد چنڈال پر کوئی بھی نیکی کی طاقت اثر نہیں کرے گی۔ اور پھر شولما جب چنڈال کے پاس ہوگی تو تم وہاں پہنچو گے اور پھر تمہاری کوئی طاقت چنڈال پر اثر نہ کرے گی اور چنڈال تمہیں شیطان کے کالے پنجرے میں قید کردے گا اور تم بھوکے پیاسے مرجاؤ گے۔'' سردار جن خیام نے کہا۔

''اتنا بڑا دھوکہ لیکن خیام یہ سب کچھ تمہیں کس نے بتایا۔'' دلشاد نے پوچھا۔

''دلشاد جی۔'' خیام نے کہنا شروع کیا۔''مجھے یہ سب کچھ بابا کمال الدین شاہ نے بتایا ہے۔ اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ میں آپ کو خبر کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہوں کہ آپ نے چنڈال اور شولما کو اسی لال غار کے اندر مارنا ہے۔ اگر چنڈال اپنے قبیلے میں مرے گا تو تمام بے قصور جانیں بھی ضائع ہونگیں۔ دلشاد جی آپ نے اتنی محنت کر کے چنڈال کو بھاگنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب آپ بہت احتیاط کریں کیونکہ بیکال جی نے ہمیں جو مدت بتائی تھی کہ اس میں چنڈال کو ماردیا جائے وہ بہت کم رہ گئی

ہے۔اس لئے آپ خیال رکھیں اور ہاں پہلے آپ شولما کو بابا خیر دین کے گھر پر ماردیں اور اس کے بعد شولما کے روپ میں جاکر چنڈال کوختم کردیں۔‘‘

’’تم فکر مت کرو خیام انشاء اللہ میں چنڈال کو موت کے گھاٹ اتار کر ہی دم لوں گا۔‘‘ دلشاد نے کہا اور اس کے ساتھ ہی خیام جن نے اجازت مانگی اور وہ درختوں میں گم ہوگیا۔

☆......☆......☆

دلشاد بابا خیر دین کے گھر موجود تھا۔ بابا خیر دین اور دلشاد باتیں کررہے تھے۔اتنے میں کلثوم چائے لے کر آ گئی۔ شولما بھی وہاں موجود تھی۔ ’’شولما‘‘ دلشاد نے کہا۔ ’’میں تمہارا زندگی بھر احسان مند رہوں گا۔تم آج اگر میری مدد نہ کرتی تو میں کیسے چنڈال تک پہنچ پاتا۔‘‘

’’احسان کی بات مت کروتم نے بھی تو مجھے میری غلطی پر معاف کردیا تھا اس لئے حساب برابر۔‘‘

شولما مجھے ناگ راجہ نے ایک ہار لاکر دیا ہے جو کہ اصلی ہیروں کا ہے۔ یہ خوب صورت بھی ہے اور کراماتی بھی، تم اگر اسے پہن لوگی تو چنڈال تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔اس کا کوئی جادوتم پر اثرنہیں کرے گا۔ لوتم اسے پہن لو۔‘‘ دلشاد نے شولما کو ایک خوبصورت ہار دیتے ہوئے کہا۔

’’واؤ...... دلشاد یہ تو بہت خوب صورت ہے۔‘‘ شولما نے ہار پہنتے ہوئے کہا۔ ہار کا پہننا تھا کہ ہار آہستہ آہستہ شولما کی گردن کے اردگرد تنگ ہونا شروع ہوگیا۔ آہستہ آہستہ شولما کو بھی اس کا احساس ہوگیا۔ ’’دلشاد یہ...... یہ ہار...... میری گردن......‘‘ ہار بہت تنگ ہوگیا تھا۔ دلشاد نے شولما سے کہا۔ ’’یہ تمہاری موت کا سامان ہے شولما۔تم نے مجھے دھوکہ دینا چاہا تھا اور اب خود ہی پھنس گئی چیخو...... چیخو اب تمہارا چنڈال بھی تمہیں نہ بچا پائے گا۔‘‘ دلشاد نے کہا۔

’’دلشاد...... مجھے...... معاف...... آ...... آ...... ہا...... ہا‘‘ اور اس کے ساتھ ہی شولما دم گھٹنے کی وجہ سے ہلاک ہوگئی۔

’’دلشاد بیٹا یہ سب کچھ کیا تھا۔‘‘ خیر دین نے پوچھا۔ ’’بابا یہ غدار دھوکے باز تھی۔ یہ یہاں سے آپ کی بیٹی کلثوم کو اغوا کرتی اور پھر بعد میں مجھے چنڈال کی مدد سے شیطان کے کالے پنجرے میں قید کروادیتی اور آخر کار میری موت واقع ہوجاتی۔ لیکن اچھا ہوا کہ مجھے سب کچھ پتہ چل گیا۔ ورنہ نہ جانے اب کیا ہوتا۔‘‘ دلشاد نے کہا۔ ’’اچھا بابا آپ اپنا خیال رکھئے گا میں چلتا ہوں۔‘‘ دلشاد نے خیر دین سے اجازت لی۔ ’’خدا تمہاری حفاظت کرے دلشاد بیٹا ...... جاؤ فی امان اللہ۔‘‘ خیر دین نے دعا دی اور دلشاد صحن کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

چاروں طرف سرخ زمین تھی اور سرخ پہاڑ، البتہ درخت ہرے تھے۔ دلشاد سرخ پہاڑوں کے درمیان ایک بڑے پتھر پر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک دو سفید کبوتر اس کے سامنے ایک درخت پر بیٹھ گئے۔ وہ کچھ دیر دلشاد کی طرف دیکھ کر گرگراتے رہے۔ اور پھر چلے گئے۔ یہ بابا کمال الدین شاہ کے تعینات کئے ہوئے کبوتر تھے۔ جو کہ دلشاد کی مدد کے لئے آئے تھے۔ کبوتروں کے جانے کے بعد دلشاد بھی آہستہ آہستہ ایک طرف چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ کانٹے دار جھاڑیوں کے بیچ چل رہا تھا۔ یہ راستہ آہستہ آہستہ اوپر کی جانب جارہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دلشاد ایک ٹیلے کے اوپر نظر آرہا تھا۔ یہاں سے بائیں جانب دلشاد نے جونہی نظر دوڑائی تو اسے ایک لال رنگ کا گول پہاڑ نظر آیا۔ جس کے چاروں طرف کالے درخت تھے۔ دلشاد نے اپنی جیب سے ایک سفید رومال نکالا اور اسے نیچے رکھ دیا۔ دوسرے ہی لمحے رومال بڑھتا گیا اور ایک قالین کی شکل اختیار کرگیا۔ اب دلشاد اس قالین پر بیٹھ گیا اور اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ آنکھوں کا بند ہونا تھا کہ قالین ہوا میں اڑا اور دلشاد سمیت نیچے سرخ پہاڑ کی جانب اترنے لگ لگا۔ کچھ ہی دیر بعد دلشاد لال رنگ کے پہاڑ کے پر موجود تھا۔ اب وہ آہستہ آہستہ ایک چھوٹے سے سوراخ

کی طرف جھک کر دیکھ رہا تھا۔ دلشاد نے جیسے ہی آگے دیکھا وہ سوراخ کافی بڑا تھا۔

دوسرے ہی لمحے دلشاد سوراخ میں داخل ہوگیا۔ داخل ہوتے ہی وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اندر کا راستہ بڑا وسیع تھا۔ تھوڑی دیر چل کر جب سوراخ کا راستہ دائیں جانب مڑ رہا تھا تو دلشاد رک گیا۔ اس نے کچھ پڑھ کر خود پر پھونکا تو دوسرے ہی لمحے اس کی شکل تبدیل ہونے لگی۔ اور پھر آہستہ آہستہ اس نے شولما کی شکل اختیار کرلی۔ اب وہ بالکل شولما کی طرح تھا۔ وہ جیسے ہی دائیں جانب مڑا تو اسے ہلکی ہلکی روشنی دکھائی دینے لگی۔ کچھ دیر آگے چلنے کے بعد اسے صاف آگ نظر آئی جو کہ بہت سی لکڑیوں کو لگی ہوئی تھی۔

آگ کے آگے ایک دیو ہیکل نما آدمی جھکا ہوا تھا۔ جس کے سر سے ایک لمبی چوٹی لٹکی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس آدمی کی تین آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ یہ چنڈال تھا۔ جو آگ کی پرستش میں مصروف تھا۔ دلشاد آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک چنڈال نے اپنا سر اٹھایا اور گرجدار آواز میں کہا۔ ”آؤ..... آؤ..... ہماری محافظ شولما ہم تمہارا ہی انتظار میں تھے۔ کیا تم وہ مالا لے آئی ہو۔ جس کا ہم نے تم سے کہا تھا۔“

”ہاں چنڈال آقا میں وہ مالا لے آئی ہوں۔ لیکن میں نے اس مالا کے دانوں کے اوپر کالی ڈوری کا کپڑا لپیٹ دیا ہے تاکہ کسی کو بھی اس مالا کی اصلیت کا علم نہ ہوسکے۔“ دلشاد نے شولما کی آواز میں کہا۔

”یہ تم نے بہت اچھا کیا شولما اب تم آؤ اور یہ مالا ہمارے گلے میں ڈال دو۔ ہم طاقتور اور محفوظ بن کر اس دلشاد کے بچے کو ایسا سبق سکھائیں گے کہ وہ یاد کرے گا۔ اس نے ہمیں یہاں اس لال غار میں چھپنے پر مجبور کیا ہے۔“ چنڈال نے سرخ آنکھوں سے دلشاد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اور پھر دلشاد آہستہ آہستہ چنڈال کے پیچھے سے آیا اور اس نے محتاط طریقے سے کالی ڈوری میں لٹکا ہوا تعویذ جو کہ بالکل ایک مالا کی طرح لگ رہا تھا۔ چنڈال کے گلے میں ڈال دیا۔

تعویذ کا چنڈال کے گلے میں ڈالنا تھا کہ چنڈال نے اتنی بھیانک اور زوردار چیخ ماری کہ دلشاد کو اپنے کان بند کرنے پڑے۔ دوسرے ہی لمحے چنڈال دھڑام سے گرا اور بے ہوش ہوگیا۔

چنڈال جیسے ہی گرا دلشاد نے اوپر سے کچھ پڑھ کر پھونکا اور اب وہ اپنی اصلی شکل میں آگیا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی جیب سے ایک قینچی نکالی اور چنڈال کی چوٹی سے تین بال کاٹ لئے۔ اور پھر انہیں خورس پیپل کے پتے میں لپیٹ دیا جو کہ وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ دوسرے ہی لمحے دلشاد نے اس پتے کو پہلے سے موجود آگ میں پھینک دیا۔ پتوں کا آگ میں گرنا تھا کہ بے ہوش چنڈال ایسے کانپنے اور پھڑ پھڑانے لگا جیسے کٹی ہوئی مرغی پھڑ پھڑاتی ہے اور پھر جب پتا اچھی طرح جل گیا تو چنڈال ٹھنڈا ہوگیا۔ لیکن ٹھنڈا ہونے سے پہلے چنڈال کے منہ سے آواز نکلی۔

”ہا..... ہا..... تو دنیا کا ایک حقیر انسان تھا۔ دلشاد لیکن تو نے آخر کار مجھے مار دیا..... افسوس کہ تو بچ گیا افسوس..... لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر ایک چیونٹی بھی ہاتھی کے کان میں گھس جائے تو وہ آخر ہاتھی کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے اور تو نے مجھے بھی موت سے ہمکنار کردیا۔“ چنڈال مرگیا تھا۔

دلشاد نے ادھر ہی قبلہ کی طرف رخ کرکے سجدہ کیا اور پھر دعا مانگی اور خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ اس نے ایک نیک کام کیا تھا۔ ایک بہت بڑے شیطان کو دنیا سے ختم کردیا تھا اور مسلمان جنات کو شیطان چنڈال کے ظلم وستم سے آزاد کرادیا تھا۔

دوسرے لمحے دلشاد آہستہ آہستہ سرخ غار سے باہر جانے لگا کیونکہ چنڈال کے مردہ جسم سے بہت گندی بدبو پورے غار میں پھیل رہی تھی کہ وہاں کوئی انسان سانس نہیں لے سکتا تھا۔
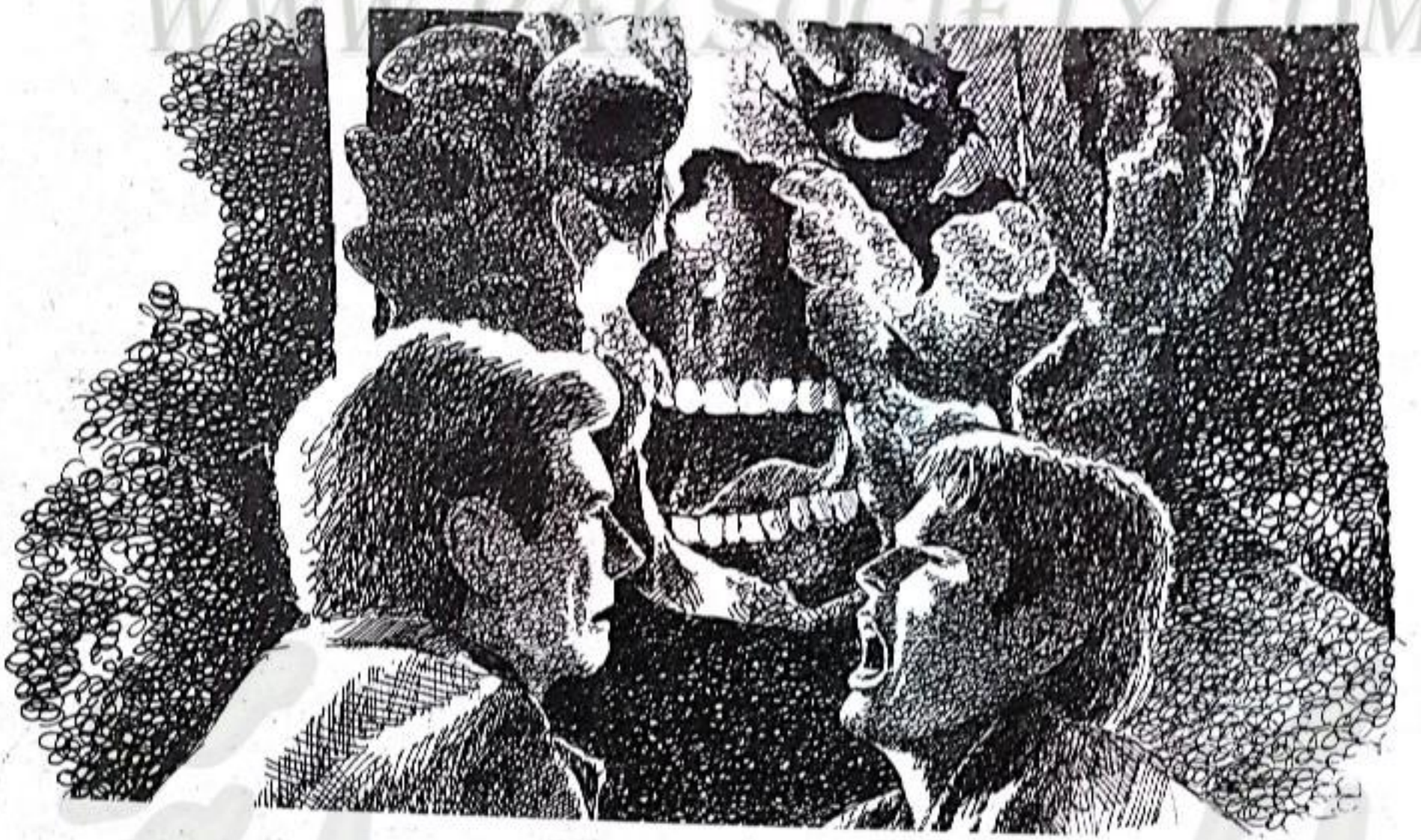
نادیدہ مخلوق

طاہرہ آصف۔ساہیوال

ھاتھ کو ھاتھ سجھائی نہ دینے والا اندھیرا دل کو دھشت زدہ کررھا تھا اور ایک جگہ آگ روشن تھی چند بچے اس جگہ بیٹھے تھے ایک بزرگ اس جگہ آگئے اور ان کے ایک عمل سے اچانک وہ بچے دھواں بن گئے کہ پھر......

کوئی مانے یا نہ مانے لیکن یہ حقیقت ہے کہ نادیدہ مخلوق کا وجود رہتی دنیا تک رہے گا

بچپن تو زندگی کا وہ حسین ترین دور ہے جس کی یادیں تمام عمر ساتھ رہتی ہیں، بچپن میں والدین سے جو بے تکلفی ہوتی ہے وہ بھی باشعور ہونے کے بعد رخصت ہوجاتی ہے، ماں کا بچے کو گود میں لینا پیار کرنا رات کو امی ابو کے ساتھ سونا یہ سب بچپن کا حصہ ہیں، میرا بچپن بھی ایسی حسین یادوں سے بھرا ہوا ہے...... بھائی دوپہر میں چھت پر پتنگ اڑانے آتا تو میں دبے پاؤں پیچھے آجاتی، جس کا وہ بہت برا مناتا مگر میں ڈھیٹ بنی رہتی پھر پتنگ کو کنی دینا بھائی کے لئے بار بار پانی لینے جانا ایسی خدمات سے میری بھی دوپہر کٹ جاتی اور بھائی کا پتنگ بازی کا شوق بھی پورا ہوجاتا اور جب کسی بات پر لڑائی ہوجاتی تو جھٹ امی کو شکایت لگادیتی کہ ”جب آپ سب سورہے تھے تو بھائی دھوپ میں پتنگ اڑا رہا تھا۔“ اسے جو ڈانٹ پڑتی سو پڑتی وہ بھی میرا کان مروڑ کر اور بال کھینچ کر بھاگ جاتا۔

رات جب سب سونے لگتے تو میں ابو کے پاس آجاتی، ان کے ساتھ لیٹ کر کہانی کی فرمائش ہوتی ابو نے لاتعداد کہانیاں سنائیں، ابو مطالعے کے بے حد شوقین تھے اور سنانے کے لئے کہانیوں کی کمی نہ تھی۔

آج جب میں خود ماں ہوں اور رات میں بچوں کو سلانے لگتی ہوں تو میرے بچے بھی کہانی کی فرمائش کرتے

ہیں تو میں انہیں زیادہ تر وہی کہانیاں سناتی ہوں جو کبھی خود ابو کے پاس لیٹ کر سنی تھیں، ان کہانیوں سے میرے ابو کی یادیں وابستہ ہیں جواب ہم میں نہیں ہیں۔

خیر بات ہو رہی تھی کہانیوں کی جب تک میں چھوٹی تھی ابو سے دیو جن پریوں بادشاہ ملکہ شہزادوں اور جانوروں کی کہانیاں سنیں لیکن جیسے جیسے شعور آتا گیا تو خود بھی بچوں کا ادب پڑھنا شروع کر دیا۔

ایک بار سردی کی رات تھی امی اون اور سلائیاں لے کر کچھ بن رہی تھیں، دوسری چارپائی پر ابو سونے کے لئے لیٹ چکے تھے، میں حسب معمول ابو کے پاس آئی او رکہا۔ ”ابو کہانی سنائیں۔“

ابو کو غالباً کوئی نئی کہانی، ذہن میں نہیں آئی تو انہوں نے پہلے سے سنائی ہوئی شاہ بہرام کی کہانی سنانا شروع کی تو میں نے ٹوک دیا۔ ”نہیں ابو یہ پہلے سنی ہوئی ہے آپ آج مجھے کوئی اور کہانی سنائیں جو بالکل سچ ہو، مجھے سچی کہانی سننی ہے۔“ تب ابو نے مجھے یہ کہانی سنائی جو کہ پاس بیٹھی امی نے بھی سنی۔

ابو نے بتانا شروع کیا۔ ”یہ واقعہ ان کے نانا کا ہے۔“ یعنی دادی کے والد کا ابو نے کہا۔

”پرانے وقتوں میں سفر کے لئے بسوں اور گاڑیوں جیسے وسائل نہیں ہوتے تھے زیادہ سے زیادہ یکہ ہی چلتے تھے، وہ بھی مخصوص روٹ پر، امیر لوگ ذاتی گھوڑے رکھتے تھے جبکہ عوام عام طور پر پیدل ہی سفر کرتے، یا پھر یکہ کام آتا، یہ بھی غالباً بیسویں صدی کی ابتدا سے پہلے کا زمانہ تھا اس دور میں رواج تھا کہ شادی بیاہ سے لے کر وفات تک ہر غم خوشی میں لازمی شرکت کی جاتی تھی، تمام دور، نزدیک کے عزہ اقربا بلائے جاتے اور آتے تھے۔

ابو کے نانا کے کچھ عزیز ایک دوسرے گاؤں میں تھے جو خاصہ دوری پر تھا۔ ان کے یہاں شادی میں شرکت کے لئے نانا صبح صادق کے وقت نماز کے بعد روانہ ہوئے اور پیدل سفر کرتے ہوئے دوپہر سے کچھ پہلے جا پہنچے۔ ابو کے نانا بہت سفید پوش شخص تھے، گھوڑے کی استطاعت نہیں تھی ویسے بھی اس دور میں روزمرہ کی خوراک سادہ مگر بہت خالص اور طاقت بخش ہوتی تھی۔

لوگ بھی محنتی اور تنومند ہوتے تھے پیدل سفر کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا ابو کے نانا وہاں شادی میں شامل ہوئے، سردیوں کے دن تھے، شام جلدی ہو جاتی تھی، عصر کے وقت تک رخصتی ہوئی تو انہوں نے بھی نماز کے بعد واپسی کے لئے اجازت چاہی، اہل گھرانہ نے انہیں اصرار کیا کہ جاتے وقت رات ہو جائے گی وہ وہیں رک جائیں اور اگلے روز چلے جائیں مگر نانا نے قیام پر آمادگی کے بجائے واپس آنے پر اصرار کیا۔

خیر نانا اپنا سفید مردانہ کھیس اوڑھ کر روانہ ہوئے، سردی غضب کی تھی، جلد مغرب ہوگئی اور مغرب کے بعد رات چھانے لگی، ابو کے نانا تیز قدموں سے راستہ طے کر رہے تھے لیکن رات نے آلیا اور چاند نکل آیا، انہیں امید تھی کہ عشاء کی اذان تک وہ گھر پہنچ جائیں گے لیکن سردی نے بے حال کر رکھا تھا وہ سوچ رہے تھے کہ کہیں نہ کہیں رات میں کھیت کو پانی لگانے والے کسی کسان سے مڈبھیڑ ہو جائے تو وہ آگ تاپ لیں کیونکہ رات میں پانی لگانے والے کسان آگ جلا لیتے تھے۔

ساتھ ساتھ سردی کے بچاؤ کا بھی حل نکل آئے، وہ تازہ دم ہو جاتے اگر آگ تاپ لیتے اور آگے جلد پہنچ جاتے۔ چلتے چلتے انہیں کہیں روشنی دکھائی دی تو وہ اسی جانب چل دیئے تاکہ کچھ آگ تاپ لیں وہ چلتے چلتے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ آگ کا بڑا سا الاؤ جل رہا ہے اور بڑے سے گھیرے میں بچے اس آگ کے گرد بیٹھے ہیں تمام کے تمام بچے ہی تھے۔

نانا جلدی سے ان کے گھیرے میں جا کر بیٹھ گئے اور سلام کر کے ہاتھ آگ کی جانب کر دیئے، بچوں نے سلام کا جواب نہیں دیا بلکہ غور سے نانا کو دیکھنے لگے، وہ ہاتھ آگے کر کے آگ تاپتے تو وہ بچے بھی ہاتھ آگے کرتے، وہ پاؤں آگ کے قریب کرتے تو وہ بھی پاؤں ان کی نقل میں اٹھا کر ویسا ہی کرتے۔

غرض جو نانا نے آگ کے قریب بیٹھ کر کیا انہوں نے بھی کیا۔ پہلے نانا نے غور نہیں کیا، وہ سمجھے کہ بچے ہیں

اور سردی میں آگ تاپ رہے ہیں مگر جب ان کی حرکات دیکھیں اور اردگرد کے ماحول پر نظر ڈالی تو جان گئے کہ یہ انسانی بچے نہیں کیونکہ اس ویرانے میں انسان کہاں۔

اب وہ جانے کے لئے کھڑے ہوئے تو تمام بچے بھی کھڑے ہوگئے تو نانا نے سوچا کہ اگر وہ چل پڑے تو یہ بچے بھی ان کے ہمراہ ہوجائیں گے اور وہ کسی مصیبت میں پھنس سکتے ہیں۔ نانا واپس بیٹھ گئے۔

آج کل تعلیم تو عام ہے مگر شعور اور آگاہی عام نہیں، نانا نے جنات کے بارے میں سن رکھا تھا، وہ جانتے تھے کہ اگر وہ خوفزدہ ہوئے تو مشکل میں پڑجائیں گے، وہ اطمینان سے بیٹھ گئے اور آگ تاپنے لگے۔

جنات آگ سے تخلیق ہوئے ہیں اور آگ سے دور رہتے ہیں اسی بات کو ذہن میں رکھ کر نانا نے آگ سے ایک جلتی لکڑی نکالی اور احتیاط سے اپنی دونوں ٹانگوں کے درمیان کرلی۔

وہ پاؤں کے بل زمین پر بیٹھے تھے جنات کے بچوں نے دیکھا تو بغیر سوچے سمجھے ان کی نقل میں جلتی لکڑی نکال کر ہر ایک نے اپنے نیچے کرلی۔

آگ ان سے مس ہوئی تو وہ چیختے ہوئے گیند کی طرح آسمان کی طرف اچھل گئے۔

نانا جلدی سے اٹھے اور تیز قدموں سے وہاں سے نکل لئے، آیت الکرسی کا ورد کرتے وہ تقریباً بھاگنے کی رفتار سے گھر کی جانب چل دیئے اور بالآخر وہ گھر آگئے، اس قصے میں ان کی ذہانت نمایاں ہوتی ہے، انہوں نے گھبرانے کے بجائے سمجھداری سے جنات کے بچوں سے نجات حاصل کی۔

اس کے بعد مجھے حقیقی پراسرار واقعات سننے کا شوق ہوگیا، میں نے کچھ روز بعد پھر ان کو کوئی حقیقی قصہ سنانے کو کہا، تب ابو نے مجھے یہ واقعہ سنایا۔ اس واقعے میں جن بزرگ کا ذکر ہے۔ ان سے ابو کا رشتہ مجھے اب یاد نہیں اگر ابو حیات ہوتے تو دوبارہ معلوم کرلیتی لیکن اب یہاں انہیں اپنے دادا کے والد فرض کرلیتے ہیں۔

ابو کے بقول پردادا کو نامعلوم وجوہات کی بنا پر گاؤں سے باہر جانا پڑا جہاں کچھ دن قیام کے بعد وہ واپس آرہے تھے۔ چلتے چلتے رات ہوگئی۔ انہوں نے مختصر راستہ یعنی شارٹ کٹ استعمال کرنے کا سوچا جو کہ ایک قبرستان سے ہوکر جاتا تھا، گھر جلد پہنچنے کے خیال سے وہ قبرستان میں داخل ہوتو گئے لیکن رات کا وقت اور وہ تنہا کچھ دل پر اثر ہوگیا۔ پردادا نے سوچا اگر ان کے ساتھ کوئی اور ہوتا تو یوں اکیلے اس خوفناک قبرستان سے گزرنا مشکل نہیں ہوتا، باتوں میں راستہ کٹ جاتا، انہوں نے بلند آواز سے آیت قرآنی پڑھنے لگے، مقصد یہ تھا کہ اپنی آواز میں آیت قرآنی سنتے ہوئے راستہ طے ہوجائے گا، انہوں نے ابھی چند آیات ہی پڑھی ہوں گی کہ یکا یک عقب سے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی گردن گھما کر پیچھے دیکھا تو ایک گھڑ سوار آتے معلوم ہوا، قریب آکر گھڑ سوار نے داداجی کو پرتپاک انداز سے ''السلام علیکم'' کہا۔

دادا نے ''وعلیکم السلام'' کہا۔

گھڑ سوار درمیانی عمر کا صحت مند آدمی تھا۔ بہت متاثر کن شخصیت تھی۔ اس نے پردادا کے برابر گھوڑا کرلیا اور گفتگو شروع کردی، تمام راستہ باتیں کرتے ہوئے طے ہوگیا حتیٰ کہ باتوں میں معلوم ہی نہ ہوا اور وہ بالکل گاؤں کے قریب آگئے۔

پھر گھڑ سوار نے پردادا سے کہا۔ ''میاں جی آپ کی منزل تو آگئی اب مجھے اجازت دیجئے۔'' ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا اور گھوڑا موڑلیا۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ پردادا کو گھوڑے کی آواز سنائی دینا بند ہوگئی، انہوں نے فوراً مڑکر دیکھا تو کچھ بھی نہیں تھا، وہ بہت حیران ہوئے کہ اتنی جلدی بھلا گھوڑا دور جا کر نگاہوں سے اوجھل کیسے ہوسکتا ہے، ابھی تو دو چار لمحے ہوئے ہیں، گھڑ سوار کو مڑے ہوئے، وہ ہوا میں تو تحلیل نہیں ہوگیا کیا۔

خیر دادا گھر آئے، نماز عشا ادا کی اور سوگئے، اگلے روز انہوں نے یہ بات اپنے والد سے بیان کی تو انہوں نے کہا۔ ''بیٹا چونکہ رات کو تم تنہا تھے اور اس وحشت وخوف میں اللہ کے کلام سے مدد چاہی تو اللہ نے انسان اور گھوڑے کی مشکل میں اپنے فرشتے کو بھیجا، وہ باتیں کرتا

ہوا تم کو یہاں تک چھوڑ گیا اور جیسے ہی تم مڑے اور کچھ قدم چلے وہ اپنا فرض پورا کر کے غائب ہوگیا، وہ انسان ہوتا تو جاتے ہوئے معلوم ہوتا، اس واقعہ کے بعد دادا نے رات میں تنہا سفر کرنے سے توبہ کرلی۔

اسکول کی زندگی میں بھی ہم تمام بچے کہانیوں کے متلاشی تھے جس دوست کے ہاتھ میں کوئی کتاب یا رسالہ دیکھا تو جھٹ مانگ لیا، ہمیشہ ایک دوسرے سے کہانیاں لے کر پڑھتے لیکن نویں جماعت میں میری دوست بننے والی لڑکی کو جس کا نام افشین تھا کبھی دلچسپی لیتے نہیں دیکھا، ایک بار میں نے افشین سے پوچھا۔ ''تمہیں کتابیں پڑھنا کیوں پسند نہیں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''مجھے بالکل کتابیں پڑھنے کا شوق نہیں اگر تمہیں ہے تو میرے گھر میں بہت سی کتابیں ہیں جو میری امی پڑھتی ہیں، کہو تو لا دیا کروں۔'' اندھا کیا چاہے دو آنکھیں اس کے مصداق میں نے فوراً خواہش ظاہر کردی۔

ایک دن اس نے مجھے اپنے گھر مدعو کیا میں نے گھر آ کر امی سے اجازت مانگی، انہوں نے بھائی کے ساتھ جانے کی تاکید کے ساتھ اجازت دے دی۔ چھٹی کے دن میں نئی کتب کے اشتیاق میں تیار ہو کر بھائی کے ساتھ افشین کے گھر پہنچی وہ مجھے اپنے ہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئی، اس کی والدہ بھی مجھے بہت محبت سے ملیں۔

بھائی کا ارادہ مجھے چھوڑ کر واپس جانے کا تھا، لیکن افشین کے بڑے بھائی نے انہیں مہمانوں کے کمرے میں بیٹھا لیا اور خود کمپنی دینے لگے، خیر بہت اچھی ملاقات رہی ساتھ ہی ان کی امی کے ذوق کا اندازہ ہوا، وہ بہت ادبی ذوق والی خاتون تھیں، گھر سنبھالنے کے ساتھ ساتھ مطالعہ کو بھی بھرپور وقت دیتیں، ان کے پاس میں نے باقی کتب کے ساتھ پراسراریت کے موضوع پر بھی بہت سی اچھی اور تحقیق کتابیں دیکھیں اس بارے میں، میں نے ان سے سوال کیا تو انہوں نے کہا۔ ''میں خود عملی زندگی میں اس تجربے سے گزر چکی، اسی لئے یہ موضوع میرے لئے بہت خاص ہے۔''

میں نے ان سے کہا۔ ''وہ مجھے بھی اس تجربے کی کہانی سنائیں۔'' تو انہوں نے بلا تردد مجھے یہ بات سنائی۔

''فرزانہ آنٹی کے مطابق 82ء کے آغاز میں ان کی شادی ہوئی، شادی غیر خاندان میں ہوئی تھی، اس لئے وہ اپنے سسرالیوں کے مزاج سے قطعی ناواقف تھیں، ان کی ساس نے ان کا رشتہ تو بہت اہتمام اور چاہت سے کیا، شادی بھی معقول انداز میں کی لیکن طبیعتاً ان کا تعلق اس طبقہ سوچ سے تھا جو بہو کو حریف کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کی خامیوں اور خوبیوں کو پرکھے بغیر روز اول سے محاذ بنا لیتے ہیں۔

انہیں شادی کے روز سے اگلے ہی دن ولیمہ کے دن ساس کے تیور بہت جارحانہ محسوس ہوئے اور پھر انہوں نے ہمیشہ ان سے نہایت متعصبانہ رویہ روا رکھا۔ ان کی ساس جتنی تیز تھیں ان کے شوہر اتنے ہی سادہ اور والدہ سے دبنے والی طبیعت کے تھے۔

خیر وہ صبر کے ساتھ گزارہ کرتی رہیں لیکن ایک بات اپنے گھر یعنی شوہر کے گھر آنے کے بعد محسوس کی کہ ان کی ساس نے انہیں گھر کا سب سے بڑا کمرہ دیا جبکہ ایسی فراخ دلی کچھ عجب لگی دوسرا یہ کہ وہ شادی کے فوراً بعد انہیں اپنے کمرے میں وہ جب بھی تنہا ہوتیں انہیں بہت زیادہ خوف و ڈر محسوس ہوتا جبکہ باقی گھر میں ایسی کوئی کیفیت نہیں ہوتی، انہوں نے اس سے نجات کے لئے نماز اور تلاوت کی پابندی کرلی۔ اگرچہ شادی سے قبل بھی وہ پابند شرع تھیں لیکن شادی اور شوہر میں مصروف ہو کر کچھ تعطل آ گیا لیکن جلد ہی انہوں نے یہ معمول درست کرلیا، ساتھ ہی کمرے کی صفائی پر بہت توجہ دی ان کے بقول وہ ہمیشہ سے سلیقہ اور صفائی پسند طبیعت کی مالک ہیں، یہی اصول انہوں نے اپنے کمرے کے لئے رکھا جبکہ باقی گھر کے افراد معمول کی لگی بندھی صفائی تو کرتے لیکن طہارت کی باریکیوں پر کم توجہ دی جاتی۔

خیر ان کی طہارت اور مذہبی امور کی پابندی سے ڈر خوف کی کیفیت تو ختم ہوگئی لیکن کمرے میں انہیں اکثر اپنے علاوہ کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا، شوہر ساتھ

ہوتے تو بہت احسن وخوبی سے وقت گزرتا لیکن جب تنہا ہوتیں تو لگتا کہ ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے، ساس صاحبہ نے اکثر کمرے میں آکر جائزہ لینا اور سوال کرنا۔ ''تم یہاں ٹھیک ہو، دل لگ گیا۔'' انہیں عجیب تو لگتا لیکن ٹال جاتیں۔

ایک روز جب ساس گھر پر نہیں تھیں تو سب سے چھوٹی نند نے ان سے پوچھا۔ ''بھابھی آپ کو ہمارے ہاں آئے دو ماہ ہو گئے ہیں۔ آپ کو کبھی اپنے کمرے میں ڈر خوف تو نہیں لگا۔''

فرزانہ نے الٹا اس سے سوال کیا۔ ''تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟''

تو اس نے بتایا۔ ''بھابھی امی سے نہ کہنا بات یہ ہے کہ ہمارا یہ کمرہ کچھ بھاری ہے، امی کہتی ہیں کہ اس کمرے میں کوئی نادیدہ شے ہے۔ ہم تو چند بار یہاں رات سوئے تو بہت بری طرح ڈر گئے، امی کو تو دوبار تھپڑ بھی پڑ چکا ہے، ہم تو یہ کمرہ استعمال ہی نہیں کرتے تھے۔'' وہ بچی تھی۔ سادگی میں تمام بات اگل دی تو انہیں سمجھ میں آیا کہ ان کی ساس صاحبہ کی فراخ دلی کا سبب کیا ہے لیکن چونکہ ان کے ساتھ کچھ غلط نہیں ہوا تھا سو وہ بالکل نہیں گھبرائیں۔

اسی دوران ان کا پاؤں بھاری ہو گیا، اس خوشگوار امر نے بھی ان کی ساس کی طبیعت پر کوئی مثبت اثر نہیں ڈالا بلکہ ان کے اس کمرے میں کسی شکوہ و شکایت کے بغیر اتنا عرصہ خیر خیریت سے رہنے پر الٹا چڑ سی گئیں، انہیں لگا کہ اپنے کمرے پر جو کوئی بھی قابض ہے اس نے گھر کے مالک افراد سے تو سخت رویہ رکھا جبکہ وہ نئی آنے والی خوش اسلوبی سے رہ رہی ہے، اس بات نے انہیں زیادہ تلخ کر دیا۔

فرزانہ کبھی اس اذیت بھری زندگی سے گھبرا کر اپنے والدین کے گھر واپس جانے کا سوچ لیتیں، یہاں تک کہ ایک روز ان کی طبیعت خاصی ناساز تھی، شوہر شہر سے باہر کاروباری سلسلے میں گئے تھے۔

موقع غنیمت دیکھ کر ساس صاحبہ نے نہایت معرکہ کی جنگ کی جس کا مقصد محض بہو کو بیٹیوں اور خود کے سامنے بالکل نیچے لگ کر رہنے کا عندیہ دینا تھا۔

اس دن وہ بہت ٹوٹی ہوئی اور دل گرفتہ تھیں، اپنے کمرے میں جا کر دیر تک روتی رہیں اور مصمم ارادہ کر لیا کہ اب وہ بالکل اس گھر میں نہیں رہیں گی۔ یہاں تک کہ روتے روتے وہ بھوکی ہی سو گئیں۔

سخت سردی کا موسم تھا اور وہ بغیر لحاف اوڑھے لیٹ گئی تھیں، کسی نے ان سے کھانے کا نہ پوچھا، وہ ایسی حالت میں تھیں کہ بھوک جلد لگ جاتی اور برداشت نہیں ہوتی۔

رات بارہ بجے کے بعد وہ اچانک یورین آنے کی حاجت کے لئے اٹھ گئیں، دیکھا تو لحاف ان کے اوپر تھا جبکہ انہیں ٹھیک سے یاد تھا کہ لحاف نہیں اوڑھا تھا، خیر وہ واش روم سے باہر آکر ہاتھ منہ دھو کر کچن کی طرف آئیں تاکہ کچھ کھا پی لیں، دیکھا تو کچن مقفل تھا انہیں شدید دکھ ہوا، اوپر سے غضب کی بھوک لگی ہوئی تھی وہ واپس کمرے میں آئیں تو لائٹ آن کی دیکھا تو بیڈ پر ایک ٹرے رکھی ہوئی تھی وہ حیرانی کے ساتھ ٹرے میں دیکھا تو تین طرح کا کھانا تھا انہیں چونکہ بھوک تھی وہ فوراً کھانے لگ گئیں بہت لذیذ کھانا سیر ہو کر کھایا اور برتن ایک طرف رکھ کر سو گئیں۔

صبح فجر سے پہلے خواب دیکھا کہ ایک نہایت نفیس اور شائستہ عورت انہیں مخاطب کر کے کہتی ہے۔ ''فرزانہ گھبراؤ نہیں یہ تکلیفیں عارضی ہیں، کامیابی تمہیں ہی ملے گی، کبھی واپس جانے کا نہ سوچنا، یہ سب تدبیریں تمہیں نکالنے کے لئے ہی کی جا رہی ہیں اور ہم بھی تم سے خوش ہیں، تم بہت نیک ہو۔''

اس کے بعد آنکھ کھلی تو اذان ہو رہی تھی، وہ اٹھیں اور نماز ادا کی، تلاوت کی۔

رات کے واقعہ کے برعکس ان کی طبیعت بہت ہلکی پھلکی تھی حیران کن بات یہ تھی کہ رات کے کھانے والے برتن بھی غائب تھے، وہ فارغ ہو کر معمول کے کاموں میں لگ گئیں، ساس صبح انہیں ہشاش بشاش دیکھ

کر ہکا بکا تھی، نندیں بھی جو یہ سوچ رہی تھیں کہ اب بھابھی سامان اٹھا کر چلتی بنے گی اسے گھر کے کام کرتا دیکھ کر حیران ہوگئیں۔

یہاں تک کہ ان کے زچگی کے دن قریب آ گئے وہ اپنے میکے جانا چاہتی تھیں، والدہ اور بھائی لینے بھی آئے مگر ساس نے رواج کا حوالہ دے کر کہہ دیا کہ ''پہلی زچگی سسرال میں ہوگی۔'' جانے سے روک دیا، والدہ نے بھی کہا کہ وہ خود آ جائیں گی یوں وہ پھر سسرال میں رہ گئیں۔

ساس نے دایہ کو بلوا کر سارہ احوال معلوم کرلیا۔ دو دن بعد انہیں محسوس ہوا کہ وقت قریب آ رہا ہے تو انہوں نے ساس کو خبر کی تو اس نے کہا کہ ''صبر کرو ابھی کچھ وقت ہے۔''

دوپہر کے وقت کچھ تکلیف میں اضافہ ہوا تو وہ یہ کہہ کر دایہ کو لے کر آتی ہوئی چلی گئیں۔ شوہر اپنے کام پر گئے ہوئے تھے، گھر پر فون کی سہولت ابھی آئی نہ تھی۔ چھوٹی نندا سکول گئی ہوئی تھی اور بڑی گھر کے کام کر رہی تھی۔

ساس کو گئے خاصہ وقت گزر گیا لیکن نہ خود آئی نہ دایہ۔

وہ اپنے کمرے میں آ کر شدت تکلیف سے بے حال ہو کر زمین پر لیٹ گئیں۔

اچانک ایک عورت جس نے عمدہ لباس پہن رکھا تھا، نہایت خوب صورت لیکن صورت سے ناآشنا بھینی بھینی خوشبو اس کے وجود سے آ رہی تھی، ان کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بہت شفقت سے تسلی دی اور کہا۔ ''گھبراؤ نہیں میں آ گئی ہوں۔'' اس نے کچھ پڑھ کر پھونک ماری تو لگا سارے جسم و جاں میں راحت اتر گئی، پھر اگلا تمام مرحلہ اس نے اپنے ہاتھوں انجام دیا۔

اس دوران ہی ساس دایہ کو لے کر آ گئیں، لیکن کمرے کے اندر جیسے ہی آئیں، فوراً گھبرا کر پلٹ گئیں، اللہ نے بہت صحت مند اور صحیح و سالم بیٹا عطا کیا، تمام کام بہت خوبی سے مکمل کرنے کے بعد خاتون نے ایک گلاس میں کوئی مشروب دیا اور سہارے سے بیٹھا کر پلایا اور اللہ حافظ کہہ کر غائب ہوگئیں۔

میں نے ان کے جانے کے بعد ساس امی کو آواز دی تو وہ ڈرتے ڈرتے اندر آ گئیں۔ پوتا دیکھا تو حیرت سے آنکھیں کھلی رہ گئیں بولیں۔ ''فرزانہ دایہ تو میرے ساتھ ہے یہ سب کس نے کیا اور یہ تمہارے کمرے میں وہ بدصورت بلا کون تھی؟''

میں نے بات بنائی کہ ''امی مجھے کچھ معلوم نہیں میں تو یہ سمجھی کہ انہیں آپ لائی ہیں۔''

دایہ کو بھی بھاگنے کی پڑی تھی وہ یہ کہہ کر بھاگ گئی کہ ''سارا کام تو ہوگیا اب میری کیا ضرورت۔''

خیر ساس صاحبہ کچھ خاموش ہوگئیں۔ اس واقعہ کے بعد ساس نے مجھے کبھی تنگ نہیں کیا بلکہ کہنے لگیں کہ ''بچہ سال بھر کا ہو رہا ہے، اب دوسرے بیٹے کی شادی کرنی ہے تم الگ گھر کرلو۔'' یہ بات سب سے تعجب انگیز تھی وہ خود الگ ہونے کا۔'' کہہ رہی تھیں۔ میں تو پہلے ہی تیار تھی۔ شوہر نے پہلے کرایہ پر گھر لیا لیکن بعد میں حالات اتنے اچھے ہوتے گئے کہ تین سال کے اندر گھر ذاتی لے لیا اب ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔

بعد میں وہ چھوٹے دیور کی بیوی بیاہ کر لائیں تو اسے بھی وہی کمرہ دیا لیکن وہ ایک مہینہ سے زیادہ نہ ٹک سکی، الٹا بیٹا ماں کو مار پیٹ کر اسے وہ کمرہ دے دیا اور خود دوسرے کمرے پر قابض ہوگیا، ساس چند ماہ بیمار رہ کر اللہ کے گھر چلی گئیں۔

میں نے اس کمرے میں ڈھائی سال کا عرصہ گزارا لیکن اپنے اچھے اعمال اور مذہبی رجحان کی بدولت فلاح پائی جبکہ میرے علاوہ جو بھی مکین ہوا تباہ ہوگیا، اس تجربے کے بعد سے میرا دھیان اب ان موضوعات پر بہت بڑھ گیا ہے اور یہ کتابیں اسی پر موضوع ہیں، آپ لے کر پڑھ سکتی ہیں۔'' میں نے دو تین بہترین کتب اور کچھ رسالے لئے اور بھائی کے ساتھ گھر آ گئی۔

بیٹی

شگفتہ ارم درانی - پشاور

لالچی کالے جادو کے عامل نے عورت کو موت سے ھمکنار کرنے کے لے عمل شروع کردیا کہ اچانک ایک پاکیزہ طاقتور روح اس کے سامنے آدھمکی اور پھر دیکھتے ھی دیکھتے عامل کا عمل الٹ ھو کر عامل کو موت سے ھمکنار کردیا۔

حقیقت میں اور واقعی بیٹیاں والدین کے لئے دل کا سرور اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہیں

صبح کی روشن کرنیں ہر طرف اجالا پھیلا رہی تھیں۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ کی دلفریب آوازیں ہر گھر کے در و بام پر دستک دینے لگی تھیں۔ بیگم وجاہت جائے نماز پر بیٹھی اپنے رب سے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ یہ وقت ہی اتنا خوشگوار اور پرسکون ہوتا ہے کہ انسان ساری دنیا سے بے خبر ہو کر بس اپنے خالق و مالک کی ثنا بیان کرنے میں مگن ہو جاتا ہے۔ کائنات کے جلوے ہر طرف سے بیدار ہو کر اپنے پروردگار کی تسبیح بیان کرنے لگتے ہیں۔ بیگم وجاہت کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اپنے مالک سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہی تھیں۔ بیتے دنوں کی یادیں کسی فلم کی طرح ان کے دماغ کی اسکرین پر ابھرنے لگیں۔

”بیٹی...... پھر سے بیٹی...... پتہ نہیں قدرت کیوں ہمارے امتحان لے رہی ہے، ہمیں ہی بیٹیاں

کیوں......؟'' بیگم وجاہت بے زاری سے بولیں۔ ان کی پہلے بھی ایک بیٹی تھی اور اب وہ بیٹے کی بڑی خواہش مند تھیں لیکن دوسری مرتبہ بھی بیٹی کی پیدائش نے ان کا ضبط توڑ دیا...... نجانے کیوں ماں ہوتے ہوئے بھی انہوں نے اپنی دوسری بیٹی کو گود میں اٹھانا گوارا نہ کیا اور پاس کھڑی خادمہ سے بولیں۔

''شکورن۔ لے جاؤ اسے۔ اور کسی غریب کو دے دو...... مجھے نہیں چاہئے یہ بیٹی......!''

''لیکن بیگم صاحبہ......!'' کہا نا لے جاؤ...... تمہیں جو مناسب لگے کرو۔ مگر خدا کے لئے مجھ سے دور کرو اسے......'' نفرت سے اپنا منہ دوسری طرف موڑتے ہوئے بیگم وجاہت نے کہا۔ ''اور شکورن بچی کو اٹھا کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''اچھا امی میں چلتا ہوں...... کامران کی آواز نے بیگم وجاہت کو چونکنے پر مجبور کردیا۔ انہوں نے بیٹے کا ماتھا چوما اور ڈھیروں دعائیں دیتے ہوئے اسے رخصت کردیا۔

بیگم وجاہت کو اللہ نے 2 بیٹیاں اور 2 بیٹے دیئے تھے۔ انہیں شروع سے ہی بیٹیوں کے وجود سے نفرت تھی۔ وہ صرف بیٹوں کو چاہتی تھیں۔ ایک بڑی بیٹی جو پیدائشی معذور تھی اور چل پھر نہیں سکتی تھی اور دوسری وہ جس کو پیدائش پر ہی انہوں نے خود سے ہمیشہ کے لئے دور کردیا تھا۔ اور پھر کبھی اس کے بارے میں سوچا تک نہ تھا۔ اس کی ضرورت ہی انہیں پیش نہ آئی تھی کیونکہ اس کے بعد 2 بیٹوں کی پیدائش پر انہیں لگا جیسے وہ پہلی مرتبہ ماں بنی ہوں......

وقت کا پہیہ گھومتا رہا۔ وجاہت صاحب کا ایک حادثے میں انتقال ہوگیا اور بیگم وجاہت اپنے 3 بچوں کے ساتھ زندگی گزارنے لگیں۔ بڑی بیٹی شبانہ کا کمرہ گھر سے الگ تھلگ کرکے بنایا گیا تھا جس کو ایک خادمہ کے سپرد کردیا گیا تھا کیونکہ بیگم وجاہت تو جیسے شبانہ کی ماں ہی نہیں تھیں جو کبھی اسے دیکھتیں......

عمران اور کامران کی شادیاں بڑی دھوم دھام سے کردی گئیں اور عمران اپنی بیوی کو لے کر دوسرے شہر میں اپنی نوکری کی وجہ سے آباد ہوگیا جبکہ کامران اور اس کی بیوی وجاہت کے پاس ہی رہنے لگے۔

کامران کی بیوی کا نام سلمٰی تھا۔ شروع شروع میں تو سب کچھ ٹھیک رہا لیکن پھر سلمٰی کی اصلیت بیگم وجاہت پر کھلنا شروع ہوئی۔ وہ بیگم وجاہت کا وجود اس گھر میں برداشت نہیں کررہی تھی۔ ساس کو ایذا پہنچانے کا ایک موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ساس کا گلا دبادے...... بیگم وجاہت نے اس تمام صورت حال کا ذکر کامران سے کیا مگر کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

''بیٹا تب تک بیٹا رہتا ہے جب تک اس کی شادی نہ ہوجائے اور بیٹی قبر میں اترنے تک بیٹی ہی رہتی ہے!''

کامران کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ وہ سلمٰی کی محبت میں اتنا اندھا ہوچکا تھا کہ اسے اپنی ماں کی باتیں محض جھوٹ لگنے لگیں۔ اور اس نے زیادہ کان دھرنا چھوڑ دیا۔ دوسری طرف عمران، کامران سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ ''یار امی کی عمر اب بہت بڑھ گئی ہے اور اس عمر میں انسان ویسے بھی بچوں کی طرح ہوجاتا ہے زیادہ پرواہ مت کیا کرو تم ان کی باتوں کی......'' وہ اکثر بس یہی کہہ کر کامران کو سمجھا دیتا اور دوسری طرف سلمٰی کو اور زیادہ آزادی اور چھوٹ مل گئی تھی اور وہ بد سے بدتر ہوتی چلی گئی......

☆......☆......☆

ثمینہ...... کہاں مرگئی تو...... کھانا دے گی یا نہیں......؟'' رفیق نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''جج۔ جی۔ جی۔ و۔ وہ...... آج میں کھانا نہیں...... بنا سکی...... وہ طب۔ طبیعت۔ خراب تھی......'' ثمینہ نے ڈرتے ڈرتے بمشکل کہا۔ اس نے دوپٹے سے اپنا سر باندھ رکھا تھا اور اس کی سوجی ہوئی لال آنکھوں سے صاف نظر آرہا تھا کہ اس کی طبیعت سخت خراب تھی۔ ''کیا......؟ کھانا نہیں بنایا......؟ کیا موت پڑگئی تھی تجھے......؟'' رفیق نے اٹھتے ہوئے کہا اور اسے بالوں سے پکڑلیا وہ چیختی رہی۔ لیکن ہر روز کی طرح آج بھی رفیق نے اس

پر ذرا ترس نہ کھایا۔ وہ لاتوں اور گھونسوں سے اسے بے حال کر کے چیختا ہوا باہر نکل گیا۔ ”مر جا یہیں پر۔ جان چھوٹ جائے گی میری......“

وہ نشہ کرتا تھا۔ روزگار اس کا ایک معمولی سی ورکشاپ پر سائیکلیں ٹھیک کرنا تھا۔ ورکشاپ اس کے مالک کی تھی جو روز اس کی بری طرح سرزنش کرتا تھا۔ ورکشاپ سے وہ جو کچھ کماتا تھا وہ جوئے پر لٹا دیتا تھا۔

ثمینہ سے اس کی شادی کو ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ لیکن ثمینہ کے ہاں ابھی اولاد نہیں ہوئی تھی وہ اپنی ایک رشتے کی خالہ کے پاس پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی۔ اس کی ماں کون تھی...... کہاں تھی...... اس کے بارے میں خالہ نے نہ صرف یہی بتایا تھا کہ وہ بیچاری دکھوں کی ماری بہت مجبوری میں اسے خالہ کی گود میں ڈال گئی تھی۔ یہ جھوٹ خالہ نے صرف اس لئے بولا تھا کہ کہیں ثمینہ کو ”ماں“ کے وجود سے نفرت ہی نہ ہو جائے۔ بہرحال ثمینہ وہیں بڑی ہوتی گئی اور خالہ سے ’ماں‘ کی باتیں سن سن کر اس کے ذہن میں ’ماں‘ کا ایک بہت پیارا خاکہ بن گیا جس سے اسے ہمیشہ محبت، پیار اور شفقت کی خوشبو آتی تھی، وہ اپنے تصور میں اپنی ماں کو دیکھا کرتی تھی۔ وہ ماں جو جنت سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے، جس کی گود میں اسے اتنا سکون مل سکتا ہے کہ وہ خوشی خوشی موت کو بھی گلے لگا لے۔

ثمینہ جب کبھی بہت اداس ہوتی تھی تو اپنی ان دیکھی ماں کو تصور میں لا کر خود کو تسلی دیتی تھی کہ ایک نہ ایک دن وہ بھی اپنی ماں کو دیکھے گی اسے بھی ماں کا پیار ملے گا...... اور وہ خوش ہو جاتی تھی۔ پھر اس کی شادی رفیق سے ہو گئی اور وہ بیاہ کر رفیق کے گھر چلی آئی لیکن رفیق جیسے خودسر اور جاہل انسان نے اسے چین کا ایک سانس بھی نہ لینے دیا اور اس پر مظالم کی انتہا کر دی۔ اس کی شادی کے دوسرے ہی مہینے اس کی خالہ چل بسی اور اب وہ رفیق کے ظلم و ستم سہنے کے لئے بالکل تنہا رہ گئی تھی وہ کسی سے اپنے دل کا دکھ نہیں بانٹ سکتی تھی۔ ہاں مگر ایک ہی جگہ اسے سکون ملتا تھا۔ جب وہ جائے نماز پر رو

روکر اپنی ماں کو یاد کرتی تھی، اسے لگتا تھا کہ جیسے حقیقت میں اس کی ماں نے آکر اسے گلے سے لگالیا ہو۔ وہ انتہائی پرسکون ہوجاتی اور اکثر جائے نماز پر ہی روتے روتے اس کی آنکھیں بند ہوجاتی تھیں اور وہ نیند کی آغوش میں چلی جاتی تھی......

☆......☆......☆

''اٹھو بڑی بی، آج کھانا نہیں پکانا کیا......؟''

سلمٰی نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ اور بیگم وجاہت نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''ہا، ہاں، و......وہ میں بس آنے ہی والی تھی......!''

''اچھا بس۔ اب روز کی طرح اپنی صفائیاں دینا مت شروع کردینا۔ جلدی سے کھانا بناؤ، اور ہاں صحن میں بہت گند ہورہا ہے۔ وہ بھی صاف کردینا، کامران کے آنے سے پہلے، سمجھ آگئی میری بات......'' سلمٰی نے حکم سناتے ہوئے کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس نے گھر کی تمام خادماؤں کو نکال دیا تھا وہ گھر کا سارا کام بوڑھی ساس سے ہی کروانا چاہتی تھی۔ بیگم وجاہت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ نہ وہ انکار کرسکتی تھیں نہ ہی شکایت...... انتہائی بےبس ہوگئی تھیں وہ......

ہائے اس درد میں جائیں تو کہاں جائیں ہم
جی تو کرتا ہے کہ اب جاں سے گزر جائیں ہم
اپنے حالات کا شکوہ بھی کریں تو کس سے؟
اب تو سوچا ہے کہ راہوں میں بکھر جائیں ہم ......

اپنی آنکھیں صاف کرتی ہوئی وہ گھر کے کام میں مصروف ہوگئیں۔

☆......☆......☆

رفیق 3 دن کے لئے شہر گیا تھا۔ اور ثمینہ نے ذرا سکھ کا سانس لیا تھا۔ لیکن وہ بہت بیمار تھی۔ اس کی تیمارداری کرنے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ اسے سخت بخار تھا۔ اور اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اٹھ کر باہر جاتی اور اپنے لئے دوا خرید سکتی...... بےبس ولاچار۔ ثمینہ انتہائی مایوسی و بےبسی کے عالم میں بستر پر پڑی تھی۔ آج اسے پھر سے اپنی ان دیکھی ماں کی ہستی کی یاد آرہی تھی۔ وہ تصور میں خود کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کررہی تھی۔ اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی ماں کو دیکھنے کے لئے بہت بےچین ہورہی تھی...... ''اے اللہ میری ماں سے ملادے مجھے...... میں انہیں دیکھے بغیر مرنا نہیں چاہتی......'' اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ لیکن اس خالی گھر میں ثمینہ کی آواز سننے والا، اس کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہیں تھا۔

''ماں...... آپ کہاں ہیں...... اے اللہ میری ماں کو کسی مشکل میں مت ڈالنا...... مم...... مجھے میری ماں سے مل...... ملادے......'' ثمینہ نے آخری ہچکی لی اور ساکت ہوگئی......

لیکن یہ کیا...... تھوڑی دیر پہلے جس درد کی شدت اور جسم کی تھکاوٹ اس پر حاوی تھی اب اس کے برعکس وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا اور توانا محسوس کررہی تھی...... وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اسے حیرت کا جھٹکا لگا کیونکہ اس کا جسم اس کے سامنے بےسدھ و حرکت بستر پر دراز تھا...... تو...... پھر وہ...... اس نے اپنے جسم کو چھونا چاہا لیکن اس کا ہاتھ آرپار ہوگیا......

ثمینہ اپنے جسم کے پاس ہی بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بہت دل گداز اور دردناک منظر تھا جہاں مرنے والے کے پاس سوائے اس کی اپنی روح کے رونے والا بھی کوئی نہیں تھا......

''بیٹی......'' ایک باوقار سی آواز نے ثمینہ کو اپنی طرف متوجہ کردیا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر بزرگ تھے۔ سفید لمبی داڑھی اور ہاتھ میں تسبیح تھامے وہ چہرے پر ایک خوب صورت مسکراہٹ لئے پیار اور شفقت سے ثمینہ کو دیکھ رہے تھے۔

''بیٹا قدرت کے ہر راز میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ تم اب زندہ لوگوں میں سے نہیں ہو۔ تم پر دنیا میں جو کچھ بیتی وہ سب تو مجھے معلوم نہیں ہاں مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ رب ذوالجلال تم پر بہت مہربان ہے۔ اس نے تم پر خاص عنایت کرکے تمہاری روح کو کچھ مہلت دے دی ہے تاکہ تمہاری ایک آرزوئے ناتمام

اب اس دنیا میں ہی پوری ہوجائے۔ اور تم اپنی ماں کو دیکھ سکو......!" بابا کی بات پر ثمینہ کی آنکھوں میں خوشی کی چمک آ گئی اور وہ خوشی سے نہال ہونے لگی۔ "لیکن اتنا یاد رکھنا بیٹا...... اس مہلت کے دوران تم کسی کو ناحق ایذا نہیں پہنچاؤ گی......"

"مم...... میں وعدہ کرتی ہوں بابا...... میں ایسا کچھ نہیں کرونگی جس سے مخلوق خدا کو پریشانی ہو، لیکن میں اپنی ماں کے پاس کیسے جاؤں گی......؟ میں نے تو انہیں دیکھا تک نہیں ہے۔" ثمینہ نے پریشانی سے کہا۔

"یہ سب میں تمہیں بتاتا ہوں، اپنی آنکھیں بند کرو......" اور ثمینہ نے آنکھیں بند کرلیں۔

☆......☆......☆

آج سلمٰی نے ایک بہت گھناؤنا منصوبہ بنایا تھا۔ وہ اپنی ساس سے انتہائی بیزار تھی اور مزید اسے گھر میں برداشت نہیں کرسکتی تھی اس لئے آج اس نے بیگم وجاہت کو راستے سے ہٹانے کا ارادہ کرلیا۔ کامران کے آفس جانے کے بعد وہ سیدھی کچن میں گئی اور تمام کھڑکیاں اور روشن دان بند کرکے گیس کے چولہے آن کردیئے، اور دروازہ بند کرکے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ بہت مطمئن اور پرسکون تھی کیونکہ اس طرح کی موت وہ آسانی سے کسی حادثے کا رنگ دے سکتی تھی اور اس طرح اس کا نام بھی نہ آتا......" لیکن مارنے والے سے بچانے والا بہت بڑا ہے......

وہ اگر ایک بار بھی پلٹ کر کچن کی طرف دیکھ لیتی تو اس کے ہوش اڑ جاتے کیونکہ کچن کے دروازے، کھڑکیاں دھیرے دھیرے خود بخود کھلتے چلے جارہے تھے۔

"اماں، او اماں کہاں ہو تم......" بیڈ پر بیٹھی وہ چلا چلا کر ساس کو بلانے لگی۔

"ہاں بیٹا بولو...... میں پودوں کو پانی دے رہی تھی......!" بیگم وجاہت دوڑتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ "میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ ذرا ایک کپ چائے بنادو۔ سر میں بہت درد ہے۔" سلمٰی نے اداکاری کی۔

"اوہ...... میں سردبادوں بیٹا......" بیگم وجاہت نے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ "نہیں نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اماں مجھے بس ایک کپ چائے لادو، جاؤ......" سلمٰی انہیں جلد از جلد کچن بھیجنا چاہتی تھی۔ بیگم وجاہت اٹھیں اور جلدی سے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ جبکہ دوسری طرف سلمٰی کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

ساس کے جانے کے فوراً بعد ہی وہ اٹھی اور ان کے پیچھے چل پڑی کیونکہ وہ اپنی آنکھوں سے انہیں جلتا دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ کیا......

کچن پر نظر پڑتے ہی سلمٰی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ تمام کھڑکیاں دروازے حسب معمول چوپٹ کھلے تھے۔

سلمٰی عجیب شش و پنج کے عالم میں دل مسوس کر رہ گئی لیکن آخر یہ کیسے ممکن تھا وہ تو اچھی طرح دروازے کھڑکیاں بند کرکے آئی تھی۔ اور گھر میں اور کوئی تھا بھی نہیں۔ تو یہ سب......

سلمٰی ہر بار اپنا وار خالی جانے پر انتہائی پریشان تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر وہ کس طرح راستے کا کانٹا نکالے...... وہ ہر صورت میں اپنی ساس کو راستے سے ہٹانا چاہ رہی تھی۔ لیکن ہر مرتبہ اس کا وار کوئی ان دیکھی قوت ناکام بنادیتی۔ انہی سوچوں کے تانے بانے میں سلمٰی کو "سمیع الرحمان" کا خیال آیا جو اس کے پڑوس میں رہتے تھے اور لوگوں کے مسائل اللہ کے حکم سے حل کرتے تھے۔ سلمٰی کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور دوسرے دن وہ سمیع الرحمان کے آستانے پر موجود تھی۔

"کہو بیٹی کیسے آنا ہوا...... کیا پریشان ہے تمہیں......؟" سمیع الرحمان نے سلمٰی سے اس کے آنے کا مدعا پوچھا۔

"کیا بتاؤں بابا...... میری زندگی میری ساس نے اجیرن کررکھی ہے۔ ایک سانس لینا بھی مشکل ہے میرے لئے......" سلمٰی نے چہرے پر بناوٹی دکھ سجاتے ہوئے بولنا شروع کیا لیکن درمیان میں ہی بابا نے اسے روک دیا۔

''بس......! پہلے مجھے خود معلوم کرنے دو......''
اور انہوں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ لمحہ کے لئے خاموشی رہی اور پھر سمیع الرحمان کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ اور انہوں نے جھٹ سے آنکھیں کھول کر ناگواری سے سلمٰی کی طرف دیکھا۔

''زندگی تمہاری اجیرن ہوچکی ہے یا کسی اور کی......؟'' سلمٰی کے چہرے پر سوالیہ نظر ڈالتے ہوئے بابا نے پوچھا۔ اور جواباً سلمٰی نے اپنے آنے کا اصل مقصد کہہ سنایا۔

''بس بابا اب میری جان چھڑادو اس عورت سے......اب ویسے بھی دنیا میں اس کا کیا کام......''

''دنیا میں ہر بندہ اپنے مقررہ وقت پر آتا اور جاتا ہے۔ ہم بھلا کون ہوتے ہیں کسی سے اس کی زندگی چھیننے والے...... میرا تمہیں مشورہ ہے کہ ذہن سے اس شیطانی سوچ کو نکال دو۔ اپنی ساس کو ماں سمجھ کر اس کی خدمت کرو۔ میں یہاں مخلوق خدا کی خدمت کو بیٹھا ہوں نہ کہ کسی بے گناہ کو ناحق ایذا پہنچانے...... یہ تعویذ لو اور اپنے تکیے کے نیچے رکھ دینا۔ انشاء اللہ تمہارے دل سے یہ شیطانی سوچیں خود بخود ختم ہوجائیں گی......'' بابا نے کہا اور ایک تعویذ سلمٰی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

☆......☆......☆

سلمٰی کا مسئلہ جوں کا توں برقرار تھا۔ وہ تعویذ اس نے کاٹ کر پہلے ہی ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا تھا۔ اور اب بیگم وجاہت کے وجود کو مٹانا اس کی ضد بن چکا تھا۔ اور اپنی اس ضد کو پورا کرنے کے لئے وہ اب ایک بہت گھناؤنا منصوبہ بنا چکی تھی۔ اس نے ساس پر کالا جادو کرانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک ہندو سادھو سے رابطہ کیا اور اگلے ہی دن وہ اس سادھو کی جھونپڑی میں موجود تھی۔

''ہوں...... تیرا کام ہوجائے گا۔ مجھے ایک خاص عمل کرنا پڑے گا اس کے بعد تیری ساس کا کام تمام۔'' کالی داس کے چہرے پر بھیانک ہنسی آ گئی۔

''ہم تو یہاں بیٹھے ہی تم جیسوں کی سیوا کے لئے ہیں۔ تم چنتا نہ کرو۔ پرنتو ہماری رقم......!''

''رقم کی آپ پرواہ مت کریں اس کام کا آپ کو منہ مانگا معاوضہ دوں گی میں...... مگر اس بڑھیا کو ٹھکانے لگا دو بس......!''

اور کالی داس خوش ہوگیا۔ اس نے بیگم وجاہت کو ختم کرنے کے لئے ایک خطرناک عمل شروع کردیا۔ 21 دن اس شیطانی عمل کے اختتام پر بیگم وجاہت کی موت واقع ہونا تھی۔ جبکہ دوسری طرف عمل ادھورا چھوڑنے پر کالی داس اور سلمٰی کی جان کو خطرہ تھا۔ کالی داس نے اپنے باقی تمام معاملات پس پشت ڈال کر پیسوں کی لالچ میں اس مکروہ عمل کو اسی رات سے شروع کردیا......

☆......☆......☆

آج بیگم وجاہت کی طبیعت بہت عجیب سی ہورہی تھی۔ ان کے دل کی دھڑکن بار بار تیز ہوجاتی۔ اور وہ اپنی اکھڑتی سانسوں کو ترتیب دینے کے لئے ایک گھونٹ پانی وقفے وقفے سے پی لیتیں۔ رات 12 بجنے والے تھے۔ کامران اور سلمٰی سوچکے تھے۔ باہر ہلکی بوندا باندی جاری تھی۔ ایسے میں کوئی ان کا ہمدرد نہ تھا جو انہیں ایک کپ چائے بنا کردیتا۔ جس کی اس سردی میں انہیں انتہائی طلب ہورہی تھی۔

معاً دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور انہیں لگا جیسے صحن میں سے کوئی گزرا ہے اپنے وجود کو سمیٹتے ہوئے وہ بمشکل اٹھیں اور صحن میں آگئیں لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ ہوا کا ایک سرد جھونکا انتہائی قریب سے گزرا اور خوف سے ان کے پورے جسم پر جھرجھری ہوئی۔ اچانک کچن کی طرف سے ایک انتہائی بھیانک چیخ سنائی دی اور ساتھ ہی کچن کی لائٹ خود بخود آن ہوگئی۔ ان کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی کو بہت اذیت سے مارا گیا ہو۔ چونکہ کامران اور سلمٰی کا کمرہ ذرا فاصلے پر تھا اور وہ گہری نیند میں تھے اس لئے انہیں آواز نہیں سنائی دی۔ ڈرتے ڈرتے بیگم وجاہت ہمت کرکے کچن کی طرف بڑھنے لگیں۔ وہاں اس وقت کون ہوسکتا ہے؟

بہرحال بیگم وجاہت کچن میں آ ہی گئیں لیکن

وہاں کوئی ہوتا تو نظر آتا ناں...... بیگم وجاہت نے لائٹ آف کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن چولہے کے سائیڈ پر گرما گرم چائے کا بڑا کپ دیکھ کر چونک گئیں...... ''یہ ...... یہ چائے کس نے بنائی......؟'' حیرت سے ان کے ذہن میں سوالات ابھرنے لگے۔

وہ دھیرے دھیرے چائے کی طرف بڑھیں...... اتنی سردی میں رات کے اس وقت کچن میں کون آ کر چائے بنا گیا......؟

بہرحال مزید کچھ سوچے سمجھے بغیر انہوں نے جلدی سے چائے کا کپ اٹھایا۔ لائٹ آف کی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

چائے پی کر جیسے ان کی روح بھی تر وتازہ ہوگئی۔ انہیں انتہائی سکون مل رہا تھا۔ انہیں اپنی پڑوسن نجمہ کی بات یاد آ گئی۔ ''بھئی سردی میں جب طبیعت خراب ہونے لگتی ہے تو میری بیٹی کے ہاتھ کی ایک کپ چائے پی کر میں تو جیسے بالکل توانا ہو جاتی ہوں......!''

اور پھر سوچوں کا سمندر اس دن کے گرد چکر لگانے لگا۔ جب انہوں نے اپنی ننھی بیٹی کو کسی اور کے سپرد کر دیا تھا۔ اور پھر کبھی اس کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔ آج ان کے دو دو بیٹے تھے لیکن ان دونوں کو ماں کی تکلیف، پریشانی یا کسی چیز کا خیال نہیں تھا۔ بس فکر تھی تو اپنی بیویوں کی...... اپنے پیسے کی...... نجانے وہ معصوم جسے پیدا ہوتے ہی کسی کے حوالے کر دیا گیا تھا وہ کہاں تھی کس حال میں تھی......؟

یہ خیالات سوچتے ہوئے نہ جانے کب ان کی بھیگی پلکیں بند ہوئیں اور وہ نیند کی وادی کی سیر کرنے لگیں جبکہ ثمینہ ان کے سامنے بیٹھی ان کے چہرے کو دیکھ دیکھ کر سکون پاتی رہی......!

☆......☆......☆

''مہاراج آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر لیکن یہ سب میرے بس میں نہیں ہے۔ چمپا نے بے بسی سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''آخر کیوں......؟ ایسا کیا مسئلہ ہے تمہیں......؟''

کالی داس نے قہر برساتی نظروں سے چمپا سے پوچھا جو اس کی خاص داسی تھی اور اس کا ہر حکم بجا لاتی تھی۔

''مہاراج اس عورت کی رکھشا ایک آتما کر رہی ہے اور وہ بہت شکتی شالی ہے۔ رات کو اس نے شنکر کو بھی مار ڈالا ہے......''

''کیا......؟ آتما......؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو......؟ کیسی آتما......؟''

کالی داس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ وہ درمیان میں پھنس چکا تھا۔ عمل ادھورا چھوڑنے پر اسے اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی اور آتما کے بارے میں وہ بے خبر تھا۔ دوسرے دن ہی اس نے سلمٰی کو بلایا۔

''اے لڑکی۔ تو نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا کہ بڑھیا کے ساتھ کوئی آتما ہے......؟'' کالی داس نے غصے سے پوچھا۔

''کیا مطلب......؟ کیسی آتما......؟'' سلمٰی نے حیرانگی سے پوچھا۔ ''میرے بیروں کے ذریعے مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کی رکھشا ایک شکتی شالی آتما کر رہی ہے۔ اس نے رات ہمارے ایک بہت خاص بیر کو بھی مار ڈالا ہے۔ تو پہلے بتا دیتی تو ہم کوئی اپائے کر لیتے لیکن اب ہم اس عمل میں اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ واپس نہیں آ سکتے......''

''کیا مطلب......؟'' سلمٰی نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

''ہم دونوں کی جان کو خطرہ ہے۔ یہ کوئی عام جادو نہیں۔ کالا جادو ہے۔ اور اس کو ادھورا چھوڑنے والے سب لوگ جان سے جاتے ہیں۔'' کالی داس خود بھی انتہائی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

''اس آتما کے ہوتے ہوئے بڑھیا کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ اور بڑی بات تو یہ ہے کہ اس آتما کے ساتھ بڑھیا کا خونی سمبندھ ہے...... اور جو سمبندھ بھگوان نے خود جوڑا ہے اس میں بہت شکتی ہوتی ہے تو تو جان سے جائے گی ہی میں بھی تیری بے وقوفی کی وجہ سے...... تو جا یہاں سے...... جا چلی جا......'' کالی داس چیخنے لگا اور سلمٰی وہاں سے بھاگ کر گھر آ گئی۔ لیکن اس

کی جان بھی جیسے نکل گئی تھی۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ تھی۔
دوسرے دن کالی داس کی بھیانک موت کی خبر نے اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا کردیئے اور وہ بیگم وجاہت کے قدموں میں گر کر اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔
''معاف کردو اماں تمہیں خدا کا واسطہ مجھے معاف کردو......'' وہ گڑگڑا گڑگڑا کر معافی مانگ رہی تھی جبکہ بیگم وجاہت حیرت سے اسے دیکھ رہی تھیں کہ آخر یہ سب کیا ماجرا ہے اور سلمیٰ نے مختصر سا سارا واقعہ اپنے شیطانی منصوبوں کی تمام روداد ان کے گوش گزار کردی۔
''اٹھو بیٹا۔ میں تمہیں معاف کرتی ہوں......بس اللہ سے معافی مانگو...لیکن......'' بیگم وجاہت شش وپنج میں پڑ گئیں۔ اور کچھ لمحوں کے وقفے کے بعد بولیں۔
''لیکن وہ آتما والی بات کا کیا مطلب ہے؟ میرے ساتھ بھی کئی مرتبہ ایسے واقعات پیش آئے ہیں جو میں نے تم سب سے چھپائے ہیں......!''
''پتہ نہیں اماں لیکن کالی داس نے بتایا تھا کہ اس آتما کا آپ سے کوئی خونی رشتہ ہے......!'' سلمیٰ کی بات پر بیگم وجاہت چونک پڑیں۔
''خونی رشتہ......!'' ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھیں کہ ایک انجانی سی نسوانی آواز نے ان کی توجہ کا رخ موڑ دیا اور وہ آواز کی سمت دیکھنے لگیں۔
''اماں......!'' وہ ایک بہت پیاری نازک سی لڑکی تھی۔ جو سفید چمکتے لباس میں ملبوس، آنکھوں میں آنسو لئے بیگم وجاہت کی طرف دیکھ رہی تھی......
''میں آپ کو یاد ہوں اماں......؟'' لڑکی نے سوالیہ انداز میں بیگم وجاہت کو دیکھا اور پوچھا۔ اور بے اختیار بیگم وجاہت اپنا دل تھام کر رہ گئیں۔
''میری بچی......'' ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔
یہ وہی بچی تھی جسے بچپن میں ہی انہوں نے کسی کو سونپ دیا تھا۔
''ہاں اماں......میں آپ کی وہی بیٹی ہوں جسے آپ نے کسی کو دے دیا تھا۔ آپ کے وجود کو، آپ کے پیار کو ساری زندگی ترستی رہی میں......مرتے وقت بس ایک ہی خواہش تھی میری اللہ سے کہ میں اپنی ماں کو دیکھوں، آپ کو دیکھ کر مجھے بہت سکون ملا اماں......!''
''کیا......؟ تو اس دنیا میں نہیں رہی......؟''
میں تیری مجرم ہوں بیٹا......!'' میں نے بھیک میں بھی تجھے پیار نہیں دیا اور تو مر کر بھی......'' ندامت اور مایوسی سے بیگم وجاہت کھڑی نہ رہ سکیں اور دوزانو بیٹھ گئیں۔ زبان بند ہوگئی تھی ان کی۔ کہتیں بھی تو کیا کہتیں۔ کچھ بچا ہی نہیں تھا کہنے کو۔
''نہیں اماں آپ ایسا مت کہیں۔ میری زبان تو بس ماں کہنے کے لئے ترستی رہی۔ آپ کو دیکھ لیا بس مجھے اتنا سکون مل گیا جو زندہ رہ کر بھی کبھی حاصل نہ کرپائی۔ مگر آپ کی جان بچانے کے لئے مجھے دی گئی مہلت میں توسیع کردی گئی۔ بھابھی نے واقعی بہت برا کیا۔ لیکن وہ اپنی غلطی پر شرمندہ ہیں میں ان کو معاف کرتی ہوں۔ آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے بھابھی مگر مجھ سے وعدہ کرو......میری ماں کا خیال رکھو گی......''
''میں وعدہ کرتی ہوں تم سے......!'' ندامت بھرے لہجے میں سلمیٰ نے جواب دیا۔
''ایک وہ وقت تھا جب میں تجھے سینے سے لگانا نہیں چاہتی تھی اور آج تجھے سینے سے لگانا چاہتی ہوں بھی تو......''
''ماں شاید اسی میں اللہ کی رضا ہو......اب میں چلتی ہوں۔ آج تمہاری بیٹی بہت سکون سے جاکر اپنے خالق حقیقی سے ملے گی......'' بیگم وجاہت اور سلمیٰ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

عزم و ہمت کی محبت کی صدا ہے بیٹی
ہر زمانے میں شجاعت کی ندا ہے بیٹی
یہ جہاں بارہا جھٹلائے تیری عظمت کو
تو ہی ہر گھر میں اجالے کی ردا ہے بیٹی

خونی انتقام

محمد خالد شاہان۔ صادق آباد

ٹنڈ منڈ درخت پر بیٹھے خونی جانور جیسے ہی کسی جانور کو سامنے دیکھتے تو اس پر ٹوٹ پڑتے اور اپنے خونی پنجے اور خونی چونچ سے اسے ادھیڑ کر رکھ دیتے اور پھر وہ ہوگیا جو کہ تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

حقیقی خواہشات کا پروردہ شخص جب اس کی خواہش کی تکمیل نہ ہوئی تو اپنا ہوش کھو بیٹھا

دلدل کے شمال میں گھنی جھاڑیوں سے گھرا ہوا وہ پرانی طرز کا مکان تھا جس کی دیواروں سے سفیدی جھڑ چکی تھی۔ سورج کی کرنیں بھول کر بھی ادھر کا رخ نہیں کرتی تھیں۔ اس لئے سارا دن کمروں میں اندھیرا رہتا۔ باہر احاطے میں بھی سبزے کا نام ونشان نہ تھا۔ اگلے وقتوں کے چند ٹنڈ منڈ درخت تھے جن کی ننگی شاخوں پر مردار خور پرندے دلدل میں پھنس کر مرنے والے جانوروں کا انتظار کرتے رہتے تاکہ ان کے جسم سے گوشت کی ایک آدھ بوٹی اڑا لائیں۔ جونہی وہ کسی جانور کو دلدل میں دھنستے ہوئے دیکھتے تو اپنی منحوس آواز میں چلاتے ہوئے اس سمت میں اڑ جاتے۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آتے تو ان کے پنجوں میں تازہ گوشت کا ایک آدھ ٹکڑا ہوتا۔ ٹنڈ منڈ درختوں پر بیٹھ کر وہ دعوت اڑاتے اور پھر اپنے لمبے گندے پروں میں

سر چھپا کر او نگھنے لگتے ان درختوں پر ان کے خون آلود پنجوں کے نشانات صاف دکھائی دیتے تھے۔ یہاں چاروں طرف مردہ گوشت کی بدبو پھیلی رہتی۔ رہی سہی کسر دلدل سے اٹھتی ہوئی بدبودار ہوا پوری کر دیتی۔

اس لئے شہر کا کوئی شریف آدمی ادھر کا رخ نہیں کرتا تھا۔

لوگ دور سے اس پرانے مکان کو دیکھتے اور زیر لب بڑبڑاتے ہوئے دوسری طرف منہ پھیر لیتے۔ مکان کا بیرونی پھاٹک کب سے ٹوٹ چکا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی مردار خور پرندوں کی مکروہ آوازیں سنائی دیتیں۔ طویل برآمدے کے دونوں طرف چھوٹے بڑے کمرے تھے جن کے دروازوں پر زنگ آلود تالے پڑے رہتے، آخری حصے میں لکڑی کی گول گھومتی ہوئی سیڑھیاں تھیں جن سے گزر کر دوسری منزل تک پہنچا جا سکتا تھا، ان کی لکڑی اس قدر بوسیدہ تھی کہ پاؤں رکھتے ہی چر چرانے لگتی۔ نیم تاریک سیڑھیوں کو عبور کرتے ہی وہاں کمرہ آتا ، جو پرانے کپڑوں، قدیم طرز کے فرنیچر اور لکڑی کے بڑے بڑے صندوقوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی دیواروں پر شیر چیتے اور دوسرے جنگلی جانوروں کے سر آرائش کے طور پر لگائے گئے تھے۔

کمرے کے عین درمیان میں چھت سے ایک بلوری فانوس لٹک رہا تھا جس کے رنگ گردش زمانہ کے ہاتھوں معدوم ہو چکے تھے۔ اس ہال کا دوسرا دروازہ ایک ایسے برآمدے میں کھلتا تھا جس میں ہر وقت مکمل تاریکی رہتی تھی، یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بجلی کے قمقمے لگے ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک استعمال کے قابل تھا اور دھند میں لپٹی ہوئی صبح کی سورج کی طرح ماحول کو روشن کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ نچلی منزل کی طرح اس برآمدے کے دونوں طرف بھی بہت سے کمرے تھے لیکن وہ سب کے سب مقفل رہتے فرش دکھائی دیتا تھا جس پر بھوکی چھپکلیاں منہ کھولے خوراک کی تلاش میں ماری ماری پھرا کرتیں۔ یہاں پہنچ کر برآمدہ ختم ہو جاتا تھا آگے مکان کا وہی حصہ دکھائی دیتا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یہاں سے درختوں کی ٹہنیاں اس قدر قریب تھیں کہ پرندوں کو ہاتھ بڑھا کر پکڑا جا سکتا تھا۔ تاہم ان کی گول سرخ آنکھوں اور خون میں سنے ہوئے غلیظ جسموں کو دیکھ کر کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

لکڑی کے پل سے گزر کر اس عمارت کے واحد آباد کمرے تک پہنچا جا سکتا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر بھانت بھانت کی بے شمار تلواریں، خنجر نیزے اور ڈھالیں آویزاں تھیں انہیں دیکھ کر بخوبی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس جگہ رہنے والے شخص کا مشغلہ قدیم اسلحہ جمع کرنا ہے، جنوب کی سمت ایک کھڑکی کھلتی تھی۔ جس میں سے دلدل کی جھاڑیاں نظر آتی تھیں۔

ماضی میں انجان مسافر جھاڑیوں کو دیکھ کر یہ سمجھتے کہ ابھی دلدل شروع نہیں ہوئی۔ اور مزے مزے گھاس پر چلتے ہوئے اس جگہ آ پہنچتے تھے جہاں سے واپس جانا ناممکن تھا۔ پلک جھپکنے میں ان کی چیخیں اور گرد و نواح کے مردار خور پرندوں کا شور سنائی دیتا، تھوڑی دیر کے لئے جس جگہ وہ غرق ہوتا وہاں بڑے بڑے بلبلے دکھائی دیتے اور پھر غائب ہو جاتا۔

چیختے چلاتے پرندے غرق ہوتے ہوئے جسم سے گوشت نوچ کر اپنی اپنی راہ لیتے اور جلد ہی فضا میں بھیانک خاموشی چھا جاتی، اس خطرے کے پیش نظر گزشتہ سال لوہے کا ایک جنگلہ لگا دیا گیا تھا تاکہ اجنبی لوگوں کو دلدل کا پتہ لگ سکے۔

اس روز آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے، رات بھر زور کی بارش ہوئی تھی اس لئے چاروں طرف جل تھل ہو رہا تھا اور دلدل سے مینڈکوں کی آوازیں آ رہی تھی۔

مکان میں اداسی چھائی ہوئی تھی ۔ مردار خور پرندے بارش میں بھیگنے کی وجہ سے چپ چاپ شاخوں پر بیٹھے تھے۔ رات کے وقت برآمدے میں دو تین آوارہ کتوں نے ڈیرہ جما لیا تھا۔

صبح کے دس بجے ہوں گے جب رجنی مکان میں داخل ہوئی وہ تیکھے نقوش اور چھریرا بدن کی ایک خوبصورت عورت تھی۔ اس کی عمر چھبیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس

کے مرجھائے ہوئے چہرے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ پچھلے کئی ماہ سے سخت اذیت میں مبتلا ہے۔ ہاتھ میں سبزی کی ٹوکری اٹھائے وہ بڑی بے پروائی سے چل رہی تھی۔ اس کے کانوں میں ابھی تک بوڑھے میجر کے الفاظ گونج رہے تھے جو اس نے تھوڑی دیر قبل کہے تھے۔ "مادام آپ جس تن دہی اور جانفشانی سے اپنے پتی کی خدمت کرتی رہی ہیں اس کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتی تو کب کا پاگل ہوجاتی۔ اتنی چھوٹی عمر میں آپ باآسانی دوسری شادی کرسکتی تھیں مگر واہ جی آپ نے تو کمال ہی کردیا بھئی بیوی ہو تو ایسی ہو۔"

ٹوکری زمین پر رکھتے ہی رجنی کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی آنکھیں ایک وحشیانہ جذبے سے چمک اٹھیں۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا ان میں تناؤ پیدا ہو رہا تھا آہستہ آہستہ اس کے دونوں ہاتھ اپنی گردن کی طرف اٹھ گئے۔ یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی بدروح اس کے ہاتھوں میں داخل ہوکر انہیں اس قاتلانہ حرکت پر مجبور کررہی ہے۔ اگلے ہی لمحے وہ خود اپنا گلا گھونٹ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اس کا جسم کوشش کے باوجود انہیں روکنے سے قاصر تھا۔ وہ متضاد طاقتیں اس کے جسم میں ایک دوسرے سے برسرپیکار تھیں۔ ہاتھ پوری قوت سے گلا دبا رہے تھے اور باقی جسم گلا چھڑانے کی ناکام کوشش کررہا تھا، اس کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔ منہ سے خون بہنے لگا۔

اچانک اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور دونوں ہاتھ گلے سے ہٹ گئے۔ اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا وہ خشک اور بے جان تھے۔ خون کی پتلی سی لکیر اس کی تھوڑی تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے انگلی پر ذرا سا خون لگایا اور اسے چاٹنے لگی پھر بلند آوازیں قہقہے لگاتے ہوئے وہ دیوانہ وار گھومنے لگی۔ اچانک اس کا سر برآمدے کی دیوار سے ٹکرا گیا اور وہ بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑی۔

جب اس کی آنکھیں کھلی تو وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر پڑی تھی۔ دھوپ کی شدت سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ اسے یہاں پڑے ہوئے کافی وقت گزر چکا ہے وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ سبزی کی ٹوکری اٹھاتے وقت وہ سنجیدگی سے سوچنے لگی کہ ڈاکٹر کے بیان کے مطابق کہیں واقعی اس کا دماغ تو نہیں چل گیا۔ لکڑی کے پل پر پہنچ کر اس نے کمرے کی طرف دیکھا اسے یہاں سے گئے تین دن گزر چکے تھے۔

اصل میں پرسوں جب وہ بازار کے لئے گھر سے نکلی تو اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ راستے میں اچانک بے ہوش ہوکر گر پڑی چند راہ گیروں نے اسے اٹھا کر اسپتال پہنچادیا۔ آج صبح اسے وہاں سے چھٹی ملی لیکن اس کا پتی تو ان باتوں سے بے خبر تھا۔ وہ یقیناً اسے قصوروار سمجھے گا یہ سوچ کر وہ ملول ہوگئی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی یہاں فرنیچر بہت کم تھا صرف ایک میز تھی جس پر لکڑی کا ایک پرانا سا لیمپ رکھا تھا۔ کمرے پر پرانی لکڑی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی ایک کونے میں کھردری چٹائی پر بستر بچھا ہوا تھا جس کی چادر پر جابجا بڑے بڑے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔

کھانے اور خون کے ملے جلے دھبے اس بستر پر اس کا پتی پڑا تھا۔ دور سے دیکھنے پر وہ کپڑے کا ایک تھیلا معلوم ہوتا تھا جس میں کسی جانور کا ذبح کیا ہوا گوشت بھر دیا گیا ہو۔ اس جیتے جاگتے لوتھڑے کے دونوں بازو اور ٹانگیں غائب تھیں۔ اس کا چہرہ جگہ جگہ سے نچا ہوا تھا وہ ایک میلی چادر میں لپٹا ہوا تھا جو غلاظت سے بھر چکی تھی اور بری طرح بدبو چھوڑ رہی تھی بازو اور ٹانگوں کے بغیر گوشت پوست کے اس ڈھیر کا نام شامو تھا۔

کبھی وہ بھی تندرست وتوانا نوجوان تھا جنگ کے دور میں بم کے ایک حادثے نے اس کی بولنے اور سننے کی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ بازو اور ٹانگیں بھی چھین لی تھیں، صرف دو آنکھیں باقی تھیں جن کے دم سے اس کا تعلق اس جیتی جاگتی دنیا سے قائم تھا۔

رجنی اس پر جھک گئی اس کی آنکھیں شدید غصے سے سرخ ہو رہی تھیں اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ رجنی کا گلا گھونٹ دیتا۔ وہ خوف زدہ ہوکر پیچھے ہٹی اور یہ جانتے

ہوئے بھی کہ وہ ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا۔ عاجزانہ لہجے میں بولی۔ ”مجھے معاف کردو میں بیمار ہوگئی تھی۔“

لوتھڑے میں حرکت پیدا ہوئی شامو نے سر ذرا اوپر اٹھایا اور دیوار سے دے مارا وہ فوراً اس کا مطلب سمجھ گئی جب کبھی وہ کچھ کہنا چاہتا تو اسی طرح دیوار سے سر ٹکرایا کرتا تھا۔ اس نے میز پر سے پینسل اٹھائی اور اس کے دانتوں میں دے دی اور کاپی کھول کر اس کے چہرے کے قریب لے گئی۔ پینسل آہستہ آہستہ کاغذ پر پھرنے لگی ۔تھوڑی دیر بعد شامو کا سر تھک کر نیچے ڈھلک گیا اور پینسل اس کے منہ سے نکل کر فرش پر گر پڑی۔

رجنی نے کاپی اٹھائی ٹیڑھے میڑھے شکستہ حروف میں لکھا تھا۔ ”کہاں گئی تھی؟“

رجنی نے پینسل اٹھائی اور لکھا۔ ”میں بیمار تھی اس لئے اسپتال چلی گئی تھی آج صبح جونہی ہوش آیا اٹھ کر چلی آئی۔ تمہیں بہت تکلیف ہوئی ہوگی مجھے معاف کردو، لو اب تم کھانا کھالو۔“

شامو اسے پڑھ کر مطمئن نہیں ہوا کھانے کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ رجنی لقمے بنا کر اس کے منہ میں ڈالنے لگی۔ کھانے کے بعد اس نے شامو کے کپڑے اتار دیئے صاف کپڑے پہنانے سے پہلے اس نے ایک نظر اس کے مفلوج جسم پر ڈالی اس کی دونوں ٹانگیں جڑ سے کٹ چکی تھیں، زخم چونکہ بھر چکے تھے اس لئے دھڑ کا نچلا حصہ اب گول گیند کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اسے متلی سی ہونے لگی، قمیض پہناتے وقت اس نے بازوؤں کی طرف دیکھا ایک بازو کندھے سے ذرا نیچے تک موجود تھا۔ اس پر بوجھ ڈال کر شامو اپنا دھڑ ذرا سا اوپر اٹھا لیا کرتا تھا، دوسرا بازو سرے سے غائب تھا، کھانے کے بعد شامو کی آنکھیں دوبارہ غضب آلود ہوگئی تھیں۔

رجنی نے اسے خوش کرنے کے لئے آخری حربہ آزماتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں اور جی کڑا کرکے اس کی پیشانی چوم لی۔ گرم گرم گوشت کو محسوس کرتے ہوئے اسے بچارگی پر رونا آگیا اور سسکیاں لیتی ہوئی باہر نکل گئی۔

لکڑی کے پل پر کھڑے ہوکر اس نے چاروں طرف دیکھا اسے بے اختیار وہ دن یاد آگئے جب اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس وقت شامو پچیس سال کا ایک صحت مند نوجوان تھا وہ فوج میں ایک معمولی سپاہی تھا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا وہ دونوں ایک دوسرے سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ دن بھر وہ اسی پل پر کھڑا ہوکر اس کا انتظار کرتی اس کا چہرہ سرخ ہوجاتا اور وہ ایک ہی سانس میں سیڑھیاں اترتی ہوئی پھاٹک تک پہنچ جاتی، اس وقت یہ گھر ایسا ویرانہ تھا اس کے باغ میں پھول کھلا کرتے تھے جن پر بے شمار تتلیاں منڈلاتی تھیں۔ سارا گھر شیشے کی طرح چمکتا تھا اس کے پتی کو بھی محاذ پر جانا پڑا۔ جنگ کے دوران میں وہ اسے ہر ہفتے خط لکھا کرتا اور ایک دن اس کی ساری خوشیاں اس سے چھن گئیں۔

دفتر جنگ سے اطلاع ملی تھی کہ اس کا پتی ایک بم پھٹنے سے زخمی ہوگیا ہے اور وہ اسپتال آکر اسے دیکھ سکتی ہے، وہ آنسو بہاتی اسپتال گئی، فوجی اسپتال میں ایک بڑے پلنگ پر اس کا پتی لیٹا تھا۔ اسے دیکھ کر خوف کے مارے اس کی چیخ نکل گئی۔ چھ فٹ لمبے صحت مند نوجوان کی جگہ بستر پر ایک مسخ شدہ صورت پڑی تھی جو پہلی نظر میں ذبح کیا ہوا جنگلی جانور معلوم ہوتی تھی۔

ڈاکٹر نے اسے سمجھایا لوگوں نے اسے تسلی رشتہ داروں نے صبر کی تلقین کی اور وہ سب کچھ چپ چاپ برداشت کرگئی۔ اس کی چیخ کے بعد کسی نے اس کے منہ سے شکایت کا ایک لفظ بھی نہیں سنا، وہ جنگ میں اس ٹوٹے ہوئے کھلونے کو سینے سے لگا کر گھر لے آئی۔

اخبارات نے کالم لکھے، عوام نے تعریفی خطوط بھیجے ایک مدت تک ان کا گھر ملاقاتیوں سے بھرا رہا۔ اخبارات کے رپورٹر، افسانہ نگار، قومی لیڈر، فوجی افسر، مرد، عورتیں بچے اور بوڑھے اس کھلونے کو دیکھنے کے لئے آتے رہے۔ اس ہنگامے سے وہ بہت خوش ہوئی، خطابات اور انعامی سرٹیفکیٹ دیکھ کر وہ پھولے نہ سماتی، کل تک وہ ملک کی ایک گمنام شخصیت تھی، لیکن آج ملک کے گوشے گوشے میں اس کا چرچہ تھا، اخبارات دھڑا دھڑ اس کی تصویریں

شائع کر رہے تھے۔ ایک ادیب نے تو سپاہی کی پتنی کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب بھی لکھ دی جس میں اس کے پتی سے اس کی وفاداری اور ہمت و استقلال کو افسانوی رنگ میں بیان کیا گیا تھا۔ چھ ماہ اسی ہنگامے میں گزر گئے۔

رجنی نے پتی کی خدمت میں دن رات ایک کر دیئے۔ آہستہ آہستہ ملاقاتیوں کی تعداد کم ہونے لگی۔ حتیٰ کہ سال کے آخر تک بالکل ختم ہوگئی۔ لوگ بہادر سپاہی اور اس کی وفادار پتنی کو بھول گئے۔ شامو کے رشتہ داروں نے بھی اسے فراموش کر دیا۔ خود لڑکی کے ماں باپ کبھی کے مر چکے تھے اب وہ تن تنہا سارا دن گوشت کے اس جاندار لوتھڑے کے پاس بیٹھی رہتی۔ اس کا تعلق بیرونی دنیا سے ختم ہوتا چلا گیا۔ دن میں صرف ایک مرتبہ وہ سودا سلف خریدنے بازار جاتی۔

شامو پہلے پہل تو اپنی حالت پر دل ہی دل میں کڑھتا، دانتوں میں پینسل دبا کر اس نے اپنی کڑھن کا اظہار ایک آدھ فقرے میں کیا بھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا احساس مرتا چلا گیا شروع شروع میں وہ ان اخبارات کو پڑھتا جن میں اس کے بہادرانہ کارنامے درج ہوتے تھے۔

حکومت کی طرف سے اسے ایک طلائی تمغہ دیا گیا تھا وہ اس کے سرہانے پڑا رہتا تھا، تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ گردن موڑ کر اس پر نظر ڈالتا اور دیر تک دیکھتا رہتا۔ اس نے فوجی اعزاز کو دیکھ کر اس کے مجروح ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلنے لگتی جو اس کے بدنما چہرے کو اور زیادہ خوف ناک بنا دیتی۔ تاہم آہستہ آہستہ اس کی دلچسپی ختم ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک ایک روز اس نے طلائی تمغہ دانتوں میں داب کر فرش پر دے مارا۔ اب اس کی دلچسپیوں کا واحد مرکز کھانا تھا اس کی بھوک روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ رجنی تنگ آگئی جب وہ اسے کھانا دینے سے انکار کرتی وہ زور زور سے اپنا سر دیوار سے مارنے لگتا۔

دن رات اٹھنے بیٹھنے سے معذور ایک گونگے بہرے انسان کے پاس بیٹھنا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن وہ ایک فرض شناس پتنی کی طرح سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ زندگی بڑی بھلی گزرتی رہی۔

دوسرے سال کے آغاز میں اسے محسوس ہوا کہ وہ غیر شعوری طور پر شامو سے بے نیاز ہوتی جا رہی ہے۔ بات یہاں تک محدود رہتی تو شاید وہ اتنی متفکر نہ ہوتی لیکن ایک روز اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ شامو کی بے بسی دیکھ کر اسے خوشی ہوتی ہے۔ اسے کھانے کے لئے منہ کھولتے دیکھ کر اس کی حیوانیت جاگ اٹھتی اور اس کے جی میں آتا کہ وہ کھانے کی بجائے کوئی اور چیز اس کے منہ میں ٹھونس دے، ایک بار تو اس نے چٹکی بھر مٹی اس کے منہ میں بھر دی۔ شامو کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ ڈر گئی لیکن فوراً سنبھل گئی بھلا یہ گوشت کا لوتھڑا اور اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے، اب اسے ایک مشغلہ مل گیا، وہ اس کے سامنے بیٹھ جاتی اور اسے دکھا دکھا کر کھانا کھاتی۔ بے چینی سے شامو کی پتلیاں ادھر ادھر حرکت کرتیں۔ زبان کی لپ لپ سن کر وہ دیوانہ وار قہقہے لگاتی اور خالی چمچ اس کے منہ میں ٹھونس دیتی۔ وہ کروٹ بدلنے کی کوش کرتا اور اسے روکنے کے لئے دائیں ہاتھ کا ذرا سا ٹنڈ اوپر اٹھاتا جو اس کے جسم کا واحد حرکت والا حصہ تھا۔ جب وہ کسی طرح باز نہ آتی تو شامو سختی سے اپنا منہ بند کر لیتا۔ اس کی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو گرتے جسے دیکھ کر وہ رک جاتی اور خالی نظروں سے اسے گھورنے لگتی۔

اچانک اسے اپنی بے ہودہ حرکت کا شدت سے احساس ہوتا اور وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگتی۔ ایسے میں دوبارہ اس کی پیشانی چوم کر اپنی غلطی کے لئے معافی مانگتی۔ لیکن محبت کا یہ جذبہ جلدی سرد پڑ جاتا اور وہ اسے تنگ کرنے کے لئے نئی نئی تجویز سوچنے لگتی۔

ایک روز تو اس کا پاگل پن انتہا کو پہنچ گیا۔ ہوا یوں کہ جہاں وہ رہتا تھا سیاہ دلدلی چیونٹیوں کی ایک قطار اکھڑے ہوئے پلاسٹر کے نشیب و فراز سے عبور کرتی ہوئی چھت کی طرف حرکت کر رہی تھیں۔ اچانک ایک چیونٹی راستہ بدل کر شامو کی گردن پر جا چڑھی اور کان کی لو سے گزرتے ہوئے ہوا رخسار تک آن پہنچی۔ دلدلی چیونٹی تھی جس کے جبڑے انتہائی تیز تھے رخسار کے گوشت کو نسبتاً نرم پاتے ہوئے اس نے اپنے جبڑے اس میں گاڑ دیئے

وہ پاس بیٹھی انہماک سے یہ تماشہ دیکھتی رہی، شامو تکلیف سے سر زور زور سے دیوار پر مارنے لگا، بار بار وہ اپنے بازو ٹنڈ ہلاتا کہ چیونٹے کو گرا سکے۔ لیکن اس کی گول مول ٹنڈ کو حرکت کرتے دیکھ کر رجنی کی آنکھیں وحشیانہ جذبے سے چمکنے لگیں دوسرے کی تکلیف پر خوش ہونے کی انسانی جبلت جاگ اٹھی تھی۔ اس نے دیوار پر سے تین چار چیونٹے پکڑے اور شامو کے رخسار پر رکھ دیئے۔ ذرا سی دیر میں وہ سب کے سب اسے کاٹ رہے تھے۔

اب وہ بری طرح تڑپ رہا تھا، سارا درد اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا تھا جو تکلیف سے پھٹ رہی تھیں وہ انتہائی بے چارگی سے اپنی دکھ سکھ کے ساتھی کو دیکھ رہا تھا جو اس کی محتاجی پر جی کھول کر ہنس رہی تھی۔

اچانک رجنی ڈر گئی اگر یہ شخص حرکت کرنے کی طاقت رکھتا تو اس کی بوٹیاں نوچ لیتا۔ اس نے چیونٹیوں کو ہاتھ سے مسل دیا اور اس کے چہرے کو دھو کر دوا لگا دی۔ اس شام وہ ڈاکٹر سے ملی جس نے اسے بتایا کہ دماغی توازن درست نہیں۔ بہت سی دوائیں لے کر وہ واپس آئی اور تکیہ میں منہ چھپا کر تہارات بھر روتی رہی۔

☆......☆......☆

تین سال گزر گئے اس طویل عرصے میں اس کی حالت ابتر ہوتی چلی گئی۔ شروع میں اس کی جنونی کیفیت کبھی کبھار ختم ہو جایا کرتی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کیفیت اس کی فطرت ثانیہ بن گئی۔ اب وہ بات بات پر شامو کو ڈانتی۔

ایک روز بازار میں اس نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنی بیوی کو انتہائی بے دردی سے پیٹ رہا تھا۔ اس کے اندر چھپی ہوئی نفرت جاگ اٹھی۔ مردوں سے انتقام لینے کا جذبہ بہ شدت پکڑ گیا حتیٰ کہ گھر پہنچ کر اس نے شامو کا چہرہ تھپڑوں سے سرخ کر دیا۔ اس کے منہ سے بب بب کی آواز نکلتی رہی۔ تکلیف کی شدت سے اس کے لوتھڑے جیسے جسم میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا وہ بے چینی اور کرب سے سر دیوار سے ٹکرانے لگا حتیٰ کہ سر سے خون بہنے لگا اور پھر تنگ آ کر وہ آنسو بہانے لگا۔

شام تک رجنی کی حالت سنبھل گئی اور اسے اپنے کیے پر ندامت محسوس ہوئی۔ اس نے بڑی محنت سے اچھی اچھی چیزیں پکائیں اور بڑے پیار سے شامو کو کھلانے لگی۔ شامو نے مزاحمت کی اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے سختی سے ہونٹ بند کر لئے لیکن وہ تازہ کھانے کی خوشبو نے جلد ہی اسے بے بس کر دیا۔

بستر پر لیٹے لیٹے رجنی نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا کمرے میں اندھیرا تھا کھڑکی کے راستے اندر آتی ہوئی چاند کی کرنیں شامو کے چہرے اور سینے پر پڑ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں ابھی تک چھت کو گھور رہی تھی جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔

رجنی دھیرے سے بولی دفعتاً اسے خیال آیا کہ وہ اس کی تین دن کی غیر حاضری کے متعلق سوچ رہا ہے۔ اس نے ناگواری سے گوشت کے اس ڈھیر کی طرف دیکھا اچانک ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس شخص سے شدید نفرت کرتی ہے۔ یہ وہ شخص تھا جس کے لئے وہ تین سال سے اس بے ہودہ جگہ پر رہتی تھی جہاں اسے کسی سے گفتگو کئے بغیر عرصہ گزر چکا تھا یہ وہی تھا جس کے لئے وہ زندگی کی تمام مسرتوں سے کنارہ کش ہو کر دن بھر اس کے اپاہج ولاچار جسم کے پاس بیٹھی رہتی تھی اور اب وہی شخص اسے بدکرار سمجھ رہا تھا۔ وہ اب سب کچھ برداشت کر سکتی تھی لیکن ایک مشرقی عورت کی طرح اپنی آبرو کے متعلق ایک لفظ سننا بھی اسے گوارا نہ تھا۔ اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بند کر لئے اور اپنے آپ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی لیکن نفرت کا دھارا پورے زور سے شور سے بہہ نکلا تھا۔ اس کا سارا جسم کانپنے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر آگ جل رہی ہے اور جب تک وہ اس کی منحوس آنکھوں کو ختم نہ کر دے یہ آگ ٹھنڈی نہیں ہو سکتی۔

ایک جست میں وہ شامو کے معذور جسم پر جا چڑھی اس نے آخری مرتبہ ان آنکھوں کی طرف دیکھا۔ ان میں بے پناہ غصہ تھا۔ نفرت اور حقارت تھی رجنی نے مٹھیاں کھول دیں اور دونوں انگوٹھے سختی سے اکڑا کر پوری قوت سے اس کی آنکھوں میں ٹھونس دیئے،

تکلیف کی شدت سے شامو کا جسم اپنی جگہ سے ایک ایک فٹ اچھلنے لگا۔ اس کا منہ کھل گیا اور حلق سے غرغرا کی آوازیں نکلنے لگیں۔ اس کی آنکھوں سے سرخ گاڑھا خون بہہ نکلا۔ تھوڑی دیر تڑپنے کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا اور پھر وہ بے حس وحرکت نظر آنے لگا۔ رجنی نے انگوٹھے باہر نکال لئے اور چادر سے ہاتھ صاف کر کے شامو کی طرف دیکھا اس کی ایک آنکھ پوری طرح کچلی جا چکی تھی، پتلی میں سے زرد زرد پانی بہہ رہا تھا۔ دوسری آنکھ صرف زخمی ہوئی تھی کیونکہ جذبات کی شدت سے اس کا انگوٹھا درست نشانے پر نہیں تھا۔ اس کی آنکھ کا صرف ایک کونہ زخمی ہوا تھا اور اس میں سے خون رس رہا تھا۔

اچانک اسے خوف نے آن لیا۔ یہ اس کا پتی تھا اس کا محبوب پتی جو اس سے بے پناہ محبت کیا کرتا تھا جس کی اس نے تین سال دل وجان سے خدمت کی تھی۔ بے اختیار اس کا دل بھر آیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ گونگا بہرا اور معذور تو وہ پہلے ہی تھا۔ لیکن اس کی اس حرکت نے اسے اندھا بھی بنا دیا۔ اب وہ کیسے زندہ رہے گا۔ وہ سسکیاں لیتی ہوئی باہر کی طرف بھاگی اور ایک ہی سانس میں سیڑھیاں عبور کرتے ہوئے نیچے پہنچ گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اسپتال کی طرف جانے والی سڑک پر تیزی سے دوڑ رہی تھی، شامو کے جسم میں حرکت ہوئی۔ اس کی داہنی آنکھ ذرا سی کھلی اور سیاہ پتلی دائیں بائیں حرکت کرنے لگی۔

اچانک ٹنڈ بازو کا سہارا لے کر وہ فرش پر اوندھے منہ لیٹ گیا اور تھوڑی فرش پر ٹکا کر اس نے جسم کو ذرا سا آگے بڑھایا۔ سخت فرش پر گھسٹنے سے اس کے چہرے سے خون بہنے لگا لیکن وہ بڑھتا چلا گیا۔ دوسری دیوار تک پہنچتے ہوئے وہ لہولہان ہو چکا تھا۔ یہاں سے اس نے سارا زور لگا کر اپنے جسم کو کھڑا کر لیا، دیوار کا سہارا لے کر اس نے دانتوں سے تلوار اتاری اور زمین پر پھینک دی۔ گردن اونچی کر کے اس نے دوسری تلوار اتاری اور اپنے آپ کو زمین پر گرا دیا۔

کچھ دیر کے [illegible] دروازے

کی طرف بڑھا، دروازے کے سامنے پہنچ کر تلوار اس نے فرش پر رکھ دی اور دوبارہ واپس ہو کر دوسری تلوار دروازے تک پہنچانے میں اسے بیس منٹ لگے، فرش پر گھسٹنے سے اس کا سارا جسم خون میں نہا گیا۔

ٹنڈ بازو اور دانتوں کی مدد سے اس نے دونوں تلواروں کو دروازے کے عین سامنے ایک دوسرے کے سہارے اس طرح کھڑا کیا کہ باہر سے آنے والا جونہی پٹ کھولے ان کا شکار ہو جائے۔ اب وہ گھسٹتا ہوا کھڑکی کی طرف بڑھا کمرے کا سارا فرش اس کے خون سے سرخ ہو رہا تھا دوسری آنکھ بھی بوجھ پڑنے سے ناکارہ ہوتی جا رہی تھی کسی نہ کسی طرح وہ کھڑکی تک پہنچ ہی گیا دانتوں سے پٹ پکڑ کر وہ ٹانگوں کے ٹنڈ پر کھڑا ہو گیا اور ایک ہی جھٹکے میں کھڑکی پر چڑھ گیا۔ اب وہ کھڑکی میں لپٹا ہوا تھا نیچے دور زمین نظر آ رہی تھی۔

بار بار وہ اپنی زخمی آنکھ کھولتا اور دروازے کی طرف دیکھ لیتا۔

وقت دھیرے دھیرے کھسک رہا تھا، رجنی ڈاکٹر کے پاس پہنچی تو وہ ایک مریض کے آپریشن میں مصروف تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ فارغ ہوتے ہی اس کے گھر پہنچ جائے گا، یہاں مزید ٹھہرنا بیکار سمجھ کر وہ الٹے پیروں گھر کی طرف بھاگی۔ تیزی سے سیڑھیاں عبور کرتے ہوئے وہ کمرے کے دروازے پر جا پہنچی۔ ایک لمحے کے لئے رکی اور اس نے سوچا کہ وہ رو کر اپنے قصور کی معافی مانگے گی۔

کمرے کا دروازہ اسی طرح بند تھا جیسا کہ وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ اس نے جھٹکے سے دروازے کو کھولا اور تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ بے اختیار اس کے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکلی۔ تیز دھار تلواریں اس کے آر پار ہو چکی تھیں۔ کھڑکی میں پڑے ہوئے گوشت کے ڈھیر میں حرکت پیدا ہوئی اور اگلے ہی لمحے خون میں نہایا ہوا ایک جسم کھڑکی سے نیچے گر پڑا۔

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 116

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

حضور میں تو حکم کا غلام ہوں، مجھے اپنے وش میں کرنے والا عامل جو حکم دے گا وہ میں کرنے پر مجبور ہوں، آپ جب اپنے علم سے مجھے حاضر کرسکتے ہیں تو یہ بھی معلوم کرسکتے ہیں کہ مجھے اس کام پر لگانے والا کون ہے اور کس شکتی کا مالک ہے۔ یہ سن کر رولوکا بولا میں تو معلوم کرسکتا ہوں لیکن اگر تو بیان کردے گا تو رام داس بھی سن لیں گے جو کہ اس مسائل سے متاثر ہیں۔ یہ سن کر ہیولہ بولا۔ مہاپرش آپ کی بات کو میں رد نہیں کرسکتا مگر آپ سے میری بنتی ہے کہ میں جس کے وش میں ہوں اس سے آپ مجھے آزاد کرادیں نہیں تو وہ مجھے بہت کشٹ دے گا۔ رولوکا بولا تو فکر نہ کر، میں تجھے اس سے آزادی دلوادوں گا اور پھر وہ تیری گرد کو بھی نہیں پاسکتا، یہ سننے کے بعد ہیولہ چند لمحے خاموش رہا، پھر اس نے ساری کتھا سنادی کہ رام داس کا چچیرا بھائی تلسی داس نے یہ سب کرایا ہے اور یہ کرنے والا ایک سادھو ہے جو کہ فلاں جنگل میں بیٹھا ہے، اس کے بعد رولوکا نے اس ہیولے کو اس سادھو سے آزادی دلادی اور کیا ہوا عمل الٹ دیا تو اس عمل نے تلسی داس کی زندگی اجیرن کردی۔ مگر تلسی داس بھی کائیاں تھا ایک گیانی نے اسے بتادیا کہ یہ عمل تم پر ایک بہت بڑے گیانی نے الٹ دیا ہے اور اس عمل کا توڑ وہی کرسکتا ہے۔ خیر رونے دھونے کے بعد اس گیانی نے بتادیا کہ تمہارا عمل الٹ کس نے کیا ہے لہٰذا تلسی داس سسکتا بلکتا رولوکا کے پاس آیا اور رولوکا کے پاؤں پڑا تو رولوکا کو اس پر رحم آگیا اور پھر رولوکا نے تلسی داس کو تمام اذیتوں سے ٹھیک کردیا، ادھر زالوشا..... جنگل سے نکلنے کے بعد ایک گاؤں میں پہنچا جہاں کہ ایک بہت ہی بڑا سایہ دار برگد کا درخت تھا، اس درخت کے نیچے بیٹھ گیا، ایک سادھو کا روپ دھار کر اور گاؤں والوں کو اپنی جناتی طاقتوں کے بل بوتے پر چند چمتکار دکھلائے تو گاؤں والے اس کے گرویدہ ہوگئے، دراصل زالوشا کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس گاؤں میں سادھو کے روپ میں بیٹھ کر رولوکا، التمش اور مانی پر نظر رکھے گا اور موقع ملتے ہی سب سے پہلے رولوکا کو نقصان پہنچائے گا، مگر رولوکا اپنے کمرے میں بیٹھا اور پل پل کی سادھو کی خبریں رولوکا کو مل رہی تھیں۔ رولوکا کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ (اب آگے پڑھیں)

رولوکا کے منہ سے نکلا۔ ”زالوشا..... چاہے تو کتنے ہی روپ بدل لے، میری نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔“

رولوکا اس کے بعد اپنی گردن جھکا کر بیٹھ گیا، ایسا لگتا تھا کہ وہ بہت دور کی سوچ رہا ہے اور پھر چند منٹ بعد ہی رولوکا نے اپنا سر اوپر کو اٹھایا۔

اب رولوکا کے سامنے زالوشا کی ساری حقیقت کھل کر آگئی تھی کہ ”زالوشا..... اس گاؤں میں سادھو کا روپ دھار کر کیوں بیٹھا ہے۔“

دراصل زالوشا نے یہ سوچ لیا تھا کہ ”گاؤں والوں کو چند چمتکار دکھلا کر گاؤں کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالوں گا اور اس طرح میں آرام سکون سے پڑا رہوں گا، اور پھر درپردہ اپنے دشمن رولوکا دینو بابا اور مانی کے خاتمے کے لئے کوئی مضبوط منصوبہ مرتب کروں گا اور موقع ملتے ہی سب سے پہلے یہ رولوکا جو کہ میرے اور التمش کے درمیان کود پڑا ہے اسے ختم کردوں گا۔

اور جب رولوکا ختم ہوجائے گا، اس کے بعد التمش اور مانی کی کیا حیثیت ہوگی، ان دونوں کو تو چٹکی بجا کر زندہ درگور کردوں گا۔“

پھر رولو کا دل ہی دل میں خوش ہونے لگا، اس کے بعد اس کے منہ سے آواز نکلی۔ ''زالوشا تو بھی کیا یاد کرے گا، میں تیرے ساتھ چوہے اور بلی والا کھیل کھیل کر ایسا نڈھال کروں گا کہ ایک قدم چلنے سے بھی قاصر ہو جائے گا...... سادھو بن کر چند دن تو عیش کرلے، پھر میں تجھے اس حال میں کر دوں گا کہ تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوگا۔''

ادھر جب ٹھاکر برگد کے درخت کے پاس پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ سارا گاؤں سادھو مہاراج کے پاس موجود ہے، اور سادھو مہاراج گاؤں والوں کو بھاشن دے رہے ہیں۔

ٹھاکر کو قریب دیکھ کر گاؤں والے ایک طرف کو ہٹ گئے تا کہ ٹھاکر صاحب سادھو مہاراج کا درشن کریں اور ان کے چرن چھوئیں اور ایسا ہی ہوا۔

ٹھاکر نے سب سے پہلے مہاراج کو پرنام کیا اور پھر مہاراج کے سامنے جھک کر ان کے پاؤں کو ہاتھ لگایا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے سر پر پھیر لیا۔

پھر ٹھاکر گاؤں والوں سے مخاطب ہوا۔ ''گاؤں والو! تم لوگ کیا اسی طرح مہاراج کا درشن بھی کرتے رہو گے یا مہاراج کے لئے جل پانی اور بھوجن کے لئے کوئی اپائے کیا بھی ہے کہ نہیں۔''

یہ سن کر گاؤں والے خاموش رہے تو ٹھاکر نے پھر کہا ایک نوجوان سے۔ ''تو میرے گھر بھاگا بھاگا جا اور ٹھاکرائن سے کہنا کہ ''مہاراج کے لئے گرم گرم پوریاں ترکاری اور لسی بھی تیار کر دیں۔ اور یہ تمام چیزیں لے کر ترنت آجا۔''

یہ سنتے ہی سادھو مہاراج نے کہا۔ ''ٹھاکر مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں...... میں کھانے پینے سے بہت دور ہوں...... میں نے تو دنیاوی چیزوں کو تیاگ دیا ہے۔ تم میرے لئے کوئی بھی چیز نہ منگاؤ، مجھے گیان دھیان میں لگا رہنے دو۔''

پھر سادھو نے ٹھاکر کو اپنے بہت قریب بلایا اور ٹھاکر کے کان میں کہا۔ ''ٹھاکر تو رات کے اندھیرے میں جو کچھ بھی کرتا ہے یہ تیرے لئے ٹھیک نہیں۔ تو اپنی حرکتوں کو چھوڑ دے، اور اب اگر تو نے اندھیرے کا کھیل کھیلا تو تیرے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔''

یہ سنتے ہی ٹھاکر کی گردن شرمندگی سے جھک گئی اور پھر ٹھاکر نے اپنا سر سادھو کے پاؤں پر رکھ دیا اور بولا۔

''مہاراج شماں کر دیں...... میں آج ہی سے سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔''

سادھو اور ٹھاکر میں یہ باتیں بہت دھیمی آواز میں ہو رہی تھیں۔ اس کے بعد سادھو نے ٹھاکر کے سر پر اپنا ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے تو اپنی بات پر قیام رہنا۔''

پھر ٹھاکر نے اپنے بندوں سے کہا کہ ''مہاراج کے لئے برگد کے درخت سے تھوڑا ہٹ کر ایک کٹیا بنا دی جائے تا کہ مہاراج رات سے اس کٹیا میں آرام کریں۔'' یہ سنتے ہی ٹھاکر کے آدمیوں نے جھٹ پٹ ایک شاندار کٹیا تیار کر دی۔

ٹھاکر نے مہاراج سے کہا۔ ''مہاراج آپ کے لئے کٹیا میں نے تیار کرا دی اور اس میں آپ کے آرام سکون کے لئے سارے انتظامات کر دیئے گئے ہیں۔ آپ جب چاہیں کٹیا میں جا کر آرام کر سکتے ہیں۔ اور ویسے بھی آج کل وقفے وقفے سے پانی برس رہا ہے۔ لیکن یہ آپ کا چمتکار ہے کہ بارش کا پانی اس درخت پر نہیں گر رہا ہے، ویسے مہاراج میں اپنا ایک بندہ آپ کی سیوا کے لئے چھوڑے جا رہا ہوں، آپ کو جس چیز کی بھی ضرورت ہوگی یہ فوراً حاضر کر دے گا۔''

اور پھر سادھو مہاراج کی اجازت سے ٹھاکر اس جگہ سے واپس آ گیا۔ ٹھاکر کا بندہ سادھو مہاراج کے پاس بیٹھ گیا، مہاراج کے منہ سے کوئی لفظ کسی کام کے لئے نکلا اور وہ جھٹ وہ کام کر دے۔ لیکن سادھو مہاراج گاؤں والوں کی بپتا سنتے رہے اور ہاتھ کے ہاتھ اس مصیبت سے چھٹکارا کے لئے حل بتاتے رہے۔

شام سے پہلے مہاراج اس بندے سے

بولے۔ ''کٹیا میں جا کر دیا جلا دے اور دیا جب جل جائے تو آ کر مجھے بتا دے۔''

یہ سنتے ہی وہ بھاگا ہوا گیا اور کٹیا میں دیا جلا کر تر نت آیا اور مہاراج سے بولا۔ ''مہاراج میں نے دیا جلا دیا ہے آپ اگر چلنا چاہیں تو چلیں۔''

سادھو مہاراج نے لوگوں سے کہا۔ ''لوگو! میرے آرام کا سمے ہو گیا ہے، اور رات سے کوئی بھی میرے پاس نہ آئے...... کل دن سے، میں پھر تم لوگوں سے ملوں گا، دراصل رات کا اندھیرا پھیلتے ہی میں گیان دھیان میں لگ جاتا ہوں، اچھا اب تم لوگ اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔''

اور یہ سنتے ہی گاؤں کے سارے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور سادھو مہاراج اپنی کٹیا میں آ گئے۔

رات کا اندھیرا پورے گاؤں پر مسلط تھا، تمام گھر کے لوگ میٹھی نیند میں تھے۔ مگر ایک ایسا گھر بھی تھا جس میں دو عورتیں جاگ رہی تھیں، ایک ماں اور دوسری اس کی بیٹی جواں سال رکمنی۔

رکمنی سے اس کی ماں بولی۔ ''ارے جنم جلی میری بات مان اور تو سادھو مہاراج کے پاس اس سمے چلی جا۔ مہاراج کی سیوا کر کے اپنا جیون سنوار لے، تیرا باپ مر گیا...... غربت ہمارے لئے چھوڑ گیا...... اور غربت کی وجہ سے تیری جوانی اکارت جا رہی ہے۔ تو گاؤں کی سب سے سندر ناری ہے مگر کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا کہ ہم غریب ہیں۔

سادھو مہاراج بہت پہنچے ہوئے ہیں۔ دن بھر لوگوں کے سامنے چمتکار پر چمتکار کرتے رہے، میری بات مان لے، مہاراج نے تجھ پر دیا کر دیا تو تیرا جیون سنور جائے گا۔ ایسا کر کے منہ ہاتھ دھو کر صاف صاف چولی اور چندری پہن لے۔

مہاراج کو اپنی بپتا سنا کر ان کے دل میں گھر کر لینا اور ویسے بھی تو اچھی بھلی بات کر لیتی ہے۔ اور ہاں یہ یاد رکھنا کہ اس بات کی کسی کو بھنک نہ لگے...... میرا من کہتا ہے کہ مہاراج ضرور تجھ پر کرپا کریں گے۔ اچھا اب تو جلدی سے کپڑے بدل لے۔ منہ ہاتھ بھی ذرا اچھی طرح دھو لینا۔''

خیر رکمنی نے ماں کی بات مان لی۔ وہ خود بھی چاہتی تھی کہ ان کے گھر سے غربت دور ہو جائے، اس کا بھی بیاہ کسی اچھی جگہ ہو جائے۔ غربت کی وجہ سے اس کی اٹھتی جوانی کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔

کوئی آدھا گھنٹہ میں رکمنی ڈھلی ہوئی چندری اور چولی پہن کر تیار ہو گئی۔

اور پھر دونوں ماں بیٹی گھر سے نکل کر مہاراج کی کٹیا کی طرف بڑھنے لگیں۔ کوئی پندرہ منٹ کا راستہ تھا۔ دونوں کٹیا کے قریب پہنچ گئیں۔ ماں بولی۔ ''میں برگد کے درخت کے پاس بیٹھتی ہوں تو مہاراج کی کٹیا میں جا۔'' یہ سن کر رکمنی بولی۔ ''ماں اگر مہاراج نے بھگا دیا تو؟''

''ماں بولی۔ ''ارے ایسا نہیں ہوگا...... مہاراج بہت دیالو ہیں...... میرا من اندر سے کہہ رہا ہے کہ مہاراج تیری قسمت ضرور بدل دیں گے۔ تو گھبرا نہیں ارے پاگل مطلب کے لئے تو نہ جانے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔''

رکمنی کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ رات کا اندھیرا قرب و جوار کو بہت ڈراؤنا بنا رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا مگر مہاراج کی کٹیا میں دیا جل رہا تھا۔

خوف و ہراس کے چنگل میں پھنسی نڈھال قدم اٹھاتی ہوئی رکمنی کٹیا کے دروازے پر پہنچ گئی کہ اتنے میں اندر سے آواز آئی۔ ''رکمنی اندر آ جا۔''

اپنا نام سن کر رکمنی اچنبھے میں پڑ گئی کہ ''مہاراج نے اپنے گیان سے میرا نام بھی معلوم کر لیا۔ مہاراج واقعی بہت چمتکار والے ہیں۔''

خیر رکمنی کٹیا میں داخل ہو گئی۔ اندر جاتے ہی رکمنی نے مہاراج کو پرنام کیا، اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر تو مہاراج نے بھرپور نظر سے رکمنی کا جائزہ لیا۔

رکمنی پر جوانی اس قدر مہربان ہوئی تھی کہ رکمنی کو

دیکھ کر گاؤں کے جوان عش عش کر اٹھتے تھے۔ گورا رنگ، جھیل سے زیادہ گہری غزالی آنکھیں، دلکش دلفریب گلاب کی پنکھڑی جیسے ہونٹ، کمر سے نیچے تک بل کھاتی ہوئی ناگن زلفیں، چال مستانی اور کسا کسا بدن، دیکھنے والوں کی دل کی دھڑکنیں تیز کر دیتا تھا۔

رکمنی پر نظر پڑتے ہی مہاراج تو رکمنی کی دلکشی میں جیسے کھو گئے تھے۔ وہ یک ٹک رکمنی پر نظریں جمائے ہوش وحواس سے بیگانے تھے۔

''مہاراج......'' رکمنی کے منہ سے نکلا تو جیسے مہاراج چونک گئے اور منہ سے نکلا۔ ''رکمنی تو آ گئی...... مجھے سب پتہ ہے...... تیرا باپ تم دونوں ماں بیٹی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ اب تم دونوں ماں بیٹی غربت کی چکی میں پس رہی اور غربت کی وجہ سے تجھے کوئی ''بر'' نہیں مل رہا۔ خیر کل کا سورج تیرے لئے خوشیوں کا پیغام لے کر طلوع ہوگا۔ بس یہ یاد رکھ کہ ''کرے گی سیوا...... تو کھائے گی میوا۔''

رکمنی بولی۔ ''مہاراج آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے میں کیا بتاؤں...... بس آپ مجھ پر دیا کر دیں...... تاکہ ہمارے کشٹ کے دن ختم ہو جائیں...... میں پوری زندگی آپ کے لئے پرارتھنا کروں گی۔''

دراصل زالوشا...... جو کہ سادھو کے روپ میں تھا۔ وہ تو ویسے بھی جوان تھا۔ رکمنی کی الہڑ جوانی قیامت خیز، کسا کسا جسم نے زالوشا کے جذبات کو بھڑکا دیا تھا۔

مہاراج کی آواز سنائی دی۔ ''رکمنی میرے قریب آ...... تاکہ میں تیری بے سکونی کو سکون میں بدل دوں اور غربت کو تجھ سے دور بھگا دوں۔''

رکمنی مہاراج کے سامنے بیٹھ گئی تو مہاراج نے رکمنی کا ہاتھ پکڑا اور بولے۔ ''ارے تو کہاں بیٹھ رہی ہے ادھر میرے قریب بیٹھ۔'' اور پھر مہاراج نے رکمنی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو رکمنی کھنچی چلی گئی۔ اور مہاراج کے نرم گداز بستر پر جیسے گر گئی۔

مہاراج نے رکمنی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے سہلانا شروع کر دیا۔ رکمنی کے پورے جسم میں جیسے چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

مہاراج کا ہاتھ ذرا اور اوپر کو بڑھا...... اس کے بعد مہاراج کا ہاتھ رکمنی کی گردن تک پہنچ گیا...... اور پھر مہاراج نے اس کی گردن کو سہلانا شروع کر دیا۔

دو جوان جسم پہلو بہ پہلو تھے۔ رکمنی کے جسم میں جیسے بھونچال سا آنے لگا۔ اس کی ہیجانی کیفیت اندرونی طور پر ہلچل مچانے لگی۔

مہاراج کے ہاتھ اب گردن سے ہوتے ہوئے اس کے گالوں کو سہلا رہے تھے۔ پھر مہاراج کی انگلیاں رکمنی کے ہونٹوں پر گداز پیدا کرنے لگیں اور ساتھ ہی ساتھ اس کے پپوٹوں پر بھی ہلکا دباؤ پڑنے لگا۔ رکمنی کا پورا بدن ڈولنے لگا۔ اس کے پورے جسم میں جیسے کرنٹ سا دوڑنے لگا۔

مہاراج کی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ''رکمنی......!!''

رکمنی کے منہ سے نکلا۔ ''جی مہاراج۔''

''رکمنی آج تو نہال ہو جائے گی...... دولت تیرے گھر کی باندی ہوئی۔ آج رات تیرا سارا کشٹ دور ہو جائے گا۔

''رکمنی۔'' تجھے کوئی اعتراض تو نہیں۔ تو اندر سے خوش تو ہے ناں۔''

''جی مہاراج! میں آپ کی سیوک ہوں۔''

پھر مہاراج نے ہولے سے رکمنی کو بستر پر لٹا دیا۔ اور اپنے گرم تپتے ہوئے ہونٹ رکمنی کے ہونٹوں پر رکھ دیئے، ایسا ہوتے ہی رکمنی اندر سے پوری طرح کانپ سی گئی۔ رکمنی کے دونوں پپوٹے بوجھل ہو کر بند ہو گئے تھے۔ رکمنی اپنا سدھ بدھ کھو چکی تھی۔ وہ جذبات کے سمندر کے گرداب میں حال سے بے حال ہو چکی تھی۔

مہاراج نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ جذبات کے طوفان میں پتے کی طرح اڑتی پھر رہی تھی۔ اس کے لمبے لمبے سانس اسے اتھل پتھل کر رہے تھے۔ اور پھر وہ یکدم نڈھال ہو کر بے سدھ ہو گئی۔ اسے کچھ ہوش

نہ رہا۔ اور جب اس کے حواس بحال ہوئے تو مہاراج کی آواز سنائی دی۔ ”رکمنی“

”جی مہاراج......“

”رکمنی آج تو پوتر ہوگئی......تو نے میرا من خوش کردیا۔ میں بھی تجھے خوش کردوں گا۔ بھولے سے بھی تو اپنی زبان کسی اور کے سامنے نہ کھولنا۔ اب تو جا...... صبح ہونے والی ہے، تیری ماں برگد کے درخت کے نیچے بیٹھی ہے۔ اسے ساتھ لے کر جلدی سے گھر چلی جا......

اور کل کی رات گزار کر جب صبح تو سو کر اٹھے گی تو تیرا گھر دھن دولت سے بھرا ملے گا۔ اور بہت تھوڑے دنوں میں تیرا بیاہ بہت اچھی جگہ ہو جائے گا۔“ اور پھر مہاراج کی بات سنتے ہی رکمنی نڈھال قدموں سے چلتی ہوئی کٹیا سے نکل گئی۔ ماں اپنی جگہ بیٹھی ہوئی ملی۔

ماں تجربہ کار اور جہاں دیدہ تھی۔ ساری حقیقت کو جان گئی رکمنی کی حالت اور چال دیکھ کر۔

اور پھر ایسا ہی ہوا جیسا کہ مہاراج نے کہا تھا۔ دوسرے دن رکمنی کا گھر سونے چاندی سے بھر گیا تھا۔ اس کے بعد تو رکمنی مہاراج کی دیوانی ہوگئی......اب وہ خود اپنی ماں سے بولتی......”ماں میں تو مہاراج کے پاس جارہی ہوں......کیونکہ سیوا کرنے سے میوہ ملتا ہے۔“

برگد کے درخت کے نیچے بیٹھے سادھو مہاراج کو ایک ہفتہ ہوگیا تھا۔ چوتھے دن سے مہاراج جب درخت کے نیچے بیٹھتے تو نہ جانے کہاں سے ایک زہریلا بہت لمبا سانپ آکر مہاراج کی گردن میں اپنا پھن کاڑھ کر لپٹ جاتا اور اسے دیکھ کر گاؤں والے اور بھی مہاراج کے عقیدت مند ہونے لگے تھے۔

اب تو ہر رات پاپ ہونے لگا تھا۔ اندھیرا پھیلتے ہی رکمنی کی کٹیا میں آجاتی اور رات بھر مہاراج کی سیوا میں گزار دیتی۔ دراصل مہاراج نے اپنی خفیہ طاقتوں سے رکمنی کو مسخر کرلیا تھا۔ اور مہاراج چونکہ جناتی طاقت والے تھے۔ گاؤں والوں کے لئے سادھو مہاراج لیکن حقیقت میں زالوشا۔

ادھر رولوکا نے حتمی فیصلہ کرلیا کہ اب زالوشا......عرف سادھو مہاراج کا خاتمہ کردینا چاہئے۔

ٹھیک دسویں دن مہاراج صبح سویرے اپنی کٹیا سے نکل کر آئے اور برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ دن کے گیارہ بجتے ہی لوگوں کی بھیڑ لگ گئی۔

سوا گیارہ بجے وہ سانپ نہ جانے کدھر سے رینگتا ہوا آیا اور مہاراج کی گردن کے گرد لپٹ گیا۔ اور یہ روز کا معمول تھا کہ سانپ خود بخود آکر مہاراج کی گردن میں لپٹ جاتا تھا۔

آج رولوکا نے مہاراج کے بیٹھتے ہی مہاراج عرف زالوشا......کے گرد ایک مضبوط حصار قائم کردیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اب مہاراج کی زبان بھی بند کردی تھی۔ مہاراج بولنے سے قاصر تھے۔

ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے، سانپ کا دھڑ اور سر اوپر کو اٹھنے لگا اور مہاراج کی گردن کے گرد سانپ کا گھیرا کسنے لگا۔ یہ دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

سانپ اوپر کو اٹھتے اٹھتے اپنے سر والے حصے کو ایک شاخ کے گرد لپیٹنے لگا، اس کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ مہاراج کی گردن کو سانپ کی دم نے اپنے گھیرے میں جکڑ لیا تھا، پھر سانپ نے اپنے پورے وجود کو اوپر کو کھینچنے لگا اور اس طرح مہاراج اوپر کو اٹھنے لگے۔

مہاراج اب بے سدھ ہوچکے تھے۔ مہاراج کی دونوں آنکھیں باہر کو ابل پڑی تھیں۔ اور پھر یکبیک مہاراج کے پورے جسم میں شعلے بھڑک اٹھے اور مہاراج دھڑام سے نیچے کو گرے، ان کا پورا وجود بھڑکتے ہوئے شعلوں میں غائب ہو چکا تھا۔

اس جگہ جمع سارے لوگ حیران و ششدر تھے کہ یہ ہوا تو کیا ہوا۔

اور پھر چند منٹ میں شعلے ختم ہوگئے تو لوگوں نے دیکھا کہ اس جگہ تھوڑی سی راکھ پڑی تھی کہ اچانک تیز ہوا چلی جس نے اس راکھ کو اڑا کر ختم کردیا۔

اور درخت پر جو مہیب خوفناک اور دہشت ناک سانپ شاخ سے لپٹا تھا وہ بھی غائب ہو چکا تھا۔ اب

لوگ ہر طرح کی باتیں کرتے ہوئے خوف کی حالت میں اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اور اس طرح رولوکا نے زالوشا کے وجود کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کردیا تھا۔

☆......☆......☆

حکیم وقار اپنے کمرے میں بیٹھے تھے، آج چھٹی کا دن تھا، ان کے سامنے ایک کتاب پڑی تھی، اور وہ اپنے خیالوں میں گم تھے کہ اتنے میں رولوکا ان کے کمرے میں داخل ہوا۔

حکیم وقار کی آنکھیں کھل گئیں تو وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ ''آیئے حکیم صاحب...... تشریف رکھیں...... دراصل میں آپ ہی کا انتظار کررہا تھا کہ آپ آئیں تو دونوں مل کر چائے پئیں۔''

دونوں نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا...... رولوکا حکیم وقار کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تو حکیم وقار نے آواز دے کر ملازم سے کہا کہ ''دو کپ چائے لاؤ۔''

میز پر کتاب دیکھ کر رولوکا بولا۔ ''حکیم صاحب لگتا ہے یہ کوئی دلچسپ کتاب ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ کی میز پر پڑی ہے۔ اگر اچھی ہے تو مجھے بھی سنائیں...... ویسے بھی آج چھٹی کا دن ہے، اور میں بھی آج فارغ ہوں۔''

اتنے میں ملازم دو کپ چائے لے آیا اور دونوں کے سامنے رکھ کر چلا گیا تو حکیم وقار بولے۔ ''آپ چائے پئیں اس کے بعد میں کتاب شروع کرتا ہوں۔'' کتاب کا مصنف لکھتا ہے کہ ''یہ واقعہ حقیقت پر مبنی ہے۔'' اور پھر چائے پینے کے بعد حکیم وقار کتاب پڑھنے لگے۔

کتاب کا نام ہے۔ ''نیل کنٹھ۔''

کرامت کا باپ بڑھئی تھا اور ایک قصبے میں رہتا تھا۔ اس کا نام سلامت تھا۔ وہاں پر زیادہ آبادی کسانوں اور کاشت کاروں کی تھی، سلامت ہل اور دوسرے کاشت کاری کے اوزار بنانے کا ماہر تھا اور اس کے سوا کوئی دوسرا یہ کام کرنے والا نہ تھا اس لئے اس کے پاس کام کی کمی نہ تھی، سارے کسانوں اور کاشت کاروں کو اس کی ضرورت پڑتی تھی اس لئے سب ہی آتے تھے، سلامت نہایت مناسب اجرت پر سب کا کام کردیا کرتا تھا اگر وہ چاہتا تو زیادہ بھی کما سکتا تھا۔ کیونکہ ہر کسان شہر جا کر تو کام نہیں کرواسکتا تھا اس سے کام کروانے پر مجبور تھا مگر سلامت نے کبھی کسی کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھایا اور اپنی جائز مزدوری ہی وصول کی۔ اس کی اس اصول پرستی کی وجہ سے سب اس کی عزت کرتے تھے اور اس قصبے میں سلامت غریب ہونے پر بھی باعزت زندگی گزار رہا تھا۔

کرامت اسی جگہ پیدا ہوا تھا اور جب چار سال کا ہوا تو اس کا نام قصبے کے اسکول میں لکھوا دیا گیا اور دینی تعلیم اس کی ماں کرنے لگی، کرامت شروع میں پڑھنے میں تیز نہ تھا، مگر عمر کے ساتھ ساتھ اس کا شوق بڑھتا گیا اور وہ اپنی کلاس کا اچھا لڑکا مشہور ہوتا گیا۔ یہ اسکول صرف پرائمری تک تھا۔ چھٹی کلاس میں پڑھنے کے لئے دوسرے اسکول میں جانا پڑتا تھا۔ پانچویں کلاس کرامت نے بڑی نمایاں پوزیشن لے کر پاس کی اور وہ ہائی اسکول میں داخل ہوگیا۔ سلامت کی خواہش تھی کہ کرامت پڑھ کر سرکاری ملازمت کرے اور بڑا آفیسر بن جائے، اتفاق سے کرامت کا کوئی بہن یا بھائی نہ تھا اس لئے والدین کی پوری توجہ کا مرکز بھی وہی تھا۔

وہ جس علاقے میں رہتے تھے وہ نہایت کھلا علاقہ تھا چاروں طرف کھیت تھے اور باغات تھے۔ یہاں پر بچوں کے کھیلنے کودنے کو بہت جگہ تھی باغات میں پھل فروٹ بھی تھا اور چھوٹا موٹا شکار بھی مل جاتا تھا۔

لڑکے ٹولیاں بنا کر شام کو یا اسکول کے بعد نکل کھڑے ہوتے اور خوب تفریح کرتے تھے زیادہ بڑی جگہ نہ تھی، اس جگہ کے ہر لڑکے کو سب جانتے تھے اس لئے ان سے کچھ نہیں کہتے تھے، ان کی شرارتوں پر ڈانٹ بھی دیا کرتے، اور ضرورت پڑی تو مار بھی دیا کرتے تھے، مگر کوئی لڑکا اس کی شکایت گھر پر نہیں کرتا تھا اس

لئے کہ شکایت کرنے کی صورت میں اس کے والدین اس کو اور بھی ڈانٹتے تھے کہ تو نے ضرور کچھ شرارت کی ہوگی۔ اس ماحول میں بچے شرارت تو کرتے تھے مگر بڑوں کی نظروں سے بچ کر بڑے سب لوگ تھے، سب ان کو برے کام سے روکنے اور مارنے کا حق رکھتے تھے، بچوں کو سب سے ڈرنا پڑتا تھا، پھر بھلا بچوں سے غلط کام کیسے ہوسکتے تھے، ہر بڑے کی نظر ان پر رہتی تھی، بچہ کسی کا ہو ہر کوئی اپنا سمجھ کر ان پر نظر رکھتا تھا۔

ایسا ماحول اور انسانوں کا ایسا رویہ پڑھ کر شاید آج کا انسان حیرت کرے اور کرے گا۔ مگر راوی یہی حقیقت بیان کرتے ہیں کہ ایسا ہی ماحول تھا اور اسی ماحول کی یہ کہانی بیان کرتے ہیں کہ کرامت ساتویں میں بڑی اچھی پوزیشن لے کر گیا۔ اسکول میں ہی دوستوں کے ساتھ شکار کا پروگرام بن گیا اور چھٹی کے بعد اس نے کتابیں ایک لڑکے کے ہاتھ گھر بھیج دیں اور چھ لڑکے اپنی اپنی غلیلوں کے ساتھ شکار پر چل پڑے، کیوں کہ باغات کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ مگر وہ آگے بڑھتے گئے آگے ایک نہر تھی، مگر پانی زیادہ نہیں ہوتا تھا، تین لڑکے مچھلی کے شکار کرنے نہر کے کنارے بیٹھ گئے۔

کرامت کے ساتھ شمشاد اور احمد رہ گئے وہ غلیل کے شکاری تھے۔

شکار تو ان کو فاختہ اور تیتروں کا کرنا تھا اور ان کی تلاش میں نہر سے آگے گئے تھے۔

ایک پرندہ ہے اس کو نیل کنٹھ کہا جاتا ہے اس میں کئی رنگ ہوتے ہیں اور بڑا خوب صورت نظر آتا ہے مگر زیادہ رنگ نیلے ہوتے ہیں اس کی پرواز زیادہ نہیں ہوتی اڑتا ہے اور دس بیس گز اڑ کر پھر زمین پر بیٹھ جاتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ بڑا کمزور ہے پکڑا جائے گا، بچے اس کے تعاقب میں میلوں دوڑتے ہیں اور وہ ان کو دوڑاتا رہتا ہے۔

شمشاد کو نیل کنٹھ نظر آ گیا اور وہ اس کے قریب بھی چلا گیا مگر جب ذرا فاصلہ رہ گیا تو وہ اڑ گیا اور بیس پچیس قدم کے بعد پھر زمین پر بیٹھ گیا شمشاد پھر دبے پاؤں اس کی طرف بڑھا اور بڑی ہوشیاری سے اس کے قریب پہنچ گیا، مگر پھر نیل کنٹھ اڑ گیا اور آگے بیس پچیس قدم دور بیٹھ گیا، کرامت نے کہا۔ ”شمشاد کیا کررہا ہے یہ تو تجھے دوڑا تا رہے گا، ہاتھ نہیں آئے گا۔“

شمشاد بولا۔ ”ذرا فاصلہ رہ گیا تھا اب کے پکڑلوں گا۔“ اور وہ دبے قدموں پھر اس کی طرف چلا۔ مگر وہی ہوا۔ حمزہ بولا۔ ”چھوڑ اس کو سامنے جھاڑیوں میں شکار ملے گا۔“

شمشاد نے نیل کنٹھ کی طرف منہ کرکے کہا۔ ”اچھا دوست خوش رہ تو نے خوب دوڑایا میں جاتا ہوں۔“

احمد بھی قریب آ گیا اور بولا۔ ”ابے تو اس سے اس طرح کہہ رہا ہے جیسے یہ تیری بات سمجھ رہا ہے۔“

یہ سن کر کرامت نے کہا۔ ”کہنے میں کیا برائی ہے۔ دوست کہا ہے دشمن تو نہیں کہا۔“

تینوں ہنستے ہوئے جھاڑیوں کی طرف چلے گئے۔ جھاڑیوں میں انہوں نے کچھ شکار کیا اور بیر کھائے اور واپس ہوئے، واپسی میں ایک سوکھے درخت پر وہی نیل کنٹھ بیٹھا تھا۔

شمشاد بولا۔ ”یار یہ کاہل سست اور نہایت کمزور سا نظر آنے والا پرندہ بھی خوب ہے ہر کوئی اس کی طرف دوڑتا ہے اور پکڑنا چاہتا ہے مگر یہ کسی کے ہاتھ نہیں آتا۔“

حمزہ بولا۔ ”یہ کاہل نظر آتا ہے مگر ہے نہیں اور اس کی ہوشیاری بھی تم نے دیکھی ہے کہ جب دو چار قدم تم اس سے دور ہوتے ہو تب اڑتا ہے تا کہ تمہاری پکڑنے کی امید باقی رہے اور تم دوبارہ اس کی طرف دوڑو، اس طرح تم کو یہ دوڑاتا ہے، یہ کسی کے ہاتھ نہیں آتا، یہ بچوں سے کھیلتا ہے، شاید اس کو بھی اس کھیل میں مزا آتا ہے۔“

احمد بولا۔ ”ہاں یار یہ تو تم نے درست کہا میں نے نہیں دیکھا کہ کسی نے نیل کنٹھ کو پکڑا ہو۔“

وہ اس سوکھے درخت کے نیچے سے گزر گئے اور

نیل کنٹھ اڑ گیا۔

وقت گزرتا رہا۔ بچے بڑے ہوتے گئے اور جوان بوڑھے ہوگئے۔ کرامت میٹرک کے بعد شہر پڑھنے اپنی پھوپھی کے پاس آ گیا اس کے میٹرک کے نمبرا تنے اچھے تھے کہ بڑے آرام سے داخلہ مل گیا اور وہ تعلیمی مدارج طے کرنے لگا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ ہاکی اور فٹ بال کا بہترین کھلاڑی بھی تھا۔ اس کے کالج کی ٹیم اچھی ٹیم تھی اور اس ٹیم کا حمزہ بھی حصہ تھا۔ وہ کالج کے مقابلوں میں ہمیشہ نمایاں رہا کرتا تھا۔

پورے شہر کے تمام کالجوں کی ایک منتخب ٹیم بنائی گئی تو اس کا کیپٹن کرامت کو بنایا گیا۔ اور اس کے پورے ہندوستان کا دورہ کرایا گیا اور سب لڑکوں کو ایک ہفتہ کا ریسٹ دیا گیا۔ کرامت اپنے والدین کے پاس آ گیا۔ شام کو سیر کرتا وہ نہر کے کنارے چلا گیا اس نے دیکھا نیل کنٹھ سو کے درخت پر اداس سا بیٹھا تھا اس کے قریب کوئی نہ تھا اور کرامت بھی اکیلا تھا۔ کرامت اس درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا اور بولا...... ''نیل کنٹھ پٹواری اداس کیوں ہو، میں آ گیا ہوں، میں تمہارا دوست ہوں، میں پھر واپس یہاں پر ہی آؤں گا، میں ہاکی کے میچ کھیلنے جا رہا ہوں دعا کرنا جیت کر آؤں۔''

نیل کنٹھ نے اپنی پیدائشی عادت کے مطابق اس کی طرف دیکھا اور اڑ گیا۔

اور کرامت اپنی حماقت آمیز حرکت پر ہنس پڑا۔

''یہ بیچارہ پرندہ میرے لئے کیا کرے گا۔''

مگر اس کے ذہن میں یہ نیل کنٹھ بیٹھ گیا۔ پانچ دن کے بعد وہ واپس آ گیا مگر نا معلوم کیوں نیل کنٹھ اس کے ذہن کے ایک گوشے میں موجود رہا۔

ان کا سفر بمبئی سے شروع ہوا، ممبئی کے کالجوں کی منتخب ٹیم بہت متوازن تھی اس کے فارورڈ بہت تیز تھے، اور ڈیفنس بھی بہت مضبوط تھا، میچ بڑی تیزی سے شروع ہوا، کرامت کو دو کام کرنا تھے وہ وقت ضرورت اپنے ڈیفنس کی مدد بھی کرتا تھا اور فارورڈ کو بھی فیلڈنگ کرتا تھا اس لئے پوری فیلڈ میں وہ نظر آتا تھا، بمبئی کے فارورڈ نے بڑے بھرپور اور منظم حملے کئے مگر کرامت کے ڈیفنس نے ان کو ناکام بنا دیا، ایک دفعہ تو ایسا ہوا کہ گول کیپر بھی کٹ گیا مگر گول مین پر کرامت موجود تھا۔ اس نے صاف گول بچا لیا اور نہ صرف یہ کیا بلکہ ایک جوابی حملہ بھی کر دیا۔ گیند لیفٹ سے فارورڈ کو ملی اس نے فارورڈ کو پاس کیا مگر فارورڈ کے سامنے دو دفاعی کھلاڑی تھے۔ ڈی کے اندر گول کیپر بھی تھا اس نے رائٹ کو پاس کر دیا۔ دفاعی کھلاڑی اس کی طرف لپکے مگر اس نے عقل مندی یہ کی کہ گیند اپنے پاس نہیں رکھی اور نہایت ہوشیاری سے پاس کرامت کو دے دیا۔

کرامت کے سامنے ایک دفاعی کھلاڑی تھا۔

کرامت نے اس کو کاٹ کر کونے میں زوردار شاٹ مارا، گول کیپر بجلی کی تیزی سے اس پر لپکا مگر شاٹ زیادہ تھا تیز تھا بال گول کے اندر تختے پر ٹکرائی اور گول کیپر گول پوسٹ کے کھمبے سے ٹکرا کر گر پڑا اور اس کے ہاتھ میں چوٹ آ گئی۔

تماشائی اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے۔ اور سب واہ واہ کرنے لگے، حمزہ کی یہ ایک بڑی کامیابی تھی اس کے بعد بمبئی کے فارورڈ چڑھ دوڑے مگر کرامت چٹان بن کر گول لائن پر موجود رہا اور بمبئی کئی بار کامیابی کے قریب پہنچ کر بھی گول نہ کر سکی۔ انٹرویل ہوا اس وقت کرامت کی ٹیم ایک گول سے جیت رہی تھی۔ کرامت کے کھیل کی سب تعریف کر رہے تھے۔

انٹرویل کے بعد بھی بمبئی کے فارورڈ کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی اور جب بھی موقع ملا کرامت نے ان کے گول پر بھرپور حملے کئے اور آخر تک وہی ایک گول برقرار رہا اور کرامت کی ٹیم یہ مشکل میچ جیت گئی، میچ کے بعد اس کے ذہن میں نیل کنٹھ کا خیال آ گیا اور وہ بولا۔

''واہ نیل کنٹھ پٹواری خوب کام دکھایا۔''

اس کا ایک ساتھی قریب تھا بولا۔ ''کیا کہا کپتان میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔''

کرامت بولا۔ ''تیرے سمجھنے کو میں نے نہیں

کہا ہے۔“

تین میچ بمبئی میں ہوئے اور تینوں میں کرامت کی ٹیم جیت گئی اب پونا کا نمبر تھا۔

پونا کی ٹیم بھی کمزور نہ تھی مگر صرف ایک میچ برابر کرسکی دو ہار گئی۔ اب اور شہروں کے لوگوں کو خیال آیا کہ یہ چھوٹے شہر کی ٹیم اور بڑے شہروں کی ٹیموں پر حاوی آرہی ہے۔ تو انہوں نے سیاسی چال بازیاں شروع کردیں اور اعتراضات اٹھادیئے مگر کچھ نہ ہوا۔ الہ آباد لکھنو اور پھر دلی کی ٹیم بھی ہار گئی، جنوب میں حیدر آباد اورنگ آباد میں اچھے کھلاڑی تھے مگر نو آمیز اور نوجوان کی شاندار کارکردگی کے سامنے ان کی نہ چلی، کرامت کی ٹیم جھنڈ سے گاڑتی آگے بڑھتی رہی۔

پنجاب میں بھی اچھی ہاکی کھیلی جاتی ہے مگر پھر بھی کوئی ٹیم کرامت کی ٹیم پر گول نہ کرسکی، وہ سب کرامت کی حیرت انگیز کارکردگی سے پریشان تھے وہ پوری فیلڈ میں نظر آتا تھا اور حملے کے وقت گول مین موجود ہوتا تھا اس کا ڈیفنس بے داغ تھا، ڈی میں اس نے کبھی فاؤل نہیں کیا تھا۔

ہاری ہوئی ٹیموں نے اس کو زخمی کرنے کی کوشش کی مگر وہ مسکراتا رہا اس کو کچھ نہ ہوا۔ اس نے کسی کو مارنے یا غصہ اتارنے کی کوشش نہیں بلکہ اپنے کھیل پر توجہ کی اور اپنی ٹیم کی کمزوریوں پر نظر رکھی، ہر میچ کے بعد وہ لڑکوں کی میٹنگ بلاتا اور ان کو بتاتا کہ کس نے کس مقام پر غلطی کی ہے، اس طرح اس کے کھلاڑیوں کی غلطیاں دور ہوتی گئیں اور کرامت کی ٹیم جب واپس آئی تو وہ ایک بہترین ٹیم تھی اس کے لڑکے کم عمر اور پھرتیلے تھے اور ان کا قائد ایک مکمل ہاکی کا کھلاڑی تھا۔

واپس آنے کے بعد کرامت کی عزت کالج میں اور شہر میں بہت بڑھ گئی۔

مگر کرامت کے والد کی خواہش تھی کہ کرامت تعلیمی میدان میں بھی نمایاں رہے، دورے کی واپسی کے بعد وہ گھر آگیا، سارے لوگوں نے اس کا بڑا شاندار استقبال کیا اور اس کے والد کو مبارکباد دی۔

روح

جسم کی کوئی حیثیت نہیں۔ زندہ رہنے والی چیز تو روح ہے، اگر زندگی میں کبھی ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو جسم کو کبھی اولیت مت دینا، اس پر لگے داغ اور اذیت کے تمام نشانات کبھی نہ کبھی اپنی موت مرجاتے ہیں لیکن روح کا معاملہ بالکل الگ ہے، اسے کبھی داغ دار مت ہونے دینا، ورنہ ساری زندگی جہنم کا ایندھن بنے رہوگے۔

(شرف الدین جیلانی۔ٹنڈوالہ یار)

شام کو کھانے کے بعد اس کے والد نے کہا۔

”بیٹا یہ کھیل تو چند روز کے ہوتے ہیں میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری ساری توجہ کھیل پر لگ جائے اور تعلیم سے تم غافل ہوجاؤ، اصل چیز تو تمہاری تعلیم ہے اس پر توجہ کرنے کی ضرورت زیادہ ہے۔“ کرامت نے کہا۔

”ابا میں تعلیم کی طرف سے غافل نہیں ہوں۔“

والد نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں تم لاپرواہ نہیں ہو، مگر ابھی کم عمر ہو، گہرائی کی باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی، شہرت اور لوگوں کی واہ واہ تم کو بھٹکا سکتی ہے، تم اپنے مقصد کو بھول سکتے ہو تم جانتے ہو میری زندگی کے تم حسین خواب ہو، میں نے زندگی بھر لکڑی چھیلی ہے اس لکڑی سے اوزار بنائے ہیں اور اپنا کام ایمانداری سے کیا ہے اور تمہارے پیٹ میں حلال کی روٹی ڈالی ہے تم اب خود پڑھ لکھ کر مجھ سے زیادہ جانتے ہو تم نے اتنی کم عمر میں پورا ہندوستان گھوم لیا ہے اور میں کبھی باہر نہیں گیا۔ اس پر بھی میری عمر کا تجربہ تو ہے، تعلیم بہت کچھ سکھاتی ہے انسان کے دماغ کے بند دریچوں کو کھول

دیتی ہے۔ مگر تجربہ ان میں روشنی پیدا کرتا ہے جو لوگ اپنے بزرگوں کے تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ بہت کامیاب زندگی گزارتے ہیں۔“

کرامت بولا۔ ”ابا آپ کی شخصیت میرے لئے ہمیشہ مشعل راہ رہی ہے میں فخر سے اپنے دوستوں کو بتاتا ہوں، مجھے کبھی ذرا سی جھجک اور شرم نہیں آتی کہ میں ایک بڑھئی کی اولاد ہوں، میں فخر کرتا ہوں آپ پر۔“

والد نے بیٹے کو گلے لگالیا اور بولے۔ ”تم نے آگے جانا ہے تمہارے ماتھے پر کامیابیاں تحریر ہیں، تم بہت نام پیدا کرو گے، تم ہر لائن میں کامیاب ہوگے، جن بچوں کے ساتھ ان کے والدین کی دعائیں ہوتی ہیں وہ ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں یہ میرا کہنا نہیں ہے یہ میں اپنے بزرگوں سے سنتا آرہا ہوں۔ اور تم بھی اپنی اولاد کو یہ بات ضرور بتانا۔“

کرامت کے جو دوست تھے وہ سب قصبے سے باہر تھے جو تھے وہ اس کو جانتے نہ تھے، تو وہ اکیلا ہی باغوں کی تفریح کرنے نکل گیا، سب کچھ ویسا ہی تھا کوئی تبدیلی نہیں آئی، وہاں پر وہی بیریوں کے جھنڈ اور ان پر چڑیوں کے گھونسلے۔

وہ اور آگے بڑھ گیا اور وہی سوکھا درخت، کرامت نے سوچا یہ درخت کب سے سوکھا کھڑا ہے۔ اور اور اس درخت کی ایک نیچی ٹہنی پر نیل کنٹھ گیا۔ ”یہ وہی میرا دوست نیل کنٹھ“ ہے اس نے دل میں سوچا اور اس کے قریب چلا گیا۔ ٹہنی پر سے نیل کنٹھ اڑا نہیں کاہلی سے بیٹھا رہا۔

کرامت اس کے نزدیک چلا گیا اور بولا......

”یار تم وہی ہو میرے دوست یا کوئی اور، بات یہ ہے کہ تم سب ایک جیسے تو ہو میں کیسے پہچانوں کہ تم وہی ہو یا دوسرے ہو۔“ اور پھر خود ہی ہنسنے لگا۔

نیل کنٹھ نے دونوں پر پھیلا کر ایک انگڑائی لی اور بہت قریب ہونے پر بھی اڑا نہیں، کرامت کی طرف دیکھنے لگا۔ کرامت کی اور اس کی نظریں آپس میں ٹکرائیں اور کرامت کو یقین آگیا کہ یہ وہی نیل کنٹھ ہے۔

کرامت بولا۔ ”تم نے میرا انتظار کیا ہوگا مگر میں یہاں کب تھا، میں تو پڑھنے گیا تھا اور دو چار روز میں پھر چلا جاؤں گا تم کو پھر میرا انتظار کرنا پڑے گا تم میرے دوست ہو میری کامیابی کے لئے دعا کرنا مگر افسوس مجھے یہ ہے کہ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔“

نیل کنٹھ نے پھر بڑی کاہلی سے پر پھیلائے اور کرامت کی طرف دیکھا۔ پھر دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور کرامت کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اس کا دوست اس کی کامیابی چاہتا ہے۔ یہ ایک ذہنی رابطہ تھا۔ اس کے لئے کسی لفظ کی ضرورت نہ تھی کسی آواز کی ضرورت نہ تھی، ساری بات چیت لمحے سے بھی کم مدت میں ہوجاتی تھی اور فریقین سمجھ بھی جاتے تھے یہ کون سا سسٹم تھا کسی کو پتہ نہ تھا۔

آج کرامت پر صاف واضح ہوگیا کہ اس کا دوست نیل کنٹھ اس سے کس طرح بات کرتا ہے وہ حیران تو تھا مگر اس حیرت کو کوئی نام وہ نہیں دے سکتا تھا اور نہ کسی کو بتا سکتا تھا کہ ایک پرندہ نیل کنٹھ اس کا دوست ہے اور اس سے ذہنی طور پر بات بھی کرتا ہے یہ انوکھا رابطہ تھا انوکھا کھیل تھا، انوکھی بات تھی اس کی اس بات پر کون یقین کرتا، لوگ سن کر اس کا مذاق بناتے اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہ بات کسی کو نہیں بتائے گا۔

شام تک وہ نہر کے کنارے اور باغات میں پھرتا رہا اپنے بچپن کی یادوں کو تازہ کرتا رہا اور نیل کنٹھ اس کے قریب ہی رہا۔ شام ہوگئی تو وہ نیل کنٹھ کی طرف منہ کرکے بولا۔

”اچھا دوست اب میں جاتا ہوں پھر شہر سے آیا تو تم سے ملنے ضرور آؤں گا۔ تم یہیں پر ملنا۔ تمہاری یاد تو مجھے آئے گی مگر میں اس کا ذکر کسی سے نہیں کروں گا۔“

اور نیل کنٹھ نے پر پھیلائے کرامت کے سر کے اوپر سے گزرتا ہوا چلا گیا اور کرامت واپس گھر آگیا۔ اس حیرت انگیز ملاقات کا ذکر وہ کس سے کرتا حسب وعدہ خاموشی سے واپس شہر آگیا۔ اور اس نے

والد کی نصیحت کے مطابق اپنی پوری توجہ تعلیم پر مرکوز کردی اور تعلیمی میدان میں آگے بڑھتا رہا۔

اور یہ حیرت انگیز تبدیلی اس نے محسوس کی کہ جہاں اس کو کوئی مشکل درپیش ہوئی اس کے ذہن کے پردے پر نیل کنٹھ اڑتا ہوا آیا اور اس کی سمجھ میں اس مشکل کا حل آگیا امتحانات میں بھی اس کے ساتھ یہی ہوا اور وہ نہایت شاندار تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ فارغ ہوا اب اس کے سامنے مقابلے کا امتحان تھا۔

اس کے بعد وہ esp آفیسر بن جاتا۔ یہاں پر مقابلہ سخت تھا اس مقابلے میں وہ اکیلا مسلمان تھا اس کو اس مجبوری کی وجہ سے شامل کیا تھا کہ اس کا ریکارڈ بہت شاندار تھا مگر ہندو اس کے ساتھ اس کے باوجود بھی تعصب کر رہا تھا اور پرسب ہی ہندو تھے کسی کی مرضی نہ تھی کہ وہ esp آفیسر بنے اس کے باوجود وہ اس مقابلے میں موجود تھا۔ اس کے ذہن کے پردے پر نیل کنٹھ موجود تھا اور سب صحران اس کے خلاف ہونے پر بھی کچھ نہ کر سکے اور وہ کامیاب ہوگیا۔

اس کی کامیابی گویا قصبے کی کامیابی تھی رضا علی کی عزت میں ایک دم اضافہ ہوگیا اب وہ صرف بڑھئی نہ رہا۔ لوگوں کی نظروں میں احترام آگیا۔ بیٹے نے باپ کے مقام کو اونچا کردیا تھا۔

بیٹا کمشنر بن گیا تو باپ نے اس کی عزت کی خاطر کام کرنا بند کردیا۔ ماں باپ کی عزت بڑھ گئی۔ اور پھر کرامت کو ایک نئے مقام پر جانا پڑا۔ ملازمت ہی ایسی تھی جانا تو تھا۔

والد نے مجبوری میں اپنا گھر چھوڑا اور بیٹے کے ساتھ پیلی بھینٹ بریلی آگئے، سرکاری رہائش گاہ ملی اور نوکر چاکر، والد یہاں پر خوش نہ تھے، ماں بھی خوش نہ تھی وہ جلد از جلد کرامت کا گھر بسانا چاہتی تھی، مگر یہ نئی جگہ تھی، کسی سے جان پہچان نہ تھی، سب عزیز تو پرانے شہر میں تھے۔ کرامت کی ذمہ داریاں زیادہ تھیں۔ روز ہی اس کے پاس نئے نئے کیس آتے تھے۔

ایک کیس اس کے پاس آگیا یہ ایک مسلمان عورت کا کیس تھا اس کا خاوند عورت کو طلاق دینا نہیں چاہتا تھا اور عورت اس کے پاس رہنا نہیں چاہتی تھی۔ عورت کا موقف تھا کہ ''یہ آدمی نہایت اجڈ اور گنوار ہے وہ ایک تعلیم یافتہ عورت ہے آدمی کا سلوک اچھا نہیں ہے۔''

مگر آدمی ضدی اور زمیندار تھا وہ کسی حالت میں عورت کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

دونوں کے بیانات سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ دونوں میں لچک نہیں ہے، مرد نے اپنی انا کا مسئلہ بنایا ہوا ہے اور عورت اس کی شکل سے بیزار تھی، راضی نامے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ کرامت نے دونوں کو الگ الگ بلا کر سمجھایا مگر دونوں طرف ضد موجود تھی۔

احمد یار زمیندار تھا اس کا ایک مقام اس کی جگہ پر تھا اگر وہ طلاق دے دیتا تو عورت کی جیت ہوجاتی اور احمد یار کی عزت مٹی ہوجاتی اس نے کرامت کو اکیلے میں کہا۔ ''کمشنر صاحب یہ تو آپ بھول جاؤ کہ میں اس کو طلاق دوں گا کیونکہ یہ بات اب پھیل چکی ہے کہ وہ مجھ سے طلاق لینا چاہتی ہے۔ آپ اس علاقے میں نئے ہو آپ کو پتہ نہیں ہے کہ یہاں کے ریت رواج کیا ہیں، میں ایک خاندانی آدمی ہوں میرے خاندان میں اب تک ایسا نہیں ہوا ہے، وہ میری حویلی میں میری بیوی بن کے آگئی تھی، اور اس کے ماں باپ نے خوشی سے شادی کی تھی، میں کہتا ہوں یہ بات اس کے ماں باپ کو پتہ تھی آج بھی میں ویسا ہی ہوں۔

ہم زمیندار لوگ ہیں۔'' وہ کہتی ہے میں اجڈ ہوں پڑھا لکھا نہیں، میرے مشغلے اس کو پسند نہیں، میں اس کے لئے اپنے دوستوں کو نہیں چھوڑ سکتا، وہ حویلی میں رہے اس کے لئے نوکر چاکر ہیں، مالکن بن کر موج کرے اور طلاق کا نام نہ لے، جو عورت حویلی میں آجاتی ہے وہ ہماری ہوجاتی ہے اس کو ہم کسی دوسرے کے لئے نہیں چھوڑتے یہی ہمارا دستور ہے ہماری خاندانی ریت ہے۔''

احمد یار میں ذرا لچک نہ تھی، کرامت نے ہر طرح کوشش کی مگر کامیابی نہ ملی۔

آمنہ خاتون نے کہا۔ ”کمشنر صاحب میں یہ نہیں کہتی کہ میرے باپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا، اس نے تو ظاہری نام نمود دیکھا تھا زمینداری دیکھی تھی اور میرے مستقبل کو بہتر کرنے کی کوشش کی تھی مگر شادی کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ظاہری طور پر جو کچھ نظر آتا ہے ویسا نہیں ہے۔ اس کی حویلی میں کئی جوان عورتیں رہتی ہیں وہ اس کی بیویاں نہیں ہیں، مگر بیویاں ہی ہیں۔ میں نے بہت برداشت کیا ہر طرح اس کو خوش رکھنے کی کوشش کی، خود پر جبر کیا مگر وہ نہ مانا۔

عورت اپنی ہر چیز تقسیم کرسکتی ہے مگر شوہر کو نہیں تقسیم کرتی، وہ ہر حالت میں اس کو اپنے آنچل میں باندھ کر رکھنا چاہتی ہے، میں جب ناامید ہوگئی تو میں نے طلاق کا مطالبہ کیا ہے اس کے بعد مجھے ہر طرح دھمکایا گیا، میرے باپ کو مار ڈالنے کی کوشش کی گئی وہ خود کو زمین کا خدا سمجھتا ہے سب کو اپنی جاگیر خیال کرتا ہے میں ایک پڑھی لکھی عورت ہوں اس کے اجڈ پن کے کاموں سے تنگ آکر میں نے فیصلہ کیا تھا اور آج میں سمجھتی ہوں کہ میرا فیصلہ غلط نہ تھا اس کی حویلی میں آج بھی کئی عورتیں ہیں اس کو میری ضرورت نہیں ہے بس ہٹ دھرمی ہے مگر میں نے طے کرلیا ہے کہ مرجاؤں گی مگر اس کی حویلی میں نہیں جاؤں گی۔“

کرامت کے لئے کوئی راستہ میل ملاپ کرانے کا نہیں تھا اس نے آخری حجت تمام کرنے کو زمیندار احمد یار کو طلب کرلیا اور کہا۔ ”آمنہ بیگم تمہارے ساتھ جانے پر راضی نہیں ہے بولو کیا کہتے ہو؟“

احمد یار بولا۔ ”زندہ نہیں جائے گی تو لاش لے جاؤں گا حویلی تو جانا پڑے گا۔“

”تم میرے سامنے اس قسم کی باتیں کررہے ہو جانتے ہو میں کون ہوں؟“

”ہاں جانتا ہوں آج تم ہو کل نہیں ہوگے اور تمہاری جگہ دوسرا آجائے گا، تمہاری ہمدردی کو بھی میں جانتا ہوں میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے، کمشنر تم مجھے بچہ سمجھتے ہو۔“

”ابھی تم نے صرف پانی پیا ہے میں تم کو شربت پلاؤں گا، تم نے میری ہمدردی کی کیا بات کی ہے۔“ کرامت بولا۔

”وہ بہت خوب صورت عورت ہے تعلیم یافتہ بھی ہے، یہ ہے وجہ ہمدردی کی۔“

”تم واقعی نہایت منہ پھٹ اور اجڈ آدمی ہو، میں نے تم دونوں کے درمیان راضی نامہ کرانے کی ذاتی کوشش اس لئے کی ہے کہ تم مسلمان ہو، میں اس بات کو اسکینڈل بنانا نہیں چاہتا تھا اور تم نے نہایت بے غیرتی سے مجھ پر ہی الزام لگا دیا اب تم پیشی پر آنا اور اپنا فیصلہ سن لینا۔“

وہ غصے سے کھڑا ہوا اور بولا۔ ”دیکھ لوں گا تجھے بھی میں بے ہاتھ پیر کا نہیں ہوں۔“ اور وہ چلا گیا۔

کرامت جانتا تھا کہ احمد یار بڑا زمیندار ہے اور نہایت گری فطرت کا مالک بھی ہے وہ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ وہ گھر آگیا اور کھانا وغیرہ کھا کر بستر پر لیٹ گیا گرمیوں کے دن تھے، پنکھا چل رہا تھا۔ اور کھڑکیاں کھلی تھیں، ابھی اس کو نیند نہیں آئی تھی اس کی نظر کھڑکی کی طرف گئی تو اس نے دیکھا کہ کھڑکی کی جالی پر ایک پرندہ موجود ہے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور غور سے اس کو دیکھنے لگا، کمرے کی روشنی میں صاف نظر آرہا تھا کہ وہ نیل کنٹھ ہے۔

کرامت اس کو دیکھ کر خوش ہوگیا اور بولا۔ ”خوب آئے میرے دوست مجھے تمہاری ضرورت تھی۔“

نیل کنٹھ نے پر پھیلائے اور کرامت کی طرف دیکھا اور نیل کنٹھ کا جواب کرامت کی سمجھ میں آگیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تم نے اپنی سی کوشش کرلی مگر سوکھی لکڑی سیدھی نہیں ہوتی اب تم کچھ نہ کرنا میں کروں گا۔“

کرامت نے پوچھا۔ ”تم کیا کروگے یہ تو بتاؤ۔“

نیل کنٹھ نے پھر پر پھیلائے اور جواب کرامت کے ذہن میں موصول ہوا۔

"وہ تمہارے خلاف کل سے کارروائی کرے گا تم پر قاتلانہ حملہ کرائے گا اپنا اثر رسوخ استعمال کرے گا، دولت خرچ کرے گا اس نے جاتے ہی سارے پروگرام بنالئے ہیں مگر وہ کچھ نہ کرسکے گا تم بے فکر ہو کر سو جاؤ۔" اور نیل کنٹھ کھڑکی سے غائب ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد کرامت بولا۔ "واہ میرے دوست! تم نے تو مجھے بے فکر کردیا!!"

نیل کنٹھ نے جو کہا تھا وہی ہوا، کرامت کے خلاف کچھ نہ ہوا البتہ احمد یار کے بارے میں پتہ چلا کہ اس کی زبان اکڑ گئی ہے وہ بات کرنے کے قابل نہیں ہے حکیم ڈاکٹر علاج کررہے ہیں، مگر مرض سمجھ میں نہیں آرہا تھا، احمد یار کے کرامت کے خلاف سارے پروگرام دھرے کے دھرے رہ گئے۔

احمد یار کا مرض اور بڑھا اور اس پر سخت خطرناک پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ وہ ڈاکٹروں کو مارنے لگا، سول اسپتال پیلی بھیت میں داخل کردیا گیا اور وہاں پر ڈاکٹروں کے بورڈ نے اس کو خطرناک پاگل قرار دے کر پاگل خانے میں داخل کردیا۔

اور آمنہ کو ایک طرف کارروائی کے بعد خلا مل گیا۔

اس کیس کے بعد کئی اور بھی پریشان کن حالات نے کرامت پر حملہ کیا مگر وہ حیرت انگیز طور پر صاف بچ گیا۔ آمنہ کو دوسری شادی کرنے کا اختیار عدالت نے دے دیا تھا۔

ایک دن ایک آدمی اس کے گھر آگیا اور وہ اس کے والد سلامت سے ملا، شام کو سلامت نے بتایا کہ "آمنہ کا باپ آیا تھا، آمنہ نے اب تک شادی نہیں کی ہے، وہ تمہارے لئے پیغام لائے تھے اس میں آمنہ کی مرضی بھی شامل ہے، سوچ لو، وہ طلاق یافتہ عورت ہے عمر تو زیادہ نہیں ہے، مگر تم کنوارے ہو۔" یہ خبر کرامت کے لئے تعجب خیز تو تھی مگر اس نے جواب نہیں دیا۔

اسی رات نیل کنٹھ اس کے پاس تھا اور اس کا ذہنی رابطہ کرامت سے ہوا تو نیل کنٹھ نے کہا۔

"تمہارے لئے وہ بہترین بیوی ثابت ہوگی، تمہاری اولاد اس کے بطن سے ہوگی دیر نہ کرو، اور شادی کرلو۔" اب کرامت کے لئے انکار کی ذرا گنجائش نہ تھی اس کے دوست نیل کنٹھ کا مشورہ تھا۔

اور پھر یوں ہوا کہ نہایت سادہ طریقے پر دونوں کا عقد ہوگیا اور آمنہ خاتون کرامت کی بیوی بن کر اس کے گھر آگئی۔ اور کرامت کا تبادلہ سہارن پور ہوگیا۔

وہ اپنی جائے پیدائش سے دور ہوتا جارہا تھا مگر اس کے باوجود ہر مشکل وقت میں نیل کنٹھ اس کے پاس آجاتا تھا۔ وقت بدل رہا تھا، سیاسی حالات تبدیل ہورہے تھے۔ ہندو مسلمانوں کو برداشت نہیں کررہا تھا، انگریزوں کا بستر گول ہورہا تھا، مسلمان آفیسر پر ہندوؤں کی نظریں تھیں۔ اور کرامت ایک نہایت ہی اندرونی علاقے میں ڈیوٹی پر تھا اس کے چاروں طرف ہندو تھے، متعصب ہندو لیڈروں نے اس کے خلاف خوب پروپیگنڈا کیا تھا اس علاقے سے کرامت کا نکلنا ناممکن نظر آرہا تھا اس وقت اس کے دو بچے تھے اور دونوں لڑکے بہت چھوٹے تھے، حالات پوری طرح اس کے خلاف تھے اور وہ سخت پریشان تھا کہ اس کے ذہن کے پردے پر نیل کنٹھ اڑتا ہوا آگیا اور بولا۔

"پریشان نہ ہو۔"

"میں تمہارے پاس ہوں، مجھے پتہ ہے تمہارے خلاف صرف اس لئے یہاں کے لیڈر ہیں کہ تم مسلمان ہو، مگر یہ تمہارا کچھ نہیں کرسکیں گے دو تین دن میں اس ملک کے لئے بڑے فیصلے ہوں گے۔ اس کے بعد تم اپنے لئے جو فیصلہ کرو گے میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

مگر رات کو اس کے بنگلے پر بلوائیوں نے حملہ کردیا۔ وہ اس کو اور اس کے بیوی بچوں کو تلاش کرتے رہے اور یہ لوگ آرام سے اپنے کمرے میں سوتے رہے وہ سب اندھے ہوگئے اور کرامت کو تلاش نہ کرسکے۔

اور پھر ہندوستان تقسیم ہوا، کرامت نے پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیا اور وہ دلی کے لئے روانہ ہوا

اس نے ضروری سامان ٹرک میں ڈالا خود بھی اس ٹرک میں اور بچے والدین بھی کیونکہ حالات اتنے خراب تھے کہ اس کا اپنے علاقے سے نکلنا ناممکن تھا وہ مشہور آدمی تھا۔ اس کے بہت دشمن تھے، اور جو دوست تھے ان پر بھی بھروسہ کرنا مناسب نہ تھا صرف ایک دوست تھا۔

نیل کنٹھ جو اس کا بے لوث دوست تھا اور اس نے اس کے بھروسے پر ہی سہارن پور سے دلی تک کا سفر کرنا تھا، دلی جانا ضروری تھا، کچھ سرکاری کام اور کاغذات حاصل کرنا تھے۔ علاقے کے بلوائی جانتے تھے، کرامت جانے والا ہے، انہوں نے اس راہ میں پوری پوری رکاوٹیں کھڑی کردی تھیں، ہر موڑ پر آدمی موجود تھے اس کا ڈرائیور ایک ریٹائر فوجی تھا اور مسلمان تھا اس کے گھر کے تمام افراد شہید ہوچکے تھے، ٹرک میں سامان اس طرح رکھا گیا تھا کہ درمیان میں جگہ تھی، وہاں پر گدے ڈال دیئے تھے اور سب ان پر بیٹھ گئے۔

کرامت ڈرائیور کے ساتھ تھا اور اس کے پاس بھری ہوئی دو بندوقیں تھیں، ٹرک پرانا ضرور تھا مگر فوجی تھا اور نہایت مضبوط اور طاقتور تھا اس کے علاوہ ڈرائیور نے اس کو اس سفر کے لئے تیار بھی کیا تھا، سلمان خان ڈرائیور دن بھر کرامت کے پاس رہا تھا اور ٹرک کی ایک ایک چیز چیک کرتا رہا۔

شام کو نکلنے کا پروگرام تھا سلیمان خان بولا۔ ''سر کھانے کا دو تین وقت کا اور پانی کا پورا بندوبست ہونا چاہئے، آگے کے حالات کا پتہ نہیں ہے سنا ہے پانی پت اور سونی پت میں حالات بہت خراب ہیں۔ امرتسر کی طرف لدھیانہ اور اس کے اطراف میں سکھ بلوائی قتل عام کررہے ہیں۔ دلی پہنچ گئے تو پھر آگے کی طرف کا راستہ تلاش کریں گے آپ سرکاری کاغذات لے لینا۔''

کرامت نے کہا۔ ''سلمان خان تم بے فکر ہوکر سفر کرو، خدا تمہاری اور میری فیملی کی حفاظت کرے گا۔

سلمان خان بولا۔ ''تمہاری بات درست ہے میں نے برما کے محاذ پر سینکڑوں کو مارا اور زندہ آگیا، مگر اپنی فیملی کو نہ بچاسکا صرف آدھے گھنٹے کو باہر گیا تھا واپس آیا تو کچھ نہیں تھا گھر کی جگہ جلا ہوا راکھ کا ڈھیر تھا اور اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ مگر میں پھر بھی رویا نہیں ہوں، میں فوجی ہوں، مقابلہ کرنا جانتا ہوں اور مرنا جانتا ہوں مجھے موت کا ڈر نہیں ہے، آپ اپنا خیال رکھنا اور اگر میں مرجاؤں تو آپ کو خود یہ ٹرک چلانا ہوگا میں نے آپ کو اس کے بارے میں بتادیا ہے۔''

اور رات آٹھ بجے یہ قافلہ روانہ ہوا پہلے موڑ پر ہی کچھ لوگ ڈھاٹے باندھے ہاتھوں میں ہتھیار لئے سڑک پر آگئے اور رکنے کا اشارہ کیا سلمان خان نے ذرا اسپیڈ کم کی اور قریب پہنچ کر سڑک کا انجن زور سے غرایا اور ان کے اوپر سے گزر گیا کئی زمین پر گر پڑے ٹرک بہت تیز تھا ان سے دور ہوتا گیا، دو تین میل چلے تھے کہ پھر رکاوٹ آئی مگر ٹرک اس رکاوٹ کو بھی توڑ گیا۔

کرامت دیکھ چکا تھا کہ ٹرک کے اوپر نیل کنٹھ پرواز کررہا ہے، جب بھی خطرہ ہوتا تھا وہ ٹرک کے قریب آجاتا تھا اور کسی نہ کسی طرح ٹرک خیریت سے گزر جاتا تھا، دلی شہر کے اطراف میں قتل و غارت گری کا بازار تھا، آنے والوں اور جانے والوں کو قتل کیا جارہا تھا، ان کا اسباب اور عورتوں کو اغوا کیا جارہا تھا، مردوں کے قتل سے خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں، سڑک سرخ تھی جابجا لاشیں پڑی تھیں، ان پر گدھ منڈلا رہے تھے، زخمی آہ وزاری کررہے تھے اور کرامت کا دیوہیکل ٹرک چلا جارہا تھا۔ اس پر گولیاں بھی برسائی گئیں، راستے میں رکاوٹیں بھی کھڑی کی گئیں مگر یہ ملٹری میک ٹرک ان رکاوٹوں کو توڑتا گزر گیا۔

بہت دفعہ تو ایسا ہوا کہ بلوائیوں کو یہ فوج کا ٹرک نظر آیا اور وہ اس کو دیکھ کر خود بھاگ گئے۔

دلی شہر کی حالت بھی خراب تھی ہر طرف افراتفری اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔

ٹرک اجمیری گیٹ کی پولیس چوکی پر رکا، کرامت اتر کر اندر گیا، اور اس نے بتایا کہ وہ کون ہے تو پولیس نے ٹرک کو چاروں طرف سے گھیر کر اپنی حفاظت

میں لے لیا۔ انچارج نے بتایا کہ ''سر ہمارے پاس اتنی نفری نہیں ہے کہ ہم حالات پر قابو کرسکیں۔''

کرامت نے کہا۔ ''میں رات کو یہاں رکنا چاہتا ہوں کیونکہ شہر کا کوئی حصہ پرامن نہیں لگتا، صبح میں کچھ سرکاری کام کروں گا۔''

انچارج نے کہا۔ ''ہاں یہ میں کرسکتا ہوں کہ آپ کی حفاظت یہاں پر کرسکوں۔''

کرامت نے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

انچارج بولا۔ ''سر میرا نام دھیان چند اگر وال ہے۔''

کرامت بولا...... ''دھیان چند میرے ساتھ دغا کرنے کی کوشش نہ کرنا اگر کرو گے تو زندگی بھر خود کو عذاب میں ڈال لو گے، میرے ساتھ میرے بچے اور ماں باپ بھی ہیں اور وہ ٹرک میں ہیں، کوئی کمرہ خالی کرو، اس میں بستر ڈلواؤ تاکہ میں ان کو اتاروں۔''

انچارج حیرت سے بولا۔ ''ٹرک میں تو صرف سامان نظر آتا ہے۔''

کرامت بولا۔ ''تم وہ کرو جو میں نے کہا ہے زیادہ کرید کرنے کی کوشش نہ کرو۔''

فوراً ایک کمرہ خالی ہوا اس میں دریاں ڈالی گئیں اور سب لوگ ٹرک سے اتر کر وہاں آگئے۔

سلمان خان نے کہا۔ ''اب رات کے کھانے کا انتظام کرنا ہے، یہ کام میں خود کروں گا ان پولیس والوں پر بھروسہ نہیں کروں گا، چاندنی چوک پر یا جامع مسجد کے اطراف میں مسلمانوں کے ہوٹل ہیں۔ میں وہاں جاتا ہوں اور کھانا لاتا ہوں۔''

ٹرک کے اوپر نیل کنٹھ بیٹھا تھا۔ کرامت ٹرک کے پاس آیا۔ اور بولا۔ ''تم ٹرک کے ساتھ جاؤ میں یہاں رہتا ہوں۔''

سلمان خان نے ٹرک اسٹارٹ کیا اور چلا اس کے اوپر نیل کنٹھ پرواز کررہا تھا۔

دو گھنٹے کے بعد سلمان خان کھانا لے کر آگیا اس نے بتایا ''شہر کے حالات بہت خراب ہیں۔ سارا بازار بند ہے مسجد کے ہوٹل بھی بند تھے، مگر ایک دکاندار مل گیا، مسلمان تھا اس نے ٹرک فوجی سمجھا اور ڈر کے مارے دکان کھول کر روٹیاں پکائیں سالن گرم کیا اس دوران بلوائی آئے مگر ٹرک کو دیکھ کر بھاگ گئے، راستے میں بھی ایسا ہوا وہ ٹرک سے دور دور رہے، تعجب کی بات ہے ضرور اس ٹرک میں کچھ ہے لوگ اس کو دیکھ کر ڈرتے ہیں۔''

کرامت ہنس کر بولا۔ ''کیوں نہ ڈریں گے آخر سلمان خان فوجی کا ٹرک ہے۔''

''آپ کچھ بھی کہیں سر مگر میں نے محسوس کیا ہے کہ کوئی بات ہے ضرور میری سمجھ میں نہیں آرہی مگر ہے۔''

''چلو ہوگی مان لیا اب کھانا سب کو کھلاؤ اور آرام کرو تم بھی تھک گئے ہو گے۔''

رات کو کئی دفعہ چوکی پر حملہ کرنے کی کوشش کی گئی مگر ہر بار بلوائی گھبرا کر بھاگ گئے حالانکہ رات کو صرف چار پولیس والے تھے اور دو ہم تھے، سویرے دھیان چند آگیا اور حیرت سے بولا۔ ''رات کچھ ہوا تو نہیں۔''

سلمان خان رات کو بار بار اٹھا تھا اس کی نیند خراب ہوئی تھی، غصے میں بولا۔

''ایسا لگتا ہے تم نے تو پورا انتظام کیا تھا۔ مگر کچھ ہوا نہیں۔''

دھیان چند بولا۔ ''میں سمجھا نہیں خان صاحب آپ نے کیا کہا۔''

''سب کچھ سمجھ رہے ہو نا آخر پولیس والے ہو مگر میں بھی ایک فوجی ہوں، چھپ کر وار نہیں کرتا، بہادری سے لڑتا ہوں، بلوائی بار بار پولیس چوکی پر حملہ کرتے رہے اور آپ اپنے گھر آرام کرتے رہے۔ وقت بدل رہا ہے، دھیان چند ورنہ تم جیسے افسر دس سلوٹ مارتے، یہ تیرے سامنے کون ہے تجھے پتہ ہے۔''

دھیان چند شرمندگی سے بولا۔ ''آپ ناراض نہ ہوں میں آپ کے لئے ناشتے کا انتظام کرتا ہوں۔''

سلمان خان بولا۔ ''رات کو بھی کھانے کا اچھا بندوبست تم نے کر دیا تھا۔''

''غلطی ہوگئی معاف کر دیں۔''

سلمان بولا۔ ''آپ کچھ نہ کریں میں خود یہ کام کرلوں گا۔''

دھیان چند بولا۔ ''آپ لوگ پاکستان جا رہے ہیں، آخری خدمت ہمیں بھی کر لینے دیں۔''

''تم نے تو آخری خدمت کر لی دھیان چند اب اور نہ کرو تو بہتر ہے۔'' سلمان خان بولا۔

''سلمان نے ٹرک اسٹارٹ کیا اور جامع مسجد کی طرف روانہ ہوا جگہ جگہ دکانیں اور مکان جل کر کالے سیاہ پڑے تھے، روڈ پر اکا دکا گاڑیاں تھیں اور بازار بند تھا، جامع مسجد کے ہوٹل بھی بند تھے، سلمان خان نے ٹرک ایک ہوٹل کے سامنے روکا وہ ہوٹل شاید کسی ہندو کا تھا ایک دو آدمی اندر موجود تھے۔

سلمان خان نے کہا۔ ''کھانا چاہئے مل جائے گا۔'' کاؤنٹر پر جو آدمی تھا وہ بولا۔

''کھانا تو مشکل ہے پکانے والا کوئی نہیں آیا۔''

سلمان خان بولا۔ ''انڈے تو ہیں سات آٹھ پراٹھے پکوا دو کام چل جائے گا۔''

کاؤنٹر والا بولا۔ ''ہاں یہ ہو سکتا ہے تم ذرا انتظار کرو میں بندوبست کرتا ہوں۔''

سلمان خان نے دس کا نوٹ کاؤنٹر پر رکھ دیا اور بولا۔ ''میں گاڑی پر ہوں تم انتظام کرو میں ابھی آتا ہوں۔'' گاڑی کے اردگرد چار پانچ آدمی کھڑے تھے مگر قریب نہیں آرہے تھے، ان کے ارادے خطرناک لگتے تھے۔ سلمان خان کو دیکھ کر وہ سب چلے گئے، سلمان خان نے سوچا میں ٹرک پر نہیں جاتا تو یہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ سامان لوٹ لیتے ٹرک کو آگ لگا دیتے مگر یہ قریب نہ آئے، سلمان خان نہیں جانتا تھا کہ کرامت کا دوست ٹرک کی حفاظت کر رہا تھا اس نے کسی کو ٹرک کے قریب نہ آنے دیا، ان کے دلوں میں خوف پیدا کر دیا۔

سرکاری دفاتر بند تھے، تبادلے کے کاغذات کہاں سے ملتے، تین دن گزر گئے مگر ٹرانسفر لیٹر کے ملنے کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی اور بغیر اس کے کرامت جانا نہیں چاہتا تھا۔ رات کو اس نے تصور کے پردے پر نیل کنٹھ سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ کوئی تعاون نہیں کر رہا ہے میں کیا کروں؟''

نیل کنٹھ نے جواب دیا۔ ''کشور نندن تمہارے رینک کا آدمی ہے وہی یہ کام کرتا ہے مگر بہت متعصب اور مسلمانوں سے نفرت کرنے والا ہے۔ ہندو ہے اس نے جان بوجھ کر تم کو روکا ہوا ہے۔ مگر وہ کل خود تمہارے پاس آئے گا اور سارے ڈاکومنٹ تم کو دے گا۔''

کرامت سکون سے سو گیا، سویرے ناشتہ کیا ہی تھا کہ کشور نندن آ گیا اور بولا۔ ''سوری کرامت صاحب میں بہت مصروف تھا اس لئے دیر ہوگئی یہ آپ کے کاغذات ہیں، آپ کو پاکستان میں پریشانی نہیں ہوگی۔''

کرامت نے فائل لے کر تمام کاغذات کو چیک کیا پھر کہا۔ ''یہ فائل تو مکمل پڑی تھی مگر آپ کے دفتر میں کوئی ہوتا ہی نہیں ہے پھر آپ کہاں مصروف ہوتے ہیں۔''

نندن ذرا شرمندہ نہ ہوا بولا۔ ''یار اب تو تم جا رہے ہو خوش خوش جاؤ تلخ باتوں کو بھول جاؤ۔ تمہارے لیڈروں نے آخر اپنا ملک بنا ہی ڈالا اب تمہارا ہمارا کیا جھگڑا۔''

''یہ تو تم نے ٹھیک کہا جھگڑا تو کچھ نہیں ہے مگر تمہارے رویے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم لوگوں نے پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا اور جب تسلیم نہیں کیا تو آگے بھی آپ لوگ مشکلات پیدا کریں گے اس کو ختم کرنے یا نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے، معاف کرنا نندن صاحب میں نے یہ اندازے یہاں کی قتل گری اور آفیسروں کے رویے سے قائم کئے ہیں، شاید درست نہ ہوں۔'' کرامت نے کہا۔

''نندن ہنس کر بولا۔ ''ایسی بات نہیں ہے، میں آپ کے لئے ٹرانسپورٹ کا بندوبست کر دوں۔''

کرامت نے کہا۔ ’’میرے پاس ٹرک ہے، میں اس میں ہی دلی آیا ہوں اور دلی سے باہر بھی اسی میں جاؤں گا۔‘‘

نندن بولا۔ ’’میں خدمت کرنا چاہتا تھا خیر آپ کی مرضی آپ کب روانہ ہوں گے؟‘‘

’’کہہ نہیں سکتا ابھی دلی میں کچھ عزیزوں سے ملاقات کرنی ہیں۔‘‘

’’میں اس لئے پوچھ رہا تھا کہ آپ کی سیکورٹی کا بندوبست کرتا۔‘‘ نندن بولا۔

’’میں خود اپنی سیکورٹی کرسکتا ہوں، آپ یہ مہربانی نہ کریں اور اپنے انتظامات واپس لے لیں تو اچھا ہے میں بھی اسی رینک کا آدمی ہوں، آپ کی پاور اور پھیلاؤ کو جانتا ہوں۔‘‘ کرامت نے کہا۔

’’آپ کو کسی نے میرے بارے میں بہکا دیا ہے۔‘‘ نندن بولا۔

’’اگر ایسا ہے تو بھی میں اپنی سیکورٹی خود کروں گا۔‘‘

’’آپ کی مرضی۔‘‘ اور نندن برا سا منہ بنا کر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد سلمان خان کرامت کے پاس آگیا اور بولا۔ ’’اس کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں، آج رات کو ہی نکل جائیں تو بہتر ہے، میں نے کئی پیٹرول پمپ سے ٹینک فل کرالیا ہے اور دو کین بھی بھر لئے ہیں کافی لمبے سفر کے لئے پیٹرول ہے اس بدمعاش کو موقع نہیں دینا ہے۔‘‘

’’تو پھر کس طرف کا راستہ اختیار کرنا ہے؟‘‘ کرامت نے پوچھا۔

’’پنجاب کا راستہ تو بہت خطرناک ہے راجستھان میں راجواڑے ہیں ان میں جاٹوں کی حکومت ہے، بھرت پور ان میں سب سے آگے ہے صرف جے پور کا راجہ ایسا ہے جس نے امن رکھا ہوا ہے، وہاں تک جانے کو دوسری ریاستوں سے گزرنا پڑے گا اور وہی خطرناک ہوگا۔ اور اگر کوٹہ بوندی رتلام کی لائن پر چلیں تو پھر سمندری راستے سے کراچی جانا ہوگا۔

’’مگر اب تک یہ راستہ محفوظ ہے۔‘‘ سلمان خان نے بتایا۔

’’بمبئی پہنچ کر تم کو اپنا ٹرک چھوڑنا ہوگا یا فروخت کرنا ہوگا۔‘‘ کرامت نے کہا۔

’’اگر بک گیا تو ٹھیک ہے اور نہ بکا تو سڑک پر کھڑا کردوں گا اور آپ کے ساتھ کراچی جاؤں گا، اب اس ملک میں رہنے کو دل نہیں کرتا، وہاں اپنی حکومت ہوگی، آزادی ہوگی محنت کروں گا اور پھر ٹرک بنالوں گا کم ازکم اتنی قربانی تو میں بھی دے سکتا ہوں۔‘‘

کرامت نے کہا۔ ’’تمہارا جذبہ بڑا قیمتی ہے میں تمہارے ساتھ ہوں فکر نہ کرو، اور بمبئی کا راستہ پکڑلو اگر کوئی راہ میں آئے تو روند ڈالو۔‘‘

نندن کے خواب وخیال میں یہ بات نہ تھی کہ کرامت رات کو روانہ ہوجائے گا۔ دلی کی سڑکیں سنسان پڑی تھیں مگر چوراہوں پر لٹیرے موجود تھے ان کے منہ خون لگ گیا تھا، انسانیت کو وہ لوگ بھول چکے تھے ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے وہ کسی بھی گاڑی کو روک کر لوٹ لیا کرتے تھے۔ قانون اور پولیس نے ان کو چھوٹ دے رکھی تھی۔ یہ دس بارہ آدمیوں کا ٹولہ تھا وہ برابر مہادیو اور جے کالی کے نعرے لگاتے سڑک پر آگئے اور ٹرک روکنے کا اشارہ کرنے لگے، مگر ان کے قریب پہنچ کر ٹرک کا طاقتور انجن زور سے گرجا اور ان پر سے ٹرک گزر گیا، ٹرک کو ہلکا جھٹکا تو لگا مگر وہ سڑک پر گر پڑے اور بری طرح زخمی ہوئے۔

دلی شہر سے نکلتے نکلتے تین مقامات پر ایسا ہوا اور وہ گزر گئے، سلمان خان ماہر ڈرائیور تھا وہ ان کو دیکھ کر اسپیڈ کم کرتا تھا اور یہ تاثر دیتا تھا کہ ٹرک رک رہا ہے اور قریب پہنچ کر ان پر چڑھ جاتا تھا۔

ٹرک کے ٹائر خون میں لت پت تھے، خون کی ہولی ہورہی تھی جو بھاری تھا مار رہا تھا جو کمزور تھا، مر رہا تھا لٹ رہا تھا ہزاروں عورتیں ہندوؤں اور سکھوں کے قبضے میں تھیں اور موت کی دعائیں کرتی تھیں، دلی ایک

بار پھرلٹ رہی تھی اس کے نصیب میں لٹنا ہی لکھا تھا۔ اس شہر کی ہمیشہ سے بدقسمتی رہی ہے کہ ہر سو سال کے بعد ایک بار اجڑ جاتا ہے لٹ جاتا ہے اور ہزاروں جانیں چلی جاتی ہیں اس کی زمین خون سے سرخ ہوجاتی ہے، اس دفعہ مسلمانوں کا خون پی رہی تھی اور ہندو لیڈر اور پولیس جلتی پر تیل ڈال رہے تھے۔

ہر طرف جلے مکانات کے ڈھیر تھے، سڑکوں پر جابجا لاشیں پڑی تھیں اور ایک سوگواری کیفیت طاری تھی، یہ وہ شہر تھا جہاں پر مسلمانوں کا چراغ جلتا تھا جہاں پر مسلمانوں نے سینکڑوں سال حکومت کی اور سب کے ساتھ عدل وانصاف کیا۔ آج ان کے نام لیوا سڑکوں پر بے گوروکفن پڑے تھے، یہ انقلاب زمانہ ہے کبھی کے راجہ آج کے فقیر، آج وہ لوگ جو جھک جھک کر سلام کرتے تھے، سینہ تان کران کے سامنے کھڑے تھے اور کرامت یہ سب سوچتا سلمان خان کے ساتھ اگلی سیٹ پر موجود تھا اور صبح کے آثار نظر آرہے۔ ''یہ کون سی جگہ آرہی ہے؟'' کرامت نے پوچھا۔

''سر میں بھی اس سڑک پر پہلی بار ہی آیا ہوں رک کر پتہ کرتے ہیں اور ناشتہ بھی کرتے ہیں۔''

''دیکھ لینا علاقہ پرامن ہے کہ نہیں۔'' کرامت نے کہا۔

یہ کوئی بڑی جگہ نہ تھی، سلمان خان نے ایک گھنے درخت کے سائے میں ٹرک روک دیا اور نیچے اتر پڑا نیچے اتر کر بولا۔ ''سر جگہ تو پرامن لگتی ہے آپ بھی آجاؤ اور ابا اماں کو بھی اتار لو ناشتہ کریں گے۔''

سلمان خان بازار کی طرف چلا ہی تھا کہ اس کے پاس ایک آدمی تیزی سے چلتا ہوا آیا اور بولا۔

''تمہارا نام سلمان خان ہے؟''

سلمان خان حیرت سے بولا۔ ''تم کو کیسے پتہ چلا۔''

''ڈرائیور صاحب یہ بات نہ پوچھیں یہ بتائیں تم کرامت صاحب کو لے کر بمبئی جارہے ہو۔'' وہ آدمی بولا۔

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' سلمان خان بولا۔

''تو پھر فوراً آگے بڑھ جاؤ، دیر نہ کرو تمہارے تعاقب میں کوئی آرہا ہے۔''

سلمان خان فوراً سڑک پر آگیا اور بولا۔ ''سر جلدی کریں اور ٹرک پر چڑھ گیا۔'' کرامت بھی بیٹھ گیا۔ اور ٹرک تیزی سے روانہ ہوا۔

کرامت بولا۔ ''ہوا کیا تھا۔ ناشتہ تو کر لیتے؟''

''سر ہمارا تعاقب کیا جارہا ہے، پتہ نہیں کون تھا اس نے میرا نام اور آپ کا نام بتا کر اطلاع دی کہ فوراً روانہ ہوجاؤ آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ اس نئی جگہ پر کس نے اطلاع دے دی۔''

کرامت بولا۔ ''کوئی میرا یا آپ کا ہمدرد ہوگا میں کیا بتاؤں میں نے تو دیکھا بھی نہیں۔''

مگر کرامت اپنے مہربان دوست کو پہچان چکا تھا۔

چار گھنٹے کے سفر کے بعد پھر ایک ویسا ہی قصبہ آگیا۔ اور سلمان خان اتر کر جانے سے پہلے بولا۔

''آپ بھی تھک گئے ہوں گے میں حالات دیکھتا ہوں آپ ٹرک کے قریب ہی رہنا۔''

کرامت بھی اتر پڑا اور ٹرک کے پیچھے گیا، ابا کو آواز دی۔

سلمان خان اس طرف چلا گیا جدھر دکانیں نظر آرہی تھیں۔

روڈ اور حالات دونوں ہی خراب تھے اس روڈ پر لگتا تھا کم گاڑیاں آتی تھیں اس نے اس کی مرمت اور دیکھ بھال پر توجہ نہیں کی تھی، آبادیاں بھی دور دور تھیں، رتلام آتے آتے تین روز گزر چکے تھے۔ رتلام بڑا شہر تو نہیں ہے مگر شہر ہے آبادی ملی جلی ہے یہاں آنے میں بڑا چکر کاٹنا پڑا تھا مگر یہاں پرامن تھا بازار کھلے تھے۔

ایک سرائے نما ہوٹل کے سامنے سلمان خان نے ٹرک روکا اور ایک بڑا سا کمرہ لے لیا اور سب کو اتار کر اندر پہنچایا سب ہی ٹرک میں بے آرام تھے بچے

بہت چھوٹے تھے۔ والدین بوڑھے تھے جو کرنا تھا وہ حمزہ اوہ اور سلمان خان کو کرنا تھا۔ سب کے لئے کھانے کا بندوبست کیا، کئی دن کی بے آرامی اور سفر کی تھکان نے ان سب کو بے حال کر دیا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد سلمان خان بولا۔ ''سر پیٹرول کا بندوبست یہاں سے ہی کرنا ہے اور گاڑی کی بھی چیکنگ کرانی ہے آگے پتہ نہیں کیا حالات ہوں یہ سکون کی جگہ ہے۔'' کرامت نے سلمان خان کو ایک ہزار روپے دیئے اور کہا۔ ''جو کرانا ہے کرالو فکر نہ کرو دو چار دن رکنا بھی پڑے تو بھی یہاں رکا جا سکتا ہے۔''

سلمان خان بولا۔ ''آگے ایک شہر ہے جو کہ صرف ہندوؤں کا ہے اس کا خیال رکھنا ہوگا۔''

''وہ کون سا شہر ہے؟'' کرامت نے پوچھا۔

''اجین یہ خالص ہندو شہر ہے۔'' سلمان نے بتایا۔

کرامت نے جواب دیا۔ ''سلمان تم بے فکر رہو وہ جینیوں کی یاترا ہے۔

تم کو پتہ ہے ان کا اصول ہے کہ یہ کسی جاندار کو نہیں مارتے، یہاں تک کہ کیڑے مکوڑوں تک کو نہیں مارتے ان کے مذہب میں کسی کی جان لینا پاپ ہے یہ ہندو تو ہیں مگر ان کے اصول بہت الگ ہیں یہ لوگ انسانی اعضا کی پوجا کرتے ہیں اور بہت ہی امن پسند ہوتے ہیں۔''

''تو بھی ہم کو اپنی تیاری تو کرنا ہوگی۔'' سلمان خان نے کہا۔

گاڑی کا کام کرانے میں اور پیٹرول جمع کرنے میں تین روز لگے اور وہ آگے روانہ ہوئے، رتلام گزرتے ہی ایک حادثہ ہوا اور اچانک کرامت کی والدہ کی حالت بگڑی اس وقت یہ لوگ ایک گاؤں کے قریب تھے اور اس سے پہلے کہ کچھ علاج ہوا ان کا انتقال ہو گیا۔

گاڑی گاؤں کے بازار سے ہٹ کر کھڑی ہوئی، اتفاق سے اس گاؤں میں مسلمانوں کی آبادی تھی اور ایک مسجد بھی تھی، سلمان خان دوڑ کر مسجد میں گیا اور اس نے امام کو حالات بتائے اور پھر انہوں نے تدفین کا بندوبست کر دیا اور مسجد کے ساتھ قبرستان میں تدفین ہو گئی۔

سلامت بیوی کے اس طرح جدا ہونے پر بہت اداس ہو گئے۔ ''کرامت بیٹا تمہاری ماں کے نصیب میں اپنا پاک وطن دیکھنا نہیں تھا ارے ذرا اور رک جاتی اس کی مٹی کو تو چوم لیتی کیا پتہ میں بھی دیکھ پاؤں گا کہ نہیں۔''

رات اسی گاؤں میں گزارنی تھی اور اس کے ذہن کے پردے پر نیل کنٹھ موجود تھا۔

نیل کنٹھ نے کہا۔ ''صبر کرو تمہارا سفر بہت کٹھن ہے، میں نے تمہارے دلی کے دشمن کو بھٹکا کر بیکانیر کے ریگستان میں پہنچا دیا ہے آگے اجین ہے تم وہاں پر سکون سے دو چار دن آرام کرنا میں آگے کا راستہ دیکھ لوں گا۔''

اجین شہر کا ماحول ہی الگ ہے نہایت پر سکون یہ لوگ مہا بیر دیوتا کو مانتے ہیں۔ اور کپڑوں کا کم سے کم استعمال کرتے ہیں ان کے بھکشو جب یاترا کو نکلتے ہیں تو بدن پر صرف ایک لنگوٹی لگاتے ہیں کان ناک پیلی مٹی سے بند کر دیتے ہیں اور سارے بدن پر بھی مٹی کی تہہ چڑھا لیتے ہیں۔ اور ہر ایک کے کاندھے پر بہنگی ہوتی ہے۔ بہنگی کے دونوں طرف ان کی ضرورت کا سامان ہوتا ہے اور وہ اجین سے کتنی بھی دور ہوں، پیدل ہی سفر کرتے ہیں۔ اور ٹولیوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ مہینوں کے سفر کے بعد یہ بم بم بولے کے نعرے لگاتے اجین میں داخل ہوتے ہیں ان کے پیر سوج جاتے ہیں مگر یہ اجین پہنچ کر پھر بھی خوش ہوتے ہیں اور مہا بیر دیوتا کے درشن کرتے ہیں۔ یہ لوگ امن پسند ہیں نہ کسی سے لڑائی کرتے ہیں اور نہ کسی کے معاملے میں دخل دیتے ہیں یہ جینی کہلاتے ہیں۔

ایک ہفتہ کے بعد نل کنٹھ نے اطلاع دی کہ اب آگے سفر کرو کچھ شر پسند بمبئی سے آ گئے تھے۔ مگر وہ اب نہیں ہیں اور کرامت کا قافلہ روانہ ہوا سڑک پر آنا ضرور تھا مگر سلمان خان جیسا آدمی اس کی دیکھ بھال

کرتا تھا وہ خود اس کا ماہر ہو گیا تھا پورے اوزار اس کے پاس تھے اس کے باوجود وہ چیکنگ کراتا تھا اور صفائی کرتا تھا اس لئے ٹرک نے کہیں کمزوری نہیں بتائی تھی ٹرک اتنا بڑا تھا کہ سامان رکھنے کے باوجود درمیان میں گدے ڈال کر ایک چھوٹا سا کمرہ بنا دیا گیا تھا۔ بچے اور سب اس میں آرام کرتے تھے کرامت اور سلمان خان ساتھ ہوتے تھے۔

نیل کنٹھ نے جو کہا تھا وہی درست تھا سفر لمبا ضرور تھا مگر محفوظ تھا۔

ٹرک سڑک پر آہستہ آہستہ دوڑ رہا تھا کیونکہ سڑک ہموار نہیں تھی اور سلمان خان جانتا تھا کہ اس کے مسافر بچے بھی ہیں۔ وہ نہایت ہوشیاری اور سمجھ بوجھ کر گاڑی چلاتا تھا۔ سڑک کنارے کہیں کہیں کوئی درخت تھا دونوں طرف دور دور آبادی نظر نہ آتی تھی۔ اور سبزہ بھی نہیں تھا شاید اس علاقے میں پانی کی کمی تھی، سڑک کے کنارے پتھر پر لکھا تھا ابھی سو میل مگر روڈ کی حالت ایسی تھی کہ یہ سو میل چھ سات گھنٹے میں طے ہوں گے۔

سلمان خان بولا۔ ''صاحب کوئی بات کریں اگر نہیں کریں گے تو مجھے نیند آنے لگے گی۔''

''تم نے درست کہا خاموشی نیند بلاتی ہے۔ یہ علاقہ تو غیر آباد سا لگتا ہے۔''

سلمان خان بولا۔ ''ایک بات پوچھوں سر آپ ناراض تو نہیں ہوں گے۔''

''نہیں ناراضگی کی کیا بات ہے، میں تم کو کافی حد تک سمجھ چکا ہوں پوچھو کیا پوچھتے ہو؟''

''سر میں نے اس طویل سفر میں یہ بات محسوس کی ہے کہ آپ آگے کے سفر کے بارے میں بالکل ٹھیک ٹھیک اندازے قائم کرتے ہیں، میرا خیال ہے ان حالات میں کسی بھی مقام کے بارے میں اندازہ لگانا نہایت مشکل ہے کیونکہ لوگوں کی نظریں اس طرح بدلی ہیں کہ دوست دشمن ہو گئے ہیں زندگی بھر کی دوستیاں پاکستان کے وجود میں آتے ہی دشمنی میں بدل گئی ہیں۔ پھر آپ کے اندازے درست ہیں۔''

کرامت نے بڑے غور سے سلمان خان کی بات سنی وہ حیران بھی ہوا۔ سلمان خان کتنی گہرائی میں سوچ سکتا تھا وہ صرف ایک فوجی اور ماہر ڈرائیور ہی نہ تھا اس میں سمجھ تھی اس لئے جواب بھی ایسا دینا تھا کہ وہ تسلیم کر لے۔

کرامت بولا۔ ''تجربہ انسان کو سکھاتا ہے، تجربہ کسی درس گاہ میں نہیں ملتا وقت اور حالات دیتے ہیں۔ میں اپنے اندازے اسی کی روشنی میں قائم کرتا ہوں۔''

سلمان خان بولا۔ ''آپ شاید درست کہہ رہے ہوں مگر میرا دماغ کہتا ہے کہ بات اس سے بھی اوپر کی ہے، میں آپ کے قریب ہوں اور بہت حد تک آپ کو سمجھ بھی گیا ہوں۔''

''سلمان خان تم بہت حساس انسان ہو مگر یاد رکھو اس دنیا میں اسرار و رموز کے ایسے ایسے راز بند پڑے ہیں کہ انسانی عقل اس کو سمجھ نہیں سکتی۔ تم جو سمجھ رہے ہو وہ بھی درست ہو سکتا ہے۔ مگر میں بتا نہیں سکتا کسی کے راز کو کھولا نہیں جا سکتا جبکہ میں خود بات کو پوری طرح نہیں سمجھ پایا ہوں، ادھوری بات کرنا تجسس کو اور بڑھاتا ہے یہ بیماری اس قسم کی ہے کہ اس کا علاج نہیں ہے۔''

''سر میں پوری بات سمجھ نہیں سکا۔'' سلمان خان بولا۔

''عقل و دانش سے اوپر بھی کچھ ہے وہ ایک ایسی پراسرار دنیا کا وجود ہے کبھی کبھی اس پراسرار دنیا کا کوئی وجود ہمارے درمیان آ جاتا ہے۔ وہ نظر کچھ آتا ہے اور ہوتا کچھ اور ہے، اس کے باوجود کہ وہ قریب ہوتا ہے مگر پھر بھی دور ہوتا ہے اس کے بارے میں سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے، اس لئے اس سے پوچھا نہیں جاتا اور اس لئے نہیں پوچھا جاتا کہ وہ بتلائے گا نہیں یہ راز ہے اس کو کھولے گا سوال کرنے والا بھی گھاٹے میں اور جواب دینے والا بھی نقصان میں۔ اس نے جو ہے وہ ہے نہ تم بولو نہ میں بولوں والا معاملہ ہوتا ہے۔ صرف وہی سمجھ سمجھ کے مطابق چلتے رہو اگر اناڑی پن کرو گے تو

نقصان ہوگا، اس سے آگے میں کچھ نہیں کہوں گا۔“ کرامت نے کہا۔

”اور میں پوچھوں گا بھی نہیں کیونکہ دنیا میں ایسے بے شمار حیرت انگیز پراسرار ناقابل یقین واقعات رونما ہوچکے ہیں جن کے بارے میں آج تک کوئی توجیہ پیش نہیں کی جاسکی۔“ سلمان خان نے جواب دیا۔

”کرامت نے کہا۔“ تمہارا شکریہ سلمان خان کہ تم نے میری اشاراتی زبان کو سمجھ لیا اور مجھے کسی امتحان میں نہیں ڈالا۔“

”سر میں اتنا تو جانتا ہوں کہ انسان کے کچھ نہ کچھ راز ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کو وہ ہی جانتا ہے کسی اور کو نہیں بتا سکتا۔“ سلمان خان نے جواب دیا۔

”ایسا لگتا ہے اس روڈ پر کوئی گاؤں آباد ہے ہی نہیں۔“ کرامت نے کہا۔

”اب بمبئی قریب ہے اگر روڈ ٹھیک ہوتا تو ہم لوگ بمبئی پہنچ چکے ہوتے۔“

مراٹھی لباس اور تہذیب نظر آنے لگی تھی۔ بمبئی کے مضافات کی آبادی نظر آرہی تھی سلمان نے کہا۔ ”اب ہم بمبئی میں ہیں اور ہم محمد علی روڈ پر ہی رکیں گے۔ وہ خالص مسلمانوں کی آبادی ہے۔ رہنے کو ٹھکانا بھی مل جائے گا۔“

اب شہر شروع ہوگیا تھا سلمان نے ایک جگہ ٹرک روک کر محمد علی روڈ کا پتہ کیا اور پھر روانہ ہوا۔ زیادہ دیر نہ لگی اور ٹرک ایک مسجد کے سامنے سلمان خان نے روک کر کہا۔ ”آیئے پہلے رہنے کا بندوبست کرتے ہیں۔“ دونوں نیچے اتر پڑے اور مسجد کے اندر چلے گئے۔ جب وہ واپس آئے تو ان کے ساتھ ایک نوجوان باریش شخص بھی تھا۔ باہر آکر وہ بولا۔ ”سامان زیادہ ہے تو مزدور بلانا ہوں گے۔ آپ کتنے دن قیام کریں گے؟“

کرامت نے کہا۔ ”رحمت علی صاحب ہمارا قیام تو ٹکٹ ملنے سے مشروط ہے۔“

رحمت علی بولے۔ ”یہ آپ نے درست کہا جہاز کے ٹکٹ نہیں مل رہے ہیں۔ لوگ ایک ایک مہینے سے پڑے ہیں۔“

سلمان خان نے کہا۔ ”ٹرک میں زیادہ سامان نہیں ہے نظر آتا ہے اندر کمرہ ہے اور بچے ہیں۔“ رحمت علی نے حیرت سے کہا۔ ”ذرا بھی شک نہیں ہوتا کہ اندر بھی کوئی ہے خیر آپ لوگ ان کو اتاریں اور میرے ساتھ آئیں، آرام کریں، انشااللہ سب بہتر ہوگا، آپ لوگ لمبا سفر کرکے آئے ہیں، آرام کی ضرورت ہے۔“

کرامت اور سلمان خان نے سلامت اور بچوں کو اتارا۔

کرامت کی بیوی بولی۔ ”میرے تو پیر اکڑ گئے ہیں مجھے معلوم ہے کہ اب دوچار دن چلوں گی پھروں گی تو نارمل ہوجاؤں گی۔“

دو کمرے کا مکان ان کو رحمت علی نے دے دیا اور کہا۔ ”کھانے کے لئے یہ ہے کہ آپ لوگ مسجد کے ساتھ ہوٹل ہے وہاں کھالیں اور فیملی کے لئے لے آئیں نہایت مناسب ریٹ پر یہ انتظام یہاں کے مسلمانوں نے کیا ہے۔ اور اگر کسی امداد کی ضرورت ہو تو وہ بھی انتظام ہوسکتا ہے اسی شہر کے مخیّر حضرات نے اس کا بھی بندوبست کردیا ہے آپ بے فکر ہوکر رہیں، آپ کی ضرورت ہم پوری کریں گے۔“ کرامت نے رحمت علی کا شکریہ ادا کیا۔

کرامت اس سے پہلے بھی ایک دفعہ بمبئی آیا تھا یہ اس وقت کی بات تھی جب وہ پڑھتا تھا اور کھیلنے آیا تھا، آج وقت بدل گیا تھا آج وہ دوسرے حالات میں آیا تھا اس پر ایک ذمہ داری تھی اس وقت اس پر کوئی ذمہ داری نہ تھی، آج کے کرامت میں اور اس وقت کے کرامت میں بڑا فرق تھا۔

سلیمان کے ٹرک کا سودا ہوگیا اور ٹرک بک گیا۔ آمنہ خاتون اور سلامت بھی بہتر نظر آنے لگے، بچے بھی چاک وچوبند تھے۔ کرامت اور سلمان خان ٹکٹ حاصل کررہے تھے، رات کو کرامت اور سلمان کے ساتھ سلامت بھی کھانا کھانے ہوٹل گئے، رحمت علی ان کا انتظار کررہا تھا، کرامت کو دیکھ کر بولا۔ ”آپ کی امانت

میرے پاس ہے، آپ کھانا کھائیں میں لے کر آتا ہوں۔" اور وہ چلا گیا۔

جیسے ہی وہ کھانے سے فارغ ہوئے رحمت علی آ گیا اور اس نے کہا۔

یہ چار ٹکٹ سرسوتی جہاز کے ہیں وہ چار دن کے بعد برتھ پر آ جائے گا آپ لوگ سوار ہو جائیں۔"

کرامت بولا۔" آپ نے بڑی مہربانی کی ہے اس کی قیمت بتا دیں۔"

رحمت علی ہنس کر بولا۔" میں نے خریدے ہوں تو قیمت بتاؤں، کل شام کو مسجد کے دفتر میں ایک آدمی آیا تھا اس نے آپ کے نام کے یہ ٹکٹ بھی دیئے اور آپ تک پہنچانے کی ڈیوٹی لگائی۔ مجھے تو حیرت ہے کہ فرسٹ کلاس کے کیبن کے ٹکٹ اس نے کس طرح حاصل کر لئے۔"

کرامت نے کہا۔" میں سمجھ گیا ہمارا ایک ہمدرد اور دوست بمبئی میں ہے اس نے یہ کام کیا ہوگا۔"

"بہرحال جس نے بھی یہ کام کیا ہے بہت بڑا کام کیا ہے۔ میں نے بھی کوشش کی تھی اور کسی بھی کلاس کے ٹکٹ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر صرف وعدہ کیا گیا تھا۔"

کرامت سمجھ چکا تھا کہ یہ کام کس نے کیا ہے۔ اور کچھ کچھ سلمان خان بھی اندازے لگا رہا تھا۔

کرامت کے ابا بولے۔" تم نے کبھی اپنے بمبئی کے دوست کا ذکر نہیں کیا۔"

کرامت بولا۔" میرے نزدیک وہ قابل ذکر نہیں تھا اس لئے ذکر نہیں کیا تھا۔"

" مگر آج تو اس نے ثابت کر دیا کہ وہ قابل ذکر ہے۔" ابا بولے۔

سلمان خان نے کہا۔" ابا کبھی کبھی ناقابل ذکر بھی بڑے کام کر جاتے ہیں۔"

سرسوتی جہاز برتھ پر لگ گیا اور لوگوں کا اژدھام لگ گیا۔ ٹکٹ بلیک میں فروخت ہونے لگے، مگر فرسٹ کلاس کے مسافروں کو الگ راستے سے جہاز پر ان کے کیبن میں پہنچا دیا گیا۔ رات کو اس کی روانگی تھی اور کرامت ڈیک پر کھڑا سمندر کا نظارہ کر رہا تھا مگر اس کے تصور کے پردے پر نیل کنٹھ موجود تھا۔

کرامت نے کہا۔" نیل کنٹھ میں تمہارا کتنا شکریہ ادا کروں تم نے حق دوستی خوب نبھایا اور میں تمہارے لئے کچھ نہ کر سکا میں تم سے شرمندہ ہوں۔"

نیل کنٹھ بولا۔" دوستی کا مطلب لینا نہیں دینا ہے، یہ کاروبار نہیں ہے دوستی ہے۔ میں نے دوستی کی تھی کاروبار نہیں کیا تھا۔ آج تم مجھ سے جدا ہو رہے ہو، اب میں تمہارے کسی کام نہ آ سکوں گا، اگر تمہارا آنا ہندوستان میں ہو تو مجھے میرے پرانے مقام پر تلاش کرنا، آواز دینا میں آ جاؤں گا۔" جہاز کے ہوٹر کی آواز آ گئی اور نیل کنٹھ بولا۔ یہ ہماری تمہاری آخری ملاقات ہے۔"

کرامت اداس اداس واپس کیبن کی طرف روانہ ہوا۔ پھر نیل کنٹھ بولا۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ ایک نہ ایک دن، میں تمہارے سامنے انسانی شکل میں ملوں، میں یہاں سے کہیں دور نہیں جا سکتا، کیونکہ میرا تعلق جس مخلوق سے ہے، تو ہماری بھی ایک حد بندی ہوتی ہے، ہم اس حدود سے کہیں دور نہیں جا سکتے۔" اور تصوراتی رابطہ ختم ہو گیا۔

رولو کا آنکھیں بند کئے سن رہا تھا۔ پھر حکیم وقار کی آواز سنائی دی۔" حکیم صاحب کتاب ختم شد ہو گئی۔"

یہ سن کر رولو کا بولا۔" بہت خوب جواب نہیں! مصنف نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ یہ بالکل حقیقت ہے کہ جنات مختلف شکلیں اختیار کر لیتے ہیں۔ دیکھنے والوں کے لئے کچھ اور حقیقت میں کچھ اور ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے علاقے بھی الگ الگ ہوتے ہیں اور وہ اپنی حدود میں رہتے ہیں۔ خیر مصنف نے حقیقت کو بہت اچھے طریقے سے بیان کیا ہے۔" پھر حکیم وقار اور رولو کا اپنی اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ (جاری ہے)
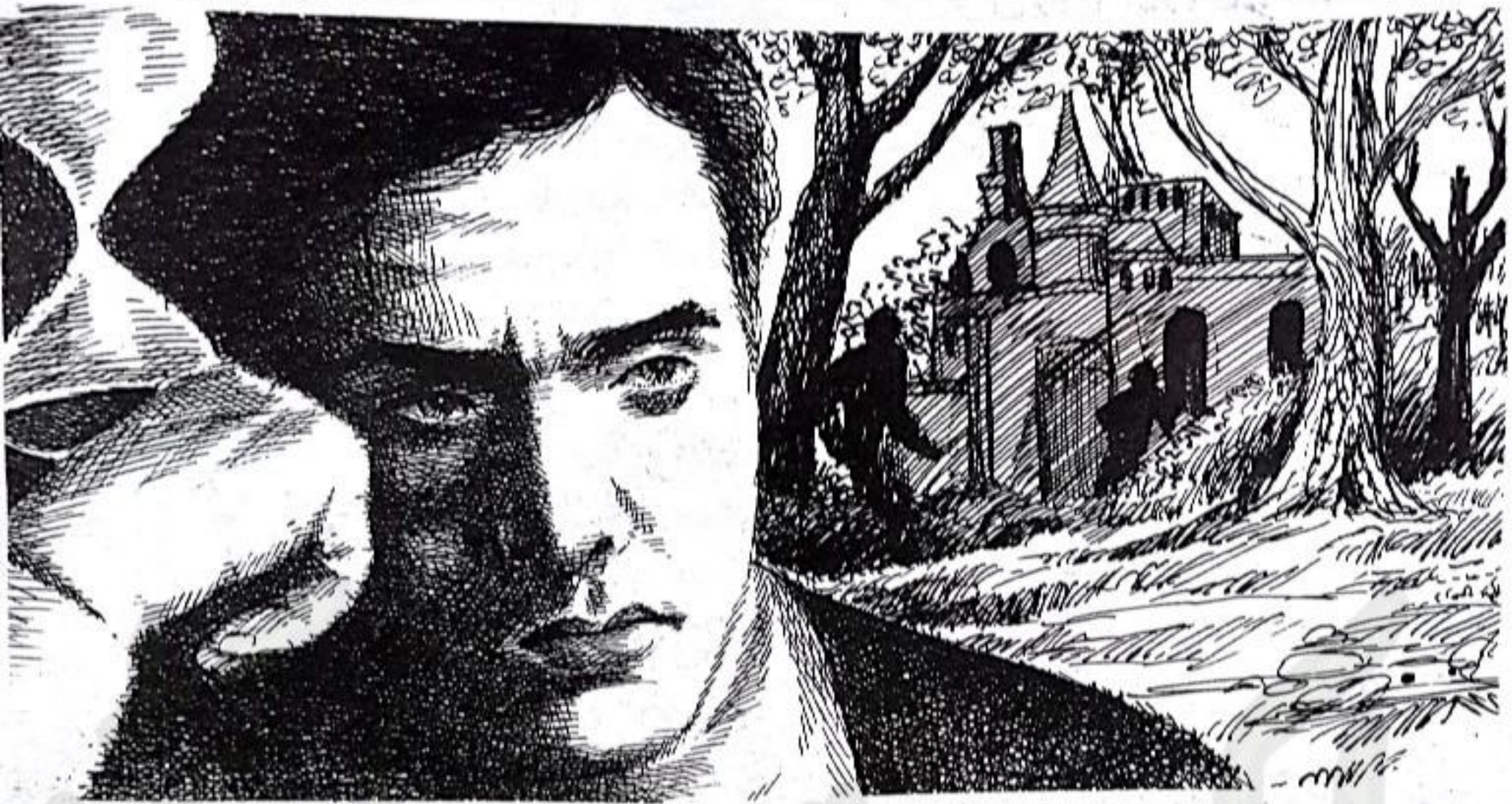
پراسرار مندر

عاصمہ احمد۔ جنڈانوالہ۔ بھکر

کھنڈر نما مندر کا دروازہ کھلتے ہی اس جگہ موجود گائوں کے سارے لوگ حیران و پریشان ہوگئے کیونکہ صدیوں سے ویران مندر میں بے شمار دیئے جل رہے تھے اور ان دیوں کے درمیان ایک مجسم آتما بیٹھی تھی۔

رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم والینے والی پرہول، پرہیبت اور ڈراؤنی کہانی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میری عمر یہی کوئی بیس سال کے لگ بھگ تھی، میں ایک گاؤں میں اپنی ماں اور تین بہنوں کے ساتھ رہتا تھا، اس گاؤں کے لوگ بہت ہی سچے، کھرے، سادہ اور پرخلوص تھے مگر ایک عادت جو بزرگوں سے لے کر کم سن بچوں میں بھی کوٹ کوٹ کر بھری تھی وہ ان میں توہم پرستی تھی، وہ ہر ایک انہونی کے بارے میں مختلف قیاس کرتے۔

مگر یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس نے گاؤں کے لوگوں کو تو ہراساں کیا ہی مگر میرے جیسے سرپھرے نوجوانوں کو بھی خوفزدہ کردیا۔ ہم جو گاؤں والوں کی باتوں کا مذاق اڑاتے تھے اس واقعہ کی شروعات اس طرح سے ہوئی۔ گاؤں میں ایک لڑکا جس کا اصل نام تو عاشق تھا مگر وہ فطرتاً بہت ہی بھولا اور اگر بے وقوف کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، اسے ہم سب گاؤں والے بھولا

ہی کہتے تھے، بھولا اکیلا تھا، گاؤں والے اس سے مختلف کام کے عوض دو وقت کی روٹی دیتے اور پرانے کپڑے وغیرہ بھی اور وہ بے چارہ خوشی خوشی ہر کسی کا کام کردیتا مثلاً گھاس کاٹ دیتا، درختوں سے سوکھی ہوئی لکڑیاں بطور ایندھن لاتا یا پھر بکری بھیڑوں اور گائے بھینسوں کے چارے لے آتا اس کے علاوہ بھی وہ مختلف کام کردیتا اور جب بھی اسے فرصت ملتی تو گاؤں والوں کی بکریاں اور دیگر مویشی بھی چراتا۔

ایک شام جب وہ بکریاں لے کر گاؤں کی طرف آیا تو ان بکریوں میں سے ایک کم تھی، وہ بکری ایک بہت ہی لڑاکو اور ضدی شخص اکرم کی تھی، اپنی بکری نہ پاکر وہ بھولے پر بہت بگڑا اور اسے ڈھونڈنے کے لئے واپس بھیج دیا۔

شام سے رات ہوگئی مگر بھولا آیا نہ بکری، حتیٰ کہ رات گزرگئی مگر بھولے کا کوئی اتہ پتہ نہیں۔ اگلے دن سب گاؤں والوں نے مل کر اسے ڈھونڈا مگر وہ کہیں نہ ملا۔

ہمارے گاؤں سے ذرا دور ایک کھنڈر تھا، بزرگوں کا کہنا تھا کہ کسی زمانے میں یہ جگہ ہندوؤں کی عبادت گاہ تھی پھر نجانے وہ سب کہاں چلے گئے اور پھر آہستہ آہستہ یہاں مسلمان آباد ہوگئے۔ اب وہ مندر ویران پڑا تھا ادھر گاؤں کے لوگ بہت کم جاتے تھے۔ گاؤں والے بھولے کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے۔

ایک دن ہم لڑکوں نے جھاڑی کے پاس خون کے چھینٹے دیکھے جو سورج کی حرارت کے باعث سیاہی مائل ہوگئے تھے، ہم نے گاؤں کے امام صاحب کو بتایا تو وہ پریشان ہوگئے اور دیگر گاؤں کے لوگوں نے یہ خیال کیا کہ ہو نہ ہو بھولے کو کسی بھوت پریت نے ماردیا ہے کیونکہ وہ مندر سالوں سے ویران پڑا ہے اسی لئے اس میں کسی آسیب نے بسیرا کرلیا ہوگا۔

اس واقعہ سے گاؤں میں خوف وہراس پھیل گیا اور دیگر والدین کی طرح میری والدہ نے بھی مجھے اس مندر کی طرف نہ جانے کی نصیحت کی جسے میں نے چٹکیوں میں اڑادیا۔

ہم سب دوستوں نے اس مندر میں جانے کا پکا ارادہ کیا اور ظاہر ہے اگر اس خطرناک ارادے کی خبر ہمارے والدین کو ہوجاتی تو وہ ہمیں گھروں میں بند کرنے سے قطعاً گریز نہ کرتے اس لئے ہم نے وہاں چھپ کر جانے کا پروگرام بنایا۔

☆......☆......☆

جون کی تپتی اور جھلساتی دوپہر میں ہم مندر جانے کے لئے تیار ہوگئے۔ میں یعنی سلامت ...... جیرا...... شیدا اور ثومی ہم چار لڑکوں پر مشتمل یہ قافلہ مندر کی جانب رواں ہوگیا، اس قدر بپھرے ہوئے سورج کی آگ اگلتی دوپہر میں ہم لرزتے قدموں اور پسینہ پسینہ وجود لئے آگے ہی آگے بڑھ رہے تھے اور ہم اس مندر کے بالکل نزدیک پہنچ گئے۔

وہ قدیم خستہ حال مندر تھا جو یقیناً اپنے دور میں بہت ہی مضبوط اور خوب صورت رہا ہوگا لکڑی کا بہت بڑا دروازہ جو کہ بند تھا۔ اس پر کسی قسم کا کوئی بھی تالا وغیرہ نہ لگا تھا مگر جب ہم نے اس دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا تو ہمارے دانتوں تلے پسینہ آگیا، بالآخر ہم چاروں نے مل کر اس دروازے کو کھول دیا ایک زوردار آواز کے ساتھ وہ دروازہ کھلا اور خاموش فضا میں زوردار آواز ابھری...... پھر وہی سکوت چھا گیا۔

جیسے ہی ہم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے ایک عجیب دل کو متلا دینے والی بدبو نے ہمارا استقبال کیا۔ ہمارے ذہن میں تھا کہ جہاں سالوں سے کسی ذی روح کا گزر نہ ہوا ہو اس جگہ مکڑی کے بے شمار جالوں، گندگی اور غلاظت کا ڈھیر ہوگا۔ مگر حیرت انگیز طور پر وہ ہال نما سارا مندر بے حد صاف تھا، یوں لگتا تھا کہ جیسے کوئی ابھی ابھی اس کی صفائی کرکے گیا ہو۔ مندر کی دیواروں پر بڑے عجیب قسم کے چہرے بنے ہوئے تھے رنگ برنگ کے انسانوں کی بدہیت تصویریں...... فرش پر لاتعداد چھوٹے چھوٹے مٹی کے پیالے نما چراغ رکھے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ مندر میں پھیلی ناگوار بوان ہی چراغوں کی بدولت ہے ہمارے دل میں جوخوف اور ڈر کنڈلی مار کے بیٹھا تھا اب وہ قدرے زائل ہوگیا اور ہم چاروں حیرت سے گھوم پھر کراس مندر کو اب دیکھ رہے تھے۔

مندر میں کہیں بھی بھولے کا کوئی نشان نہ تھا نجانے وہ غریب کہاں غائب ہوگیا تھا......؟ یہ بات سوچتے اور کرتے ہم چاروں مندر کے دروازے کو اچھی طرح بند کر کے واپس آ گئے۔

گھر واپس آ کر میں نے کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیا اور معمول کے مطابق دن گزر گیا شام کے بعد میں نے رات کا کھانا کھایا اور حسب معمول ریڈیو پر اپنا پسندیدہ پروگرام سنتا رہا۔ امی اور میری تینوں بہنیں سوگئیں تو میں بھی ریڈیو بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا، چونکہ گرمی کا موسم تھا اس لئے ہم سب صحن میں چارپائیاں بچھا کر سوتے تھے۔ میری چارپائی کے ساتھ ہی باجی چھوٹی سی میز پر پانی رکھ دیتی تھیں تا کہ رات میں کسی کو پیاس لگے تو وہ اٹھ کر پانی پی لے۔ پاس ہی میں نے اپنا ریڈیو بھی رکھ دیا تھا۔

ابھی میں نے دوسری طرف کروٹ لی ہی تھی کہ ریڈیو پوری شدت سے آن ہوگیا، میں نے کرنٹ کھا کر پیچھے مڑ کر دیکھا اور جلدی سے اٹھ کر اسے بند کر دیا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں پھر سونے کے لئے لیٹ گیا، لاشعوری طور پر میرا خیال ریڈیو میں ہی اٹکا تھا کہ اب بجے کہ تب بجے۔ مگر جب کافی دیر گزر گئی تو مجھے قدرے اطمینان ہوا اور میں پھر سونے کی کوشش میں لگ گیا۔ ابھی مجھ پر غنودگی طاری ہوئی تھی کہ ایک بار پھر ریڈیو کی آواز اندھیرے اور خاموش رات میں گونج اٹھی۔ میں شپٹا کے اٹھ بیٹھا۔ ڈرتے ڈرتے ایک بار پھر اسے بند کیا...... میں بری طرف کانپ رہا تھا، میرا رواں رواں لرز رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر میری امی اور بہنیں گہری نیند سو رہی تھیں۔ ”حالانکہ ذرا سے کھٹکے کی آواز پر میری امی کی آنکھ کھل جاتی تھی تو ریڈیو کی فل آواز پر وہ کیوں نہ جاگیں۔؟“ سوچتے الجھتے میں پھر سونے کی کوشش کرنے لگا مگر اب مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میرے سرہانے کوئی بم رکھا ہے جو کسی بھی لمحے پھٹ سکتا ہے۔ پھر نجانے کب میں سوگیا۔ نیند میں بھی میں ریڈیو بند کرتا اور وہ پھر بج اٹھتا۔

صبح میری آنکھ اس وقت کھلی جب سورج کی آسمان پر راجدھانی تھی دن کا اجالا پوری طرح ہر سو پھیل چکا تھا، دھوپ ہمارے کچے صحن میں دبے پاؤں آتی جا رہی تھی باورچی خانے میں برتنوں کی آوازیں آ رہی تھی۔

میرا سب سے پہلا خیال آن ہوتے ریڈیو کی جانب گیا مگر کوئی بھی مناسب سرا میرے ہاتھ نہ لگا۔

میں اٹھا منہ ہاتھ دھو کر جلدی سے ناشتہ کیا اور دوستوں کے پاس گیا کہ اگر ان کے ساتھ بھی کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے تو وہ ضرور مجھے بتائیں گے کیونکہ ہم چاروں ہی اس ویران مندر میں گئے تھے۔ مگر ان تینوں میں سے کسی نے بھی کوئی اس قسم کی بات نہ کی تو میں نے بھی بتانا مناسب نہ سمجھا اور کچھ دیر کے بعد گھر واپس آ گیا۔

☆......☆......☆

اس کے بعد ایک ہفتہ بالکل خیریت سے گزر گیا اور کوئی بھی ایسی بات نہ ہوئی جس سے میں خوف اور پریشانی کا سامنا کرتا۔

ہمارے گاؤں کے نزدیک ہی ایک اور گاؤں تھا جہاں میری امی کی منہ بولی بہن کا جیٹھ فوت ہوگیا، امی کا جانا ضروری تھا امی کے ساتھ میں بھی وہاں گیا، نماز جنازہ کے بعد امی نے مجھ سے کہا کہ میں گھر واپس چلا جاؤں کیونکہ وہ دو دن رکیں گی میں نے ہامی بھرلی اور اپنے گھر واپس آ گیا۔ دونوں گاؤں کے درمیان فاصلہ زیادہ نہیں تھا اور باقی دنوں کی بہ نسبت موسم بھی کافی خوش گوار تھا اس لئے پیدل چلتا ہوا اپنے گھر کی جانب رواں تھا۔ راستے میں ہمارے گاؤں کا قبرستان تھا، میں وہاں سے گزر رہا تھا کہ اچانک وہاں سیاہ لباس میں ملبوس ایک وجود کو دیکھ کر بری طرح چونکا۔ اس کی پشت میری جانب تھی اور میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی

عورت ہے اس کے سیاہ لباس اس کے بال جیسے تھے جو اس کی کمر پر لہرا رہے تھے۔ ’’اے کون ہو......؟‘‘ میں نے اسے آواز دی۔

مگر اس نے نہ پیچھے مڑ کر دیکھا نہ کوئی جواب دیا بلکہ سیدھ میں چلنے لگی تو فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ کیونکہ میرا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کون ہے؟ اور اس قبرستان میں کیا کر رہی ہے؟ وہ عورت سامنے ہی چلتی جارہی تھی یہ دیکھ کر میں پوری طرح چونکا کیونکہ اس کا رخ مندر کی جانب تھا وہ آگے ہی آگے چلتی جارہی تھی ......اب وہ مندر سے تھوڑے سے فاصلے پر تھی۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ ایک دم سے میں نے ٹھوکر کھائی اور خود کو سنبھالنے کی میں نے بہت کوشش کی اور میں نے اپنے کو سنبھالا اور نیچے دیکھا کہ مجھے کس شے سے ٹھوکر لگی ہے۔ زمین بالکل صاف تھی مگر مجھے پاؤں پر بڑی زور کی چوٹ لگی تھی درد کی لہر اس قدر تیز تھی کہ ایک لمحے کے لئے اس پر اسرار عورت کا خیال میرے ذہن سے نکل گیا اور جب یاد آیا کہ میں کسی عورت کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آیا تھا تو میں فوراً الرٹ ہو گیا مگر اب وہاں میرے علاوہ اور کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ مندر کا دروازہ ہنوز بند تھا اور اردگرد دور تک ویرانہ تھا میں نے مندر کے چاروں طرف دیکھا مگر مجھے وہ عورت دکھائی نہ دی اور پھر میں تھک ہار کر اپنے گھر واپس آ گیا مگر میرے ذہن سے اس عورت کا نظر آنا اور پھر ایک دم سے غائب ہو جانا فراموش نہ کر سکا۔

پھر تو اس کے بعد مندر کے پاس جانا میرا روز کا معمول بن گیا یہ الگ بات ہے کہ میں اسے کھولنے اور اندر جانے کی ہمت نہ کر پاتا۔

ایک روز میں کسی وجہ سے مندر نہ جا سکا تو سارا دن عجیب سی بے چینی مجھے رہی جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی مقناطیسی کشش مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور پھر مجھ پر جیسے میرا اپنا اختیار نہ رہا ہو میں مندر کی جانب کھنچا چلا گیا اور میں اس وقت چونکا جب مجھے کسی نے میرا نام لے کر پکارا۔ میں نے گردن موڑ کر آواز کی سمت دیکھا تو مسجد کے پیش امام صاحب مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے...... مجھے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا بس امام صاحب کا چہرہ کسی دھندلی تصویر کی مانند لگ رہا تھا۔

پھر جیسے میرے اعصاب پر حاوی وہ غیر مرئی قوت اتر گئی تو ایک دم سے مجھے ہر شے واضح دکھائی دینے لگی۔

مسجد کے امام صاحب پریشانی کے عالم میں مجھ سے میری طبیعت کا پوچھ رہے تھے میں نے انہیں مطمئن کیا اور ان کے ساتھ ہی باتیں کرتے ہوئے واپس مڑ گیا مگر جاتے وقت میں نے مندر پر ضرور نظر ڈالی تھی۔

☆......☆......☆

اگلے دن کا سورج بہت ہی قیامت خیز ثابت ہوا، میرا دوست جیرا غائب ہو گیا تھا، بھولے کی طرح جیرا کا بھی کوئی پتہ نہ لگ سکا اس کے گھر والے اور ہم سب نے مل کر اسے بہت ڈھونڈا مگر بھولے کی طرح اس کا بھی کوئی سراغ نہ مل سکا بھولے کے بعد جیرے کا غائب ہو جانا گاؤں والوں کے لئے باعث پریشانی تھا جیرے کے گھر والوں کا صدمے سے برا حال تھا۔

میں ان کے گھر گیا اس کی والدہ جیرے کی گمشدگی سے بہت بیمار تھیں اس کی والدہ کا کہنا تھا ’’کچھ دنوں سے جیرا کچھ عجیب قسم کی حرکتیں کر رہا تھا وہ اکثر خود سے ہی باتیں کرتا رہتا رات کو بعض اوقات پورے گھر میں پھرتا گاؤں کے کچھ لوگوں نے بتایا کہ ہم نے کئی مرتبہ جیرے کو مندر کے پاس دیکھا ہم اس سے پوچھتے کہ وہ وہاں کیوں جاتا ہے......؟ مگر وہ ٹال دیتا۔

اس واقعہ کے بعد گاؤں میں ایک بار پھر خوف وہراس اور تشویش کی لہر دوڑ گئی گاؤں کی گلیوں میں آوارہ پھرتے بچے بھی گھروں میں دبک گئے گاؤں میں کام کرنے والے افراد بھی جلد ہی اپنا کام ختم کرتے اور جلد اپنے گھروں کو لوٹ آتے۔

ایک دوپہر کھانا کھا کر میں یونہی گھر سے باہر نکلا ......اس وقت کڑکتی دوپہر میں کم لوگ ہی باہر نکلتے، اس وقت بھی ویرانی سی تھی۔ گاؤں سے باہر نکل کر میں

آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک درختوں کے سائے میں کھڑا ہوگیا جانے کس خیال کے تحت میں اس سمت آ گیا جہاں مندر واضح نظر آ رہا تھا، پھر میں نے اس طرف ایک شخص کو جاتا دیکھ کر بری طرح چونکا...... بھلا اس وقت اس قدر ویران جگہ پر کون جاسکتا ہے۔؟

میں الجھتے ہوئے اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ اور یہ اندازہ لگا کر میں بری طرح چونکا کہ وہ میرا دوست ثومی تھا۔ جو خراماں خراماں چلتا ہوا مندر کے نزدیک پہنچتا جارہا تھا۔ میں نے اسے پوری شدت سے آواز دی۔ ''ثومی...... ثومی؟'' مگر وہ اردگرد سے بے نیاز مندر کا دروازہ کھول چکا تھا...... یہ دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور میں بے اختیار چلاتا ہوا مندر کی جانب اندھا دھند دوڑ پڑا۔ مگر میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہ مندر میں داخل ہوگیا، میں سرپٹ دوڑتا وہاں تک پہنچ گیا...... پھولی سانسوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھول کر اندر گیا اور یہ دیکھ کر میری جان نکل گئی کیونکہ مندر بالکل خالی تھا۔

میں نے خود اپنی آنکھوں سے ثومی کو اندر جاتے دیکھا تھا مگر اب اس کا کوئی نشان بھی نہیں تھا۔ مندر میں ا ن عجیب تصویروں اور بجھے ہوئے بے شمار دیئوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں پاگلوں کی طرح ''ثومی ثومی'' آواز لگاتا ہوا مندر میں چکراتا رہا مگر ثومی نے نہ ملنا تھا اور نہ وہ ملا، تو آنسو بہاتا اور گرتا پڑتا میں گاؤں کی جانب بھاگا۔

میں اس قدر وحشیانہ انداز میں چلا رہا تھا کہ گاؤں کے لوگ مجھے دیکھتے ہی پریشان ہوگئے۔ میں ''ثومی ثومی'' کہہ رہا تھا میری حالت بہت غیر تھی اور میں ہاتھوں کے اشارے سے مندر کی جانب لوگوں کو سمجھانا چاہتا تھا، میرے دیگر گوں حالت دیکھ کر گاؤں کے لوگوں کے چہروں پر حیرت تھی اور مجھ سے کوئی بات نہیں بن رہی تھی میرے اعصاب میرا ساتھ دینے سے انکاری تھے۔

بھولے کا غائب ہونا، پھر جیرا اور اب میرا جان سے پیارا دوست ثومی...... جسے مندر میں موجود کوئی مرئی قوت نگل چکی تھی۔ میں کٹے شہتیر کی مانند زمین پر گرا...... بند ہوتی آنکھوں نے نیم جھری سے ثومی کے بھائیوں اور امام مسجد سمیت دیگر گاؤں والوں کو مندر کی جانب بھاگتے دیکھا۔ اس کے بعد میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہوگیا۔

☆......☆......☆

جب مجھے ہوش آیا تو جانے کیا وقت تھا کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ آہستہ آہستہ میرے حواس ٹھکانے پر آگئے۔ شعور کی حالت میں آتے ہی مجھے وہ منظر یاد آیا۔ ثومی کا غائب ہونا...... میرا اسے ڈھونڈنا...... سب کو بتانا...... پھر پتہ نہیں کیا ہوا؟ ثومی کا خیال آتے ہی میں تڑپ کر اٹھا...... تیزی سے کمرے سے باہر نکلا۔

وہ میرا اپنا ہی گھر تھا جو بالکل خالی تھا میں اس بات پر غور کیے بغیر ہی کہ امی اور میری بہنیں کہاں ہوں گی؟ باہر کو لپکا پھر مجھے لگا میرے پیچھے کوئی ہے۔

اسی احساس کے تحت میں نے مڑ کر دیکھا اور کھڑا کا کھڑا ہی رہ گیا۔

سیاہ لباس میں ملبوس وہ وہی عورت تھی جو قبرستان میں مجھے نظر آئی تھی...... اب بھی اس کی بالوں سے ڈھکی پشت میری طرف تھی۔

''کون......؟'' میں نے لرزتی آواز میں اسے مخاطب کیا۔ وہ دھیرے سے مڑی اور میرے سامنے آ گئی۔ اس کے سیاہ لمبے بالوں نے چہرے کے بائیں حصے کو مکمل طور پر ڈھانپ رکھا تھا اور چہرے کا دایاں حصہ بے حد حسین تھا، اس کی سیاہ آنکھ مجھ پر مرکوز تھی اور جو میں نے اس کی آنکھ میں جھانکا تو نجانے مجھے کیا ہوگیا میں مبہوت ہوکر رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا یا وہ کچھ بولتی میرے پیچھے دروازہ ایک دم سے بجا...... میں نے بے اختیار گردن موڑ کر پیچھے دیکھا...... پھر اگلے ہی لمحے اس جانب دیکھا جہاں وہ پراسرار عورت کھڑی تھی یہ دیکھ کر میری سانس لمحہ بھر کر رک گئی کہ وہ جگہ اب بالکل خالی تھی وہاں کوئی عورت تو کیا...... کوئی نشان بھی نہ تھا...... دروازہ ایک بار پھر بجا تو میں جیسے ہوش کی دنیا میں واپس آ گیا۔

اچانک دروازہ کھولا...... محلے کا ایک بچہ پیش امام صاحب کا پیغام لایا تھا کہ مجھے امام صاحب بلا رہے ہیں۔

یہ سنتے ہی میں چلتا ہوا مسجد کے پاس بنے حجرے میں چلا آیا۔ جہاں امام صاحب اکثر اوقات گاؤں کے لوگوں کو اللہ رسول کی باتیں بتایا کرتے تھے اس جگہ کئی لوگ پہلے سے تشریف فرماں تھے۔

بس ایک چہرہ جو مجھے انجان لگا وہ ایک بزرگ کا تھا۔

''بیٹھو بیٹا۔'' میں انہیں سلام کر کے بیٹھ گیا......

''یہ سید کمال شاہ ہیں۔'' امام صاحب نے بزرگ کی طرف اشارہ کر کے مجھے بتایا۔ میں نے انہیں دیکھا وہ مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ میرے دیکھنے پر وہ مسکرائے۔

''یہ میرے پیر و مرشد ہیں اور مندر کا طلسم توڑنے آئے ہیں۔ اور تمہاری مدد کی ضرورت بھی پڑسکتی ہے۔'' امام صاحب نے بتایا۔

امام صاحب کی بات پر میں نے انہیں حیرت سے دیکھا۔ ''میری ضرورت۔؟''

''ہاں۔'' سید صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں رات میں ایک مخصوص عمل کروں گا۔ اس کے لئے مجھے تمہاری ضرورت بھی پڑسکتی ہے۔ مگر تم گھبراؤ مت ایسا کچھ نہیں ہوگا جس سے تمہیں نقصان پہنچے گا۔'' وہ شاید میری اندرونی کیفیت کا اندازہ لگا چکے تھے تبھی مجھے تسلی دینی چاہی۔ میں بھی انہیں مطمئن کرنے کے لئے مسکرایا۔

یہ الگ بات تھی کہ میرے اندر کی ٹوٹ پھوٹ مجھے اس کام سے روک رہی تھی اور میں وہ کیفیت سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس پراسرار عورت کے دیکھنے پر محسوس کی تھی۔

☆......☆......☆

رات کا وقت تھا آسمان چمکتے تاروں سے بھرا ہوا تھا۔ میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ سارا گاؤں اندھیرے اور سناٹے میں ڈوب چکا تھا میری نظریں مندر پر جمی ہوئی تھیں اور دل میں ہلکا ہلکا اضطراب اور بے چینی کروٹیں بدل رہی تھی مجھے نیند کی شدت برداشت سے باہر تھی۔ مگر پھر بھی میں اپنی آنکھوں کو مسلتا ہوا کھڑا رہا۔ مجھے انتظار سید صاحب کا تھا جنہوں نے مجھے یہاں بلایا اور خود ابھی تک نہیں آئے تھے۔ میں بددل سا ہو کر گھر جانے کے لئے مڑا کہ اچانک ایک ہیولہ حرکت کرتا نظر آیا۔ اس کا رخ میری جانب ہی تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ قریب آ کر رکا۔

چاند کی مدھم چاندنی میں جو وجود نظر آیا، وہ سید صاحب تھے۔ ''آؤ......'' وہ یہ کہتے ہوئے مندر کی جانب چلنے لگے اور میں کسی روبوٹ کی مانند ان کے پیچھے چلنے لگا اور ہم مندر کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔

مندر کے دروازوں کے دونوں پٹ کھلے تھے...... سید صاحب اندر داخل ہو گئے اور میں ایک پل کو رک گیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کوئی انجانی کشش مجھے اندر کی جانب کھینچ رہی ہے۔ میں نے دھیرے سے اندر اپنے قدم رکھ دیئے۔ اندر مندر میں عجیب سی مہک پھیلی ہوئی تھی دیواروں کے سامنے رکھے قطار میں تمام مٹی کے دیئے روشن تھے، دیوں کی زرد روشنی میں مندر کا اندرونی منظر بڑا ہی عجیب تھا۔ دیواروں پر لگی تمام تصاویر بہت ہی ہیبت ناک محسوس ہو رہی تھیں مجھے لگا ان سب کی خوف ناک آنکھیں مجھ ہی کو گھور رہی تھیں۔

روشن چراغوں کے درمیان سیاہ لباس میں ملبوس وہی عورت بیٹھی تھی اس کے سیاہ بالوں نے آج اس کا چہرہ نہیں ڈھانپ رکھا تھا اس کا چہرہ چراغوں کی روشنی میں واضح تھا...... اس کے چہرے کا ایک حصہ بے حسین تھا اور دوسرا حصہ......؟ بے حد سیاہ تھا یوں جیسے بری طرح جھلس گیا ہو...... زرد روشنی میں اس وقت اس کا چہرہ بہت ہی بھیانک لگ رہا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ مجھے اس سے بالکل بھی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے قریب پہنچا اور سامنے بیٹھ گیا...... وہ مسکرائی وہ کچھ کہہ رہی تھی، زبان میری سمجھ سے باہر تھی، ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ کوئی منتر پڑھ رہی ہو۔ عجیب سحر سا تھا اس کی آواز میں، میرے ذہن پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی میں مدہوش سا ہو رہا تھا، پھر میں نے دیکھا وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھ پر نیند طاری ہوگئی اور نیند کی حالت میں شاید میں

کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔

وہ چیخ رہی تھی اور کوئی اس پر کچھ پھینک رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم دھواں بن گئی۔ بہت سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہر کوئی مجھ پر جھکا۔ ''اٹھ جاؤ۔'' کی آواز سنائی دی...... پھر جیسے ایک دم بوندیں پڑنے لگیں ننھی ننھی بوندیں میرے چہرے پر برس رہی تھیں۔

اور میں اپنی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھا۔ میرے سامنے سید صاحب ہاتھ میں پانی کا گلاس لئے کھڑے تھے اور مجھے ہوش میں لانے کے لئے پانی کا چھینٹا میرے چہرے پر ڈال رہے تھے۔ ''شکر ہے تم ہوش میں آ گئے۔'' وہ سیدھے ہو کر بولے۔

''اب میرا ذہن آہستہ آہستہ بیدار ہو چکا تھا، تمام واقعہ ایک بار پھر مجھ پر واضح ہوا۔''

''تو کیا وہ سب حقیقت تھا، عورت کے سامنے بیٹھنا اور پھر نیند کا غلبہ...... سید صاحب کا اس عورت کو قابو میں کرنا۔'' میں حیرت سے سوچ رہا تھا۔

''تم وہ پہلے انسان ہو جو اس پراسرار عورت سے بچ گئے ورنہ جو بھی یہاں آتا ہے بچ کے نہیں جاتا۔''

''وہ کون تھی......؟'' میں نے سید صاحب سے پوچھا۔

''وہ ایک ہندو پنڈت کی بیٹی تھی...... جسے کالے علم سیکھنے کا بے حد شوق تھا چونکہ پنڈت کی بیٹی تھی اس لئے جانتی تھی کہ اس کا شوق کبھی پورا نہ ہو سکے گا مگر اتفاق سے اس کی شادی ایک ایسے لڑکے سے ہو گئی جس کی ماں بھی کالے علم کی ماہر تھی اور اس نے اپنی ساس سے کالا علم سیکھا اور جب بھینٹ دینے کی باری آئی تو اس نے اپنے شوہر اور ساس کو مار ڈالا۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے گاؤں کے لوگوں کا جینا حرام کر دیا تو سب نے مل کر اس عورت اور اس کی ساس کے گرو...... جس سے اس نے بھی کالا علم سیکھا اس کو مارنے کا فیصلہ کیا۔

پھر ایک رات لوگوں نے اس کے چلے والی جگہ پر آگ لگا دی جس سے اس کے گرو اور چیلے تو بچ کر بھاگ گئے۔ مگر اس عورت کے چہرے کا ایک حصہ جل گیا مگر وہ پھر بھی بچ گئی وہ جادو ٹونے میں بہت ماہر ہو چکی تھی اپنے عمل کے زور پر گھر سے نکلتی اور ہر رات کسی نہ کسی چھوٹے بچے کو اغوا کر لیتی، اس کے بعد وہ اس بچے کو مار کر اس کا خون شیطان کے قدموں میں ڈالتی تاکہ اس کی جادوئی طاقت میں مزید اضافہ ہو اور اس بات کی خبر اس کے باپ کو ہو گئی تو اس کے باپ نے مختلف پنڈتوں کے ساتھ مل کر اسے مار کر اس کی روح کو اسی مندر میں قید کر دیا۔ کیونکہ اگر وہ زندہ رہتی تو اپنا خونی کھیل جاری رکھتی۔

ایک طویل عرصہ بعد بھولے نے اس جگہ قدم رکھا اور شاید وہ زخمی تھا اور اس کے زخموں سے خون ٹپک رہا تھا، بھولے کے خون سے وہ جگہ تر ہو گئی جہاں وہ چلہ کرتی تھی اور پھر اس عورت کی بدروح آزاد ہو گئی اور پھر اس نے اپنا خونی کھیل شروع کر دیا کیونکہ اب اس کی روح بغیر خون کے نہیں رہ سکتی تھی۔

اس طرح جیرا اور ٹومی بھی اس کا شکار ہو گئے اور اگلا نشانہ تم تھے مگر خوش قسمتی سے میرا عمل پورا ہوا اور میں تم تک پہنچ گیا۔'' سید صاحب یہ بول کر میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ پھر ہم دونوں گاؤں میں واپس آ گئے۔ سید صاحب مسجد میں چلے گے اور میں اپنے گھر واپس آ گیا۔

دوسرے دن گاؤں کے تمام لوگ مندر پہنچ گئے، سید صاحب اور امام صاحب بھی لوگوں میں موجود تھے پھر سید صاحب کے اشارے پر لوگوں نے مندر کو آگ لگا دی اور یوں لوگوں کی اس آسیبی مندر سے جان چھوٹ گئی۔

آج اتنے سالوں کے بعد وہ مندر جب بھی مجھے نظر آتا ہے تو بھولا، جیرا اور ٹومی کی یاد بڑی طرح مجھے غمزدہ کر دیتی ہے۔ میں آج اپنی زندگی میں مگن ہوں مگر جب بھی مجھے اس پراسرار عورت کا خیال آتا ہے تو میرا خون برف کی مانند ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

موت کا سودا

رضوان علی سومرو۔ کراچی

لوگ ماں کی محبت کی مثالیں دیتے ہیں لیکن باپ کو بھول جاتے ہیں باپ کی محبت بھی اولاد کے لئے لاثانی ہے اور یہی حقیقت پوری کہانی اپنے دلگداز اور دل فریب لفظوں سے روشناس ہے۔

چاہت وخلوص کی ایک انمٹ کہانی جو پڑھنے والوں کو سوچ کے سمندر میں غوطہ زن کردے گی

"**طاقت** !توازن!" کا قانون اپنے دور کا عظیم ترین نظریہ تھا، آج بھی اس کی اہمیت اور افادیت میں فرق نہیں آیا کچھ لوگوں کے نزدیک طاقت کا مرکز اقتدار، کچھ کے نزدیک حیثیت اور کچھ کے نزدیک پیسہ ہے۔

لیکن مٹی میں مل جانے والا انسان یہ بھول جاتا ہے کہ طاقت کا اصل سرچشمہ صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے جو کہ پوشیدہ بھی اور ظاہراً بھی بڑائی والا صرف اللہ ہے۔

میری داستان حیات جان کر آپ مجھے ایک نمبر کا جھوٹا اور مکار کہیں گے جبکہ بیشتر پڑھنے والے میری کہانی کو فروخت کرنے کا کوئی نیا حربہ کہیں گے۔

میں کوئی وہمی یا جاہل نہیں ہوں بلکہ بے حد پڑھا لکھا اور سنجیدہ طبع انسان ہوں پیشے کے اعتبار سے میں ایک کہانی کار ہوں ہمیشہ سنجیدہ اور معاشرے کے رستے ہوئے پہلوؤں پر قلم اٹھانا میری عادت رہی ہے۔ سال کے گیارہ ماہ میرا اور قلم کا رشتہ جڑا رہتا ہے مگر سال کا بارہواں مہینہ صرف اور صرف میری فیملی کا ہوتا ہے۔ میرا نام جواد حیدر ہے میری عمر 45 سال کے آس پاس ہے اور میری شادی کو چودہ سال ہو چکے ہیں۔ میری فیملی کچھ زیادہ بڑی نہیں ایک بیٹا اور ایک

عدو بیوی ہی میرا کل اثاثہ تھیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرے پاس اپنے کام کا بہت زیادہ دباؤ تھا۔ اکثر و بیشتر مجھے اپنے کام کے سلسلے میں رات دیر تک اپنے آفس میں رکنا پڑتا تھا۔ کیونکہ میرا ایک ناول زیر طبع تھا اس وجہ سے زیادہ لیٹ گھر پہنچنا میرا معمول بن گیا تھا۔

اس رات میں قریب قریب رات کے ڈیڑھ بجے آفس سے باہر نکلا، موسم انتہائی خوش گوار تھا۔ میں اپنی گاڑی کو انتہائی سکون سے ڈرائیو کرتا ہوا گھر جا رہا تھا مجھے گھر جانے میں عجلت نہ تھی جہاں اتنی دیر وہاں تھوڑی اور سہی بے خیالی میں نہ جانے کیسے میری گاڑی اس سڑک پر آ گئی تھی جس پر سفر کرنا سٹی گورنمنٹ کی طرف سے ممنوع تھا۔

رات تو رات دن میں بھی اس سڑک سے گزرتے ہوئے لوگ ڈرتے تھے کافی چوڑی اس سڑک کی وجہ شہرت کیا تھی، لوگ کیوں ڈرتے تھے اس کے بارے میں مختلف روایات منسوب ہیں۔

لیکن سب سے زیادہ جس وجہ نے شہرت پائی اس کا تعلق سیٹھ دھنی رام سے تھا، سیٹھ دھنی رام کی ایک بیٹی تھی جس کا نام شاردا تھا شاردا ایک ڈرائیور کو بیٹے سے محبت ہو گئی، ڈرائیور کے بیٹے گوپال نے شاردا کے بطن میں اپنی محبت کا ثبوت چھوڑ دیا تھا اور موت کے خوف سے وہاں سے بھاگ گیا۔ شاردا کئی ماہ تک ڈر کے مارے چپ رہی۔ لیکن ماں بننے کے وقت بات چھپی نہ رہ سکی شاردا ڈر کے مارے وہاں سے بھاگی، اسی سڑک پر پہنچ کر شاردا کا اتنا شدید ایکسیڈنٹ ہوا کہ وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئی۔

تب سے لوگوں کو شاردا کی روح نظر آتی۔ ”جس کے ہاتھ میں ایک بچہ ہوتا۔“ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں لوگوں نے اس سڑک سے منسوب کر رکھی تھیں۔ لیکن ان تمام باتوں پر میں یقین نہیں رکھتا تھا۔

چنانچہ گاڑی کے اس سڑک پر آ جانے کے باوجود میں بغیر کسی خوف کے آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ سڑک پر بہت اندھیرا تھا صرف کار کی ہیڈ لائٹس کی مدد سے میں ڈرائیونگ کر رہا تھا اچانک مجھے دور سڑک پر کوئی کھڑا نظر آیا جو کہ بالکل سڑک کے درمیان میں کھڑا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے خوف محسوس ہوا اور وہ سارے پراسرار واقعات میرے ذہن میں گھوم کر رہ گئے، اس سڑک سے جڑی پراسراریت مجھے یاد آ گئی لیکن میں نے اس کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ ”شاید کوئی پریشان حال شخص ہے جو کہ اس طرح مدد کا طالب ہے۔“ میں نے گاڑی بالکل اس کے قریب جا کر روک دی، یہی شاید میری سب سے بڑی بھول تھی نو وارد آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آیا۔

کار کی روشنی میں، میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ ایک 22 تا 23 برس کی پرکشش لڑکی تھی۔

”صاحب ...... جی ...... میرے بچے کو بچالو...... بہت بیمار ہے۔“

”کہاں ہے، تمہارا بچہ۔؟“ میں نے انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت پوچھا۔

میری بات سن کر وہ ایک لمحے کے لئے رکی اور دوسرے لمحے وہ ہنس پڑی اس کی ہنسی انتہائی مکروہ تھی۔

اس پل بھی مجھے احساس نہ ہوا کہ یہ آسیبی چکر ہے۔

”کہاں ہے تمہارا بچہ۔؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں......“ یہ کہہ کر اس نے اپنا خوب صورت پیٹ عریاں کر دیا اس کے بعد جو منظر میری آنکھوں کے سامنے آیا وہ انتہائی حیرت انگیز اور ناقابل فراموش خوف ناک تھا جسے دیکھ کر میں اپنی چیخوں پر قابو نہ رکھ سکا۔

اس لڑکی کے پیٹ سے خون میں لتھڑے ہوئے ایک بچے کا سر باہر نکل رہا تھا میں سمجھ گیا اگر میں نے فرار اختیار نہ کی تو میری لاش کسی کو بھی نہ ملے گی بچے کا سر نصف کے قریب باہر آ چکا تھا۔ اسی لمحے میں نے اس لڑکی کو ہاتھ مار کر ایک زوردار دھکا دیا تو وہ چیختی ہوئی سڑک پر جا گری اور لمحہ ضائع کئے بغیر میں نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

وہ لڑکی چیختی ہوئی میری گاڑی کے پیچھے دوڑی اور میں نے گاڑی کی اسپیڈ مزید بڑھا دی۔

”میں تجھے نہیں...... چھوڑوں گی...... تو نے میرا بچہ مار دیا۔“ وہ لڑکی چیختی ہوئی گاڑی کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

اسی وقت میں نے آیت الکرسی کی تلاوت شروع کردی۔ پھر میں کب گھر پہنچا مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔

گھر پہنچتے ہی مجھ پر انتہائی شدید قسم کا بخار چڑھ گیا رہ رہ کر پیش آنے والے واقعات میرے ذہن میں گھومتے رہے کہ وہ سب کیا تھا؟ ان تمام واقعات سے پیچھا چھڑانے کے لئے میں نے سوچا کہ مجھے اپنی بیوی بچوں کے ساتھ فارم ہاؤس میں منتقل ہوجانا چاہئے تاکہ آب وہوا کی تبدیلی سے مجھ پر اچھا اثر پڑسکے، چھٹیوں کے دوران میں کام کو بالکل بھی ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔

ایک ہزار ایکڑ کا فارم ہاؤس ہر لحاظ سے بہترین تفریح گاہ تھی۔ فارم ہاؤس میں مچھلی اور سنگھاڑے کی بھی نشوونما کی جاتی جو کہ ہماری آمدنی کا اچھا خاصہ ذریعہ تھا۔

میرا فارم ہاؤس جو کہ آباؤاجداد کی ملکیت ہے کچھ اور لوگ بھی رہتے ہیں یہ لوگ ہمارے گھریلو ملازم ہیں جو کہ سال کے بارہ ماہ اسی فارم ہاؤس میں رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ اس فارم ہاؤس کا سب سے پرانا ملازم خورشید چاچا ہیں جو کہ فارم ہاؤس کی دیکھ بھال اور آمدنی وغیرہ کا حساب کتاب رکھتے ہیں خورشید چاچا اپنی فیملی کے ساتھ اسی فارم ہاؤس میں ملازموں کے کوارٹر میں رہتے ہیں۔

دوسرے نمبر پر شرفو تھا، جس کا کام فارم ہاؤس کے مہمانوں کے کھانے پینے کی سہولیات کو دیکھنا تھا۔

تیسرے نمبر پر روشن تھا جو کہ گھوڑوں کے اصطبل اور گھوڑوں کی دیکھ بھال پر مامور تھا۔

چوتھی ایک صفائی والی تھی جس کا نام دھنو تھا جو کہ انتہائی خوب صورت اور حسین نقش ونگار کی مالک تھی۔ اس کا جسم انتہائی خوب صورت اور حسین تھا دیکھنے والے اس خوب صورت جسم کو اپنی بانہوں میں لینے کی آرزو ضرور رکھتے ہوں گے۔ کئی بار میرے دل میں بھی یہ آرزو مچلی تھی کہ تنہائی کے چند گھنٹے مجھے میسر آجائیں تو اس بدمست ساغر کو ایک بار ضرور چکھوں۔ لیکن صرف یہ آرزو ہی تھی اس پر عمل کرنے کی میں نے کبھی کوشش نہ کی تھی۔

فارم ہاؤس میں اس کے علاوہ اور بھی ملازمین تھے جن کا ذکر کرنا داستان کی طوالت بڑھادینے کے مترادف ہوگا۔

فارم ہاؤس میں آئے مجھے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اس ایک ہفتے کے دوران میری طبیعت کافی بہتر ہوگئی تھی اور فارم ہاؤس میں میرا بیٹا زوہیب کی تفریحات میں اضافہ ہوچکا تھا جبکہ میری بیوی رخسانہ کا زیادہ وقت گاؤں کی عورتوں کے ساتھ گزرتا تھا۔

اس دن موسم کافی خوش گوار تھا شرفو نے آکر بتایا کہ مہمان خانے میں دو لوگ انتظار کررہے ہیں۔

”کون ہیں وہ لوگ ......؟“ میں نے شرفو سے استفسار کیا۔

”پتہ نہیں صاحب...... لیکن ہیں بہت عجیب سے۔“ شرفو کے لہجے میں حیرت تھی۔

”کیا مطلب۔؟“ میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”معلوم نہیں صاحب...... آپ خود دیکھ لو چل کر۔“

شرفو کی بات حیرت انگیز تھی لیکن مل لینے میں کیا تھا۔

واقعی وہ دونوں بہت عجیب تھے۔ بلکہ آٹھواں عجوبہ کہوں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

میرے لئے انتہائی حیرت انگیز تھا وہ دونوں شکل وصورت کے اعتبار سے بالکل ایک جیسے تھے قد کاٹھ چال ڈھال، لباس بالکل ایک جیسا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کی فوٹو کاپی ہوں، میں انہیں حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

”اس قدر حیرت سے نہ دیکھے جواد صاحب ہم جڑواں ہیں اور ویسے بھی خانہ قدرت میں کوئی بات ناممکن نہیں۔“ وہ دونوں یک زبان ہوکر بولے۔

میرے لئے یہ حیرت کا دوسرا جھٹکا تھا کیونکہ وہ دونوں بولتے بھی ساتھ ساتھ تھے۔

”واقعی ...... خانہ قدرت میں کوئی بات ناممکن نہیں۔“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہم دونوں مطلب کی بات کریں۔“ وہ دونوں ساتھ ساتھ بولے۔

”جی......“ میں نے حیرت کے خول سے باہر آتے

ہوئے کہا۔

"دراصل ہمیں ایک ناول لکھوانا ہے۔" وہ دونوں صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"آپ میری سیکریٹری سے بات کرلیں وہی ڈیل کرتی ہے۔" میں نے خفگی سے کہا۔

"آپ کی سیکریٹری سے بات کی تھی لیکن اس نے منع کردیا۔" وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔

"آپ دونوں ایک ایک کرکے بات کریں ساتھ بولنا ضروری ہے کیا۔؟" میں نے غصے سے کہا۔

"مجبوری ہے جناب...... ہم کوئی بھی کام ایک دوسرے کی مدد کے بغیر نہیں کرسکتے۔" ان کے لہجے میں دکھ بھر گیا۔

"مگر کیوں......؟"

"یہ ایک ایسا راز ہے جس سے ہماری زندگی جڑی ہوئی ہے۔ جس کے فاش ہونے پر ہماری موت یقینی ہے۔" ان دونوں نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

"میری سیکریٹری نے آپ کو منع کیوں کیا۔؟" میں نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

"اس نے کہا تھا کہ آپ ایک ماہ تک کوئی کام نہیں کرتے اور ہمیں ایک ہفتے کے اندر ناول چاہئے۔"

"میری سیکریٹری کافی سمجھ دار ہے...... اس نے بالکل ٹھیک کہا۔ ایک ماہ کے بعد میں حاضر خدمت ہوں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اسی دوران شرفو چائے وغیرہ لے آیا۔

"نہیں ایک ماہ تو بہت دیر ہوجائے گی...... کیونکہ یہ وہ ناول ہوگا جو کہ نہ تو طباعت کے لئے جائے گا اور نہ ہی تشہیر ہوگی۔ پیسے وہ ملیں گے جو آج تک کسی کو نہیں ملے۔"

اسی لمحے شاید یہ میری بدقسمتی تھی کہ میرا بیٹا زوہیب کمرے میں داخل ہوا۔

وہ دونوں زوہیب کو بہت ہی پرشوق نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔

"یہ میرا بیٹا...... زوہیب ہے...... بہت پیارا بچہ ہے......"

وہ دونوں میری بات کا جواب دینے کے بجائے زوہیب کو یک ٹک دیکھ رہے تھے مجھے ایسا لگا کہ ان کی نگاہیں میرے بچے کے وجود کے آر پار ہورہی ہوں...... جیسے کہ کوئی قصائی کسی بکرے کو دیکھ رہا ہو۔ وہ دونوں زوہیب کی طرف اور زوہیب ان کی طرف بے حد محویت سے دیکھ رہا تھا۔

"زوہیب...... تم باہر جاؤ بیٹا۔" میری بات سن کر زوہیب نے ان کی طرف دیکھا اور باہر چلا گیا وہ دونوں زوہیب کی طرف دیکھتے رہے۔

مجھے ان دونوں مسخروں پر انتہائی شدید قسم کا غصہ آرہا تھا۔ "آپ دونوں چائے پئیں اور پھر چلے جائیں۔"

میری بات سن کر وہ مسکرانے لگے۔

"ہم آپ کو دس لاکھ دیں گے ناول کا۔"

"دس لاکھ......" ان کی بات سن کر...... میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"آپ کو لکھوانا کیا ہے۔؟" میں بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

"ایک ایسی عورت کی کہانی جس کے بچے کو ماردیا گیا ہو...... پھر وہ انتقام کا نیا طریقہ اختیار کرتی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ دونوں کہیں کھو سے گئے۔

ان کی آنکھیں عجیب وحشت ناک انداز میں پھیل گئیں۔

کچھ لمحوں کے بعد وہ دونوں یوں چونکے جیسے کسی نے ان کو گہری نیند سے جگادیا ہو ان کی آنکھوں میں اب عجیب سی ویرانی ناچنے لگی تھی۔

"آپ سوچ لیں جواد صاحب...... آپ کو ناول لکھنا ہی ہوگا۔"

ان دونوں نے پلاٹ سناتے سناتے بات ہی بدل دی تھی اور بالکل آرڈر کے سے انداز میں بولنے لگے تھے۔

"آپ دونوں جاسکتے ہیں...... میں آپ کو سوچ کر جواب دوں گا۔"

"ناول تو تم کو لکھنا ہوگا...... ورنہ!" وہ دونوں وحشت زدہ لہجے میں بولے۔

ان کے اس طرح کے لب ولہجے سے میں چونک گیا، مجھے اپنی توہین کا احساس کچو کے لگانے لگا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے......" میں غصے سے دھاڑا۔

"ناول تو تم کو لکھنا ہوگا...... ورنہ تم پچھتاؤ گے۔" یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے لب ولہجے سے ان کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی کے ٹرانس میں آگئے ہوں۔ ورنہ وہ پلاٹ سناتے وقت بالکل ٹھیک تھے۔ آخر وہ کس کے ٹرانس میں آگئے تھے؟ وہ کون تھا جو دور ہوتے ہوئے بھی ان کے قریب تھا؟ وہ کون تھا جو ناول تو لکھوانا چاہتا تھا مگر شائع نہیں کرنا تھا۔ ان کے اس بدلتے رویے نے مجھے کافی پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔

☆......☆......☆

میں کسی زمانے میں چیونگم بہت شوق سے استعمال کرتا تھا خاص طور پر ان دنوں جب میں نے سگریٹ چھوڑنے کی کوشش کی تھی آج جب میں نے زوہیب کے ہاتھ میں چیونگم دیکھی تو میں چونک پڑا۔

"کہاں سے آئی بیٹا؟" میں نے زوہیب سے استفسار کیا۔

"ابو...... دونوں انکل نے دی ہے۔" زوہیب معصومانہ لہجے میں بولا۔

"میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ کسی اجنبی سے کوئی چیز نہیں لیتے۔"

"سوری ابو۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔"

"اوکے...... بیٹا......" میں نے کہا۔

کاش میں نے اسی وقت زوہیب سے وہ چیونگم چھین لی ہوتی تو شاید میری زندگی ہمیشہ کے لئے پچھتاوا نہ بنتی۔ کاش! میں اس طرح کے دل دہلانے والے واقعات کا حصہ نہ بنتا۔

☆......☆......☆

رات کا اندھیرا بڑھ چکا تھا۔ ہر طرف ہو سناٹا طاری تھا۔ رخسانہ زوہیب اور میں نے پورا دن مختلف قسم کی تفریحات میں گزارا تھا۔ اسی لئے ہم لوگ کافی تھک چکے تھے۔ اس لئے بستر پر جاتے ہی رخسانہ تو سوگئی تھی لیکن میری نیند کافی کچی تھی۔

ایک عجیب قسم کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی وہ آواز کسی کے ہولے ہولے کراہنے کی تھی...... دفعتاً ایک درد بھری چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی میں نے الماری سے اپنا پستول نکالا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

راہداری میں چاروں طرف اندھیرا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے آواز راہداری کے آخری کونے سے آئی ہو...... اس آخری کونے کی جانب زوہیب کا کمرہ تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ آواز زوہیب کے کمرے سے آئی ہو۔ جیسے ہی میں کمرے میں اندر داخل ہوا تو میری آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

میرا بچہ زوہیب پلنگ سے تین چار فٹ اوپر فضا میں معلق گھوم رہا تھا نیلی روشنی اس کے پورے جسم پر محیط بالکل کسی چادر کی طرح تنی ہوئی تھی وہ اس نیلی روشنی کے حصار میں جکڑا ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا، نیچے وہی دونوں جڑواں بھائی کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔

"زوہیب...... میرے بچے۔" میں نے چلا کر آواز لگائی۔

زوہیب کے بجائے ان دونوں نے مجھے پلٹ کر دیکھا، دوسرے لمحے ان کی آنکھوں میں حقارت ناچنے لگی، دفعتاً ان کے ہاتھ سیدھے ہوئے اور مکا بن کر میری طرف آئے۔ ان کے مکے کا وار بڑا ہی زوردار تھا میں جیسے اڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور پوری قوت سے راہداری کے پہلے سرے سے جا ٹکرایا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں اٹھ نہ سکا مجھے اپنے سر میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا، سر کے پچھلے حصے سے چپچپاہٹ محسوس ہو رہی تھی، شاید میرا سر پھٹ گیا تھا اور خون نکل رہا تھا۔

اچانک میری نظر فرش پر پڑی، میں نے دیکھا کہ ایک عجیب لجلجی سی چیز فرش پر رینگتی ہوئی میری جانب بڑھ رہی ہے میرے حلق سے چیخ نکل گئی ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔

پہلے تو خود میری سمجھ میں نہ آیا جب حواس بحال

ہوئے تو میں خود ہی مسکرایا۔ "تو گویا یہ خواب تھا لیکن بڑا ہی خوف ناک اور وحشت ناک تھا۔" لیکن نہ جانے کیوں مجھے سر میں بہت درد محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے بعد میں کافی دیر تک جاگتا رہا پھر سو گیا۔

صبح کافی دیر سے میری آنکھ کھلی، سر میں درد ابھی تک محسوس ہو رہا تھا ایسے لگ رہا تھا کہ درد کی شدت سے میرا سر پھٹا جا رہا تھا۔ خیر جیسے تیسے باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ زوہیب دروازے پر کھڑا چیونگم چبا رہا ہے ایسا کرتے وقت اس کے چہرے کی رگیں ابھر آئی تھیں یوں لگتا تھا کہ اس کے جبڑے تھک چکے ہوں۔

زوہیب کی یہ حرکت دیکھ کر میرا بلڈ پریشر ایک دم ہائی ہو گیا۔ "صبح صبح زوہیب کی یہ حرکت بہت ہی معیوب تھی، سر میں شدید درد کی وجہ سے زوہیب کا یہ عمل مجھے اور بھی برا لگا۔

"زوہیب...... تمہیں ذرا بھی تمیز نہیں ہے۔ کہ صبح صبح۔" میں نے انتہائی سخت لہجے میں کہا۔

یہ دیکھ کر میں انتہائی حیرت زدہ رہ گیا کہ زوہیب کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے جبکہ اس کے جبڑے مسلسل چیونگم کی جگالی میں مصروف تھے۔

"مم...... میں خود سے ایسا نہیں کر رہا ابو۔" زوہیب نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"کیا مطلب ...... ہے تمہارا......؟ تم ایسا نہیں کر رہے ہو تو پھر کون کر رہا ہے۔؟" میں نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"ابو...... یہ چیونگم مجھے چبا رہا ہے۔"

فوری طور پر مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ اس کی احمقانہ بات کا میں کیا مطلب نکالوں۔

پھر بھی مجھے معلوم تھا کہ زوہیب مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا جبکہ زوہیب کی حالت بالکل میرے سامنے تھی اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی چہرہ وحشت زدہ ویران جبکہ جبڑے بالکل نیلے پڑے ہوئے تھے۔

"ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔"

دفعتاً مجھے وہ رات یاد آ گئی جس رات اس سڑک پر ایک غیر انسانی مخلوق سے میرا پالا پڑ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں پھر کچھ سوچ کر میں نے میز پر ایک کاغذ بچھا دیا۔

"چیونگم اس پر تھوک دو۔"

زوہیب نے چند لمحوں تک ایسا کرنے کی کوشش کی پھر روہانسا ہو کر بری طرح سے رونے لگا تھا۔

میرے لئے یہ صورت حال بالکل نئی اور خوف ناک تھی میں نے زوہیب کو منہ کھولنے کا اشارہ کیا اور انگلی اس کے منہ میں ڈال دی وہ لجلجا سا چیونگم میری انگلی سے لپٹ گیا۔ کراہیت تو بہت ہوئی لیکن معاملہ اپنی اولاد کا تھا۔

میں نے اس گندے ہوئے چیونگم کو باہر کھینچنے کی کوشش کی لیکن وہ بار بار پھسل جاتا یوں لگتا تھا کہ زوہیب کے منہ میں کوئی زندہ مخلوق ہو میں نے بڑی تگ و دو کے بعد اس منحوس چیونگم کو باہر کاغذ پر پٹخ دیا اس چیونگم کے باہر آتے ہی میں نے اپنے بیٹے کے چہرے پر بے حد سکون دیکھا۔

"تمہاری یہ حالت کب سے ہے۔؟" میں نے زوہیب سے پوچھا۔

"پچھلی رات سے۔؟" اس نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔

"پچھلی رات یہ میرے منہ میں تھا میں نے نیند کی جھونک میں اسے نکال کر باہر پھینک دیا۔ صبح آنکھ کھلی تو یہ میرے منہ میں تھا اور جبڑے حرکت کر رہے تھے اور جب سے یہ چیونگم باہر ہی نہیں آیا۔" پچھلی رات کی بات سن کر میں چونک پڑا وہ لجلجی شے یقیناً یہی چیونگم ہوگا۔ میں کاغذ کو لپیٹ کر کچرے کے ڈبے میں ڈالنے کے لئے کاغذ کی جانب بڑھا ہی تھا کہ میری آنکھیں حیرت اور خوف سے کھلی کی کھلی رہ گئیں میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حقیقت میں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ ایسا تو فلموں یا کہانیوں میں ہوتا ہے وہ منظر تھا ہی اتنا خوف۔

کاغذ پر موجود چیونگم بے ہنگم انداز میں ہل رہا ہے ہلتے ہلتے اپنا حجم بڑھا رہا ہے...... چیونگم کا حجم اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ وہ میز سے اتر کر فرش پر رینگ رہا تھا دفعتاً زوہیب کے حلق سے دل خراش چیخ نکلی...... پہلے تو مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ

زوہیب کے چیخنے کی وجہ کیا ہے لیکن جب میں نے دیکھا تو میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔
وہ چیونگم زوہیب کی ٹانگوں سے لپٹ چکا ہے اور دھیرے دھیرے اس کے منہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔
میری چیخوں کی آواز سن کر رخسانہ سمیت تمام ملازمین اکٹھے ہوگئے۔ ملازم تو یہ سب دیکھ کر باہر کی طرف بھاگ گئے جب کہ میں اور رخسانہ اس منحوس چیونگم کو زوہیب کے جسم سے علیحدہ کرنے میں لگ گئے، جو کہ اس کی گردن تک پہنچ چکا تھا۔ میں اور رخسانہ نے اس چیونگم کو بڑی مشکلوں سے کھینچ کھانچ کر علیحدہ کیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔
میں نے دیکھا کہ چیونگم کے نکلتے ہی زوہیب بے ہوش ہوچکا ہے۔ یہ سب کیا تھا...... رخسانہ نے زوہیب کو بیڈ پر لٹاتے ہوئے پوچھا۔
''پتہ نہیں......'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔
''مگر...... مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا...... ضرور تم کچھ چھپا رہے ہو جواد......'' رخسانہ کے لہجے میں تشویش اور پریشانی تھی۔
میں نے رخسانہ کو مختصراً ان جڑواں بھائیوں کے بارے میں بتایا جسے سن کر وہ پریشان ہوگئی۔
رخسانہ ایک ماں تھی جس کا پریشان ہونا قدرتی بات تھی...... دفعتاً مجھے اپنے اردگرد ایک عجیب سا احساس محسوس ہوا جیسے کہ میرے آس پاس کوئی موجود ہے یہ احساس انتہائی قوی تھا۔ دفعتاً میں نے رخسانہ کے بالکل پیچھے کسی کو ظاہر ہوتے دیکھا...... وہ سایہ وہ وجود اب بالکل میرے سامنے تھا وہ سفید ساڑھی میں لپٹی ہوئی کسی عورت کا سایہ تھا اس کے کھلے بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی زوہیب کے بیڈ کے پاس آگئی اس کا چہرہ جیسے ہی میرے سامنے آیا تو میں چونک گیا۔ یہ وہی عورت تھی...... جو مجھے اس دن سڑک پر ملی تھی، وہ آہستہ سے زوہیب پر جھک گئی۔
''رخسانہ...... اس عورت کو روکو......'' میں نے چیخ کر کہا۔ میری بات سن کر رخسانہ چونک پڑی۔
''کسے روکوں......؟''
''اس عورت کو جو بیڈ کے پاس کھڑی ہے۔''
''کس کو...... کون ہے بیڈ کے پاس...... کون ہے......؟'' رخسانہ حواس باختہ ہوگئی۔
''یہ مجھے نہیں دیکھ سکتی...... مجھے صرف تو دیکھ سکتا ہے۔'' وہ عورت سرد لہجے میں بولی۔
اس عورت کی نگاہوں میں تمسخر تھا اور ہونٹوں پر انتہائی طنزیہ مسکراہٹ تھی۔
''کون ہے یہاں۔؟'' رخسانہ وحشت زدہ لہجے میں بولی۔
''تو کیا بتائے گا میرے بارے میں...... یہ تجھے پاگل سمجھے گی۔ تو نے ہی میرا بچہ مارا ہے...... میں تیرے بچے کو نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ زوہیب کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔
''مجھے ماردو...... میرے بچے کو چھوڑ دو۔''
میری بات سن کر اس کے منہ سے قہقہہ نکلا...... اور وہ غائب ہوگئی۔
''یہ تم کس کو کہہ رہے ہو'' رخسانہ مجھے جھنجھوڑ کر بولی۔
''وہ...... وہ...... یہاں ہے...... وہ اسے ماردے گی۔'' میں نے وحشت زدہ لہجے میں رخسانہ کی بات کا جواب دیا۔
دفعتاً میرے کانوں میں زوہیب کی چیخیں سنائی دیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے ساتھ ساتھ رخسانہ کے حلق سے بھی چیخیں نکلنا شروع ہوگئیں۔
ہم نے دیکھا زوہیب بیڈ سے اوپر فضا میں معلق ہونے لگا تھا اس کے جسم کے اوپر نیلی روشنی نے ہالہ بنایا ہوا تھا جبکہ وہ لجلجا سا چیونگم دیوار پر چڑھتا ہوا چھت تک پہنچ چکا تھا۔
''زوہیب......'' رخسانہ کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہوکر گر پڑی مجھ پر جیسے سکتہ سا طاری تھا۔ میرا جسم بے حس و حرکت ہو چکا تھا میرا سر بری طرح سے چکرا رہا تھا۔ حواس و خرد سے بیگانہ ہونے سے قبل میں نے اتنا دیکھا کہ وہ چیونگم فضا میں معلق زوہیب کی طرف بڑھ

رہا تھا۔

مجھے جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ رخسانہ اور زوہیب مجھ پر جھکے ہوئے ہیں۔

"وہ......وہ...... چیونگم۔" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"آپ نے باہر پھینک دیا تھا......" رخسانہ نے مسکرا کر کہا۔

"وہ تو واپس آ گیا تھا ناں۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ......" رخسانہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"وہ...... کیا کہہ رہی ہو...... مجھے سمجھ نہیں آ رہا۔" میں نے کہا۔

"آپ اور ہم زوہیب کو لٹانے کے بعد باتیں کررہے تھے کہ بلاوجہ آپ چیختے چیختے بے ہوش ہوگئے۔" رخسانہ بولی۔

میرا منہ...... رخسانہ کی بات سن کر احمقانہ انداز میں کھل گیا لیکن رخسانہ کا لہجہ اور چہرے کے تاثرات اس کی سچائی کا ثبوت دے رہے تھے۔ لیکن ایک بات ضرور تھی میں اتنا ضرور جانتا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے مجھے چھوڑے گی نہیں وہ مجھ سے بدلہ ضرور لے گی۔ کیونکہ اس کی نظر میں، میں اس کے بچے کا قاتل تھا۔

☆......☆......☆

رات کے 12 بجے کا وقت رہا ہوگا۔ میں زوہیب کی وجہ سے پریشان تھا میں جانتا تھا کہ وہ میرے بچے کو ضرور مار دے گی۔ مجھے کچھ کرنا تھا زوہیب کو بچانا تھا۔

دفعتاً یکے بعد دیگرے زوہیب کی خوفناک چیخیں سنائی دینے لگیں وہ چیخیں اتنی خوف ناک اور دل دہلا دینے والی تھیں کہ پورا گھر ملازموں سمیت زوہیب کے کمرے میں جمع ہوگیا زوہیب کی آنکھیں اوپر کو چڑھی ہوئی تھیں۔ جبکہ چیونگم اس کے منہ میں تھا جسے وہ چبا رہا تھا۔ اس کے منہ سے خون جاری ہوچکا تھا اس کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں کہ میں زوہیب کی مدد کرنے آگے بڑھا مگر اس کے ایک ہی وار سے میں لم لیٹ ہوگیا شرفو کسی زمانے میں پہلوانی اور کشتی کرتا تھا اور بڑا ہی جی دار قسم کا انسان تھا۔

مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ شرفو زوہیب کے دھکے سے اڑتا ہوا پنکھے کے پروں سے جا ٹکرایا۔ رخسانہ کے حلق سے خوف ناک چیخ نکلی اور تیورا کر گر پڑی۔

پنکھے کے تیز رفتار پروں نے شرفو کی گردن کاٹ دی تھی اور اس کا بے جان لاشہ فرش پڑا تھا۔ دوسرے ملازمین یہ منظر دیکھ کر چیختے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے جبکہ دھنو وہاں کھڑی بڑی عجیب نظروں سے اس لاش کو دیکھ رہی تھی۔

زوہیب انتہائی حقارت اور نفرت بھری نظروں سے اس لاش کو دیکھ رہا تھا زوہیب کی آنکھوں میں عجیب قسم کا خوف ناک تاثر تھا۔ زوہیب اب آہستہ آہستہ میری جانب بڑھ رہا تھا۔

"جواد ہٹ جائیں یہاں سے......" رخسانہ چیختی ہوئی بولی۔

لیکن میں نے شاید سنا نہیں...... اب زوہیب مجھ تک پہنچ چکا تھا زوہیب نے مجھے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور بے حد حقارت سے گھورنے لگا اسی لمحے مسجد کا لاؤڈ اسپیکر بول پڑا۔

وہ صدا جس پر ہم کبھی بھی دھیان نہیں دیتے میری جان بچانے کا سبب بن گیا۔ اذان کی پرکشش اور دلوں کو چھو لینے والی آواز زوہیب کے کانوں سے ٹکرائی اور زوہیب بے ہوش ہوکر گر پڑا۔

بے ہوش زوہیب کے چہرے پر معصومیت اور کرب بیک وقت پایا جاتا تھا۔ رخسانہ گھسٹتی ہوئی آئی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ مجھ سے اپنے لخت جگر کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی تھی ہم نے کسی کا کیا بگاڑا تھا جو ہم کو یہ دن دیکھنے پڑے تھے شرفو کی بے گناہ لاش الگ پولیس کی منتظر تھی۔ جبکہ زوہیب کے بے ہوش ہوجانے کے بعد میں اور رخسانہ بہت کوشش کرکے اس چیونگم کو نکالنے کی کوشش میں تھے مگر ہم ناکام رہے یوں لگتا تھا کہ جیسے کسی نے منہ میں ایلفی ڈال دی ہو...... بے ہوشی میں بھی جبڑے حرکت میں تھے۔

"مالک...... مجھ سے چھوٹے سرکار کی حالت دیکھی

نہیں جاتی۔" دھنو نے میرے قریب آ کر کہا۔
"دیکھی تو مجھ سے بھی نہیں جاتی..... کاش میں اس کے لئے کچھ کرسکوں یہ کام صرف ایک آدمی کرسکتا ہے مالک۔" دھنو نے میری بات سن کر کہا۔
"کون ہے.....وہ......؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔
"اس کا نام جگن ہے..... اور وہ ذات کا چمار گند کھاتا ہے اور گندے علم کرتا ہے۔"
"تو پھر تو کھڑی کیوں ہے..... لے آ اسے....." میں نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔
"وہ ایسے نہیں آئے گا مالک۔"
"تو پھر کیسے آئے گا.؟" میں نے سیدھا ہو کر دھنو کی طرف دیکھا۔
"اسے خوش کرنا پڑے گا۔" دھنو نے سر جھکا کر کہا۔
"مطلب.....؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
"وہ عورت پر کسی ندیدے کتے کی طرح لپکتا ہے۔ مجھ پر وہ ویسے دانت تیز کئے بیٹھا ہے۔" دھنو کے لہجے میں حقارت تھی۔
"تو اسے لے کر آ..... مین اسے بہت زیادہ پیسے دوں گا۔"
"اچھا....." اس نے نہایت عجیب انداز میں میری طرف دیکھا اور باہر نکل گئی کوئی دو سے تین گھنٹے کے بعد میرے سامنے ایک اجنبی شخص موجود تھا اس طرح کے وضع قطع کے شخص کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ گہری اور سیاہ رنگت کا مالک تھا..... اس کے ہونٹ نہ صرف بہت موٹے اور بھدے تھے سر کے بال بلوچوں کی طرح گھنگھر و تھے اس کے جسم پر لباس انتہائی معمولی سا تھا کہ وہ نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ جبکہ اسکی آنکھوں کی چمک بہت گہری تھی۔
"سلام مالک....." اس نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
میں نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔
"کیا نام ہے تمہارا....." میں نے اس کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔
"حضور خادم کو جگن کہتے ہیں....." اس نے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔
"کیا تم کالا علم کرتے ہو....." دھنو نے مجھے یہی بتایا ہے۔
"ہاں..... مالک....." اس نے دھنو کی جانب حریص نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
دھنو اس کی نظروں کی ہوس محسوس کرتے ہوئے گھبرا گئی۔
"مالک کالے علم میں اپنا کوئی ثانی نہیں۔"
"تم میرے بچے کو دیکھو۔" تم نے اگر اسے اچھا کردیا تو منہ مانگا انعام ملے گا۔
انعام کا سن کر جگن کی چمکیلی آنکھوں کی چمک اور زیادہ گہری ہوگئی۔
"کہاں ہے وہ مالک.....؟"
زوہیب بدستور بے ہوش تھا۔ اس کے جبڑے مسلسل جگالی کررہے تھے اور بے حد نیلے پڑ چکے تھے اور خلاف معمول سے زیادہ پھول چکے تھے جگن چند لمحوں تک بڑی ہی باریکی سے زوہیب کا جائزہ لے رہا تھا۔ جبکہ جگن کے لب مسلسل ہل رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد جگن نے بے ہوش زوہیب کے ماتھے پر اپنا انگوٹھا رکھ دیا کچھ ہی لمحوں کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔
"وہ بہت طاقتور ہے..... بہت شکتی شالی..... تمہارے بچے کو مار دے گی۔"
"کون مار دے گی.؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔
"وہی جس کے بچے کو تمہارے دھکے نے مار دیا تھا۔" جگن نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔
"دو دن ہیں۔" اس کے پاس جگن نے پھر کہا۔
"یہ کیا کہہ رہے ہو تم.؟" میں نے جگن کو جھنجھوڑ کر کہا۔
"ہاں مالک..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں مگر وہ بچ سکتا ہے۔"

"کیسے.....؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"ایک جاپ کرنا ہوگا..... تم کو مالک۔"

"مجھ کو" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں..... تم کو مالک..... کیونکہ تم یہ جاپ کرو گے اور وہ آتما میرے قبضے میں آجائے گی..... اور میں دھنوان ہوجاؤں گا" اس نے خیالی پلاؤ پکاتے ہوئے کہا۔ اس کی بات سن کر میں نے کہا۔ "تم اس آتما کے ساتھ کچھ بھی کرو مجھے کوئی واسطہ نہیں۔"

میری بات سن کر جگن کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوگئیں۔

"مالک بچہ تمہارا اور عمل بھی تمہیں کرنا ہوگا۔"

"اچھا....." میں نے سر جھکا کر کہا شاید میں بھول گیا تھا کہ بچے کی محبت میں جو کام کرنے جارہا ہوں وہ کام غلط ہے اور گناہ ہے۔

"مجھے کیا کرنا ہوگا.....؟"

"تمہیں قبر میں لیٹ کر ایک رات گزارنی ہوگی..... قبر وہ جو کم از کم 5 سال پرانی ہو۔"

"قبر میں ایک رات....." میں نے لرز کر کہا۔

"ہاں مالک..... ایک رات..... جو میں بتاؤں گا وہ تمہیں پڑھنا ہوگا۔" میں بھول گیا تھا کہ میں ایک مسلمان ہوں اور مسلمان قبروں کا احترام کرتے ہیں لیکن مجھے بیٹے کی محبت نے اندھا کردیا تھا، میں جو کرنے جارہا تھا وہ خلاف قانون تھا اور خلاف قدرت تھا، لیکن میری آنکھوں پر تو پٹی بندھی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کے تقریباً بارہ بج چکے ہوں گے گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی چاروں طرف ہو کا عالم تھا..... سردی کی شدت میں اضافہ ہوچکا تھا میں جگن کے ساتھ قبرستان کے باہر کھڑا تھا۔ "وہ قبر کہاں ہے.....؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں جگن سے پوچھا۔

"اندر....." جگن نے ہاتھ کے اشارے سے کہا میں اور جگن ٹارچ لائٹ کی روشنی میں اس قبر تک پہنچ گئے۔ دفعتاً کسی الو کی بھیانک آواز سے میرے پورے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔

"میں باہر بیٹھ کر گندی شکتیوں کو تمہاری سمت آنے سے روکوں گا۔" "مگر.....!"

"اگر..... مگر..... کچھ نہیں..... وہ کوئی معمولی آتما نہیں..... اگر تمہاری جان چھوٹ جائے گی تو..... وہ میری ہوگی..... میں اپنے سارے کام سیدھے کرلوں گا۔" اس کے لہجے میں بے پناہ پیار انڈ آیا تھا۔

وہ ایک بہت پرانی قبر تھی۔ جگن نے اس قبر کو بالکل صاف کردیا ہر انسان کو قبر میں ضرور لیٹنا پڑتا ہے اپنے اعمال کا حساب ضرور دینا پڑتا ہے..... مگر میں زندہ ہی اس میں لیٹ گیا تھا جگن کے بتائے ہوئے منتر پڑھتے ہوئے جیسے میں سب کچھ بھول گیا تھا نہ جانے کتنی دیر گزری ہوگی کہ مجھے ایسا لگا کہ کوئی میرے اوپر آرہا ہو..... میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

لیکن وہاں کوئی نہ تھا چند لمحوں کے بعد میں نے دیکھا کہ میں ایک لق ودق صحرا میں کھڑا ہوں۔ پیاس کی شدت سے میرے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے دفعتاً میں نے ایک چیخ کی تیز آواز سنی جو کہ میرے بالکل پیچھے سے سنائی دی تھی۔ جیسے ہی میں مڑا میرے حلق سے چیخیں نکل گئیں اور میں نے بھاگنا شروع کردیا..... بھاگتے بھاگتے میرا پیر پھسلا اور میں لڑکھڑا کر گر پڑا وہ منحوس پرندہ جھکائی دے کر مجھ پر حملہ آور ہوا میں نے اپنے چہرے کو بچانے کے لئے دونوں ہاتھ آگے کردیئے پرندے کے پنجوں کی رگڑ سے میرے دونوں ہاتھوں سے خون بہنے لگا میں نے درد کی شدت سے آنکھیں کھول دیں۔

شاید یہ اسی شیطانی قوت کا کمال تھا جس سے میں اپنے بچے کو بچانا چاہ رہا تھا۔ میرے بازوؤں سے خون بہہ رہا تھا کچھ ہی لمحے گزرے ہوں گے مجھے ایسا لگا کہ میں فضاؤں میں پرواز کررہا ہوں..... میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے تارے رقص کرنے لگے میں نے گھبرا کر آنکھیں ملیں تو میرے سامنے کا منظر اب دوسرا تھا۔

میں ایک انتہائی پرانی اور بوسیدہ عمارت میں موجود تھا یہ عمارت عام عمارتوں سے مختلف تھی اس کا طرز تعمیر

بالکل جدا تھا اس کو دیکھ کر مجھے زمانہ قدیم کے بودھ مندر یاد آ گیا جو کہ قدیم تہذیبوں کی عکاسی کرتی فلموں میں دکھائے جاتے تھے۔ مجھے انتہائی تعجب ہو رہا تھا کہ قبر میں لیٹنے کے بعد میں کہاں پہنچ چکا ہوں لیکن مجھے ان سب چیزوں کی کوئی پروانہ تھی مجھے تو صرف اپنے بچے کی جان کی پرواہ تھی، اس کے لئے مجھے کچھ بھی کرنا پڑا تو میں ضرور کروں گا۔

دفعتاً مجھے شدید چرچراہٹ کی آواز سنائی دی اور مندر کا بھاری دروازہ اندر کی جانب کھلتا چلا گیا دفعتاً مجھے ایسا لگا کہ جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ اپنے بچے کی جان بچانی ہے تو اندر چلے آؤ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا مندر کے اندر داخل ہو گیا۔ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا پورا مندر روشنی سے جگمگا اٹھا سامنے ایک بہت بڑا وسیع وعریض ہال تھا ہال کی چھت گنبد نما تھی جس کی اندرونی سطح پر ہر طرف مختلف شبیہ اور اشکال کھدے ہوئے تھے ہر شبیہ اور اشکال کی تصاویر انتہائی خوف ناک تھی کہیں پر انسانوں کی قربانی کا منظر تھا اور کہیں پر عورتوں کو انتہائی شرمناک روپ میں دکھایا گیا تھا۔ ہر طرف بڑی بڑی مشعلیں روشن تھیں سامنے ایک سنگی چبوترے پر ایک گہرے سبز رنگ کا تابوت رکھا تھا جس سے روشنی کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔

دفعتاً مجھے قدموں کی آہٹ کی آواز سنائی دی جو کہ مجھے اپنے عقب سے آتی محسوس ہو رہی تھی میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جیسے میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، حیرت سے میں جیسے سکتے کی کیفیت میں آ گیا تھا۔

میرے سامنے وہی دونوں جڑواں بھائی کھڑے تھے اس بار انہوں نے سفید رنگ کے لمبے چوغے پہن رکھے تھے اور سر پر عجیب سی ٹوپیاں تھیں۔

”کتے..... حرام زادے..... ذلیل۔“ میں چیختا ہوا ان دونوں کی جانب بڑھا میرا ارادہ ان دونوں کو ختم کر دینے کا تھا لیکن مجھے اپنی سوچ پر افسوس کرنے کا موقع بھی نہ ملا کیونکہ ان دونوں کے وار نے مجھے تارے دکھا دیئے تھے میں اڑتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔

”میرے بچے نے کیا بگاڑا تھا.....“ میں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

میری بات کا جواب دینے کے بجائے وہ دونوں مسکراتے رہے۔ ”جواب دو.....“ میں نے چیختے ہوئے کہا۔

”تم نے ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑا..... مگر اس کا ضرور بگاڑا ہے.....“ وہ دونوں تابوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یک زبان ہو کر بولے۔

میں نے تابوت کی طرف دیکھا تو اس کا ڈھکن آہستہ آہستہ اوپر کی طرف اٹھ رہا تھا ماحول انتہائی شدید خوف ناک اور پراسرار ہو چکا تھا تابوت سے انتہائی خوب صورت حسین ہاتھ باہر آیا اگر کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس ہاتھ کی خوب صورتی میں قصیدہ ضرور پڑھتا۔

تابوت سے برآمد ہونے والی وہی لڑکی تھی جو اس دن مجھے سڑک پر ملی تھی جہاں سے میری بدنصیبی کا آغاز ہوا تھا۔ اس لڑکی نے ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی جسم مکمل طور پر زیورات سے لدا ہوا تھا، جبکہ اس کی ساڑھی اور جسم کے گرد نیلے رنگ کی روشنی کا حصار قائم تھا۔

”تو تم آ گئے.....“ وہ میری جانب دیکھ کر مسکرائی۔

”میرے بچے کو معاف کر دو.....“ میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

”معاف..... معاف.....“ اتنا کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑی۔ ”تم نے میرے بچے کو مارا..... مگر میں تمہیں ایک موقع ضرور دوں گی۔“

”کیسا موقع.....؟“ میں نے بےتابی سے پوچھا۔

”تم کو میرے پاس رہنا ہو گا۔ میرا بن کر..... تا کہ میں پھر ماں بن سکوں۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

”مگر تم تو ایک روح ہو..... اور میں نے تمہارے بچے کو مارا بھی نہیں۔“

میری بات سن کر اس کے چہرے پر غیض وغضب کے تاثرات نمودار ہوئے..... پھر یکدم اس کے چہرے کے تاثرات پرسکون ہو گئے۔

”تم سے پہلے بھی ایک شخص نے ایسا ہی بولا تھا..... آج اس کا اکلوتا بیٹا مر چکا ہے تمہارا بھی مر جائے گا..... پھر مجھے کوئی اور مل جائے گا.....“ وہ مسکرائی۔ اس کی بات سن

کر میرے چہرے پر لرزے کی کیفیت طاری ہوگئی۔

''خود کو بچاتا ہوں تو بیٹا مرتا ہے...... مجھے اپنی موت تو منظور ہے لیکن بیٹے کی نہیں۔'' میں نے سوچا۔

''ٹھیک ہے...... مجھے تمہاری شرط منظور ہے...... میں اپنے بیٹے کو صحیح سلامت دیکھنا چاہتا ہوں ابھی اور اسی وقت......'' میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''میری بات سن کر وہ کھل اٹھی...... اس نے دیوار کی جانب اشارہ کیا۔

دیوار جیسے کسی سینما اسکرین کی طرح روشن ہوگئی۔

وہ ایک اسپتال کا منظر تھا...... آپریشن تھیٹر کے باہر بہت سارے لوگ جمع تھے جو کہ سارے میرے ملازمین تھے جبکہ رخسانہ پریشانی کے عالم میں باہر کھڑی تھی اس کے چہرے پر سوگواری کی سی کیفیت تھی۔

چند لمحوں بعد آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر باہر آیا۔ ''مبارک ہو...... مسز جواد آپ کے بیٹے کی حالت خطرے سے باہر ہے۔''

''شکر ہے خدا کا۔'' رخسانہ نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ ''مگر مسز جواد اس کی یہ حالت ہوئی کیسے، جبڑے اس حد تک سوج گئے کہ کھانا پینا مشکل ہوگیا۔''

''معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب...... شاید کسی کیڑے وغیرہ نے کاٹ لیا ہوگا۔''

''خیر...... خطرے کی کوئی بات نہیں...... کھانے میں صرف ٹھوس غذاؤں سے گریز کریں اپنے شوہر کو بلوائیں کہاں ہیں......؟'' ڈاکٹر نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

ڈاکٹر کی بات سن کر رخسانہ کے چہرے پر اداسی طاری ہوگئی۔

''ان کی لاش کل قبرستان سے ملی۔ ان کے ساتھ ایک اور لاش بھی تھی نہ معلوم وہ قبرستان کیا کرنے گئے تھے۔'' رخسانہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''اوہ...... سوری مسز جواد ٹیک کیئر۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر دوسری طرف چلا گیا مگر رخسانہ کے آنسو تھمنے کا نام نہیں ہی لے رہے تھے۔

کچھ لمحوں بعد آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور آپریشن تھیٹر سے اسٹریچر پر زوہیب باہر آیا، اپنے بچے کو دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہوگیا اس کے پورے منہ پر پٹی بندھی پڑی تھی...... اور وہ کافی ٹھیک لگ رہا تھا۔

☆......☆......☆

دیوار پر ظاہر ہونے والے وہ مناظر غائب ہوگئے، میں نے اپنے بیٹے کی زندگی کا سودا اپنی موت سے کرلیا تھا۔ میں وہ مناظر دیکھنے میں اتنا مگن رہا کہ میں بھول گیا کہ وہ لڑکی اور وہ دونوں بھائی غائب ہو چکے تھے۔

دفعتاً پورے ہال میں اندھیرا چھا گیا میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا...... پھر اچانک مجھے کسی نے زور کا دھکا دیا پھر مجھے ایسا لگا کہ جیسے کسی نے مجھے تھام لیا ہو۔ میں اب تک قید ہوں بھوک و پیاس کا احساس تک فنا ہو چکا ہے۔

بس اتنا معلوم ہے کہ میں اس لڑکی کی ہوس پوری کرنے کی مشین بن چکا ہوں نہ جانے کب مجھے اس قید سے خلاصی ملے گی، نہ معلوم کب اپنے بچے کو گلے لگانے کی آس پوری ہوگی...... ہوگی بھی یا نہیں، دنیا کی نظروں میں تو میں ویسے ہی مر چکا ہوں۔

قارئین کرام......! میں اس کہانی کا مصنف آپ سے مخاطب ہوں یہ کہانی جس کا راوی جواد حیدر ہے سچ ہے یا جھوٹ میں نہیں جانتا اس کہانی کا مسودہ مجھے UP مارکیٹ کراچی کے ایک ریڑھی سے مسودے کی صورت میں ملا تھا جو کہ خاصا بوسیدہ اور کافی عجلت میں تحریر کردہ تھا، ایسا لگتا تھا کہ جیسے کسی کو جلدی ہے رجسٹر کے بوسیدہ صفحات پر کئی جگہ خون کے سوکھے دھبے ہیں؟ جواد کا کیا ہوا؟ اس روح کے ساتھ کیا ہوا؟'' ان باتوں کا جواب اس مسودے میں نہیں؟ اس کہانی کو میں نے دوبارہ تیار کیا اور غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے آپ تک پہنچا دیا۔ اب فیصلہ کرنا آپ کے ہاتھ میں ہے کہ یہ داستان سچ ہے یا جھوٹ لیکن باپ کی محبت کی عکاسی کرتی اس داستان کے متعلق اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔
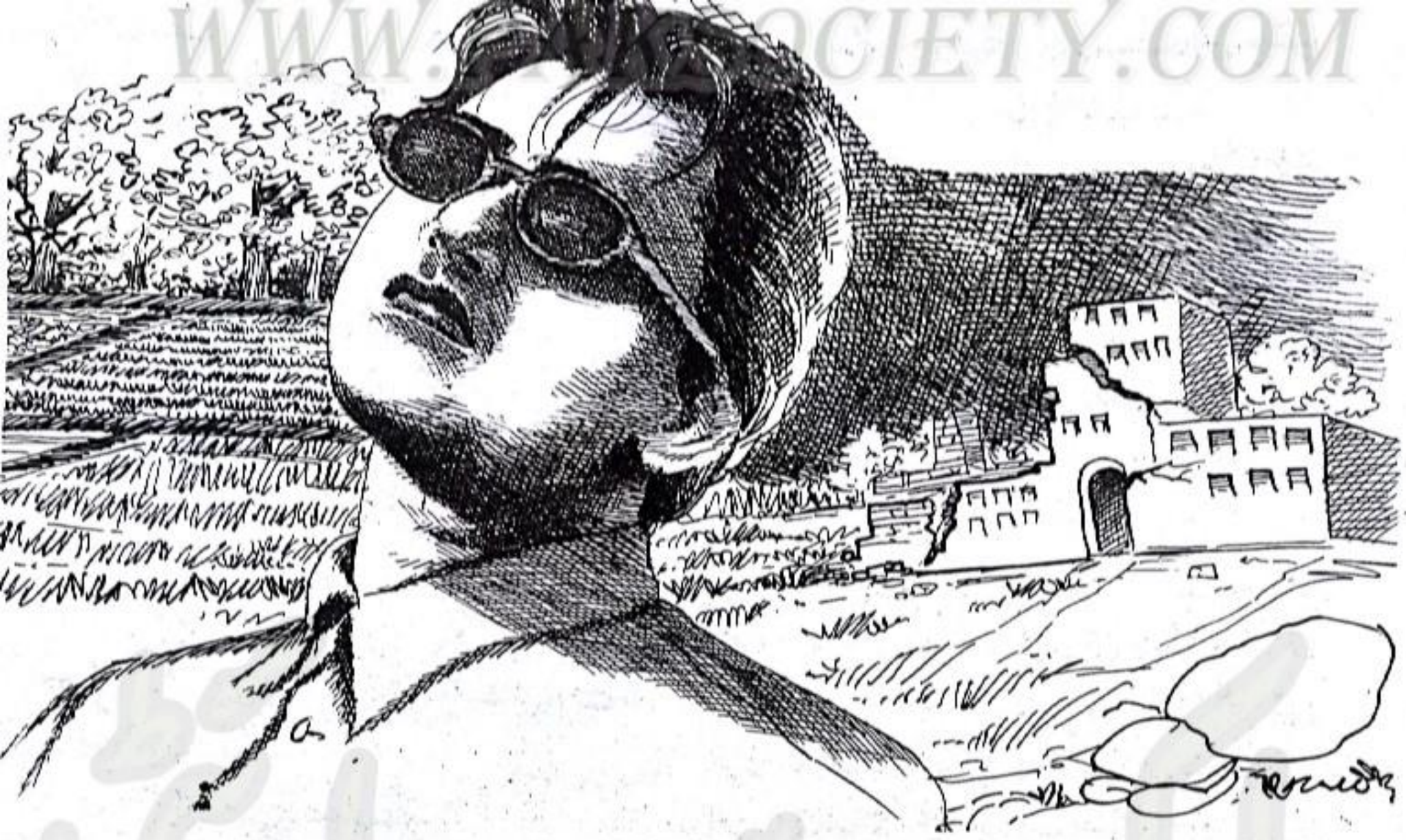
خونی چکر

سیدہ عطیہ زاہرہ۔لاہور

نوجوان ملگجی روشنی میں خوش و خرم گپ شپ میں مصروف تھا۔ اچانک ایک انہونا واقعہ ہوا جس نے پلک جھپکتے ہی نوجوان کی زندگی کو جونک لگا کر رکھ دیا پھر ایک دل دہلاتا منظر......

یہ حقیقت ہے کہ مہیب وخطرناک جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ثبوت کہانی میں موجود ہے

"**عمر** کا ہاتھ ایک حادثے میں ضائع ہوگیا، وہ اسپتال میں ہے۔" صدیق نے یہ خبر خاصی تاسف سے سنائی تھی۔ میں اس خبر کو سن کر چونکا نہیں، نجانے کیوں میرے لئے یہ خبر متوقع سی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب میں اس سے پہلی بار ملا تھا۔ اور ایک دوست نے اس سے میرا تعارف کروایا تھا تو اس نے مجھ سے ہاتھ نہیں ملایا تھا۔ صرف سر کے اشارے سے جواب دیا تھا۔ میں نے اس امر کو خاصا ناگوار محسوس کیا تھا۔ میرے دوست نے اس کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"ان سے ملئے! یہ عمر ملک ہیں، اور علی ٹیکسٹائل ملز میں میکانیکل فٹر ہیں۔"

وہ اس وقت میرے سامنے پتلون کی جیب میں ہاتھ ٹھونسے کھڑا تھا۔

"بداخلاق کہیں کا!" میں نے سوچا تھا۔

وہ چوبیس پچیس سال کا ایک گورا چٹا عام سے نقوش کا صحت مند آدمی تھا۔ لیکن اپنے چہرے مہرے کے اعتبار سے نجانے کیوں تھکا تھکا سا نظر آ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں انجانے تفکرات کے سائے تھے۔ اس کے بعد سرراہ کئی مرتبہ اس سے ملاقات ہوئی، مگر میں دور سے ہی سلام دعا کر کے گزر جاتا، کیونکہ وہ اپنا دایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے ہوتا تھا اور مجھے اس کے اس انداز سے چڑ محسوس ہوتی تھی، مجھے یقین تھا کہ اس سے ملنے کے لئے رکا بھی، تو وہ مجھ سے ہاتھ نہیں ملائے گا، لیکن ایک بار اس نے مجھے فردوس مارکیٹ میں روک لیا۔

''کیا بات ہے جناب؟ اب تو آپ مجھ سے دور دور ہی رہتے ہیں؟ یوں کترا کر گزر جاتے ہیں، جیسے مجھ سے ناراض ہوں۔''

''نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں؟''

میں نے خوش اخلاقی سے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''دراصل میں بہت مصروف ہوتا ہوں۔''

''اب ایسی بھی کیا مصروفیات، آیئے ایک کپ چائے ہو جائے۔''

اس نے بائیں ہاتھ سے میرا بازو پکڑ کر تقریباً کھینچا، اور مجھے اس کے ساتھ نعمت کدہ میں آنا ہی پڑا، ہوٹل میں چائے کا کپ اٹھانے کے لئے جب اس نے اپنا دایاں ہاتھ جیب سے نکالا، تو میں نے دیکھا کہ اس نے سبز رنگ کا سوتی دستانہ پہن رکھا ہے۔

''گرمیوں میں دستانہ؟ عجیب سنکی ہے۔'' میں نے سوچا، مگر اس کی وجہ نہیں پوچھی۔

میں نے خود کئی جواز سوچ لئے تھے۔ ''ممکن ہے اس کا ہاتھ بدصورت ہو، اس پر برص کے دھبے ہوں یا پھر اسے کوئی خاص مرض ہو، جس کی وجہ سے دستانہ پہننا پڑتا ہو۔'' اگر میں نے اسی روز دستانہ پہنے دیکھا ہوتا، تو اتنی توجہ نہ دیتا، لیکن اس کے بعد بھی وہ مجھے جب بھی ملا، دستانہ ہی پہنے ہوتا، اس کے علاوہ میں نے اسے کسی اور سے بھی مصافحہ کرتے نہیں دیکھا، تب مجھے اس کے بارے میں الجھن ہونے لگی، آخر ایک روز کیفے کے کیبن میں چائے پیتے ہوئے میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

''یہ کیا بات ہے عمر صاحب؟ آپ ہمیشہ ایک ہاتھ میں دستانہ پہنے رہتے ہیں، اور آپ کسی سے ہاتھ بھی نہیں ملاتے، سچ پوچھیں تو شروع شروع میں مجھے آپ سے کترانے کی وجہ بھی یہی تھی۔''

اس کی کھوئی کھوئی آنکھیں کچھ اور دھندلی ہو گئیں اور وہ بوجھل سے لہجے میں بولا۔

''آپ میری بداخلاقی کی وجہ سے ہی مجھ سے کتراتے ہیں، لیکن میں مجبور ہوں، اگر میں آپ سے مصافحہ کرتا تو میرے ہاتھ کا لمس محسوس کر کے آپ کو اتنی کراہیت آتی کہ آپ مجھ سے نفرت کرنے لگتے، میرا خیال ہے مجھے اب آپ سے چھپانا نہیں چاہئے۔'' یہ کہہ کر اس نے دستانہ اتار کر اپنا ہاتھ میرے سامنے کر دیا۔

''اوہ خدایا!'' مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ بڑا ہی بھیانک ہاتھ تھا۔ بالکل سیاہ، خشک اور جھریوں بھری کھال، سوکھی سوکھی مخروطی اور نوکیلے ناخنوں والی انگلیاں، مجموعی طور پر وہ کسی بہت بڑے پرندے کا بڑا سا پنجہ معلوم ہوتا تھا، اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو شاید میں نہ چونکتا، لیکن واضح طور پر میں نے یوں محسوس کیا، جیسے ان مخروطی انگلیوں کے نوکیلے ناخنوں والے سروں سے خون کی بوندیں ٹپک رہی ہوں، میں نے بے اختیار میز کی سطح کو دیکھا۔ وہ بالکل صاف اور خشک تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے خون کی بوندیں ٹپک ٹپک کر ہوا میں تحلیل ہو رہی ہوں، بلاشبہ اس کی دلکش شخصیت کے ساتھ اس غیر انسانی گھناؤنے ہاتھ کی موجودگی بڑی کراہیت آمیز تھی۔

''دیکھا آپ نے؟ کتنا بھیانک ہاتھ ہے آج سے ایک سال پہلے یہ ایسا نہ تھا؟''

عمر نے دستانہ پہنتے ہوئے کہا۔ یہ میرے لئے دوسرا حیرت انگیز انکشاف تھا۔

''کیا مطلب؟ یعنی پہلے یہ ٹھیک تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں...... بالکل اسی ہاتھ کی طرح!''

اس نے اپنا بایاں گورا چٹا ہاتھ میز پر ٹکایا۔
''تو پھر یہ ایسا کیوں ہو گیا؟''
''یہ بڑا عجیب اور نا قابل یقین سا واقعہ ہے۔ شاید آپ سننا پسند نہ کریں۔''
''ارے بھائی۔ میں تو کہانیوں کی تلاش میں پھرتا ہوں۔ باقی رہی یقین کی بات، تو اس دور میں کوئی بات قابل یقین نہیں رہی!'' میں نے کہا۔
''ان دنوں میں کراچی میں ملازمت کرتا تھا۔'' وہ بولا۔
''اور میرے لئے وہ کچھ اچھے دن نہیں تھے۔ کیونکہ ابھی میری تربیت مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے بڑی قلیل سی تنخواہ ملتی تھی۔ اور میں ایک چھوٹی سی بستی میں کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ وہ میری زندگی کا بدترین دن تھا۔ جب میرے ایک دوست شفقت نے گوپال سے میرا تعارف کروایا تھا۔ اس روز میں شفقت کے کیبن میں بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ شفقت کا یہ کیبن دراصل برف کا ڈپو تھا جہاں سے بستی کی دکانوں اور گھروں کو برف جاتی تھی۔ گفتگو کے درمیان اچانک شفقت نے کہا۔
''لو بھئی آج میں تمہیں ایک عظیم مصور سے ملواتا ہوں۔ اے گریٹ آرٹسٹ...... ان سے ملو۔ یہ ہیں مسٹر گوپال!''
میں نے چونک کر دیکھا، کیبن کے دروازے میں ایک جوان العمر شخص کھڑا آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ شفقت نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔
''مسٹر گوپال یہ میرے عزیز دوست عمر ملک ہیں۔ آرٹ کے بہت بڑے قدردان!''
''گڈ مسٹر عمر۔ گلیڈ ٹو میٹ یو!''
اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ بڑا مضبوط ہاتھ تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بڑی چمکیلی تھیں، اور اس کے بعد رخساروں کی ہڈیاں نمایاں طور پر ابھری ہوئی تھیں۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا، تو بولا۔ ''میں چھوٹی موٹی تصویر بناتا ہوں، آپ کو میرا آرٹ بہت پسند آئے گا۔''
اس نے کہا۔ میں نے مصوری کے متعلق اس سے گفتگو شروع کر دی۔ تب وہ خاصا بے تکلف ہو گیا، اور مجھے کسی وقت اپنا نگار خانہ دیکھنے کی دعوت دے کر شفقت سے برف لے کر چلا گیا، اس کے جانے کے بعد شفقت نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔
''وہ خبطی ہے یہ بالکل! بنگال سے آیا ہے۔ تصویریں تو اس کی بالکل کسی تیسرے درجے کی ہوتی ہیں، لیکن پھر بھی ان میں ایک عجیب سی بات محسوس ہوتی ہے۔''
''کیا عجیب سی بات؟'' میں نے پوچھا۔
''میں وہ تاثرات لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ جو میں اس کی تصویریں دیکھ کر محسوس کرتا ہوں، ویسے وہ نزدیک ہی گلی میں ایک گندی سی کوٹھری میں رہتا ہے، وہی اس کا ''نگار خانہ'' ہے۔
چلے چلیں گے کسی دن، تم خود ہی دیکھ لینا!'' شفقت نے کہا۔

☆......☆......☆

ایک اتوار کی شام کو جبکہ ہم دونوں کے پاس کچھ فاضل وقت تھا۔ میں نے اس سے کہا۔
''چلو بھائی آج گوپال سے ملیں!''
شفقت نے اپنے کیبن کو تالا لگایا اور ہم دونوں گوپال کی طرف چل دیئے، برابر والی گلی میں ایک چھوٹے سے دروازے والی کوٹھری کے سامنے پہنچ کر شفقت رک گیا، اور سرگوشی کے سے لہجے میں بولا۔ ''یہ ہے گوپال کا نگار خانہ!''
میں نے اندر جھانکا۔ کوٹھری کے مختلف گوشوں میں تین چار موم شمعیں روشن تھیں۔ جن کی ناکافی روشنی کوٹھری کے اندھیرے سے الجھ رہی تھی۔ سامنے اونچے سے ایزل کے سامنے گوپال ایک چھوٹے سے اسٹول پر دروازے کی جانب پشت کئے بیٹھا تھا۔ ایزل کے اسٹینڈ پر بھی ایک موم بتی روشن تھی۔ اور گوپال اس کی ناکافی روشنی میں ایزل پر جھکا ہوا کچھ کر رہا تھا۔ یہ پہلا آرٹسٹ تھا۔ جسے میں رات کے وقت اور وہ بھی اتنی کم روشنی میں کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً مڑ کر دیکھے بغیر گوپال نے کہا۔
''آیئے...... آیئے...... تشریف لایئے۔''
ہم دونوں اندر داخل ہوئے تو اس نے مڑ کر ہماری

طرف دیکھا۔ ”میں بھی کچھ دیر پہلے آپ ہی لوگوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔“

اس نے برش پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”ہمارے متعلق کیوں سوچ رہے تھے؟“ گوپال صاحب!“ میں نے پوچھا۔

”میں سوچ رہا تھا کہ آپ نے میری طرف آنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن آپ آئے نہیں، لیکن بہر حال آپ آج ہی آگئے۔“

”بس گوپال صاحب، وقت ہی نہیں ملتا، اس وقت ہم مخل تو نہیں ہوئے؟“

”نہیں..... بالکل نہیں، بلکہ مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے آپ پہلے چائے پینا پسند فرمائیں گے، یا تصویریں دیکھنا؟“

”چائے وغیرہ کا تکلف نہ کریں، ہم تو صرف آپ کی گراں قدر تصاویر دیکھنے حاضر ہوئے ہیں۔“

”خیر پہلے آپ تصویریں ہی دیکھیں۔ آج کل آرٹ کی کوئی قدر نہیں جناب! آج کے دور میں آرٹسٹ بھوکے مرتے ہیں!“

میں سمجھ گیا کہ اس بے چارے کی تصویریں بکتی بکاتی نہیں ہوں گی، ویسے بھی وہ اپنے رکھ رکھاؤ سے ہی کوئی ڈھنگ کا مصور نظر نہیں آتا تھا۔ وہ ایک موم بتی ہاتھ میں لے کر ہمیں وہ تصویریں دکھانے لگا۔ جو کوٹھری کی دیواروں پر ٹیڑھی ترچھی ٹنگی ہوئی تھیں۔ ایک ایک کرکے ہم نے ساری تصویریں دیکھیں، اور تب مجھے شفقت کے وہ الفاظ یاد آئے۔

”اس کی تصویریں دیکھ کر میں ایک عجیب سی بات محسوس کرتا ہوں!“

وہ عجیب سی بات یہ تھی، کہ اس کی تصویروں کو دیکھ کر ایک انجانی سی دہشت محسوس ہوتی تھی، حالانکہ ان میں سے کسی میں بھی خوفناک منظر کی عکاسی نہ کی گئی تھی۔ لیکن انہیں دیکھ کر جسم میں ایک ٹھنڈی سی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، میں نے اس کی وجہ پر غور کیا، تو مجھے احساس ہوا کہ تقریباً سب ہی تصویروں میں کسی نہ کسی خون کا تاثر ضرور موجود تھا۔ مثلاً شیر نے کسی ہرن کا شکار کیا اور پھر اس کے خون میں تر اپنے چہرے کو اٹھائے وہ دوسری سمت دیکھ رہا ہے۔

پھر ایک نیم مردہ عورت پینٹ کی، مگر اس کے جسم سے خون کی دھاریاں بہہ رہی ہیں۔ اسی طرح دوسری تصویروں میں بھی کہیں نہ کہیں خون کی عکاسی ضرور کی گئی تھی، اور یہ خون اس قدر حقیقی اور تازہ لگتا تھا جیسے ابھی ابھی خون کے چھینٹے تصویر پر گر گئے ہوں۔

میں نے محسوس کیا کہ خون کے اسی تاثر کو محسوس کرکے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا، اس کے علاوہ بعض تصویریں ایسے کریہہ الصورت بھیانک جانوروں کی تھیں جنہیں میں نے حقیقتاً تو کیا، تصویروں کی حد تک بھی نہیں دیکھا تھا، یہ سب بڑے ہی ڈراؤنے معلوم ہوتے تھے۔ اور ان کے نزدیک کھڑے ہو کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ تصویر کے فریم سے نکل کر ابھی ہم پر جھپٹ پڑیں گے، اور اپنے خوفناک دانتوں اور ناخنوں سے ہمارے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دیں گے!

لیکن ملگجی سی روشنی میں ایک پراسرار سائے کی طرح ایستادہ گوپال اپنی دھن میں مگن مختلف تصویروں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ”فلاں تصویر کا خیال میں نے فلاں جگہ سے حاصل کیا، فلاں تصویر میں نے فلاں واقعہ سے متاثر ہو کر بنائی۔“ وغیرہ وغیرہ!

لیکن میں اس کی گفتگو پر بہت کم دھیان دے رہا تھا۔ میرا ذہن تصویروں میں الجھا ہوا تھا۔ یقیناً ان میں چند غیر معمولی خصوصیات تھیں۔ ہم اس کی اکلوتی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

اور وہ ہمارے منع کرنے کے باوجود ہمارے لئے اسٹو پر چائے بنانے لگا! چائے بنا کر اس نے ٹرے رکھنے کے لئے ایک اسٹول چارپائی کے قریب کھینچ لیا، اور ٹرے اس پر رکھ کر خود سامنے دوسرے اسٹول پر بیٹھ کر ہمارے ساتھ شریک ہو گیا۔

چائے کے دوران، ہم دونوں اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، میں نے اس کی تصویروں کی بھی بڑی تعریف کی۔ جس پر اس نے بخوشی میری پسند کی کوئی بھی تصویر مجھے نذر کرنے کی پیشکش کی، لیکن میں نے

شکریہ کے ساتھ انکار کردیا۔

حقیقتاً میں ان تصویروں میں سے کسی کو اپنے کمرے میں آویزاں کرنے کے تصور سے ہی خوف زدہ تھا۔ لیکن خیر چائے سے فارغ ہو کر ہم نے اس سے اجازت طلب کی اور اٹھ کھڑے ہوئے، میں نے چلنے کے لئے قدم اٹھایا۔

اور عین اسی لمحے غیر متوقع طور پر میرا پاؤں چارپائی کے قریب رکھے ہوئے اسٹول میں الجھ گیا۔ چھناکے سے سارے کپ وغیرہ فرش پر گرے اور ساتھ ہی میں بھی لڑکھڑا کر اوندھے منہ گرا۔ مجھے کوئی چوٹ تو نہیں آئی، لیکن میرا دایاں ہاتھ ایزل کے پاس پڑے ہوئے اسٹول پر رکھے ہوئے ایک پیالے میں جا پڑا، جس سے نہ صرف یہ کہ میرا ہاتھ گاڑھے گاڑھے سیال سرخ رنگ میں لتھڑ گیا، بلکہ وہ پیالہ بھی فرش پر آ رہا!

گوپال نے مجھے اٹھنے میں مدد دینے کے بجائے حیرت انگیز پھرتی سے اوندھے پیالے کو سیدھا کیا، لیکن سارا رنگ فرش پر بکھر چکا تھا۔

دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ یہ دیکھ کر گوپال کے چہرے کی ساری خوش مزاجی کافر ہوگئی ہے۔ بڑی نفرت بھری نظروں سے اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کا سیاہ چہرہ تمتماتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں گویا خون اتر آیا تھا۔

''احمق آدمی تم نے ہزار سالہ مقدس گدھ کا خون ضائع کردیا، میری ساری مصوری تباہ ہوگئی۔'' وہ گویا خود سے مخاطب ہو کر بڑبڑایا۔

میں اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ ''مسٹر گوپال، اگر میں کسی قیمتی رنگ کو ضائع کرنے کا سبب بنا ہوں، تو اس کے لئے میں بے حد شرمندہ ہوں، میں اس نقصان کا ازالہ کس طرح کرسکتا ہوں؟ آپ چاہیں تو میں اس کی قیمت......؟''

''خاموش...... دفع ہوجاؤ۔ میری نظروں کے سامنے سے!''

دفعتاً غیر متوقع طور پر گوپال اخلاق و تہذیب کے سارے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر چیخا۔ ہمیں بجا طور پر بڑی حیرت ہوئی، لیکن وہ بہت زیادہ غصے میں محسوس ہوتا تھا۔ اس لئے ہم اس سے مزید کوئی بات کہے بغیر ایک ناگوار سا تاثر لے کر باہر آ گئے۔ باہر آ کر میں نے اپنے دوست سے کہا۔

''یہ تو بالکل کریک معلوم ہوتا ہے!''

''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔'' اس نے کہا۔ اپنے دوست کے کیبن میں آ کر میں نے ہاتھ دھویا۔ وہ رنگ بمشکل ہاتھ سے اترا اس کے بعد میں گھر آ کر سو گیا۔

اگلی صبح ہاتھ منہ دھوتے وقت جب میری نظر اپنے ہاتھ پر پڑی تو میری چیخ نکل کر رہ گئی۔ میرا ہاتھ یہی شکل اختیار کر چکا تھا۔ جو ابھی آپ نے دیکھا ہے، ہاتھ کی رنگت وہیں تک تبدیل ہوئی تھی۔ جہاں تک وہ اس غیر معمولی رنگ میں لتھڑا تھا۔

اس لمحے مجھے گوپال پر بے حد غصہ آیا۔ میرا ہاتھ یقیناً اس کے نگارخانے کے کسی شیطانی چکر کا شکار ہو چکا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اس بھیانک ہاتھ سے جا کر گوپال کا گلہ دبا دوں، جو ایک گدھ کے بڑے سے پنجے سے مشابہ نظر آ رہا تھا۔

میں اپنے اس ارادے پر عمل کرنے کے لئے بہت زیادہ غصے میں بھرا اپنے کمرے سے نکلا، اور اپنے دوست کو اطلاع دیئے بغیر گوپال کی کوٹھری پر پہنچا۔ وہاں ایک بڑا سا تالا جھول رہا تھا، اس کے بعد گوپال مجھے کبھی نظر نہ آیا۔ ورنہ یقیناً میں اس شیطان کا گلہ گھونٹ دیتا!

لیکن اب میرا دل چاہتا ہے کہ اس ہاتھ کو رولر میں پھنسا دوں۔ چھری سے کاٹ دوں، کیونکہ اس کی وجہ سے میں سوسائٹی سے کٹ کر رہ گیا ہوں۔''

عمر کی کہانی ختم ہوئی، تو اس کا لہجہ خاصا بوجھل ہو چکا تھا۔

آج مجھے جب عمر کا ہاتھ مشین میں آ کر کچلا جانے کی خبر ملی، تو مجھے حیرت نہ ہوئی، کیونکہ عمر کی اپنی خواہش بھی تو ایسی ہی تھی۔

زندہ صدیاں

قسط نمبر: 04

ایم اے راحت

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر جھلمل کرتی، قوس قزح کے دھنک رنگ بکھیرتی، حقیقت سے روشناس کراتی، دل و دماغ میں ھلچل مچاتی ناقابل یقین ناقابل فراموش انمٹ اور شاھکار کھانی

سوچ کے نئے دریچے کھولتی اپنی نوعیت کی بے مثال، لاجواب اور دلفریب کہانی

''ھاں! تو نے مجھے ذلیل کیا ہے۔'' نیولس نے عجیب سے لہجے میں کہا اور تونیسا اپنی جگہ سے اٹھ کر نیولس کے سینے سے جا لگی۔ پھر اس نے کہا۔

''اب ساری بیٹیوں کو تحفظ مل جائے گا۔ اب شاید اس سرزمین کی تقدیر بدل جائے گی۔'' وہ خوشی سے کہہ رہی تھی۔

''تو جو کہے گی میں وہی کروں گا۔ لیکن میں تنہا اس کھیل کو ختم نہیں کرسکتا۔ میں کمزور ہوں۔''

''میرے بے شمار بھائی اس کے خلاف کھڑے ہوگئے ہیں۔ ان کا سہارا حاصل کرو۔ اب ان کے ساتھ شامل ہونے کے لئے انہیں تلاش کرو جن کے خلاف تم کام کرتے رہے ہو۔''

اچانک ہی نیولس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

''اور تم...... تمہارے ذہن میں کوئی ایسا خیال ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔''

ایک بار پھر میرے سر میں کھجلی ہونے لگی۔ میں نے دل میں کہا کہ پیارے بھائی مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے یہ بدن بھی میرا اپنا نہیں ہے۔ مجھے اچانک ہی ذیشان عالی سے پولیسیس بننا پڑا ہے جبکہ میں یا میرے خاندان میں کبھی آج تک پولیسیس نہیں پیدا ہوا۔

بوڑھا غور سے میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ چند لمحات اسی طرح گزر گئے۔ اس کے بعد نیولس نے کہا۔

''اور یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک ایسا شخص جو ہمارا محسن ہے ہماری الجھنوں کا شکار ہوگیا ہے۔ بہرحال اب جو کچھ بھی ہے وہ ایک الگ بات ہے میرا خیال ہے کم از کم اسے ذہنی طور پر آزاد چھوڑ دیا جائے۔ میرے دوست رات ہوگئی ہے۔ تم آرام کرو۔ ہم لوگ تو فضول لوگ ہیں اپنی الجھنوں میں گرفتار ہیں۔''

میں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ اپنی اس آرام گاہ میں واپس آجاؤں اور اپنے بارے میں سوچوں۔ ویسے بھی میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ ایک عجیب الجھا ہوا معاملہ ہے۔ جس کا سر پاؤں میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ لاکھ میں تاریخ کے کسی اجنبی دور میں آ گیا ہوں لیکن بھلا مجھے ان ساری باتوں کے بارے میں کیا معلوم۔

اس وقت رات غالباً اپنے تیسرے پہر میں داخل ہورہی تھی۔ جب مجھے اپنی آرام گاہ کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر کسی نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ میں جاگ رہا تھا۔ آنے والا بوڑھا شخص

تھا یعنی نیولس کا باپ، جس کا نام ابھی تک میرے علم میں نہیں آیا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا تو اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

''میں صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ تم جاگ رہے ہو یا سو رہے ہو۔ میرا ذہن شدید الجھنوں کا شکار ہے۔ اگر تم مجھے اجازت دو تو میں اندر آ جاؤں۔''

''ہاں...... ہاں محترم بزرگ اندر آیئے۔ بھلا اس میں اجازت کی کیا بات ہے۔''

بوڑھا میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ میری شکل دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''جو الفاظ میں ادا کروں گا اگر ان میں تمہیں کچھ ناگوار گزریں تو ایک عمر رسیدہ شخص سمجھ کر معاف کر دینا۔ اصل میں مجھے اچانک ہی یہ احساس ہوا کہ یہ ساری باتیں سن کر تمہاری آنکھوں میں اجنبیت ابھرتی ہے۔ چہرے کے نقوش کبھی نہیں بولتے۔ اگر انسان ان پر قدرت رکھتا ہو لیکن آنکھیں ہر الجھن کا اظہار کر دیتی ہیں۔ اگر ان میں دیکھنے کی صلاحیت تمہارے اندر ہے۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں ہر بات سے اجنبیت محسوس کی ہے۔ کیا تم مجھے اس کے بارے میں بتاؤ گے کہ ایسا کیوں ہے؟''

''میں آپ کے اس شہر میں اجنبی ہوں، جیسا کہ آپ کے بیٹے نے بتایا کہ میں صرف جنگل میں اسے ملا تھا اور اس کی مدد کر کے اس سے شناسائی حاصل کی۔''

''خیر...... تم جو کوئی بھی ہو، میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ہم جس دور میں ہیں یہ دور یونانی تہذیب کا زرین عہد ہے۔ جس میں اقتصادی، عمرانی اور سیاسی ادارے ارتقا کے کمال پر پہنچ گئے ہیں اور ہماری ثقافت نے بھی بعض پہلوؤں پر ترقی کر لی ہے۔ میں تھوڑی سی تمہیں معلومات فراہم کروں۔

ایشیاء کوچک کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ جزائر ایجہ کی تہذیب کی بیرونی چوکیوں سے کچھ ایسے معاملات علم میں آئے ہیں جو کچھ مشکلات کا باعث بن گئے ہیں...... میمنون اور بہترین یونانی بہادر ایکلیز کے درمیان جھگڑا ہو گیا ہے۔ اور ایکلیز روٹھ کر دور چلا گیا ہے۔ ابھی کچھ عرصے پہلے لڑائی میں یونانیوں کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ ہمارا جھگڑا ٹرائے سے ہے۔ ٹرائے کے دو جوان ہیکٹر اور پیٹروکلوس قتل کر دیئے گئے ہیں۔ پیٹروکلوس جو ایکلیز کا انتہائی عزیز دوست تھا۔ غمزدہ ایکلیز نے انتقام میں ہیکٹر کو قتل کیا ہے اور وہ عجیب و غریب واقعات بڑی عجیب و غریب حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ جو ایک اور یونانی جنگ جو اوڈیسوس کو پیش آئی۔ وہ ٹرائے کی شکست کے بعد ایک انوکھی حیثیت کی حامل ہے۔

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب ایکلیز نے ہیکٹر کو قتل کرنے کے لئے قدم اٹھایا تو اسے ہتھیار پہنچائے گئے۔ اور ہتھیار پہنچانے والا اسلحہ سازی کا دیوتا تھا۔ جب ایکلیز ہیکٹر کی لاش کو ٹرائے کی فصیل کے اردگرد کھینچتے پھرتا تھا تو دیوتاؤں نے مداخلت کی اور کہہ سن کر اسے راضی کیا کہ ہیکٹر کی لاش مناسب تدفین کے لئے اہل ٹرائے کے حوالے کر دی جائے۔ دیوتاؤں کے ساتھ غیر معمولی گہرے روابط پر یونانی کہانیاں بڑی عجیب و غریب حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ تو شاید تمہیں علم ہو ایک یونانی ہونے کی حیثیت سے کہ یونان میں سورج کی حرکات کو اپولو سے منسوب کیا جاتا ہے اور سمندر میں جو طوفان آتے ہیں ان کا انتساب پوسیڈن سے ہوتا ہے۔ یونانیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی عقل حکمت کی دیوی ایتھنا بخشتی ہے۔ لڑائی میں فتح کے دیوتا اریز کی برکت سے حاصل ہوتی ہے اور محبت میں کامرانی کا ذریعہ ایفروڈائٹ ہے۔ یہ تمام دیوتا کوہ اولمپس پر رہتے ہیں اور ایک باقاعدہ خاندان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

میں تمہیں ہیرا کے بارے میں بتاؤں کہ عجب حیران کن کردار تھا۔ ہیرا کا کہنا ہے کہ جناب زیوس کیا آپ اریز کے کارناموں کے بارے میں کچھ نہیں کہیں گے، میرے خیال میں تو اسے سزا ملنی چاہئے۔ بادلوں کو سمیٹنے والے زیوس نے جواب دیا۔

''جو کچھ چاہتی ہے کہ گزرے۔ ایتھنا کو بھیج دے وہ خوب جانتی ہے کہ کیا کیا جاسکتا ہے۔'' چنانچہ ایتھنا اتر کر یونانی فوج میں آئی اور دیومیدیز سے کہا۔

''دیومیدیز تو واقعی یونانیوں کا سب سے بڑا جواں مرد ہے تو ایریز یا کسی دوسرے غیر فانی سے کیوں ڈرتا ہے۔ اٹھ اس پر حملہ کر اس پر کاری ضرب لگا وہ ایک پاگل اور تند خلوق ہے۔ اس کے سامنے ہرگز نہ جھک۔ وہ شرارت کا مجسمہ ہے وہ ہرجائی ہے۔ کل میرے اور ہیرا کے سامنے کہہ رہا تھا اور قسم کھا رہا تھا کہ میں اہل ٹرائے سے جنگ کروں گا اور یونانیوں کو مدد دوں گا۔ اب وہ اہل ٹرائے کا ساتھی ہے اور اپنا وعدہ بھلا بیٹھا ہے۔ پھر یوں ہوا کہ ایتھنا بڑے اضطراب کے عالم میں دیومیدیز کے پاس گئی اور اس کے جنگی رتھ پر سوار ہوگئی اور رتھ کے دھرے سے چیخ کی سی آوازیں نکلنے لگیں کیونکہ اس پر ایک تند خو آدمی کے علاوہ ایک ہولناک دیوی بھی سوار ہوگئی تھی۔ تب ایتھنا نے چابک اور باگیں پکڑیں اور گھوڑے سیدھے ایریز کی طرف بڑھے۔ ایتھنا نے ہیڈیز کی ٹوپی سے اپنے آپ کو چھپالیا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایریز اسے دیکھے۔

بوڑھا ایک وجد کے سے عالم میں یہ سب کچھ کہہ رہا تھا اور یہ تمام باتیں میرے ذہن کے مختلف خانوں میں کھٹ کھٹ کر کے فٹ ہو رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یونان کے قدیم ماحول پر میں کوئی داستان لکھوں تو کیا یہ تمام باتیں مجھے یاد آجائیں گی۔

میں انہی سوچوں میں تھا کہ بوڑھے کی آواز ابھری۔

ایگا میمنون ٹرائے کی جنگ میں یونانیوں کا قائد تھا، وہ انسانی قربانی کو بنیادی حیثیت دیتا تھا، اصل میں وہ چاہتا تھا کہ ڈوگی آرٹیمس اس پر مہربان ہوجائے جس نے غلط سمت میں ہوائیں چلا کر ٹرائے کے خلاف مہم میں رکاوٹ پیدا کر رکھی تھی چنانچہ اس نے اپنی بیٹی اینی جونیا کو قربان کر دیا اور یہاں سے ایگا میمنون کے خاندان کی خونی داستان کا آغاز ہوا، اس کی دیوی کلائٹم نے اپنی بیٹی اینی جینا کے انتقام کا ارادہ کیا اور اپنے شوہر میمنون کو قتل کر ڈالا۔ مقتول کی اولاد میں سے دو بچے زندہ بچے تھے، انہوں نے اپنی ماں کے خلاف انتقام کا ساز باز کرلیا، اصل میں مسیحی مراسم کے موقع پر انسانوں کی جگہ گھوڑوں سواروں اور مویشیوں کی قربانیاں دی جاتی تھیں، ہر شہر اور ہر آبادی کے خاص مقامی تہوار تھے۔ سب سے بڑا تہوار ہر چار سال کے بعد اولمپیا میں منایا جاتا تھا، جہاں زیوس کے معبد تھا اور یہیں پر اولمپیائی کھیل شروع ہوتے تھے اور ان کے خاتمے پر خاص مذہبی مراسم ادا کئے جاتے تھے جو لوگ مقابلے میں کامیاب ہوجاتے ہیں انہیں مقدس لارن کے پتوں کا پاٹ پہنایا جاتا ہے یہ کھیل صرف پانچ دن ہوتے ہیں اور ان میں بہت سی چیزیں ہیں، ان کا سلسلہ بارہ سو سال سے جاری ہے۔''

میں ایک کردار کی حیثیت سے یونان سے روشناس ہو رہا تھا اور اب میں نے بوڑھے شخص کو باقاعدہ اپنے سوالات کا نشانہ بنالیا تھا، میں نے اس سے کہا۔

''یونانی فن تعمیر کے بارے میں آپ کی اپنی کیا رائے ہے معزز بزرگ؟''

''اس میں ستون زیادہ بنائے جاتے ہیں اور سنگ مرمر کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے، خاص طور سے میں تمہیں بالا حصار کی عمارت پارتھیمان کی طرف متوجہ کرتا ہوں، کیا تم جانتے ہو کہ وہ عمارت کون سے سن میں بنائی گئی تھی۔

''نہیں۔'' میں نے کہا۔

''یہ عمارت چار سو سینتالیس قبل مسیح میں بنائی گئی اور پارتھیمان ایک انتہائی خوب صورت مندر کی عمارت تھی، آج کل اس کے کھنڈرات تمہیں مل جائیں گے، مگر بڑی وضع قطع کی عمارت تھی، اس کے ستون سیدھے جاتے تھے اور چھت پر پہنچ کر ختم ہوجاتے تھے، لیکن اب پارتھیمان کھنڈر بن چکی ہے اور یونانی تعمیر کے دوسرے شاہکار بھی پریتلیس کے دور سے اب تک بہت خراب ہوچکے ہیں، یہی کیفیت یونان کی مجسمہ سازی کی ہے۔''

بوڑھا مجھے پورے یونان سے روشناس کرا رہا تھا۔ اس کے خیال میں یوریسیس تھا، لیکن اس کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے کہ میں کس دور کا کون سا انسان ہوں، بوڑھا کہہ رہا تھا۔

''بقراط کے دبستان نے یونان کے پرانے تصورات کو ٹھکرادیا کہ بیماریاں صرف دعاؤں سے دور ہوتی ہیں انہوں نے علاج کے نئے طریقے دریافت کئے تھے، یہ بات کافی آگے بڑھی اور بڑے بڑے فلسفیوں نے اس میں مداخلت کی، سقراط افلاطون اور ارسطو نے غور وفکر کی کائنات انسان کو بنالیا۔ سقراط تقریباً چار سو انہتر قبل مسیح کا سنگتراش تھا، وہ پتھر کی عمارتیں بناتا تھا، اس نے پوری زندگی ایتھنز کے گھروں میں باتیں کرنے اور سننے میں گزار دی، لیکن ان لوگوں کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جو نئے نئے خیالات کے حامی تھے اور خوش فہمی اور خوش عقیدگی کو پسندیدہ نہیں سمجھتے تھے سقراط کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی۔ ارسطوفوج نے اس پر شدید حملہ کیا اور اس پر الزام لگایا کہ وہ دیوتاؤں کی بے حرمتی کرتا ہے اور ایتھنز کے نوجوانوں کا اخلاق بگاڑ رہا ہے، چنانچہ اس پر مقدمہ چلا اس نے کہا کہ میں مذہبی مراسم کا ٹھیک ٹھیک پابند ہوں اور اپنی قوم کو باعزت بنادینے کا خواہش مند ہوں، اگر تم مجھے موت کی سزا دو گے تو میرا بدل تمہیں آسانی سے نہیں ملے گا، میری حیثیت کو سمجھنے کی کوشش کرو، تم لوگوں نے مجھے دولت سے وابستہ کردیا ہے اور تمہارا کہنا یہ ہے کہ میں انسانوں کو بہکا رہا ہوں، لیکن میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ مجھ جیسا انسان تمہیں دوبارہ کبھی نہیں ملے گا، لیکن اکثریت کے حکم سے سقراط کو موت کی سزا دے دی گئی اور زہر کا پیالہ پی لینے کے بعد وہ صبر سے موت کا انتظار کرنے لگا، اس نے کہا کہ تم لوگ کیوں رو رہے ہو، یہ تو عورتوں والی باتیں ہیں صبر سے کام لو، اس کا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا پھر اس نے اپنا چہرہ ڈھک لیا اور پھر کپڑا اہٹا کر بولا۔

''کریٹیک اسکلیپس کا ایک مرغ مجھے دینا ہے، کیا تم یاد سے میرا یہ قرض ادا کردو گے۔'' کروٹو نے پوچھا اور بھی کوئی کام ہے، اس سوال کا کوئی جواب نہ ملا اور ایک دو لمحے کے بعد حرکت سی ہوئی، چہرے سے کپڑا ہٹایا گیا تو سقراط کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں، کروٹو نے آنکھیں بھی بند کردیں اور منہ بھی بند کردیا، یہ سقراط کا انجام تھا اور پھر سقراط کے بعد افلاطون نے چار سو ستائیس قبل مسیح میں سقراط کی زندگی کے واقعات اور اس کی تعلیمات مرتب کیں۔ افلاطون ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوا تھا، اس نے ایتھنز میں ایک درس گاہ قائم کی جسے اکاڈمی کہتے تھے اور اس نے اپنی زندگی تالیف و تصنیف میں گزاری۔''

بوڑھا خاموش ہوکر کچھ آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگا اور میں نے بھی وہ آوازیں سن لیں، تبھی بوڑھے کی آواز ابھری۔

''کوئی آرہا ہے اور کیا ہی دلچسپ بات ہے کہ میں اپنے بچوں سے خوفزدہ رہتا ہوں، ان کا خیال ہے کہ میں بہت زیادہ باتونی ہوں اور یونان پرست ہوں ہر وقت یونان کی تاریخ میں کھویا رہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر بوڑھا جلدی سے باہر نکل گیا، باہر کچھ باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں اور میں نے ان آوازوں کو محسوس کرلیا، ان میں ایک نسوانی آواز تھی جسے میں نے پہچان لیا، وہ تونیسا کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا، میں دروازے سے باہر آیا تو مجھے تونیسا نظر آئی جو مجھے دیکھ کر دلکش انداز میں مسکرادی اور بولی۔

''میں جانتی ہوں بابا صاحب تمہیں زبردستی یونان کی پرانی باتیں سنا رہے ہوں گے۔ لیکن اب ان کی جگہ میں لینا چاہتی ہوں، بس ایک آس پر یہاں آئی تھی اور یہ سوچ رہی تھی کہ تم سے بات کروں گی، جیسا کہ میرے بھائی نیولس نے بتایا کہ تمہارے بازوؤں میں فولاد بھرا ہوا ہے اور تم ایک وحشی درندے کو باآسانی ہلاک کرسکتے ہو تو مجھے تو ایسے ہی کسی شخص کی ضرورت ہے جسے میں اپنا ہمنوا بنا سکوں کیا میرے ساتھ کچھ وقت صرف کرپاؤ گے؟''

''ہاں کیوں نہیں۔'' میں نے تونیسا کے حسین

جسم کو دیکھتے ہوئے کہا لیکن دل ہی دل میں مجھے ہنسی آ رہی تھی کہ میڈم تونیسا اگر میں آپ کو یہ بتادوں کہ میں آج سے ہزاروں کیا لاکھوں سال بعد کے دور کا انسان ہوں اور میرا نام یوتیسیس نہیں بلکہ ایک نرم و نازک نام ذیشان عالی ہے اور میں صرف ایک فکشن رائٹر ہوں، تو آپ کا سر چکرا کر رہ جائے گا اور پھر آپ مجھ سے کوئی بات نہیں کر پائیں گی تاہم ظاہر ہے مجھے کوروتی نے جس ماحول میں پہنچا دیا تھا یا میں اس کی کتاب کے جن الفاظ سے نیچے گر پڑا تھا۔ مجھے اسی دور کی باتیں کرنی تھیں جب تک کہ واپسی کا کوئی راستہ نظر آ جائے یا پھر کوروتی مجھے کسی اور شکل میں یہاں نظر نہ آ جائے، یہ سب کچھ مجھے کرنا ہی تھا۔

تونیسا مجھے ایک جگہ لے کر بیٹھ گئی، پھر اس نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں دیکھ کر کچھ عجیب عجیب احساس ہوتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے تم یونان سے تعلق نہ رکھتے ہو بلکہ کوئی اجنبی انسان ہو۔''

''میں نے کہا نا کہ میں بہت دور سے آیا ہوں، ایک سیاح ہوں جو دنیا کے سفر پر نکلا ہے اور مختلف چیزوں کو دیکھتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے، بہت ہی اچھی بات ہے، اگر تم اس سرزمین کو ایک عجیب و غریب شخصیت سے نجات دلا دو تو میں سمجھتی ہوں کہ یہ تمہارا عظیم کارنامہ ہوگا، تمہیں معلوم نہیں کہ وہ وحشی درندہ انسانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے اور دکھ کی بات تو یہ ہے کہ انسان اسے صرف اس لئے قبول کئے ہوئے ہیں کہ اس نے ایک ایسی عورت کے پیٹ سے جنم لیا ہے جو شہنشاہ کی بیٹی تھی، آؤ میرے ساتھ آؤ۔''

وہ میرا بازو پکڑے پکڑے اپنی خواب گاہ میں آ گئی، اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں میں تمہیں اس کے بارے میں بتا رہی تھی۔''

''تم نے مجھے عجیب و غریب بات بتائی ہے کہ ایک جانور نما شے انسان کے جسم سے پیدا ہوئی ہے۔''

''یہی تو بدنصیبی ہے ہماری اور اس دور کی اس کا نام نیوسکی ہے، نیوسکی ہوا یہ تھا کہ نیوسکی کی ماں ایک بار اپنے باپ کے ساتھ جنگل میں نکلی تھی کہ وہاں بن مانسوں کے ایک گروہ نے ان کا محاصرہ کرلیا، بندر نما انسانوں نے بڑی تباہی مچائی اور ایگانوس کے گروہ کے بے شمار انسان ختم کر دیئے۔

ایگانوس جان بچا کر بھاگا تو اس کی بیٹی وہیں پر رہ گئی اور بن مانسوں نے اسے پکڑ لیا، کوئی ایک سال کے بعد جو مہم ایگانوس کی بیٹی کو تلاش کرنے کے لئے نکلی تھی اسے اکارشہ جو ایگانوس کی بیٹی کا نام ہے دستیاب ہوگئی اور وہ لوگ اسے محل لے آئے، ایگانوس اپنی بیٹی کو دیکھ کر بہت زیادہ خوش ہوا، لیکن بدنصیبی یہ تھی کہ اس کی بیٹی حاملہ تھی اور پھر اس نے بن مانس کی اولاد کو جنم دیا جس کا نام نیوسکی رکھا گیا، نیوسکی بندر کا بیٹا تھا، مکمل بندر لیکن عقل و دانش والا انسان اور پھر اس کے نام کے ساتھ جو تباہی پھیلی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، میں تمہیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتا سکتی یوتیسیس ایگانوس کا نواسہ کن کیفیتوں کا حامل تھا، وہ بہت ہی گندی فطرت کا مالک ہے اور کارگس کے بے شمار گھرانوں میں اس کی غلاظتیں پھیل چکی ہیں اور اب، اب وہ یہاں حکومت کر رہا ہے اور اس کی حکومت میں ایک شخص بھی محفوظ نہیں ہے میرے لئے اس سے زیادہ غم کی بات اور کوئی نہیں تھی کہ نیولس میرا بھائی اس کا ملازم خاص ہے۔''

میں گہری گہری سانسیں لے رہا تھا کہ کاش اس بار بھی میں اپنی دنیا میں بخیر و خوبی واپس جا سکوں اور میری کتاب زندہ صدیاں یونان کے اس پس منظر میں ایک انوکھی کہانی سے دنیا کو روشناس کرے کاش، آہ کاش، وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی اور میں نے دل میں سوچا کہ مجھے پوری سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے پر کام کرنا چاہئے اور اس کے لئے میرے پاس نیولس ایک بہترین مہرہ تھا۔ چنانچہ دوسرے دن جب نیولس مجھے ملا تو میں نے اسی موضوع پر بات کی میں نے اس سے کہا کہ میری

ملاقات اس کی بہن سے ہوئی اور اس نے مجھے سارے معاملات میں تفصیلات بتائیں۔

''ہاں...... میں تمہیں اپنے دل کی بات بتانا چاہتا ہوں یولیسیس، اب جبکہ میری بہن نے میرے دل میں سوئے ہوئے انسان کو جگادیا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ واقعی نیوسکی کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جائے، اب میرے ذہن میں اس کے خلاف بغاوت جنم لے رہی ہے۔ رشتے کتنے مضبوط ہوتے ہیں اور انسان کس قدر کمزور۔''

''میں سمجھتا ہوں نیولس کہ انسان کو رشتوں سے متاثر ہونا چاہئے اور نہ اپنی کمزوری اور طاقت سے، بات حق گوئی کی ہو تو وہ صرف یہ فیصلہ کرے کہ وہ کون سے راستے کو بہتر سمجھتا ہے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں تمہیں حیرانی سے یہ بات بتاؤں کہ وہ صرف بدن ہے ایک جانور کا بدن، اس کی اصل حیثیت اور اصل زبان اس کی ماں کا ارکاشہ ہے۔''

''اوہ کمال کی بات ہے، کمال کی بات ہے، ارکاشہ یعنی ایگانوس کی بیٹی۔''

''ہاں اسی کی بات کر رہا ہوں۔''

''لیکن کیوں وہ ایسی کیوں ہے جبکہ وہ تو انہی لوگوں میں سے ایک ہے۔''

''یہ بھی ایک نفسیاتی عمل ہے میرے دوست۔ ارکاشہ جوان تھی بے پناہ خوب صورت تھی ظاہر ہے۔ اس کے دل میں بھی بہت سے خیالات اور خواہشیں ہوں گی لیکن اس کے شکم میں پرورش پانے والا وجود ایک بن مانس کا وجود تھا، ظاہر ہے اس کا دل اس کے احساسات ٹوٹے ہوں گے اور اسے اپنے باپ سے شکایت ہوگی کہ ایگانوس نے اسے کس طرح جانوروں کے حوالے کردیا، بس یوں سمجھ لو کہ وہ اپنے کچلے ہوئے احساسات کا بدلہ لے رہی ہے۔''

''کیا ایگانوس زندہ ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں۔''

''اور تم، تم اس کی ملازمت کر رہے تھے۔''

''ہاں میرے دوست لیکن آج تونیسا کی باتوں نے مجھے جگادیا ہے۔ سچ ہی تو کہہ رہی ہے وہ کہ ایک جانور انسانی نسل کو کس بے دردی سے خراب کر رہا ہے۔ میں آج سے بالکل بدل گیا ہوں۔''

''تم نے غور نہیں کیا شاید، کیا تم اتنی جلدی اپنے احساسات کو بدل سکتے ہو یولیس؟''

''ہاں، میں بدل سکتا ہوں، میرے گھر کے لوگ بہت کم ہیں، اگر ان میں سے ایک کی زندگی ختم ہوجائے تو دوسرے بے موت مرجائیں گے، چنانچہ اگر میری بہن اس طرح کام آگئی تو میرے ماں باپ اور خود میں بھی زندہ نہیں رہ سکوں گا۔''

''تب پھر تمہارے لئے میرا ایک مشورہ ہے، تم ابھی اس سلسلے میں کوئی ایسا عمل نہ کرنا جس سے بقول تمہارے ارکاشہ کو تم پر کوئی شبہ ہوجائے، اچھا مجھے ایک بات بتاؤ کیا یونان کے اس خوب صورت شہر کے دوسرے لوگ جو یونان کا دارالحکومت ہے جس کا نام کارگس ہے، اس کے خلاف بغاوت نہیں کرتے، میرا مطلب ہے وہ لوگ جن کی بیٹیاں یا جن کے گھر کی عورتیں نیوسکی کا شکار ہوچکی ہیں۔''

''باغیوں کا ایک گروہ باقاعدہ پل رہا ہے اور اس نے شہر سے باہر اپنی رہائش گاہیں بنالی ہیں اور مستقل طور پر تیاریاں کر رہا ہے، ادھر ارکاشہ کے حکم سے ہمارے میرا مطلب ہے ارکاشہ کے سپاہی باغیوں کے اس گروہ کو تلاش کر کے چن چن کر قتل بھی کردیتے ہیں، ویسے تمہیں حیرت ہوگی کہ نیوسکی ایک جانور ہونے کے باوجود انسانوں کی طرح بولتا ہے باتیں کرتا ہے، سوچتا ہے، بے شک اس کی اپنی کوئی زبان نہیں ہے، لیکن ارکاشہ اسے بہت سی باتوں سے آگاہ کرتی ہے، ٹھیک ہے ایگانوس کی موت کے بعد ارکاشہ کا بیٹا ہی وہاں حکمران ہے۔''

''ٹھیک ہے اس سلسلے میں کام کا آغاز کیا جاسکتا ہے۔ اچھا ایک بات بتاؤ؟'' میں نے کسی خیال کے تحت

کہا اور یولیس میری شکل دیکھنے لگا پھر بولا۔

''ہاں کہو۔''

''کیا تم مجھے بھی ارکاشہ کے یانیوسکی کے محل میں کوئی جگہ دلا سکتے ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''میں وہاں نیوسکی کا خادم خاص بننے کا خواہش مند ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور یولیس حیران انداز میں مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔

''میں تمہیں ایک بات کہوں، تم درحقیقت میری سمجھ میں نہیں آئے، آج تک میں تمہیں سمجھنے میں ناکام رہا ہوں۔''

''میری ان باتوں کو چھوڑو، تم مجھے سمجھ کر کیا کرو گے، اگر تمہیں مجھ پر بھروسہ ہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میری ذات سے تمہیں کوئی الجھن نہیں ہوگی۔''

''مجھے یقین ہے میرے دوست، میں تمہاری ہر خواہش کی تکمیل کروں گا۔''

''تو پھر تم میرے لئے محل میں جگہ نکالو، کیا یہ ایک مشکل عمل ہوگا؟''

''نہیں، میں اتنے ہی اختیارات رکھتا ہوں، میں تمہیں نیوسکی کے مخصوص محافظوں میں جگہ دلوا سکتا ہوں اور اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوگا کیونکہ تقرریوں کا محکمہ میرے ہی سپرد ہے۔''

''تب ٹھیک ہے یہ تو بہت اچھی بات ہے۔''

''تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔'' اس نے کہا اور میں نے گردن ہلادی، لیکن اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر میرے لئے بہت ہی دلچسپ سوالات ذہن میں آ کھڑے ہوئے تھے، میں یونان قدیم میں ہوں اور بوڑھے بزرگ نے مجھے یونان کی تاریخ کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا، میں قدیم یونان سے واقفیت حاصل کر رہا تھا، دور کا تعین بھی ہوتا جا رہا تھا، بوڑھے شخص کی عمر کے بارے میں مجھے صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا لیکن یہ ضرور اندازہ تھا کہ وہ بہت ہی اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہے اور قدیم یونان سے لے کر اب تک کے یونان میں اس نے خاصا وقت گزارا ہے اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کی ہے، مزے کی بات یہ تھی کہ میں بے شک اتفاقیہ طور پر پراسرار کتاب کے ان الفاظ پر گر پڑا تھا جن پر یقیناً یونان لکھا ہوگا۔

کسی بھی زبان میں مجھے اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کتاب پر جو الفاظ کندہ ہیں وہ کون سی زبان کے ہیں، البتہ مزے کی بات یہ تھی کہ میں جس دور میں بھی ہوتا اور جس علاقے میں بھی ہوتا وہاں کی زبان بخوبی بول اور سمجھ سکتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میری شخصیت ہی بگڑ چکی تھی، یولیسیس کون تھا، یونان کی تاریخ میں یولیسیس کا کیا مقام تھا اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا مجھے لیکن نیوسکی کے بارے میں جو کہانی میرے علم میں آئی تھی وہ ناقابل یقین سی تھی، البتہ اس کی دلکشی سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ارکاشہ بن مانسوں کی صحبت میں رہی تھی، پتہ نہیں اس بن مانس کے لئے اس کے دل میں کیا جذبات تھے جس کی اولاد کو اس نے نیوسکی کی حیثیت سے جنم دیا تھا، جدید دنیا میں اس داستان کا تصور کر کے مجھے خود پر ہنسی آنے لگی، وقت نے اگر مجھے موقع دیا اور میں نے زندہ صدیاں کتابی شکل میں لکھیں تو کیا لوگ اس پر یقین کر سکیں گے، لیکن لوگوں کے بارے میں میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، آپ کچھ بھی لکھ دیں، ان میں کچھ لوگ اس سے متفق ہوں گے، کچھ اسے صرف تفریحی کہانی سمجھ کر پڑھیں گے اور کچھ برا بھلا کہیں گے کہ رائٹر نے کیا اونگی بونگی چھوڑی ہیں۔

لیکن جناب ذیشان عالی کے ساتھ جو کچھ پیش آ رہا تھا وہ ذیشان عالی ہی جانتا تھا، البتہ میں نے اپنے جسم اور اپنی جسمانی طاقت پر بھی غور کیا تھا اور مجھے ہنسی آئی تھی، بلکہ میں نے دل میں سوچا تھا کہ یولیسیس کی حیثیت سے اس وقت جو جسم میرے پاس ہے وہ امریکی ریسلر بروک لسنر یا روسی ریسلر روسو سے کم نہیں ہے بلکہ اگر اس حیثیت میں میرا سامنا بیک وقت ان دونوں سے بھی ہو جائے تو میں ان کی ایسی تیسی کر کے رکھ سکتا

ہوں۔

میرے بازوؤں میں فولاد تڑپ رہا تھا، خیر میں بروک لسنر یا روسو کو ہرا کر کیا حاصل کرسکوں گا، البتہ اگر یہ صحت مجھے حاصل ہوجائے اور میں اپنی دنیا میں اسی انداز میں پہنچ جاؤں تو بس پھر حسینان وطن میرا خیال ہے میرے لئے خون خرابے پر آمادہ ہوجائیں، کیر نجانے کب تک خیالات دل میں آتے رہے اور اس کے بعد گہری نیند سوتا رہا، جاگا تو صبح ہوچکی تھی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے ناشتے کے لئے بلالیا گیا، ناشتے کے بعد یولیس نے اسے تیار ہونے کے لئے کہا اور میں وہاں چل پڑا۔ یونان کا شاہی محل لازمی طور پر ان تمام انگریزی فلموں سے کہیں زیادہ خوب صورت تھا جن میں اسی طرح کی چیزوں کی نقل کی جاتی ہے اس پر کروڑوں روپیہ خرچ کردیا جاتا ہے، کارگس کا یہ یونانی محل اس سے بھی زیادہ حسین تھا اور میں حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا، میں اس سے بہت متاثر تھا۔

شاہی محل کا تقریباً سارا ہی نظام نیولیس کے ہاتھ میں تھا اور جس جگہ نیولیس مجھے لے کر داخل ہوا وہاں سب کے سب اس کا احترام کررہے تھے، شاہی محل کا یہ عظیم الشان کمرہ بہت ہی خوب صورت تھا اور اس میں ایک حسین تخت رکھا ہوا تھا جہاں یولیس جا کر بیٹھ گیا اور اس نے مجھے ایک الگ جگہ بیٹھنے کے لئے کہا لیکن آہستہ لہجے میں اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ مجھے جو حیثیت دے رہا ہے وہ میرے شایان شان نہیں ہے لیکن اس کا پس منظر کچھ اور ہے، غرضیکہ یولیس نے چند افراد سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں اس کے محافظوں میں سے ایک ہوں۔

مجھے محافظوں کا لباس دیا گیا جسے پہن کر میں نے ہتھیار وغیرہ ہاتھ میں سجالئے اور دل ہی دل میں خود پر ہنسنے لگا، میں نے سوچا کہ کاش مجھے کسی جنگ میں شامل ہونے کا موقع مل جائے تاکہ زندہ صدیاں میں اس جنگ کا حال بھی لکھوں اور اپنی بہادری کے کارنامے بھی بیان کروں، یہ الگ بات ہے کہ لوگ اسے کوئی مزاحیہ باب ہی سمجھ لیں، خیر اس کے بعد میں نے تیاریاں کیں اور یولیس کے ساتھ اس جگہ پہنچ گیا جہاں اس کے کہنے کے مطابق نیوسکی سے ملاقات ہوسکتی تھی اور پھر میں اندر داخل ہوگیا۔ لیکن ایک محافظ کی حیثیت سے، میرے لئے یہ سب سے زیادہ حیرت ناک بات تھی کہ ایک گوریلا انسانی آواز میں باتیں کررہا تھا اور یہ الگ بات ہے کہ وہ آواز خی خی خی اور خوں خوں خوں کی تھی اور اس کے کوئی معنی نہیں محسوس ہورہے تھے، لیکن یولیس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک، ہم کوشش کررہے ہیں اور ہمیں اس میں کامیابی بھی ہوگی۔''

جواب میں پھر خوں خوں کی آواز سنائی دی اور مجھے تعجب ہونے لگا، اس کا مقصد یہ تھا کہ اس جنگلی گوریلے کی زبان یہاں بہت اچھی طرح سمجھی جاسکتی ہے۔ آواز پھر سنائی دی اور نیولیس نے کہا۔

''ٹھیک ہے، عالم پناہ میں جارہا ہوں، آپ آرام کریں۔''

غرضیکہ نیولس مجھ پر توجہ دیئے بغیر وہاں سے آگے بڑھ گیا، وہ اس اعلیٰ حیثیت کا مالک ہے یہ بات میرے ذہن میں نہیں تھی، کافی دیر خاموشی رہی اور اس کے بعد اچانک ہی میں نے ایک اور منظر دیکھا، یہ یونان کی روایتی حسینائیں تھیں، بے حد خوب صورت لڑکیاں جو باریک لباسوں میں لپٹی ہوئی تھیں اور ان کا رخ نیوسکی کی خواب گاہ کی جانب ہی تھا۔ وہ اندر داخل ہوگئیں، نیولس نے مجھے وہیں کھڑے رہنے کے لئے کہا، کچھ ہی دیر کے بعد اندر سے قہقہوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں، ساتھ ہی ساتھ لیوسکی کی خونخوار غراہٹیں بھی وہ شاید کسی پر بگڑ رہا تھا، ظاہر ہے وہ لوگ اس کی آوازیں سن سکتے تھے، ان کا مفہوم سمجھ سکتے تھے، لیکن مجھے یہ نہیں پتہ چل رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ البتہ تھوڑی دیر کے بعد وہ آوازیں جو پہلے قہقہوں کی شکل میں تھیں بدل گئیں اور اب اس میں ان لڑکیوں کی چیخیں اور کراہیں شامل تھیں جبکہ نیوسکی کی

غرا ہٹیں ابھر رہی تھیں۔

بڑا بے ہنگم شور تھا اور لڑکیوں کی چیخیں ایک عجیب سا ہنگامہ پیدا کررہی تھیں، پھر وہ بدحواس ہوکر باہر نکل آئیں، ان کے لباس نچے ہوئے تھے اور جسموں پر جگہ جگہ خون نظر آرہا تھا، نیوسکی نے انہیں بری طرح زدو کوب کیا تھا، میں حیران تھا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے، ان لڑکیوں کے چہرے زرد ہورہے تھے، پھر کچھ ہی لمحوں کے بعد نیوسکی باہر آیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کسی کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا، اس سے بہتر موقع اور کیا ہوسکتا تھا چنانچہ میں تیزی سے اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ میرے ساتھ تین محافظ اور آگے بڑھ آئے، نیوسکی آگے کی جانب چل پڑا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

اب وہ محل کی ایک خوب صورت راہداری سے گزر رہا تھا اور ہم چاروں خادم اس کے ساتھ تھے، ایک بار پھر اس نے پلٹ کر ہم لوگوں کو دیکھا اور مجھے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے خوخو کرکے نجانے ان خادموں سے کیا کہا غالباً اس نے انہیں روک دیا تھا اور صرف مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا، پھر وہ ایک کمرے کے قریب پہنچ کر رک گیا جہاں دو پہرے دار کھڑے ہوئے تھے، ان پہرے داروں نے نیوسکی کو دیکھا اور اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے بھالے نیچے گرادیئے، ساتھ ہی انہوں نے دروازہ بھی کھول دیا تھا، میں اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوگیا، کیا حسین جگہ تھی، تصور تک نہیں کیا جاسکتا تھا اس کا، کوروتی نے مجھے نجانے کیسے کیسے ماحول سے روشناس کرادیا تھا، کمرے میں بہت ہی اعلیٰ قسم کا فرنیچر پڑا ہوا تھا جو قدیم طرز کا تھا۔ چاروں طرف رنگین پردے لہرا رہے تھے ایک بہت ہی خوب صورت مسہری بچھی ہوئی تھی اور اس خوب صورت مسہری پر جو کوئی موجود تھا اسے دیکھ کر میری آنکھیں شدت حیرت سے کھلی کہ کھلی رہ گئیں نا قابل یقین اور نا سمجھ میں آنے والی بات یہ کوروتی تھی، یونانی لباس میں ملبوس، حسن و جمال میں یکتا، چہرے پر عجیب سی تمکنت اور وقار، لیکن اس کے نقوش میں کیسے نظرانداز کرسکتا تھا، مہا بھارت کے دور میں وہ مجھے ایک اور حسینہ کی شکل میں ملی تھی اور اب یہاں نجانے کس نام سے موجود تھی۔

کمال کی بات ہے واقعی کمال کی بات ہے، نا قابل یقین، وہ سامنے دیکھ رہی تھی اور میں یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ یہ کون ہے، بہرحال میں آگے بڑھا تو وہ ایک عجیب سی کیفیت میں اٹھ کر بیٹھ گئی، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر ایک وحشت سی پیدا ہوگئی ہو، تبھی نیوسکی نے سینے پر دو ہنٹر مارے اور اپنے مخصوص انداز میں خوں خوں کرنے لگا، کوروتی کا چہرہ زرد ہوگیا تھا، اس نے اس انداز میں ادھر ادھر دیکھا جیسے وہ خود کو وحشت زدہ قیدی محسوس کررہی ہو، پھر اس کے حلق سے ایک نفرت بھری آواز نکلی۔

''تو پھر آگیا۔ ظالم کتے درندے۔'' اس کی

سوچ ریزے

☆ چراغ کی روشنی سے فائدہ اٹھاؤ۔ یہ مت دیکھو کہ وہ ''کس'' کے ہاتھ میں ہے۔

☆ وہاں رہنا آپ کی نادانی ہے، جہاں آپ کی ضرورت اور قدر نہ ہو۔

☆ حوصلہ یہ کبھی نہیں پوچھتا کہ پتھر کی دیوار کتنی اونچی ہے۔

☆ یہ مت سوچو کہ ہمارا ''دکھ'' کتنا بڑا ہے۔ یہ دیکھو کہ ہمارا ''اللہ'' کتنا بڑا ہے۔ جو اس دکھ کو خوشی میں بدلنے والا ہے۔

☆ گزرا ہوا واقعہ گزرتا ہی تو نہیں ہے بلکہ وہ یاد بن کر بار بار گزرتا ہے۔

☆ انسان محبت صرف ایک بار کرتا ہے، باقی محبتیں اس محبت کو بھلانے کیلئے کرتا ہے۔

(ساحل دعا بخاری۔ بصیر پور)

آواز میں بڑی وحشت تھی اور میرے سر میں کھلبلی ہو رہی تھی، یہ کیا چکر ہے ادھر نیوسکی اپنے سینے پر ہاتھ مار رہا تھا۔

''لعنت بھیجتی ہوں میں تجھ پر کتے، مجھے اس وقت کا افسوس ہے جب تو نے گندے کیڑے میرے بدن سے جنم لیا تھا۔''

نیوسکی نے کچھ نہ کہا بلکہ اس نے انسانوں کی طرح ایک زرنگار کرسی گھسیٹی اور اس پر بیٹھ گیا، میں اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا ہوا تھا، تب اس نے میری طرف دیکھا اور بولی۔

''تو بھی دیکھ رہا ہے وحشی غلام، درندے تجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ تو اسے نکال کر باہر کردے۔''

مجھے یوں لگا جیسے اس نے مجھے پہچانا ہی نہ ہو، اس کی آنکھوں میں قہر و غضب کی بجلیاں تڑپ رہی تھیں، میں نے گردن جھکادی تو وہ بولی۔

''ہاں میں جانتی ہوں تو کہتا ہے کہ تو صرف ایک غلام ہے، تیری اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے، لیکن اگر تو مجھے اس سے نجات دلادے تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں تجھے وہ حیثیت دوں گی جس کا تو تصور بھی نہیں کرسکتا، اپنا یہ چوڑا بھالا اس کے سینے میں اتار دے، میں کہتی ہوں اسے قتل کردے، میں کہتی ہوں قتل کردے اسے۔''

''کوروتی کی وحشیانہ آواز ابھر رہی تھی اور صحیح معنوں میں میری کھوپڑی پر جیسے بچھو ڈنک مار رہے تھے، یہ عورت یہ نوجوان لڑکی اس کی تو کچھ عمر ہی نہ تھی اس کا حسن و جمال تو آفاقی حیثیت رکھتا تھا۔ کیا یہ اس گوریلے کی ماں ہے، کیا یہ ارکاشہ ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے، اس کے انداز میں شدید وحشت تھی اور وہ ایک ہی جملہ کہے جارہی تھی۔

''ماردے اسے میں کہتی ہوں ماردے۔''

نیوسکی نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں خوفناک چمک تھی، میں نے لرزنے کی اداکاری کی اور کئی قدم پیچھے ہٹ گیا اور مجھے ایک دم محسوس ہوا جیسے نیوسکی مطمئن ہوگیا ہو، ادھر کوروتی خوفزدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور کبھی اسے، پھر وہ بولی۔

''دیکھ بدنصیب جانور میں تیری ماں ہوں، رشتے بہت بڑی حیثیت رکھتے ہیں تو نے میرے پیٹ سے جنم لیا ہے، ماں کہلاتی ہوں میں تیری سمجھا ماں کہلاتی ہوں۔''

جواب میں نیوسکی نے قریب رکھا ہوا عظیم الشان گلدان اٹھا کر زمین پر دے مارا، گویا وہ ارکاشہ کی اس بات سے نفرت کا اظہار کررہا تھا پھر اس نے میری جانب دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے مجھے دروازہ بند کرنے کے لئے کہا، میں نے دروازہ بند کردیا لیکن میں خود وہیں کھڑا رہا میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کوروتی یا یونان کے اس دور میں ارکاشہ اتنی خوفزدہ کیوں ہے۔ وہ کس عذاب میں گرفتار ہے، ایک بار پھر نیوسکی نے میری جانب دیکھا اور پھر اس طرح گردن گھمالی جیسے اسے میری موجودگی کی پرواہ نہ ہو، تب اس نے ایک جانب اشارہ کیا اور میں نے اس کی طرف دیکھا وہاں شراب کے برتن رکھے ہوئے تھے، کوروتی خوفزدہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی پھر اس نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

''نہیں نہیں میں تجھے شراب نہیں پلاؤں گی میں تیری ماں ہوں، تو میرے رشتے کو بھول گیا ہے لیکن میں نہیں۔''

''اچانک ہی نیوسکی اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا، وہ خونخوار انداز میں آگے بڑھ رہا تھا پھر اس کے وحشی پنجے نے کوروتی کے لباس کو پکڑ لیا اور کوروتی اٹھ کھڑی ہوئی اس کا تقریباً سارا لباس اتر گیا تھا۔

''ذلیل کتے کمینے۔'' اس نے دونوں ہاتھ نیوسکی کے سینے پر مارتے ہوئے کہا لیکن نیوسکی نے اسے زور سے دھکا دیا اور وہ دور جاگری، تب وہ اپنی جگہ سے اٹھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، لیکن آخر کار شراب کا برتن اسے لے کر آنا ہی پڑا۔ نیوسکی

اس کرسی پر بیٹھ گیا، تب کوروتی نے شراب پیالے میں انڈیلی اور اس کے سامنے بڑھادی۔ نیوسکی شراب حلق میں انڈیلتا رہا، مجھے شدید حیرت ہورہی تھی جبکہ کوروتی زاروقطار رو رہی تھی، اس نے روتے ہوئے کہا۔

''آہ گزرے وقت تو نے میرے ساتھ شدید دھوکہ کیا ہے، میں اس شخص کی بددعائیں اپنے ساتھ رکھتی ہوں جس کے ساتھ میں نے بے وفائی کی تھی اور بلاشبہ میں اس قابل نہ تھی کہ اس سے وفا کی جاتی، بے شک وہ بدشکل کبڑا تھا وہ مندروں میں گھنٹے بجاتا تھا، لیکن اس قدر بدنما تھا وہ کہ میں اس کی صورت بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی، لیکن اب مجھے اس کا صلہ مل رہا ہے، مجھے غم ہے کہ میں نے اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے اور اس کے نتیجے میں مجھے یہ سزا ملی، کاش میں اس جنگلی جانور کو جنم نہ دیتی، لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ درندہ درندہ ہی رہے گا۔ کاش میرے ساتھ یہ سب کچھ نہ ہوتا، آہ میرے باپ، میرے منحوس باپ تو نے اسے ہلاک کیوں نہیں کردیا۔ بول تو نے اسے ہلاک کیوں نہیں کردیا ایگانوس کاش تو اسے ماردیتا۔''

لیکن نیوسکی بدستور شراب نوشی کررہا تھا۔ دفعتاً اس نے اپنے ہاتھ سے پیالہ پھینک دیا اور صراحی اٹھا کر منہ سے لگالی، پھر وہ غٹاغٹ کرکے ساری شراب پی گیا ایک بار پھر اس نے کوروتی کی طرف دیکھا اور پھر سینے پر دونوں ہاتھ مارنے لگا تو کوروتی بولی۔

''آہ میں کمزور ہوں لوگو! میں کمزور ہوں میں تیری ماں ہوں تو نے میرے بطن سے جنم لیا ہے لیکن تو ان باتوں کو کیا سمجھے گا، تو انسان کہاں ہے۔''

''تب گوریلا آگے بڑھا اور اس نے کوروتی کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''نہیں ہرگز نہیں تو میرے ساتھ یہ وحشت ناک سلوک نہیں کرسکتا۔''

ایک بار پھر نیوسکی غرانے لگا، پھر اس نے کوروتی کو پکڑلیا، بس نجانے کیوں میرے ذہن میں ایک آگ سی بھرگئی، کوروتی چیخ رہی تھی اور نیوسکی کی ہولناک چیخیں ابھر رہی تھیں لیکن دروازے پر دستک نہ ہوئی، میں نے سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے، لیکن پھر میرے اندر کا کہانی کار جاگ اٹھا، مجھے کوروتی کی باتیں یاد آنے لگیں اس نے کہا کہ تاریخ میں جو کچھ ہوچکا ہے وہ تاریخ کے ساتھ منسلک رہتا ہے ہم بے شک تاریخ کے ایک کردار کی حیثیت سے ماضی میں جاسکتے ہیں لیکن ہم اس تاریخ میں تبدیلی نہیں کرسکتے اور تم بھی کبھی ایسا نہ کرنا کیونکہ اس طرح تاریخ نہیں بدلی جاسکتی اور ان الفاظ کو یاد کرنے کے بعد میں باہر نکل آیا، لیکن دوسرے محافظ خاموشی سے وہیں کھڑے ہوئے تھے، میں بھی ان کے درمیان جا کھڑا ہوا۔

کچھ دیر کے بعد کوروتی یا ارکاشہ کی چیخیں مدہم ہوتی چلی گئیں پھر میں نے نیوسکی کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا اور وہ سیدھا چلا گیا۔ دوسرے محافظ میرے ساتھ ہی کھڑے ہوئے تھے، غالباً وہ اندر کے معاملات سے لطف لے رہے تھے کیونکہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''کہاں گیا تھا وہ؟'' ایک محافظ نے پوچھا۔

''یہ بتانا کیا ضروری ہے؟'' میں نے کہا۔

''تمہارے خیال میں ہمیں معلوم نہیں ہے؟'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟'' میں نے بھی مسکرا کر کہا۔

''تم کہاں تھے؟''

''اندر ہی تھا۔''

''بڑا ہی وحشی جانور ہے۔'' سپاہی نے کہا۔

''تم شہنشاہ کے بارے میں ایسا کہہ رہے ہو؟''

''شہنشاہ؟'' سپاہی نے ہنس کر کہا۔ ''ہاں ہے تو وہ شہنشاہ ہی۔''

''کیوں تمہیں اس سے اختلاف ہے؟''

''یار اگر تم پہرے داری میں نئے ہو تو محل کے معاملات میں بھی کورے ہی ہو کیا؟''

''ہاں میں باہر کی فوجوں میں تھا، محل کے

معاملات سے ناواقف ہوں۔" میں نے معصومیت سے کہا۔
"اوہ تو یہ بات ہے، مگر اب تو تماشہ دیکھ لیا۔"
"ہاں اور حیرت انگیز تماشہ۔"
"یہاں تو تم تماشے ہی دیکھتے رہو گے۔ ایگانوس نے جو جال پھیلایا ہے اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"تم کیا سمجھتے ہو کیا گوریلا کوئی ذی ہوش جانور ہے؟"
"پھر؟"
"وہ صرف گوریلا ہے، خصوصی صلاحیتوں کا مالک ایک جانور، اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔"
"لیکن حکومت کون کرتا ہے؟"
"وہی جسے کرنا چاہئے یعنی ایگانوس...... دراصل یہ گہری کہانی ہے۔" سپاہی بہت باتونی معلوم ہوتا تھا۔
"میرے دوست کیا تم مجھے یہ کہانی نہیں سناؤ گے، مجھے تفصیل جاننے کا بے حد شوق ہے اور تمہاری بات پر حیرت بھی ہے۔"
"حیرت کیوں ہے؟"
"تم کہتے ہو کہ وہ خصوصی صلاحیتوں کا مالک ایک گوریلا ہے لیکن میں آج تک یہی سنتا رہا ہوں کہ وہ ایک باہوش شہنشاہ ہے جو بڑی عمدگی سے حکومت کررہا ہے گو تحت الثریٰ کی تاریخ میں یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے لیکن پھر اسے حیرت انگیز یوں نہیں کہہ سکتے کہ بہرحال اس گوریلے نے ایک عورت کے پیٹ سے جنم لیا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اس کی حرکات دیکھی ہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کافی سمجھدار ہے۔"
"اس میں کوئی شک نہیں ہے، لیکن اتنا بھی نہیں کہ حکومت کرسکے۔"
"لیکن یہ سب کیا ہے؟"
"ایگانوس کی سازش، دراصل حکومت کے شوق نے ایگانوس کو انسانیت سے کافی نیچے گرادیا ہے، اس نے اپنی بیٹی کی شادی اس شخص سے کردی جس نے خود کو اس کا اہل ثابت کردیا، لیکن پھر اس کے ذہن میں سازش نے جنم لیا اور اس نے ایک سازش کی، اس کی بیٹی نے ایک گوریلے کو جنم دیا اور خیال ہے یہ گوریلا شونی کے نطفے سے نہ تھا۔ لیکن ایگانوس اور اس کی بیٹی چاہتے تھے کہ ان کی اولاد حکومت کرے چنانچہ ایگانوس نے گوریلے کی پرورش کی اور اسے کچھ خصوصی تربیتیں دیں اس طرح گوریلے نے شونی کو شکست دی اور یہی ایگانوس کا منصوبہ تھا، اب گوریلا بظاہر شہنشاہ ہے، لیکن حکومت ایگانوس کررہا ہے، گوریلا ایک طاقتور جانور ہے چنانچہ اسے شکست دینے والے کا کوئی وجود نہیں ہے اور ایگانوس کی حکومت محفوظ ہے۔" سپاہی نے کہا۔
"اوہ بڑی انوکھی بات ہے۔"
"ہاں لیکن صرف باہر کے لوگوں کے لئے۔"
"میں تو سوچ بھی نہ سکتا تھا، لیکن میرے دوست ابھی میں نے ایک انوکھا واقعہ دیکھا ہے۔" میں نے دلچسپی سے کہا۔
"کیا؟"
"ارکاشہ تو اس کی ماں ہے نا؟"
"ہاں لیکن ایک وحشی جانور کے لئے رشتے کیا اہمیت رکھتے ہیں، اگر وہ کوئی انسان ہوتا تو اس سے یہ حرکت سرزد نہ ہوتی۔"
"تو تم جانتے ہو۔"
"ہاں عام لوگ نہیں جانتے یہاں تک کہ ہمارا آقا نیولس بھی شاید اس بات سے ناواقف ہے لیکن کون اپنی زندگی کا خطرہ مول لے۔"
"ایگانوس کو بھی یہ بات نہیں معلوم ہوگی۔"
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایگانوس کو کیا پڑی ہے کہ وہ اس کی طرف توجہ دے یا کسی کا حال جاننے کی کوشش کرے وہ حکومت کررہا ہے اور یہی اس کے لئے کافی ہے۔"
اور میرے ذہن میں پھل جھڑیاں سی چھوٹنے

لگیں، بڑی عمدہ بات تھی بڑا خوب صورت منصوبہ تھا، بلکہ میں تو یہ سوچنے لگا تھا کہ نیوسکی کو شکست دینے کے لئے میں نے جو طویل کارروائیاں کی ہیں وہ تو حماقت ہی تھی اسے تو اس محل میں آ کر ہی شکست دی جا سکتی تھی۔

بہرحال اگر حالات یوں ہیں تو یوں ہی سہی، لیکن ابھی فوری کارروائی مناسب نہیں ہے، پہلے کچھ اور حالات جان لئے جائیں تو بہتر ہے۔ چنانچہ میں نے خاموشی اختیار کی، ہاں جب میری ڈیوٹی کے اوقات ختم ہوئے اور میری جگہ ایک دوسرے پہرے دار نے لے لی تو میں نیولس کے پاس پہنچ گیا۔ نیولس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا تھا اور پھر وہ بولا۔ ''تم تھک گئے ہو گے پولیسیس۔''

''تھکن کا لفظ میری لغت میں نہیں ہے۔''

''خوب ویسے تم بھی عمدہ صلاحیتوں کے مالک انسان ہو، میں نے تمہارے اندر خصوصی صلاحیتوں کو محسوس کیا ہے۔''

''شکریہ میرے دوست۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا تم نے ہمارے شہنشاہ نیوسکی کو دیکھا۔''

''ہاں اچھی طرح اور اس گوریلے کو اس تحت الثریٰ کا عجوبہ کہا جا سکتا ہے وہ تو بڑی اعلیٰ صلاحیتیں رکھتا ہے۔''

''ہاں وہ جانتا ہے کہ وہ ناقابل تسخیر ہے اور اسے ایگانوس سے کوئی اختلاف نہیں ہے، بہرحال چھوڑو ان باتوں کو مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کرنا ہیں، میری فطرت میں ایک نمایاں کمزوری ہے۔''

''کیسی کمزوری؟''

''اس سے قبل میں نیوسکی کا وفادار تھا اور اس کی بہتری کے بارے میں سوچتا تھا، ذہن کی بات جو کچھ بھی تھی لیکن اس میں تردد نہیں تھا، اب صورتحال دوسری ہے، اب میں اس کا مخالف ہوں چنانچہ دل چاہتا ہے کہ جو کچھ کر رہا ہوں جلدی سے کر ڈالوں۔

''یہ جذبہ برا تو نہیں ہوتا نیولس۔''

''ہاں لیکن میں ابھی تاریکیوں میں ہوں۔''

''کیوں؟''

''میرے ذہن میں کوئی واضح لائحہ عمل نہیں ہے۔''

''ان لوگوں کے خلاف کچھ کرنے کے لئے۔''

''ہاں۔''

''پھر تم کیا چاہتے ہو؟''

''جلد از جلد باغیوں سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''ان سے مل کر کیا کرو گے؟''

''ان کی جدوجہد میں حصے دار بنوں گا۔''

''کیا تم انہیں کوئی بڑا فائدہ پہنچا سکتے ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''ان کی تعداد بے شمار ہے اس لئے کسی ایک آدمی کے ان میں شامل ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، ہاں اگر کوئی عمدہ منصوبہ ان تک پہنچایا جائے تو ان کی مدد ہو سکتی ہے۔''

''عمدہ منصوبہ کیا ہو؟''

''وہ میں بتا سکتا ہوں۔''

''تو بتاؤ میرے دوست۔''

''نیوسکی کے خلاف بغاوت کا اعلان معمولی ہوگا۔''

''ہرگز نہیں، کیونکہ نیوسکی کے بے شمار ہمنوا ہیں اور پھر فوجیں تو وہی کریں گی جس کا حکم انہیں نیوسکی دے گا۔''

''تو ان فوجوں سے جنگ کے لئے باغیوں کو کس چیز کی ضرورت ہوگی؟''

''کیا مطلب؟'' نیولس نے تعجب سے پوچھا۔

''میں تمہیں بتاتا ہوں، اس کے لئے انہیں اسلحہ درکار ہوگا۔''

''اوہ یقیناً۔''

''اور مجھے یقین ہے کہ اسلحہ باغیوں کی سب سے اہم ضرورت ہے۔''

''بے شک۔''

''چنانچہ اگر تم ان کی مدد کر سکتے ہو تو مجھے ایک

سوال کا جواب دو، کیا تمہاری پہنچ شاہی افواج کے اسلحہ خانے تک ہوسکتی ہے؟"

"ہاں...... گو اس کی سربراہی کسی اور کے سپرد ہے لیکن میں اسلحہ خانے تک پہنچ سکتا ہوں۔"

"اور اسلحے کا ایک عظیم الشان ذخیرہ بھی حاصل کرسکتے ہو۔"

"یہ زیادہ آسان نہیں ہوگا، لیکن کوشش کی جاسکتی ہے اوہ میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں، لیکن پھر ایک سوال آجاتا ہے۔"

"کیا؟"

"ہم اسلحہ باغیوں تک کیسے پہنچائیں گے جبکہ ہمیں ان کے ٹھکانے کا کوئی علم نہیں ہے۔"

"میں اس سلسلے میں بھی تمہاری مدد کروں گا۔"

"لیکن کس طرح......"

"میرے اوپر بھروسہ رکھو دوست، جبکہ تم اس بات کو تسلیم کرچکے ہو کہ میں بہت سی انوکھی صلاحیتوں کا مالک ہوں۔" میں نے کہا اور نیولس کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"ٹھیک ہے، لیکن تم بھی مجھے بے حد پراسرار معلوم ہوتے ہو یولیسیس۔"

"یہی سمجھ لو۔"

"اور اب تو میرے ذہن میں ایک اور شبہ جاگ اٹھا ہے۔"

"وہ بھی بتادو۔"

"کہیں باغیوں سے تمہارا کوئی تعلق تو نہیں ہے۔"

"ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ تو کیا تم ان کے ٹھکانے سے واقف ہو۔"

"اب تم بچوں کی طرح سوالات کرنے لگے، نیولس، فی الوقت ان باتوں کو جانے دو، میرے بارے میں یہ تو سوچو کہ کیا تم سے ملاقات سے قبل میں ان معاملات میں دخیل تھا۔"

"میرا خیال ہے نہیں۔"

"پھر تم خود فیصلہ کرسکتے ہو، اب میری رائے ہے کہ اس بارے میں نہ سوچو، پہلے اس کا فیصلہ کرو کہ اسلحہ خانے کے عظیم ذخائر کس طرح حاصل کئے جاسکتے ہیں۔"

"ہوں۔" نیولس نے کہا اور دیر تک یہی سوچتا رہا پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس سلسلے میں کوئی تجویز سوچنا ہوگی۔" اور میں خاموش ہوگیا میرا ذہن بہت سے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، پھر میں نے اچانک سوال کیا۔

"اسلحے خانے کے محافظ کا کیا نام ہے؟"

"آرگس۔" اس نے جواب دیا۔

"کس قماش کا انسان ہے؟"

"عیاش طبع، عورت خور جیسا کہ یہاں کے دوسرے لوگ ہیں بہت سے لوگ تو نیوسکی سے صرف اس لئے خوش ہیں کہ اس کے دور حکومت میں عورت کی عزت وعصمت بے معنی ہوکر رہ گئی ہے اور کوئی بھی شخص کسی بھی عورت پر ہاتھ ڈال سکتا ہے اس کی کسی فریاد کی شنوائی نہیں ہوتی۔"

"وہ محافظ بھی عورتوں سے متاثر ہوتا ہے۔"

"ہاں۔"

"ایسے کتنے لوگ تمہارے ساتھ ہیں نیولس جو خفیہ طور پر تمہارے لئے کام کریں اور یہ نہ سوچیں کہ تم کیا کررہے ہو؟"

"ایسے لوگ۔" نیولس نے کہا اور کسی سوچ میں ڈوب گیا پھر بولا۔ "کم از کم بیس آدمی ایسے ضرور مل جائیں گے۔"

"کافی ہیں اچھا ایک بات اور بتادو۔"

"ضرور۔"

"کیا تم اس بغاوت کی کامیابی کے لئے اپنی بہن کو داؤ پر لگاسکتے ہو، میرا مطلب ہے اس کے لئے کوئی خطرہ مول لے سکتے ہو؟"

"کیسا خطرہ؟"

"یہ کہ وہ آرگس کو اپنے جال میں پھانس لے اور ہمارے آدمی اسلحہ خانہ خالی کردیں۔" میں نے کہا

اور نیولس کسی سوچ میں ڈوب گیا، پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''گو یہ خطرناک کام ہے، لیکن اگر تونیسا سے اس کے لئے کہا جائے تو وہ فوراً تیار ہوجائے گی وہ اس سلسلے میں اتنی ہی پرجوش ہے۔''

''ہر تحریک کی تکمیل کے لئے خطرات سے کھیلنا ہی پڑتا ہے نیولس، اب اس کی چالاکی یہ ہوگی کہ وہ خود کو آرگس کی ہوس سے بچائے اور اتنی شراب پلائے کہ آرگس حواس میں نہ رہے اور اس کے لئے ایک اور ترکیب بھی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''تم خود تونیسا کو آرگس سے روشناس کراؤ تاکہ آرگس فوراً بدحواس نہ ہو۔''

نیولس نے میری باتوں پر خوب غور کیا پھر بولا۔

''ٹھیک ہے، فرض کرو ہم اس طرح اسلحہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں تو پھر اسے یہاں سے کس طرح لے جائیں گے۔''

''تمہیں روانگی کے احکامات کہاں سے ملتے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''ایگانوس سے۔''

''براہ راست۔''

''ہاں۔''

''اور ایگانوس تمہارے اوپر بھروسہ کرتا ہے۔''

''ہاں وہ مجھے اپنے معتمدوں میں سمجھتا ہے۔''

''بس تو اگر تم اس سے اسلحہ حاصل کرلو تو اسے ایک تجویز پیش کرو اس سے کہو کہ تم ایک قافلہ لے کر جانا چاہتے ہو، باغی قافلے لوٹتے ہیں وہ تمہارے قافلے کو بھی لوٹیں گے اور اس طرح تم ان کے ٹھکانے کا کھوج لگالو گے۔''

''نیولس عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔'' بہت ہی عمدہ ترکیب ہے واقعی تمہارا ذہن لاجواب سوچتا ہے، میں تو اب دل سے تمہارا قائل ہوتا جارہا ہوں۔'' میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

پھر جب ہم نے تونیسا سے اس تجویز کا تذکرہ کیا تو وہ خوشی سے پاگل ہوگئی۔ ''میں ایگانوس کے خلاف ہونے والی ہر کارروائی میں بھرپور حصہ لوں گی اور خلوص دل سے تمہاری تجاویز پر عمل کروں گی۔'' اس نے خوش ہوکر کہا۔

صورت حال گو بہت اچھی نہیں تھی، تاہم میں اور نیولس اس سلسلے میں عمل کرنے کے لئے تیار تھے، سب سے بڑی بات یہ تھی کہ خود تونیسا نے ہمیں اس بات کا یقین دلایا تھا کہ وہ اپنا کام باآسانی کرے گی اور اپنے آپ کو محفوظ بھی رکھے گی، چنانچہ تونیسا محل پہنچ گئی۔ منصوبے کے مطابق میں سپاہی کی حیثیت سے نیولس کے ساتھ تھا اور نیولس تونیسا کے ساتھ آرگس کے پاس پہنچ گیا، آرگس ہی وہ خاص شخص تھا جو اسلحہ خانے کا محافظ تھا۔ صورت ہی سے بوالہوس اور عیاش آدمی معلوم ہوتا تھا اس نے مسکراتے ہوئے ہمارا خیر مقدم کیا اور نیولس سے کہنے لگا۔

''آؤ میرے دوست نیولس، آج تمہارا گزر یہاں کیسے ہوا؟''

''بس کوئی خاص بات نہیں آرگس، تونیسا نے کہا کہ اسلحہ خانے کی طرف سے ہوتے ہوئے چلو، سو میں یہاں آگیا، ہاں تم خیریت سے تو ہونا؟''

''بالکل خیریت سے ہوں دوست، ہاں میں نے تمہارے بارے میں سنا تھا کہ تم بری طرح زخمی ہوئے تھے، بڑی آرزو تھی تم سے ملنے کی تمہیں دیکھنے کی لیکن بس میری مصروفیت تم دیکھو مجھے یہاں ہر وقت رہنا ہوتا ہے اور میں دوسرے لوگوں پر بھروسہ نہیں کرسکتا اور تم نے دیکھا ہوگا کہ میرے محافظ مجھ سے اتنی دور ہیں کہ اسلحہ خانے تک ان کا سایہ بھی نہیں پہنچ سکتا میں خود ہی ہر چیز کی نگرانی کا قائل ہوں اور یہ فرض شناسی میرے نزدیک اچھی چیز ہے۔''

''بے شک بے شک آرگس تمہاری اس فرض شناسی کے چرچے تو عام ہیں۔''

''اوہو تمہارا شکریہ، تمہاری مہربانی، ہاں یہ خاتون جس کا نام تو نے تونیسا بتایا ہے کون ہے؟'' آرگس کی نگاہیں بدستور تونیسا پر لگی ہوئی تھیں۔

''میری بہن تونیسا ہے، یہ محل دیکھنے کی خواہش مند تھی، بڑی ہی بچکانہ فطرت کی مالک ہے لڑکی، کہنے لگی کہ اسلحہ خانہ دکھانے کے لئے مجھے تم سے بہتر اور کون مل سکتا تھا سو میں یہاں تک آ گیا۔''

''یہ آرگس ہیں۔'' تونیسا نے خواب ناک لہجے میں سوال کیا۔ ''کیسی حسین شخصیت ہے ان کی، آہ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آرگس کی شخصیت اتنی حسین ہوگی، سچ بھائی مجھے تو محل کے عہدے داروں کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے پہلے میں سوچتی تھی کہ نجانے یہ لوگ کیسے ہوتے ہوں گے، لیکن آہ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ان میں ایسی ایسی حسین شخصیتیں پوشیدہ ہیں، میں آپ سے بہت متاثر ہوں آرگس، کیا میں اکثر آپ سے مل سکتی ہوں؟''

''کیوں نہیں خاتون، کیوں نہیں، میرے لائق جو بھی خدمت ہوگی میں اسے انجام دے کر بڑی خوشی محسوس کروں گا۔''

''شکریہ آرگس، بہت بہت شکریہ۔'' اور آرگس کا حلیہ بگڑ گیا۔ پھر اس نے نیولس سے کہا۔

''آپ بے فکر رہیں محترم نیولس، میں خاتون تونیسا کو اسلحہ خانے کی بھرپور سیر کراؤں گا۔''

''ٹھیک ہے تو میں اسے اپنے آپ کے پاس چھوڑے جا رہا ہوں اور تونیسا میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ تم جب چاہو آرگس کے پاس جا سکتی ہو، یہ میرا اچھا بلکہ بہت ہی پیارا دوست ہے۔'' نیولس نے کہا اور تونیسا نے مسکرا کر آرگس کی طرف دیکھا، آرگس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ وہ بڑا ہی کمینہ صفت انسان معلوم ہوتا تھا۔''

چنانچہ ہم تونیسا کو اس کے پاس چھوڑ کر چلے آئے، واپسی پر نیولس کسی قدر سنجیدہ تھا۔ ''گو مجھے اپنی بہن پر بے حد اعتماد ہے لیکن اس کے باوجود......''

''وہ ایک قابل اعتماد لڑکی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ عمدگی سے اپنا کام انجام دے گی، لیکن اب تم اپنے لوگوں کو تیار کر لو۔''

''کون سے لوگوں کو؟''

''وہ جو اسلحہ خانے سے اسلحہ غائب کریں گے۔''

''وہ ہر وقت تیار ہیں اور اسی محل میں موجود ہیں۔''

''اب ہم یہاں سے جائیں گے تو انہیں ساتھ لے جائیں گے تاکہ راز افشا نہ ہو، یہ احتیاط ضروری ہے۔''

''ٹھیک ہے گو ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس پر اعتماد نہ کیا جا سکے، لیکن اس کے باوجود یہ احتیاط غیر مناسب نہیں ہے۔'' نیولس نے جواب دیا اور میں خاموش ہو گیا، میرے پاس تجاویز کے جو دخار تھے اور جس راستے سے میں کام کرنا چاہتا تھا انہیں زینہ بہ زینہ خرچ کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے ارکاشہ وغیرہ کیبات چھپائے رکھی۔ کچھ وقت گزار کر تونیسا نے مسکراتے ہوئے ہمیں اپنا کام ہونے کی خوشخبری سنائی۔ نیولس اس کے لئے پریشان تھا۔

''وہ تو عورت کے معاملے میں پرلے درجے کا بیوقوف ہے، میرا دعویٰ ہے کہ اگر میں طویل عرصے تک بھی اس کے پاس رہی تو وہ میرے بدن کو ہاتھ نہیں لگا سکتا، میں اسے شراب میں ڈبو دیتی ہوں اور اس کے محافظوں کی مجال نہیں کہ وہ اس طرف آ سکیں، گویا پھر میرا راج ہوتا ہے۔''

''تم ہمیں ان جگہوں کی تفصیل بتاؤ۔'' نیولس نے خوش ہو کر کہا۔

''تونیسا نے اسلحہ خانے کا نقشہ اس تفصیل سے بتایا کہ ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ہم خود اس کی سیر کر چکے ہوں۔ چنانچہ اس تفصیل کے تحت نیولس کے لوگوں نے اپنا کام شروع کر دیا، اس کام کو نہایت سست رفتاری سے کیا جا رہا تھا تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو سکے، چرایا جانے والا اسلحہ نیولس کے مکان میں جمع کیا جا رہا تھا اور اب صورتحال یہ تھی کہ نیولس کے گھر میں رہنے کی جگہ نہیں تھی اور اس کے ماں باپ اس اسلحے کو دیکھ کر خوب ہنستے تھے۔

میں نے ایک عظیم کام کرلیا تھا، یعنی اتنا اسلحہ جمع کرلیا تھا کہ باغیوں کی پوری تعداد کے لئے کافی تھا اور اب مزید اسلحے کی ضرورت نہیں تھی، دوسری طرف نیوسکی کی فوجیں عین وقت پر اسلحے سے محروم ہوجائیں گی اس طرح دوہرا فائدہ ہوا تھا۔ بالآخر اسلحے کا کام ختم ہوگیا اور نیوکس نے پوچھا۔

''اب ہمیں کیا کرنا ہے پولیسیس؟''

''ٹھیک...... بہرصورت اس نے تمہیں اجازت دے دی ہے تم نے اس سے کیا کہا کہ تم کس انداز میں کہاں جانا چاہتے ہو؟''

''میں نے اس سے یہی کہا تھا کہ میں ایک قافلہ لے کر سفر کرنا چاہتا ہوں میرے پاس بے شمار گھوڑے ہوں گے اوران پر کافی سازوسامان۔''

''تو کیا اس نے اس قافلے کی وجہ دریافت کی؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں...... میں نے اسے جواب دیا تھا کہ میں باغیوں کی سرکوبی کے لئے یہ ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ وہ قافلے لوٹتے ہیں۔''

''تو کیا اس کے بعد ایگانوس نے تم سے یہ سوال نہیں کیا کہ اگر تم کسی ایسے گروہ کے ہتھے چڑھ گئے تو کیا کروگے؟''

''ہاں اس نے پوچھا تھا۔''

''پھر تم نے کیا جواب دیا؟''

''میں نے اسے بتایا تھا کہ میں چند افراد کو لے کر جاؤں گا اور جب وہ لوٹ مار کررہے ہوں گے تو میں غائب ہوجاؤں گا اور چھپ کر ان کا تعاقب کروں گا اور یہ دیکھوں گا کہ وہ ان اشیا کو کہاں لے کر جاتے ہیں۔ گویا میں اس وقت اس قافلے کو چھوڑدوں گا جب وہ لوٹ مار کررہے ہوں گے۔ میں نے یہ بات ایگانوس سے کی اور ایگانوس نے بہرحال ایک حد تک اسے منظور بھی کرلیا۔''

''اوہ......تو ایگانوس نے اس بات پر کوئی تجویز پیش نہیں کی؟''

''ہاں کی تھی۔''

''وہ کیا؟''

''اس نے کہا تھا کہ قافلے والوں کی تعداد زیادہ ہونا چاہئے۔''

''اس کی وجہ اس نے کیا بتائی؟''

''صرف یہ کہ اگر کوئی گروہ قافلے والوں پر آپڑے تو ان میں سے بچ کر وہ اس گروہ کا جائزہ لے سکیں۔''

''پھر تم نے کیا کہا؟''

''میں نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اس طرح یہ بھی ممکن ہے کہ باغی گروہ پر حملہ آور ہی نہ ہوں وہ ہمیں تعداد میں زیادہ دیکھ کر ہماری چال کو سمجھ جائیں اور حملہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔''

''پھر؟''

''اس نے مجھ سے اتفاق کیا اور اجازت دے دی کہ میں جس طرح چاہوں کروں۔''

''تو پھر میرے دوست تم نے کیا سوچا ہے اور اب تم کب روانہ ہوگے؟'' میں نے سوال کیا۔

''بس کچھ وقت لگے گا، اس دوران میں گھوڑوں کا انتظام کرلوں گا اور اس قسم کے معاملات مکمل کرلوں گا کہ مجھے یہاں سے نکلنے میں دقت نہ ہو۔''

''اسلحے کا کیا ہوگا؟''

''ظاہر ہے پولیسیس اسلحہ ہی تو خاص چیز ہے، ہمیں اس کی خاص حفاظت کرنا ہوگی بلکہ اسے چھپا کر لے جانا ہوگا، میں اسے پہلے ہی ایسی جگہ بھیج دوں گا تاکہ شہر سے نکل کر ہم گھوڑوں سے سامان اتروالیں، شہر کے اندر تک ہم گھوڑوں پر صرف وہی چیزیں بار کریں گے جو ہمارے ذہن میں ہیں اور جو ایگانوس کے سپاہیوں کو مشکوک نہ کرسکیں، ظاہر ہے میں ایگانوس کو بھی وہ اشیا دکھاؤں گا تاکہ وہ سب مطمئن ہوسکیں۔''

''مناسب خیال ہے اس کام میں تمہیں جتنا بھی وقت درکار ہو میں بھی تمہارے ساتھ شامل ہوں۔''

''نہیں بس ٹھیک ہے، باقی سارے معاملات

میں خود ہی حل کرلوں گا۔‘‘ نیولس نے جواب دیا۔’’ہاں ایک بات اور ہے کہ اب تونیسا کو وہاں نہ جانے دیا جائے۔‘‘

’’ہاں اب اس کی ضرورت بھی کیا ہے، آرگس سے کہہ دیں گے کہ تونیسا بیمار ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے کچھ نہ کچھ بندوبست کرلیں گے اور اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے اور ظاہر ہے اس کی پہنچ اتنی دور تک بھی نہیں ہے۔‘‘

چنانچہ یہ بات طے ہوگئی اور اسی روز سے تونیسا کا محل جانا بند ہوگیا اور نیولس اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ بالآخر وہ وقت آگیا جب نیولس اپنی تیاریاں مکمل کرچکا تھا اسلحہ آبادی سے کافی دور جمع کردیا گیا تھا، یہ جگہ ویران تھی۔ یہاں نیولس نے بے شمار گھوڑوں پر بہت سا سامان لدوالیا تھا لیکن اپنے ساتھ صرف بیس افراد کو لیا تھا اور یہ بیس افراد وہی تھے جو نیولس کے اپنے ہمراز اور ساتھی تھے۔ دوسرے معنوں میں یہ سب باغی تھی۔ اس بے شمار سامان والے قافلے میں ان بیس افراد کے علاوہ میں اور نیولس بھی شامل تھے، نے کسی ایسے آدمی کو ساتھ نہیں لیا تھا جو اس کے لئے برا ثابت ہوسکتا۔

جس وقت ایگانوس نے ہمیں رخصت کیا تو میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ ایگانوس نے گھوڑوں پر لدے ہوئے سامان کو بھی دیکھا تھا پھر اس نے ہمیں کامیابی کی دعائیں دی تھیں۔ ایک ایسے انسان کی حیثیت سے جو نیوسکی کے امور کا نگران ہو۔ سو ہم چل پڑے۔ نیولس بہت خوش تھے، نجانے اس کے ذہن میں میرے لئے کیا تھا لیکن وہ میری بے پناہ عزت کرتا تھا۔ پھر ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں گھوڑوں پر لدا ہوا سامان اتار کر اسلحہ بار کرنا تھا، ہم نے اسلحہ بار کیا اور کھانے پینے کی اشیا ساتھ لے لیں، باقی سامان گڑھوں میں دفن کردیا گیا اور اس کے بعد ہم نے وہاں سے کوچ کردیا۔

نیولس نے میری جانب معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا اور میں اس خیال کو اچھی طرح جان گیا تھا اس نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’ہمیں کون سا رخ اختیار کرنا چاہئے یولیسیس؟‘‘

’’تمہارے خیال میں کیا میں تمہیں چند لمحات ہی میں صحیح جگہ لے جاؤں گا۔‘‘

’’میرے خیال کی بات نہ کرو یولیسیس، میرے ذہن میں جو کچھ بھی ہے میں تم سے اس کا اظہار نہیں کروں گا، ہاں یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم مجھ سے مخلص ہو اور میرے ہمدرد بھی ہاں اگر تم خود کو کسی مسئلے میں چھپانا چاہتے ہو تو پھر بھی میرا فرض ہے کہ میں تم سے مکمل تعاون کروں۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ میں چونک گیا۔

’’نن...... نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے یولیسیس، بس بعض باتیں روانی میں ہوجاتی ہیں جن کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔‘‘

’’اوہ......‘‘ میں نے سیٹی بجانے کے سے انداز میں ہونٹ سکوڑے۔ ویسے میں سمجھ گیا تھا کہ نیولس میرے بارے میں کچھ کچھ جان گیا ہے۔ میں سمجھ چکا تھا کہ نیولس مجھ سے مشکوک ہوچکا ہے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بہر صورت اس شک کی کوئی غلط صورت نہیں تھی، اس نے کھل کر مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھے خود سے مخلص سمجھتا ہے۔ چنانچہ اب جبکہ نوبت یہاں تک آگئی تھی اور کچھ دیر کے بعد جب مجھے نیولس پر یہ بات عیاں کرہی دینا تھی تو پھر میں کسی بات کی تردید کیوں کرتا، ظاہر ہے کچھ دیر کے بعد مجھے نیولس کے علم میں یہ بات لانا تھی کہ خود میرا تعلق بھی باغیوں کے گروہ سے ہے تو میں کیوں شدت سے اس بات کو چھپانے کی کوشش کرتا، سو میں مسکرا کر خاموش ہوگیا۔ البتہ نیولس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں کچھ جاننے کی سی چمک......

اب نیولس کچھ بے چین رہنے لگا تھا اور ہم آبادیوں سے دور ایک ایسے علاقے کی جانب جارہے تھے جو ہمیں باغیوں کے علاقے تک لے جاتا۔ یعنی اس

جگہ جہاں میں نے سرنگیں پھیلائی ہوئی تھیں اور یہ سرنگیں ہماری ہی کاوشوں کا نتیجہ تھیں۔ وہ جگہ یہاں سے قریب تر تھی جہاں ہم لوگ موجود تھے میں اگر چاہتا تو ایک طویل فاصلے سے نیولس کو اس ٹھکانے تک لے جاتا لیکن اسلحے سے لدے ہوئے گھوڑے میرے لئے بہت قیمتی تھے۔ یہ ہماری بہت معمولی محنت سے حاصل ہوئے تھے یعنی پہلے لوہے کا حصول اور اس کے بعد ہتھیار سازی، گویا ایک طویل کام ایک مختصر سے وقت میں طے ہوگیا تھا اور ایک ایسا کام جس کے لئے ہمیں اچھی خاصی دشواریوں سے گزرنا ہوتا۔

مجھے اندازہ تھا کہ سرنگوں کے آس پاس پوشیدہ رہنے کی جگہیں اور کمین گاہیں کہاں کہاں ہیں چنانچہ تھوڑے سے سفر کے بعد ہم ایک کمین گاہ تک پہنچ گئے۔ اس دوران میں نے دوسرے اور بھی کام کئے تھے، یعنی میں نے یہ بات ذہن میں رکھی تھی کہ کارگس تک پہنچنے کا مختصر ترین راستہ کون سا ہوسکتا ہے اور اگر ہم ایک سرنگ ایسی بنالیں جو کسی قریبی سرنگ سے جا کر مل جائے تو اس کا ایک راستہ شہر میں کھلے تو اس کے لئے ہمیں کتنے فاصلے تک سرنگ کھودنا ہوگی اور اس کے لئے کیا نقشہ ترتیب دینا ہوگا۔ یہ ایک بڑا کام تھا جو ہمیں انجام دینا تھا اور سب سے بڑا کام ہوچکا تھا یعنی ہتھیاروں کی بازیابی اور نیوسکی کے لئے خاصا سخت ہوتا تھا جس میں اس کی شکست ایک یقینی امر تھا۔ چنانچہ میں نے کمین گاہوں سے تھوڑے فاصلے پر پہنچ کر نیولس کی جانب دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

''نیولس ہم باغیوں کی سرزمین تک پہنچ گئے ہیں؟''

''کیا مطلب؟'' نیولس حیرت سے اچھل پڑا۔

''ہاں۔''

''کیا کہہ رہے ہو یولیسیس؟''

''جو کہہ رہا ہوں درست کہہ رہا ہوں، لیکن باغی کہاں ہیں؟''

''باغی بہت ہی قریب موجود ہیں ان پہاڑیوں میں۔''

''ان پہاڑیوں میں۔'' نیولس نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں۔''

''لل.....لیکن.....'' نیولس ایک دم ہکلا گیا۔

''تمہیں اتنا تعجب ہے؟''

''میں نہیں مان سکتا، دیوتاؤں کی قسم میں نہیں مان سکتا، یہ پہاڑیاں تو کارگس سے بہت نزدیک ہیں اور نیوسکی کے فرشتے بھی نہیں سوچ سکتے کہ باغی اس کی شہ رگ سے اس قدر نزدیک ہیں، ہمیں تو زیادہ سفر بھی نہیں کرنا پڑا اور میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں نے جن باغیوں کی تلاش کے لئے اتنے دور دراز علاقے کا سفر کیا ہے وہ تو ہم سے اس قدر قریب ہوں گے اور بلاشبہ اگر باغی یہاں موجود ہیں تو پھر انہوں نے انتہائی مہارت کا ثبوت دے کر ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا ہے جس کے بارے میں کارگس کے رہنے والے سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''کیا میں ان باغیوں سے رابطہ قائم کرلوں؟'' میں نے نیولس سے پوچھا۔

''ضرور کرلو۔'' نیولس نے مسکرا کر کہا اور پھر بولا۔ ''میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ میری تقدیر بہت بلندی پر ہے لیکن حیثیت بدلنے کے بعد اگر تم کارگس کے باغیوں کی حیثیت سے اس وقت مجھے ملتے جب میں باغیوں کی تلاش میں تھا اور کارگس کا وفادار تھا تو اس وقت بلاشبہ باغیوں کی بدنصیبی ہوتی لیکن یوں لگتا ہے کہ بغاوت کامیاب ہوکر رہے گی اور تم میرے دوست جس قدر پراسرار انسان تھے اس کا اندازہ تو مجھے پہلے ہی ہوچکا تھا اور میرے دوست یولیسیس میں اپنی باتوں سے تمہیں زیادہ پریشان نہیں کروں گا تم جلدی سے ان سے رابطہ قائم کرو۔'' اور میں نے گردن ہلا دی۔

اس کے بعد میں نے اپنے مخصوص اشارے کرنا شروع کردیئے۔ میرے ہاتھ ایک مخصوص انداز میں چل رہے تھے، گویا ایک طویل داستان تھی جو میں

باغیوں کو سنا رہا تھا اور پھر میں نے اپنا اشارہ نشر کرنے کے بعد نیولس کی جانب دیکھا جو بغور میرے اشاروں کو دیکھ رہا تھا، میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''نیولس، تم اپنے آدمیوں کو قیام و طعام کا بندوبست کرنے کا حکم دو۔''

''کیا تم یہاں قیام کرو گے؟''

''نیولس تم مجھے ایک بات کا جواب دو؟'' میں نے نیولس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''ضرور یولیسیس، ضرور......''

''کیا یہ سارے آدمی تمہارے قابل بھروسہ ہیں، کیا یہ ہمارے خلاف تو نہیں جا سکتے؟''

''تم رازوں کی بات کرتے ہو یولیسیس۔''

''بالکل......میرا مقصد یہی ہے۔''

''اور تمہارا مقصد یہ ہے کہ باغی ان کے سامنے اپنے خفیہ ٹھکانوں سے باہر نہ آئیں۔''

''ہاں یہ بھی صحیح ہے۔''

''تو اس کے لئے میں تمہیں ایک تجویز پیش کر سکتا ہوں۔''

''وہ کیا؟''

''ان تمام لوگوں کو باغیوں کے حوالے کر دیا جائے اور ان میں سے صرف چند افراد ساتھ رہنے دیئے جائیں جنہیں ہم واپس لے جا سکیں جن پر مکمل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے واپس جا کر باقی لوگوں کے بارے میں ہمیں کوئی نہ کوئی کہانی تو سنانا پڑے گی۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ جب ہم واپس ایگانوس کے پاس پہنچیں گے تو کیا اسے یہ نہیں بتائیں گے کہ ہمارا سارا سامان کیسے لوٹا گیا اور قافلے کے آدمی کس طرح ہلاک کر دیئے گئے اس وقت تمہارے خیال کے مطابق ہمیں کیا جواب دینا ہوگا۔'' نیولس نے مجھ سے سوال کیا۔

''ظاہر ہے ایسا جواب جس سے ایگانوس مکمل طور پر مطمئن ہو سکے۔'' میں نے جواب دیا۔

''بالکل درست یولیسیس دراصل اس سلسلے میں مجھے تم سے ہی مشورہ لینا تھا، ظاہر ہے کوئی نہ کوئی جواب تو دیں گے ہی......''

''ایگانوس کو اس بات کا علم ہے کہ باغیوں کے گروہ بہت زیادہ مضبوط ہیں، ان کی کارروائیاں ہماری کارروائیوں سے زیادہ موثر ہوا کرتی ہیں، چنانچہ اگر ہم اس کو کوئی کہانی سنائیں گے تو وہ اس کہانی پر شبہ نہیں کرے گا۔''

''خوب تو واپس لے جانے والے آدمی کتنے ہوں گے؟'' میں نے سوال کیا۔

''صرف پانچ...... چھٹا میں اور ساتواں تم......''

''مناسب۔'' میں نے جواب دیا اور نیولس دوسرے کام انجام دینے لگا۔ پھر اس نے اپنے آدمیوں کو قیام کا حکم دے دیا۔ گھوڑوں کے اوپر سے سامان اتارا جانے لگا اور یہ قافلہ قیام پذیر ہو گیا، لیکن زیادہ دیر نہ لگی تھی کہ پہاڑی چٹانوں نے گھوڑے اگلنا شروع کر دیئے گھوڑے سوار اس برق رفتاری سے قافلے کے چاروں طرف جمع ہو رہے تھے کہ تعجب ہوتا تھا۔

میں نے اپنے لوگوں کی کارروائی دیکھی اور متاثر ہوا، یہ لوگ بہت ہی زیادہ ذہانت کا ثبوت دے رہے تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کارروائی میں ایمروس بھی شریک تھا۔ یقیناً اسے اطلاع دی گئی ہوگی کہ کوئی قافلہ یہاں آ کر رکا ہے اور اس سے اشارے نشر کئے جا رہے ہیں، لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ ایمروس نے سرنگوں کے درمیان اتنا طویل سفر اتنی جلدی طے کر لیا تھا کیونکہ جس جگہ ہمارا خصوصی ٹھکانہ تھا وہاں سے اس سرنگ تک کا فاصلہ کافی طویل تھا اور اگر سرنگوں میں گھوڑے بھی دوڑائے جاتے تو یہ فاصلہ اتنی جلدی طے نہیں ہو سکتا تھا۔ بہرحال ہر بات سے قطع نظر یہ اعلیٰ کارکردگی کی ایک عمدہ مثال تھی یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ ایمروس یہیں کہیں قریب ہی موجود ہو۔

پھر میں نے ایمروس کو دیکھا اور ایمروس نے مجھے، باغی ہمارے چاروں طرف پھیل گئے اور پھر

ایمروس دو آدمیوں کے ساتھ میرے سامنے پہنچ گیا، وہ گھوڑے سے اترا اور میرے نزدیک آ کر جھک گیا۔

''عظیم سربراہ......'' اس نے مودبانہ انداز میں کہا۔ ''کیا حکم ہے؟'' اور میں نے نیولس کی جانب دیکھا اس کی نگاہوں میں کچھ جاننے کی چمک تھی، بہرحال میں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے ایمروس سے کہا۔

''ایمروس، یہ سارا اسلحہ حاصل کرلو، میرا خیال ہے یہ تمہاری تمام تر فوجوں کے لئے کافی ہے۔''

''یقیناً، کیا یہ سارا سامان اسلحہ ہے؟''

''ہاں......تم اسے باآسانی لے جاسکتے ہو۔''

''اور یہ لوگ؟'' ایمروس نے سوال کیا۔

''سب ہمارے وفادار ہیں اور سب ہمارے ساتھی۔''

''واہ......گویا تم نے وہاں بھی ایک حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا ہے۔'' ایمروس نے سوال کیا۔

''جو چاہے سمجھ لو، میں تجھے کچھ سوچنے سے نہ روک سکوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

اور ایمروس اسلحہ سرنگوں کے ذریعے اپنے خفیہ ٹھکانوں تک پہنچانے لگا۔ نیولس کے ساتھی متحیرانہ انداز میں باغیوں کو دیکھ رہے تھے، خود نیولس کی حالت بھی حیرت انگیز تھی، وہ حیرت سے منہ پھاڑے مجھے دیکھ رہا تھا اور میں اس کی وجہ سمجھ گیا تھا، وہ ایمروس کے الفاظ پر حیران تھا جو اس نے میری شان میں کہے گا، پھر جب میں نیولس اور اس کے ساتھیوں کو لے کر سرنگ کے اندر داخل ہوا تو نیولس نے آہستہ سے پوچھا۔

''کیا یہ درست ہے میرے دوست یولیسیس؟''

''ہاں نیولس، تم نے کبھی غور ہی نہیں کیا، کیا تم نے کبھی اس بات پر سوچا کہ باغیوں کا سربراہ کون ہے؟''

''میں نے سنا تھا کہ اس کا نام یولس ہے......

اوہو......اچانک نیولس کو اپنی بات کا احساس ہوا اور اس کی آنکھیں شدت حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

محبت

درحقیقت زندگی تاریک ہے، سوائے اس وقت کے جب لگن ہوتی ہے اور لگن اس وقت تک لازمی ہے جب تک علم نہیں ہوتا اور ہر قسم کا علم اس وقت تک بےکار ہے جب تک عمل نہ ہو اور ہر عمل اس وقت تک کھوکھلا ہے، جب تک محبت نہ ہو، جب تم محبت کے ساتھ عمل کرتے ہو تو تم خود کو اپنے سے اور خدا سے باندھ لیتے ہو۔

(انتخاب: محمد علی رضا۔ٹنڈو آدم)

''کیا میں یولیسیس کو یولس بھی کہہ سکتا ہوں؟''

''ہاں میں یولس ہی ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور نیولس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اس کا چہرہ شدت حیرت سے سرخ ہوگیا تھا، پھر وہ کافی دیر تک کچھ نہ بول سکا، اب وہ پتھر کے بت کی طرح میرے ساتھ چل رہا تھا۔ جیسے اسے اپنی ناواقفیت پر شدید حیرت ہو۔ سرنگوں کا یہ جال جتنا طویل تھا نیولس اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، آخرکار اسلحہ سرنگوں میں منتقل ہوگیا اور پھر میں نے فیصلہ کیا کہ نیولس کو ان سرنگوں کی سیر کراؤں گا، میں نے اس کے پندرہ ساتھیوں کو اپنے ساتھیوں کے حوالے کردیا اور نیولس نے انہیں یہ بات بتادی تھی کہ انہیں یہاں کس طرح رہنا ہے۔ باقی پانچ آدمی جو اسے واپس لے جانا تھے ان کو بھی اس نے منتخب کرلیا تھا، یونان ان کے لئے ایک الگ جگہ منتخب کردی گئی تھی۔ اس کے بعد میں نیولس کو لے کر چل پڑا اور پھر میں نے نیولس کو وہ عظیم الشان غار دکھایا جو قیدیوں کی رہائش گاہ تھی اور غار میں موجود سرنگوں کے ذریعے وہ دور دور کے علاقوں میں جاسکتے تھے۔

یہاں ہمارا جتنا بھی وقت صرف ہوا صرف نیولس کو ان علاقوں کو دکھانے میں صرف ہوا تھا اور اس کے بعد میں نے یہ کھیل ختم کردیا اب ہم واپسی کا پروگرام بنا رہے تھے۔ نیولس نے جو کچھ دیکھا اور اسے میری شخصیت کے بارے میں جو کچھ بھی معلوم ہوا وہ اس کے لئے باعث حیرت تھا اور اب وہ اکثر حیران ہی رہا کرتا تھا، اکثر وہ تنہائی میں میری شکل دیکھا کرتا تھا، ایک دو بار میں نے اس سے پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

''میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا یولیسیس کہ تم کون اور کیا ہو گے، افسوس میں تمہارے ساتھ اتنی اچھی طرح پیش نہیں آیا جتنا مجھے آنا چاہئے تھا۔''

''اس بات کو ذہن سے نکال دو نیولس...... سب سے اچھی بات یہ ہے کہ تم میرے ہمنوا بن گئے ہو۔''

''ہاں اور شاید یہ میری خوش نصیبی ہے ورنہ تم تو میرے سر تک پہنچ گئے تھے، اگر میں تمہارا دشمن ہی ہوتا تو کیا تمہارے ہاتھ با آسانی میری گردن تک نہ پہنچ جاتے، اور اس کے بعد تم مجھے نہایت اطمینان سے قتل کرسکتے تھے۔''

''اور اس کے لئے میں وقت کا شکر گزار ہوں نیولس کہ اس نے یہ موقع نہ آنے دیا، یہ حقیقت ہے نیولس کہ اگر تم تبدیل نہ ہوتے اپنے ارادوں میں تو میں تمہیں زیادہ دیر زندہ نہ رہنے دیتا، لیکن بہرحال تمہارے روپ میں نہ صرف مجھے اپنا ایک ہمنوا بلکہ اتنا عظیم دوست بھی ملا جس کی دوستی پر میں بجا طور پر فخر کرسکتا ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے نیولس اب ہمیں واپس چلنا چاہئے۔''

''بالکل، میں خود بھی اس کام میں اب جلدی کرنا چاہتا ہوں۔'' نیولس نے سنجیدگی سے جواب دیا اور پھر ہم سرنگوں کے سفر سے واپس چل دیئے۔ ایمروس اسلحے کے یہ ذخیرے دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا اس کے پاس رہنے کے لئے مجھے بہت کم وقت ملا تھا، لیکن اسے نقشے اور ہدایات تو دینا ہی تھیں میں نے اسے پوری تفصیل سمجھادی اور نیولس گردن ہلانے لگا۔

''تو تم نے جو کچھ کیا یولس میں اس پر سخت حیران ہوں، لیکن میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ارمغانوں کی وادیوں نے ایک ناقابل یقین کارنامہ سرانجام دیا ہے اور وہ کارنامہ ہے تیری پیدائش اور تیری پرورش۔''

''حیرت چھوڑ ایمروس، کیا تو اس اسلحے سے مطمئن ہے۔''

''اسلحہ پہلے بھی ہمارے پاس کافی موجود ہے، لیکن اس عظیم الشان ذخیرے کے بعد تو ہماری ساری ضروریات پوری ہوگئیں۔''

''سرنگ کا نقشہ سمجھ لیا۔''

''ہاں۔''

''اور اب ہماری اور تمہاری ملاقات سرنگ کے اختتام پر کارگس میں ہی ہونی چاہئے، اس کام میں تم جتنی جلدی کرلو بہتر ہے۔''

''تم مطمئن رہو یولن سارے کام تمہاری مرضی کے مطابق ہی ہوں گے۔''

''خوراک کی کیا کیفیت ہے؟''

''محفوظ ذخائر ابھی تک موجود ہیں بلکہ ان میں کافی اضافہ ہوا ہے ہمارے ساتھی بہترین غلہ اور سبزیاں پیدا کررہے ہیں، ان کا جذبہ قابل داد ہے۔''

''یقیناً اس کے بعد ان کی زندگی میں جو خوشگوار تبدیلیاں آئیں گی وہ ان کی محنتوں کا ثمر ہوں گی، اس کے علاوہ یولس ہمارے ہاتھ ایسے لوگ بھی لگے ہیں جو انہی قیدیوں میں شامل تھے جو ہمارے ساتھ فرار ہوئے تھے۔''

''اوہ...... کتنی تعداد ہے ان کی؟''

''بیس آدمی تھے۔''

''کہاں مل گئے۔''

''ویرانوں میں بھٹک رہے تھے، موت کے نزدیک تھے اگر ہم ان کی زندگی نہ بچاتے تو وہ موت کا شکار ہوگئے ہوتے۔''

''اچھا کیا تم نے؟''
''لیکن ان سے ان کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں اس نے ہم سب کے حوصلے اور بڑھا دیئے ہیں۔''
''خوب...... وہ کیا معلومات تھیں؟''
''ان لوگوں پر عرصہ حیات تنگ تھا ایسی اذیتیں برداشت کرنا پڑی تھیں کہ سن کر خوف آرہا ہے اس لحاظ سے ہمارے ساتھیوں نے تو بہترین وقت گزارا ہے۔''
''کہاں ہیں وہ لوگ؟''
''ہم نے انہیں خود میں شامل کرلیا ہے اور وہ لوگ بھی اب ہمارے مشن سے بہت مخلص ہیں۔''
''ٹھیک ہے، کوئی حرج نہیں ہے، لیکن ہر شخص کو مصروف رکھو، کسی کو کاہلی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔''
''وہ سب کاشت کررہے ہیں۔''
''ٹھیک ہے ایمر وس کوئی اور سوال؟''
''نہیں۔''
''میری ہدایات پر تم نے غور کرلیا ہے۔''
''ہاں بخوبی اور تم یہاں کے معاملات سے بے فکر رہو، مجھے یقین ہے کہ تم کوئی ناقابل یقین کارنامہ انجام دینے میں مصروف ہوگے بہرحال میں بذریعہ سرنگ کارگس پہنچ رہا ہوں''
ایمر وس کی یقین دہانی کے بعد میں وہاں سے چل پڑا، پانچ ساتھی ہمارے ساتھ تھے اور ہم نے ان کی حالت خستہ بنادی تھی اور اب ہم کارگس واپسی کا سفر کررہے تھے، میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی تھا جس کا تذکرہ میں نے نیولس سے کہا۔
''نیولس کیا اسلحے کی گمشدگی کا راز کھل گیا ہوگا؟''
''اوہ ممکن ہے......''
''کیا ان کا شبہ ہمارے اوپر بھی جاسکتا ہے؟''
''ناممکن۔''
''پھر وہ کیا سوچیں گے؟''
''دوسری بات ہے کہ وہ اسے باغیوں کی حرکت سمجھیں اور تحقیقات کریں گے کہ کارگس میں باغی کہاں سے گھسے۔''
''اس صورت میں تو ہم محفوظ ہیں۔''
''سو فیصدی ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔''
نیولس نے مطمئن لہجے میں کہا اور پھر میں نے اسے مزید تفصیل بتانے کا فیصلہ کرلیا۔
''اس کے علاوہ میں ایک اور انکشاف کرنا چاہتا ہوں۔
''اوہ...... اب اور کوئی انکشاف باقی رہ گیا ہے کیا، مجھے تو آج تک حیرت ہے کہ باغیوں کا عظیم سربراہ میرے ساتھ ہے۔'' نیولس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''نہیں...... وہ بات میری ذات سے متعلق نہیں ہے۔''
''پھر؟''
''محل ہی کی ایک بات ہے لیکن میرے خیال میں تم خود بھی اس سے لاعلم ہو ورنہ اس کا تذکرہ ضرور کرتے۔''
''ایسی کون سی بات ہے۔''
''تم نے کبھی مجھے ارکاشہ کے بارے میں نہیں بتایا؟''
''ارکاشہ...... نیوسکی کی ماں......''
''ہاں۔''
''اس کے بارے میں کوئی قابل ذکر بات ہی نہیں تھی۔''
''کیا وہ زندہ ہے؟''
''ہاں اور محل کے ایک گوشے میں رہتی ہے۔''
''کیا وہ گوشہ نشین ہے؟''
''ہاں اس نے خود ہی یہ زندگی اختیار کی ہے لیکن اس کا بیٹا نیوسکی اس کا پورا پورا خیال رکھتا ہے اور اس نے اسے محل ہی کے ایک حصے میں رکھا ہوا ہے۔''
''کیا نیوسکی اس سے ملنے بھی جاتا ہے؟''
''یہی سنا ہے کہ وہ اپنی ماں کی خدمت میں حاضری دیتا رہتا ہے۔''
''تمہارے کسی سپاہی نے تمہیں اس حاضری کی

تفصیل نہیں بتائی۔''

''نہیں...... کوئی خاص بات ہے۔'' نیولس کی آنکھوں سے تجسس جھانک رہا تھا۔ لیکن میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور ایک اور سوال داغ دیا۔

''کیا ایگانوس اپنی بیٹی سے ملنے کبھی نہیں جاتا؟''

''ایگانوس......'' نیولس چونک پڑا، پھر جلدی سے بولا۔ ''نہیں میرا خیال ہے وہ اس سے نہیں ملتا۔''

''کیوں؟''

''وہ بیٹی سے زیادہ خوش نہیں ہے، شاید اس کے ذہن میں یہ بات ہے کہ ارکاشہ کی وجہ سے اس کی حکومت چھن گئی تھی۔''

''کیا اسے اس سے محبت بھی نہ ہوگی؟''

''ایسی بات بھی نہیں ہے لیکن وہ اپنے ہی جوڑ توڑ میں مصروف رہتا ہے، اسے باغیوں کا بھی خوف ہے اس لئے وہ ہر وقت جاگتا رہنا چاہتا ہے۔''

''ہوں تو پھر وہ ضرور لاعلم ہوگا۔''

''کون سی بات ہے؟''

''وحشی درندہ سو فیصدی جانور ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ انسان کی اولاد کس طرح ہوسکتا ہے۔''

''یعنی۔''

''گوریلا اپنی ماں کو صرف عورت سمجھتا ہے اور ارکاشہ کا بدن اس کے ناخنوں کی خراشوں سے بھرا ہوا ہے وہ مجبور ہے اور بیٹے سے نفرت کرتی ہے۔''

''کیا؟'' نیولس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''ہاں نیولس، ظاہر ہے کہ ایک جانور ہے اس سے زیادہ کیا توقع رکھتے ہو اور یہ تمہاری اس دنیا کا سب سے المناک پہلو ہے تم تابع ہو اس کے جس کی چیرہ دستیوں نے تحت الثریٰ کا مستقبل تاریک کر رکھا ہے وہ صرف ایک جانور ہے، انسانوں کی صفات رکھنے والا جانور۔''

''ہاں بڑی بھیانک بات کہی تم نے یولیسیس ایسی خوفناک بات کہ اگر کارگس کے لوگوں کو معلوم ہوجائے تو ایک طوفان کھڑا ہوجائے۔

''اس طوفان کا نتیجہ کیا ہوگا۔'' میں نے نیولس کو گھورتے ہوئے کہا۔

''قتل و غارت گری اور بے پناہ خونریزی کیونکہ بہرحال نیوسکی کے ہمنوا اس کے لئے سب کچھ کریں گے اور وہ طاقتور ہیں۔''

''خود ایگانوس کا کیا رویہ ہوگا؟'' میں نے دوسرا سوال کیا اور نیولس سوچ میں ڈوب گیا پھر گردن ہلا کر بولا۔

''اس کے بارے میں نہیں کہہ سکتا ممکن ہے ایگانوس کا نظریہ بدل جائے اور وہ نیوسکی کا دشمن بن جائے۔''

''اس کے امکانات موجود ہیں۔''

''کافی حد تک، کیونکہ اگر خود ایگانوس اس پہلو کو نظر انداز کرنا چاہے تو اس کے بس کی بات نہیں ہے اس کے خلاف اس قدر نفرت پھیل جائے گی کہ وہ اس نفرت کا سامنا نہیں کر سکے گا۔''

''گویا دونوں پہلو ہمارے حق میں ہیں؟''

''کیا مطلب؟''

''میں ایگانوس کو اس المیے سے روشناس کرانا چاہتا ہوں نیولس اور اب واپس جانے کے بعد تمہارا کام یہ ہوگا کہ میری مستقل ڈیوٹی نیوسکی پر ہی لگا دو۔''

''آہ...... تم اس سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہو؟''

''ان دونوں میں اختلاف، لیکن اس کا اظہار میں اس وقت کروں گا جب میرا کام مکمل ہوجائے گا۔''

''اوہ تم کس قدر خطرناک ہو یولیسیس، بلاشبہ تمہیں اس کا حق پہنچتا ہے کہ تم باغیوں کی سربراہی کرو اور اس کے بعد ملک کا نظم و نسق سنبھالو۔'' نیولس نے کہا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، احمق نوجوان غلط فہمیوں کا شکار تھا اسے کیا معلوم کہ میں کیا تھا اگر وہ میرے بارے میں جانتا ہوتا تو حیرت کا مجسمہ ہوجاتا۔ (جاری ہے)

فطرت

عامر ملک۔ راولپنڈی

انسان کے لئے یہ لازم ہے کہ اپنی زندگی کی حقیقت کو فراموش نہ کرے بلکہ غور کرے کہ حکم الٰہی کیا ہے اور قانون قدرت سے انحراف اس کے لئے باعث ہلاکت ہے۔

عادت تو آسانی سے بدل جاتی ہے مگر فطرت کا بدلنا ناممکن ہوتا ہے کہانی پڑھ کر غور کریں

وہ ایک نرم خو۔ چھوٹا سا سانپ تھا، جو افریقہ کے صحراؤں میں اکیلا ہی پروان چڑھ رہا تھا۔ آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ اس لئے وہ یہ بھی نہ جانتا تھا کہ وہ کتنی زہریلی نسل سے تعلق رکھتا ہے اور اسکے سانس میں کتنا زہر بھرا ہوا ہے کہ اس کی پھنکار سے پتھر بھی راکھ بن سکتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک معمولی سانپ سمجھتا۔ نرم نرم اور معمولی غذاؤں سے اپنا پیٹ بھرتا اور مزے کی زندگی گزار رہا تھا۔

جب وہ ذرا بڑا ہوا تو ایک دن حسب معمول اس نے نرم و نازک جھاڑیوں پر منہ دے مارا۔ وہ حیران ہوگیا ''کمال ہے۔'' وہ چیخا۔ ''یہ کیا ہوگیا۔؟'' جو کچھ ہوا تھا۔ اسے اتفاق سمجھ کر اس نے قریبی جھاڑیوں پر پھر منہ مارا۔ اس کی پھنکار سے وہ جھاڑیاں راکھ کا ڈھیر بن گئیں۔ ''یہ تو میری وجہ سے ہو رہا ہے۔'' نرم خو سانپ

نے اپنے آپ سے کہا اور پھر صدمے کی وجہ سے آنسو بہانے لگا۔

تین دن تک وہ اکیلا ہی غار میں پڑا سوچتا رہا۔ وہ جن چیزوں کو اب تک پسند کرتا چلا آیا تھا وہ چیزیں اس کے سانس کی حدت اور زہر سے راکھ میں تبدیل ہونے لگی تھیں۔

چوتھے دن وہ رینگتا ہوا غار سے باہر نکلا۔ صحرا کی وسعتوں کو دیکھ کر وہ عزم سے بولا۔ ''میں نیلی غار میں رہنے والے بزرگ سے ملوں گا وہ ایک عقل مند انسان ہے اس کے پاس میری مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوگا۔ وہ ایک نیک انسان ہے وہ میری مدد ضرور کرے گا۔''

بوڑھے بزرگ نے بڑے تحمل سے سانپ کی گفتگو سنی۔ پھر مایوسی کی حالت میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ افسوس میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا تم ویسے ہی رہو گے۔ جیسے خدا نے تمہیں بنایا ہے۔ تمہاری سرشت اور خصلت تبدیل نہیں ہو سکتی۔ نوجوانی نے تمہیں جذباتی بنا دیا ہے اگر تم انسان ہوتے تو میں شاید تمہیں سیدھی راہ پر لے آتا۔ مگر تم سانپ ہو۔ تم اپنے مقدر کو قبول کر لو۔ یہی تمہاری قسمت ہے جس سے تم بھاگ نہیں سکتے۔ اگرچہ تم چاہتے ہو کہ تمہاری پھنکار سے درخت، جھاڑیاں اور پتھر جل کر راکھ نہ ہوں مگر برسہا برس کی ریاضت اور علم نے مجھے جو کچھ دیا ہے اس کی روشنی میں، میں تمہیں کوئی امید نہیں دلا سکتا۔ تم اس نسل سے تعلق رکھتے ہو جس میں کوئی تغیر رونما نہیں ہو سکتا۔

''قابل احترام بزرگ!'' سانپ نے کہا۔'' میں آپ کی دانش اور بصیرت پر اعتماد کرتا ہوں۔ مگر میں نے سن رکھا ہے کہ اگر کوئی چاہے تو وہ اپنا آج بدل سکتا ہے۔''

''ننھے سانپ! تمہارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ تم اپنا آپ بدل سکو۔'' ننھے سانپ کو اس گفتگو سے بڑا دکھ ہوا۔ اس نے کراہنا شروع کر دیا۔ پھر اس کے منہ سے زہریلی پھنکار نکلی اور لمحوں میں وہ بزرگ راکھ بن گئے۔ راکھ کے اس ڈھیر کو دیکھ کر سانپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر اس نے اپنے آپ سے کہا...... ''یہ درست ہے کہ وہ میری وجہ سے جل کر راکھ ہو گیا ہے۔ مجھے اس کی موت کا غم ہے۔ مگر اس میں میرا کیا قصور...... اس نے جو فلسفہ مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ میرے لئے بیکار تھا۔ شاید یہ فلسفہ اس پر پورا اترتا تھا۔ یقیناً اس کی موت اسی طرح لکھی ہوگی اور وہ اپنے اس انجام سے نہ بچ سکتا تھا۔'' پھر سانپ نے چند لمحوں کے توقف کے بعد اپنے آپ سے کہا۔ ''دیکھا تم نے ایک ہی پھنکار میں وہ جل کر راکھ ہو گیا۔''

سانپ رینگتا ہوا اب زرد غار کے پاس پہنچا۔ جہاں ایک کیمیا دان رہتا تھا۔ غار میں داخل ہونے سے پہلے سانپ نے اپنے آپ سے کہا۔

''مجھے اس ''رضا بر رضا'' کے فلسفے پر ایمان رکھنے والے بزرگ کے بجائے اس کیمیا دان سے ملنا چاہئے تھا۔'' کیمیا دان نے بڑی دلچسپی سے سانپ کی باتیں سنیں۔ جب اس نے بزرگ کے انجام کا واقعہ سنا تو وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ ''یہ فلسفی اور اصول پرست ایسے ہی مرا کرتے ہیں۔ مگر تم کوئی فکر نہ کرو جلد ہی میں تمہاری مشکل حل کر دوں گا۔ ہر زہر کا ایک تریاق ہوتا ہے۔ لیکن ذرا یہ احتیاط کرنا کہ تمہارا سر ادھر ادھر نہ ہلے۔''

کیمیا دان غار کے اندر ادھر ادھر گھومنے لگا۔ جیسے کسی چیز کی تلاش میں ہو۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''میں ابھی تمہاری مشکل کا حل تلاش کر لوں گا۔ فطرت بے لچک نہیں ہوتی۔ ہر چیز کا نعم البدل ہوتا ہے۔ ہر راز کی ایک کلید ہوتی ہے بس آدمی کا کام اتنا ہے کہ وہ اس کلید تک رسائی حاصل کرے۔''

وہ پھر فخر سے بولا۔ ''میری طرف دیکھو میں سکے کے ٹکڑوں پر ایسا عمل کرتا ہوں کہ وہ خالص سونا بن جاتا ہے۔ تمہارے چھوٹے اور معمولی سے مسئلے کا حل تلاش کرنا بڑی بات نہیں۔''

''آپ درست فرماتے ہیں۔'' سانپ نے کہا۔ ''مگر جب تک۔''

"جب تک کیا......؟" کیمیا دان نے کہا۔
"یہی نا کہ جب تک تمہارا سانس زہر میں رچا ہوا ہے اس وقت تک کوئی حل نہیں مل سکتا یہ معمولی بات ہے۔"
کیمیا دان نے ایک بوتل سے ایک گرم محلول نکال کر چمچے میں ڈالا۔ محلول سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ "یہ ایک زہر ہے جس میں تمہارے زہر کا توڑ موجود ہے۔ اس کو پی جاؤ۔"
"یہ تو بہت گرم دکھائی دیتا ہے۔ مجھے جلا دے گا۔" سانپ نے شک کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"یہ کیا......؟ گھبرا گئے۔ تجربے سے ڈرتے ہو، کمال ہے۔ پی جاؤ اسے۔ تمہیں اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ شاید تمہیں علم نہیں کہ تمہاری نسل کے سانپ لازوال اور ناقابل تسخیر ہوتے ہیں۔"
"آپ کیسے کہتے ہیں کہ میں لازوال ہوں، ناقابل تسخیر ہوں۔" سانپ نے پوچھا۔
"میرا خیال ہے کہ تم شرمیلے ہو۔ مگر نہیں۔ اصل میں تم ان پڑھ ہو۔ تمہیں کسی بات کا علم ہی نہیں ہے۔ سانپ پر کسی زہر کا اثر نہیں ہوا کرتا۔ کوئی جانباز ہی تمہاری موت کا سبب بن سکتا ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ وہ تمہاری زہریلی پھنکار سے محفوظ رہ سکے تو۔"
"واہ آپ نے خوب بات بتائی۔" سانپ نے خوش ہو گیا تھا۔
"اب وقت ضائع نہ کرو۔" کیمیا دان نے چمچہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ سانپ رینگتا ہوا چمچے کے اور قریب ہو گیا اور اس نے محلول کی چسکی لی۔ گرم زہر سے اس کے ہونٹ جل اٹھے۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے درد اور کرب سے اس نے اپنا سر پھیر کر کہا۔
"اس نے مجھے جلا دیا۔ آپ کہتے تھے یہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔" سانپ کے لہجے میں احتجاج تھا۔ "جواب کیوں نہیں دیتے؟" سانپ کی آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کی نمی دور ہوئی تو اس نے اپنے سامنے راکھ کی ایک ڈھیری دیکھی۔ پھر آنکھیں جھپک کر کہا۔

سوچیں اور......

☆......ہمیشہ خوشیوں کو ڈھونڈو کیونکہ غم بغیر ڈھونڈے مل جاتے ہیں۔

☆......عادتیں بے شک آپ کی ہوتی ہیں مگر آپ دوسروں کے لئے ہوتے ہیں۔

☆......بے موقع گفتگو انسان کو لے ڈوبتی ہے۔

☆......انسان عقل سے پہچانے جاتے ہیں، شکل سے نہیں۔

☆......زندگی کا مفہوم سمجھ میں آتے آتے ساری زندگی بیت جاتی ہے

☆......محبت پانا ہر کسی کے لئے ممکن نہیں مگر محبت پھیلانا سب کے لئے ممکن ہے۔

☆......انسان وہی ہے جو دوسروں کی فکر کرے، صرف اپنی پرواہ کرنے والا آدمی کہلاتا ہے۔

☆......دوسروں کی عیب جوئی کرنے سے پہلے خود کو ایک بار ضرور دیکھو کیونکہ تم میں بھی کوئی عیب ضرور ہوگا۔

☆......احساس کمتری اور احساس برتری دونوں ہی میں مبتلا انسان کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔

☆......کوئی شک نہیں کہ میرے کپڑے پھٹے پرانے ہیں لیکن یہ میرے اپنے ہیں۔

(ایس امتیاز احمد۔ کراچی)

”مجھے افسوس ہے کہ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔ مگر یہ آدمی بھی باعمل نہ تھا۔“ پھر فخر سے اپنے آپ سے کہا۔”عامل تو میں ہوں اس کی راکھ کی ڈھیری بزرگ کی راکھ کی ڈھیری سے بھی چھوٹی ہے۔“

سانپ غار سے نکل کر باہر آ گیا۔ تھوڑی دور ہی پہنچا تھا کہ اس نے گھوڑے پر سوار زرہ بکتر لگائے ایک جانباز کو دیکھا جس کے ہاتھ میں ایک چمک دار لوہے کا نیزہ تھا۔ جانباز نے گھوڑے کو آگے بڑھا کر نیزہ اوپر اٹھایا تو سانپ گڑگڑانے لگا۔

”جناب جانباز صاحب! ایک منٹ کے لئے رک جایئے۔ آپ نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے۔ میں ایک بے ضرر سانپ ہوں جو نرم و نازک جھاڑیوں اور پھولوں سے محبت کرتا ہے۔“

”اپنی موت کے لئے تیار رہو۔ میں ایک سیدھا سادھا آدمی ہوں۔ میرے ساتھ دلیل بازی نہ کرو۔“ جانباز نے سختی سے کہا۔

”جناب! مجھ پر اعتماد کیجیے۔ اگرچہ میرا سانس زہریلا ہے مگر میں قسم کھاتا ہوں کہ کسی درخت اور کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا میں۔“

”میں اعتماد نہیں کرسکتا۔ میں ایک بہادر انسان ہوں، تم ایک زہریلے سانپ ہو۔ تمہارے سانس میں زہر ہے۔ تمہارا زندہ رہنا سب کے لئے خطرناک ہے۔“

”مگر میں کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“

”یہ تو تم اب کہتے ہو۔“ جانباز نے کہا۔”تمہارے پاس وہ قوت ہے کہ تم جھاڑیوں اور پتھروں کو ایک پھنکار سے راکھ میں تبدیل کرسکتے ہو۔ میں نے ایک بزرگ انسان سے سن رکھا ہے کہ طاقت نشہ انسان کو پاگل کردیتا ہے۔ بس اب بہت باتیں ہوچکی ہیں۔“ یہ کہہ کر جانباز نے نعرہ لگایا۔ گھوڑے کو سانپ کی طرف بڑھایا۔ پھر وہ سانپ پر نیزے سے وار کرنے کے لئے جھکا۔ سانپ خوف زدہ ہوکر بھی کھڑا رہا۔ اس کی کھوپڑی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ اب بھی یہ کہنا چاہتا تھا کہ مجھ جیسے مرم خو سانپ کو مارنا ظلم ہے مگر وہاں سنتا ہی کون تھا...... سانپ نے سر اوپر اٹھایا۔

اچانک نیزہ نیلی چنگاریوں کی زد میں آ گیا۔ نیزے کو آگ لگ گئی۔ جانباز کی زرہ بکتر پہلے سرخ ہوئی پھر نیلی، پھر سفید اور پھر مٹیالی۔ گھوڑا چند منٹوں میں راکھ میں بدل گیا۔

”وہ مارا۔“ سانپ نے نعرہ لگایا۔”واہ میرا سانس پہلے سے زیادہ زہریلا ہوتا جارہا ہے۔“

سانپ نے راکھ کی ڈھیریاں دیکھی اور آگے کی طرف رینگتے ہوئے کہنے لگا۔”اس سے یہ ظاہر ہوا کہ میں اپنی سرشت اور فطرت سے خواہش کے باوجود نجات حاصل نہیں کرسکتا ہوں۔ تو پھر...... تو پھر......“ وہ فخر سے سر اٹھا کر شاہ بلوط کے تناور درخت کو دیکھنے لگا۔ اس نے اپنے رخساروں کو ہوا سے بھر کر پھلایا اور پھر پھونک ماری۔ ایک منٹ میں شاہ بلوط کا درخت جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا اس نے اپنے آپ سے کہا۔

”دیکھا میں نے شاہ بلوط کے تناور درخت کو ایک لمحے میں راکھ کردیا۔ میں تمام سانپوں سے قوی اور زہریلا ہوں اس جانباز نے طاقت کے نشے کے بارے میں کیا کہا تھا۔ کچھ بھی ہو۔ وہ تو راکھ ہوا۔ میں زندہ ہوں اب میں اس پہاڑ کو بھی راکھ بنادوں گا۔“

پہاڑ پر پہنچ کر سانپ نے نیچے نگاہ دوڑائی تو اسے کئی جانباز چلتے پھرتے نظر آئے۔ سانپ نے اپنے آپ سے کہا۔

”میں ان کے ساتھ بھی نمٹ لوں گا۔“

اپنی ٹھوڑی ایک پتھر پر رکھ کر وہ پرعزم نگاہوں سے ان جانبازوں کو دیکھنے لگا۔ جو اب اس کی پھنکار سے راکھ کا ڈھیر بننے والے تھے۔

لیکن سانپ کو قانون قدرت کا پتہ نہ تھا کہ ”موت کو بھی ایک دن فنا ہونا ہے۔“

آہنی گرفت

مریم قیصر۔ چکوال

رات کے اندھیرے میں ایک بکری کا بچہ منمنارھا تھا کہ نوجوان نے اسے اپنی گود میں اٹھالیا اور اسے لے کر آگے بڑھا مگر یہ کیا آہستہ آہستہ اس بچے کا وزن بڑھنے لگا کہ پھر اچانک دل دہلاتا واقعہ رونما ہوا

ایک ظالم چڑیل کی کہانی جو کہ اپنے پڑھنے والوں کو حیرت کے سمندر میں ڈال دے گی

میرا نام سلامت ہے اور پنجاب کے ایک چھوٹے سے شہر کے ایک گاؤں سے میرا تعلق ہے۔ پورے گاؤں میں میری بہادری کے چرچے تھے اور ہر نوجوان میرے جیسا بننا چاہتا تھا۔ کبڈی کے کھیل میں کوئی میرا ثانی نہیں تھا۔ گاؤں میں فصلوں کی کٹائی کا موسم تھا، میں نے ہر بار کی طرح اس بار بھی سب سے پہلے گندم کاٹ کر ساری ایک جگہ پر جمع کرلی تھی۔ میرے چند دوستوں نے میری مدد کی اور ہم نے تھریشر لگوالی۔

رات کا وقت تھا اور گندم کو گھر لے جانا ممکن نہ تھا۔ گاؤں میں کھیتوں میں سونا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی اور میں اس سے پہلے کئی بار کھیت میں اکیلا سوچکا تھا، میں گھر سے بستر اٹھالایا۔ سارا دن سخت محنت سے پالا پڑا تھا، اسلیئے بستر پر سر رکھتے ہی نیند کی دیوی بہت جلد مجھ پر مہربان ہوگئی اور میں سوگیا۔

رات کا پچھلا پہر تھا، ایک عجیب سے احساس کے زیراثر میری آنکھ کھل گئی تو میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے دوبارہ سونے کی کوشش کی لیکن سونہ سکا اس کی وجہ وہ عجیب سی آواز تھی جو اس ویرانے میں میری سماعت سے ٹکرائی تھی۔ میں نے حواس کو بحال کیا اور چارپائی سے اٹھ بیٹھا۔ رات خاصی روشن تھی یعنی چودھویں کی رات

تھی ہر منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ آواز پائل کی آواز تھی چھن چھن چھن۔ "اس ویرانے میں پائل کی آواز؟" میں حیرت زدہ ہوگیا۔

میں نے آواز کا موجب معلوم کرنا چاہا اور اس سمت چل پڑا جدھر سے آواز آ رہی تھی اور میں اس سمت چلتا گیا۔ وہ آواز تھوڑی دور ایک درخت کے پاس سے آ رہی تھی میں درخت کے پاس پہنچا تو ایک دہشت انگیز منظر میرے سامنے تھا۔ درخت کے پاس ایک عورت کھڑی تھی جس کے بال بہت لمبے تھے اور اس کا چہرہ ان بالوں کی وجہ سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کا لباس عجیب وغریب وضع کا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں کلہاڑی تھی اور میں محتاط انداز میں اس کی طرف بڑھا جب میں اس کے قریب پہنچا تو میری نظر اس کے پیروں پر پڑی۔ اس کے پیر الٹے تھے۔ میں نے بڑے بوڑھوں سے کئی بار سن چکا تھا کہ چڑیلوں کے پیر الٹے ہوتے ہیں لہٰذا میں فوراً پیچھے ہٹا تو اچانک اس کی آواز آئی۔ "سلامت میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔"

خوف کے مارے میرا حلق خشک ہوگیا۔ میں نے بڑے بڑے مقابلے جیتے تھے لیکن اس بار میرا مقابلہ انسان سے نہیں بلکہ ایک ماورائی مخلوق سے تھا۔ وہ میری طرف بڑھی اور میرے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی مجھے محسوس ہونے لگا کہ جیسے میرے قدم زمین میں دھنس گئے ہوں۔ مجھ سے ہلا تک نہیں جا رہا تھا اور میں ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹ پایا۔ اب اس مخلوق کا چہرہ میرے سامنے تھا وہ بہت حسین وخوبصورت تھی، اتنی خوبصورت کہ بیان سے باہر، اور اس کی دونوں آنکھیں سرخ روشن اور دہکتے ہوئے انگارے کی مانند تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ان سے روشنی منعکس ہو رہی ہو۔ اس نے جب اپنا سیدھا ہاتھ اوپر کو اٹھایا تو خدا کی پناہ اس کے ناخن بہت بڑے اور نوکیلے تھے۔

اچانک اس نے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھایا اور اس کے ناخن میرے سینے میں دل کی جگہ پر پیوست ہونے لگے۔ درد کی ایک شدید لہر میرے جسم میں پھیل گئی اس کا انداز بتا رہا تھا کہ جیسے وہ میرا دل نکالنا چاہتی ہو، میں نے اپنا کلہاڑی والا ہاتھ بلند کیا اور اس کے بازو پر دے مارا

تو چشم زدن میں اس کا بازو کٹ کر نیچے گر گیا اور وہ یک دم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے بازو کی طرف غور سے دیکھا اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ بازو دوبارہ اس کے جسم سے جڑ گیا۔

اس نے غصے سے میری طرف دیکھا اور اس کے دونوں بازو لمبے ہوگئے، اس نے میری گردن دبوچ لی اور پھر پوری قوت سے مجھے ایک جانب اچھال دیا۔ میں دھب سے نیچے گرا، کہ اتنے میں وہ دوڑتی ہوئی میرے قریب آئی اور میرے سینے پر سوار ہو کر اپنے تیز ناخنوں سے میرے سینے کے اوپری حصے کو جیسے کھرچنے لگی۔

میں اس چڑیل کے سامنے بے یار و مددگار پڑا تھا۔ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ وہ طاقت میں مجھ سے کئی گنا زیادہ ہے اور میں جسمانی طاقت میں اس سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اس لمحے میں نے سچے دل سے اپنے اللہ کو یاد کیا جس کے قبضہ قدرت میں تمام انسان، تمام جنات اور دیگر مخلوقات ہیں اس وقت اللہ کے علاوہ کوئی بھی میری مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میرے منہ سے بابلند نکلا۔ "اللہ اکبر۔ اللہ اکبر" اور پھر ساتھ ہی بلند آواز سے میں نے آیت الکرسی کا ورد کرنا شروع کر دیا۔

اس چڑیل نے مجھے روکنے کی کوشش کی اور مجھے زخمی کرتی رہی لیکن کلام الٰہی کے سنتے ہی اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ دور جا گری اور دھوئیں میں تحلیل ہونے لگی لیکن جاتے جاتے اس کی آواز سنائی دی۔ "سلامت آج تو میرے ہاتھوں بچ گیا بلند آواز کی وجہ سے جو تو پڑھ رہا تھا اگر وہ نہ پڑھتا تو تو مجھ سے ہرگز بچ نہیں سکتا تھا۔" اور پھر اس کی آواز آنا بند ہوگئی۔

مجھ پر لرزہ طاری تھا، خیر کچھ دیر بعد میرے حواس بحال ہوئے تو میں فوراً گھر جانے والے راستے پر چلنے لگا۔ میرے زخموں سے خون رس رہا تھا بڑی مشکل سے ڈھتے پڑتے گھر پہنچا۔ میری غیر ہوتی حالت دیکھ کر گھر والے ششدر رہ گئے انہوں نے بہت کچھ پوچھا لیکن میں نے ادھر ادھر کی باتوں سے ٹال دیا اور اصل بات چھپا گیا۔

میں تین دن بخار کی حالت میں رہا اور اس دوران وہ

خوف ناک عفریت روز میرے خواب میں مجھے دہشت زدہ کرتی رہی۔ میرا ہر پل اس کے خوف میں کٹتا تھا کبھی کبھی ان زخموں میں شدید درد کی کیفیت پیدا ہوتی اور میں چیخنے چلانے لگتا، ایسے لمحات میں مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بلا یہیں کہیں میرے قریب ہے۔

ایک دن رات کے وقت میری آنکھ کھلی اور میں نے کروٹ بدلی تو اس کی بھیانک صورت میرے سامنے آ گئی، میں نے فوراً آنکھیں بند کرلیں پس پھر چند لمحوں بعد جب میں اپنی آنکھیں کھولیں تو وہاں صرف اندھیرے کا راج تھا میں نے اس واقعہ کو اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

اس واقعہ کو ایک سال کا عرصہ بیت گیا۔ میرے زخم مندمل ہو چکے تھے اور وہ واقعہ میرے ذہن سے تقریباً محو ہو چکا تھا۔ اسی دوران میری پھوپھی زاد سے میری شادی ہوگئی اور میرے ہاں ایک ننھا سا بیٹا سلیمان پیدا ہو چکا تھا۔

ایک دن مجھے میرے دوست رضا مراد کی شادی کا بلاوا آیا۔ تین دن بعد شادی تھی میں خوشی خوشی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہوگیا اور ایک دن پہلے اس کے گاؤں پہنچ گیا۔ ولیمہ والے دن اس گاؤں سے نکلنے میں مجھے شام ہوگئی اور آہستہ آہستہ اندھیرا پھیلنے لگا۔ میں نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔ گاؤں سے تھوڑا دور اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی اور بھی ہے جو میرے پیچھے پیچھے چل رہا ہے، میں نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا تو کوئی بھی نہیں تھا میں نے دوبارہ اپنے قدم آگے بڑھانا شروع کر دیئے۔

تھوڑی دور آگے جانے کے بعد وہ احساس دوبارہ ہوا، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک بکری کا چھوٹا سا بچہ میرے پیچھے پیچھے چلتا آ رہا تھا اب اس بچے نے بولنا شروع کر دیا تھا اسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ چاندنی رات، چھوٹا سا سفید اور بہت ہی خوب صورت بچہ وہ بولتا ہوا دوڑ کر میرے قریب آ گیا تو اچانک مجھے اس پر پیار آ گیا اور میں نے اسے گود میں اٹھا کر سوچنے لگا جانے کس نے اس کو رات میں چھوڑ دیا، اور کوئی نظر بھی نہیں آ رہا۔" خیر میں نے اسے گود میں لے کر آگے کو بڑھنے لگا۔

لیکن ابھی میں تھوڑا ہی دور چلا تھا کہ مجھے اس کا وزن کچھ زیادہ ہوتا محسوس ہوا تو میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر جھٹک دیا لیکن اس کا وزن متواتر بڑھتا رہا اور پھر ایک وقت آیا کہ اس کا وزن......

اور میری چھٹی حس اچانک بیدار ہوگئی تو جھٹ میں نے اسے زمین پر پٹخ دیا اسے زمین پر پٹخنا تھا کہ اچانک اس میں سے دھواں اٹھنے لگا۔

اور جب دھواں چھٹا تو اس جگہ ایک مکروہ صورت چڑیل اپنی قہر آلود نظروں سے مجھے گھور رہی تھی، وہ وہی تھی جس سے میرا ایک سال قبل سامنا ہوا تھا۔ میں آج نہتا تھا میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو انتقام کا جذبہ صاف نظر آیا۔ وہ بولی۔ "سلامت پچھلی بار تو تو مجھ سے بچ نکلا تھا مگر آج ایسا نہیں ہوگا۔"

"میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تم میری جان لینا چاہتی ہو؟" میں نے کہا۔ "یاد ہے تجھے، تیرے کھیتوں کے کنارے پیپل کا ایک درخت تھا، اس درخت پر میرے ساتھیوں کا بسیرا تھا، ہم وہاں ہنسی خوشی وقت گزار رہے تھے کہ تو نے وہ درخت کٹوا دیا اور ہم سے ہمارا ٹھکانہ چھین لیا، میں اسی جرم کی پاداش میں تیرا خاتمہ کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ میری طرف بڑھی اور مجھے گردن سے پکڑ لیا۔ اس کی آہنی گرفت اتنی سخت تھی کہ میری سانس رکنے لگی۔ میں نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے اور اسی کوشش میں اس کی چوٹی میرے ہاتھوں میں آ گئی، میں نے اس کو زور سے کھینچا تو وہ بلبلا اٹھی اور چیخنے لگی پھر میں نے پوری کوشش کی اور زور آزمائی جاری رکھی اور پھر ساتھ ہی ساتھ آیت الکرسی کا ورد کرنے لگا اور اس پر پھونک ماری تو دیکھتے ہی دیکھتے اس چڑیل کو آگ لگ گئی اور پلک جھپکتے ہی وہ جل کر بھسم ہوگئی۔ اس کی کربناک آوازیں قرب و جوار کو دہلا گئیں۔

آج اس واقعہ کو گزرے پچیس سال ہو گئے ہیں۔ لیکن وہ واقعہ آج تک میرے ذہن سے محو نہیں ہو سکا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس کے بعد ایسا کوئی واقعہ میرے ساتھ پیش نہیں آیا۔

روح کی بے چینی

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

ایک روح کی دل شکستہ روداد جو کہ پچیس سال تک سسکتی اور بلکتی رہی، اشارے اشارے سے لوگوں کو حقیقت سے روشناس کراتی رہی مگر کسی نے بھی اس کی ایک نہ سنی اور پھر آخر کار اس نے اپنا انتقام پورا کرلیا۔

دل و دماغ اور ذہن پر اپنا سکتہ بیٹھاتی اور رونگٹے کھڑے کرتی عجیب و غریب پر تحیر خوفناک کہانی

"**جہاں** تک ارواح کے وجود کا تعلق ہے میں اس پر پورا یقین رکھتا ہوں۔" کامران شامی نے نووارد ملاقاتی کا بیان سننے کے بعد کہا۔ "لیکن ضعیف الاعتقاد لوگوں کی طرح ارواح کی ماورائی قوتوں اور ناقابل فہم شعبدہ بازیوں کو تسلیم نہیں کرتا۔"

اس کے ملاقاتی کا نام ریاض حسین تھا، وہ اپنی خوب صورت بیوی ثروت کے ہمراہ اس کے پاس ایک ایسا مسئلہ لے کر آیا تھا جو بہت حد تک ارواح کی روایتی کہانیوں سے ملتا جلتا تھا۔

کامران شامی ایک تجربہ کار وکیل ماہر سراغ رساں اور نفسیاتی و سفلی علوم کا مستند عالم تھا۔ لوگ اس کے پاس قانونی، ازدواجی، نفسیاتی اور پراسرار جرائم کے مسائل حل کرانے کے لئے آتے تھے۔

"ریاض صاحب اس دنیا میں کوئی بات انہونی نہیں۔" شامی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تو بھی میرا خیال ہے کہ آج کے سائنسی دور میں شاید ہی کوئی ایسی شے ہو جو انسان کے قبضہ تصرف سے باہر رہ گئی ہو۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اگر جن بھوت وغیرہ قسم کی کوئی مخلوق اس کرۂ ارض پر موجود بھی ہو تو بلاشبہ وہ انسان کی بڑھتی ہوئی قوت تسخیر سے خائف ہو کر کسی دوسرے سیارے کی طرف چلی گئی ہوگی۔ یقین کیجئے انسان سے بڑھ کر اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔"

"آج سے کچھ عرصہ قبل میں بھی ان باتوں کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔" ریاض حسین نے کہا۔ "لیکن جناب حال ہی میں ہمارے ساتھ جو واقعات پیش آئے ہیں ان کے سبب سے میں اپنے نظریات پر نظرثانی کرنے پر مجبور ہوگیا، میری بیوی ان واقعات کی چشم دید گواہ ہے۔ نظریاتی بحث سے قطع نظر امر واقع یہ ہے کہ صورتحال ہماری برداشت سے باہر ہوگئی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اختصار سے ان واقعات کو آپ کے سامنے بیان کردوں۔"

"ضرور، ضرور۔" شامی نے کہا۔ "آپ بلا جھجک اپنا مسئلہ پیش کرسکتے ہیں۔"

"ہم وادی کاغان کے ایک چھوٹے سے گاؤں خاصکوٹ میں رہتے ہیں۔" ریاض حسین نے قدرے تامل کے بعد کہنا شروع کیا۔

"یہ علاقہ ایبٹ آباد سے تقریباً ساٹھ میل شمال میں واقع ہے۔ خاصا پرفضا اور صحت افزا مقام ہے۔ چاروں طرف سے سرسبز و شاداب پہاڑیوں میں گھرا ہوا ہے۔ آبادی بمشکل ایک ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ دو

سال قبل ہم نے ایک پرانی وضع کا پختہ مکان خریدا ہے جو زریں منزل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مکان گاؤں سے تقریباً سوگز باہر سرسبز درختوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس میں تین کمرے، ایک باورچی خانہ اور دو طرفہ برآمدہ ہے۔ مکان چونکہ سستا مل رہا تھا اس لئے ہم نے فوراً خرید لیا۔ مکان سے ملحقہ دو کنال کا ایک قطعہ بھی ہے جس میں چھوٹا سا باغیچہ بنا ہوا ہے۔ مجموعی اعتبار سے مکان اور اس کا ماحول نہایت حسین اور دلفریب ہے۔

پہلے سال گرمیوں کا موسم بہت اچھا گزر گیا۔ لیکن موسم سرما کا آغاز ہوتے ہی ہم نے عجیب قسم کی بے چینی اور گھبراہٹ محسوس کرنی شروع کردی، ابتدا میں ہم نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ لیکن بتدریج اس بے چینی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بے خوابی کی شکایت ہونے لگی۔ اکثر رات کو ڈراؤنے خواب دکھائی دینے لگے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نادیدہ ہستی ہم سے نفرت کا اظہار کر رہی ہے، دھمکیاں دے رہی ہے، غصہ اور دشمنی کا اظہار کر رہی ہے اور ''انتقام انتقام'' پکار رہی ہے۔

سردی میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس پراسرار ہستی کے بغض وعناد میں بھی اضافہ ہونا شروع ہوگیا۔ جب موسم کی پہلی برف باری ہوئی تو یقین کیجئے اس کیفیت میں ناقابل بیان شدت پیدا ہوگئی۔ گھبراہٹ، خوف اور ذہنی کھنچاؤ نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔

ہم کئی راتوں تک اچھی طرح نہیں ہوسکے، بالآخر ہم نے مکان چھوڑ دینے کا ارادہ کرلیا لیکن کچھ دنوں کے بعد موسم قدرے گرم ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی ہماری گھبراہٹ بھی جاتی رہی اور ہم نے آرام کی نیند سونا شروع کردیا۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ ہماری ساری پریشانی کا سبب سردی اور بے خوابی تھی۔ یعنی سردی کے باعث بے خوابی کی شکایت ہوئی اور بے خوابی کی وجہ سے ہم گھبراہٹ اور توہم پرستی کا شکار ہوگئے، موسم گرما کے آغاز کے ساتھ ہی گھبراہٹ اور خوف کی کیفیت بالکل ختم ہوگئی بلکہ بھولی بسری بات ہوگئی۔

اب موسم سرما میں ایک بار پھر ہمارے دلوں پر وہی بے چینی، بے خوابی، اور گھبراہٹ پیدا ہونی شروع ہوگئی۔ سردی میں اضافے کے ساتھ ساتھ یہ کیفیت بھی بتدریج بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ہم یہ یقین کرنے پر مجبور ہوگئے کہ اس کیفیت کے پس پشت ضرور کوئی پراسرار ہستی کارفرما ہے جسے عام طور پر جن یا روح وغیرہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے پھر آج سے چند روز پیشتر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہمارے یقین کو حق الیقین میں تبدیل کردیا۔

یہ گزشتہ جمعرات کی بات ہے اس روز بڑے زوروں کی برف باری ہورہی تھی۔ میں اور ثروت سرشام کھانے سے فارغ ہوکر بستر پر لیٹ گئے۔ تاہم نیند کا نام ونشان نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد برف باری کے ساتھ ساتھ تیز جھکڑ بھی چلنا شروع ہوگیا۔

دفعتاً ہمارے کانوں میں ایک عجیب سی آواز آئی۔ وہ آواز گو مبہم اور واضح نہ تھی تاہم غایت درجہ اثر انگیز اور پرسوز تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بچہ سسک سسک کر رو رہا ہے۔

شروع میں ہم نے اس آواز کو تیز ہوا کی آواز قیاس کرکے نظر انداز کردیا۔ مگر دھیرے دھیرے وہ نمایاں ہوتی چلی گئی۔ پھر دفعتاً کمرے کا درجہ حرارت گرنا شروع ہوگیا۔ حالانکہ انگیٹھی میں آگ برابر سلگ رہی تھی۔ تمام کھڑکیاں دروازے بدستور بند تھے۔ پر سردی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی چلی جارہی تھی۔ وہ رات گزشتہ تمام راتوں سے زیادہ اذیت ناک تھی۔ انگیٹھی میں جلنے والی آگ کی مدھم روشنی کمرے کی فضا میں لرز رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی نادیدہ شے چاروں طرف سے ہم پر دباؤ ڈال رہی ہے۔ ہمارے خوف اور ذہنی کھنچاؤ میں تسلسل اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

سسکیوں کی آواز نمایاں طور پر سنائی دے رہی تھی۔ وہ دردناک آواز پوری فضا پر محیط معلوم ہوتی تھی۔

برف باری اور جھکڑ کی آواز کسی ماتمی ساز کی

مانند اس آواز کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔ ناگہاں میں نے خواب گاہ سے ملحقہ کمرے کے وسط میں ایک دھندلا سا روشن غبار نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ ہولے ہولے جنبش کرتا ہوا فرش زمین سے بلند ہو رہا تھا۔ ہم ساکت و جامد آنکھیں پھاڑے اس ناقابل یقین منظر کو دیکھنے لگے۔ وہ روشن غبار ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک شکل اختیار کرنے لگا۔ ایک انسانی شکل!

چند ساعتوں کے بعد وہ غبار ایک مکمل انسانی جسم کا خاکہ اختیار کر چکا تھا۔ جس انداز میں وہ گردش کرتا اور بل کھاتا دکھائی دیتا تھا اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انتہائی غصے اور طیش کے عالم میں ہے۔ اب یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ تمام بغض و عناد اور نفرت و حقارت کا منبع یہی پراسرار ہستی تھی۔

دفعتاً اس کا سر ٹھوس شکل اختیار کرنے لگا چہرے پر کربناک تاثرات نظر آنے لگے جن میں شدید غیض و غضب احتجاج اور نفرت پائی جاتی تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے منہ کھولا اور ایک دردناک چیخ بلند کی جس کی آواز زمین سے آسمان تک گونجتی چلی گئی۔ اس کے فوراً بعد وہ دھندلا غبار تاریکی میں تحلیل ہو گیا۔"

یہاں تک بیان کرنے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔

چند لمحوں تک کمرے میں مکمل خاموشی چھائی رہی۔

"واقعی حیرت انگیز تجربات ہے۔" شامی نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ "بیگم ثروت کیا آپ اس معاملے میں کچھ کمی بیشی کرنا چاہیں گی؟"

"ریاض صاحب نے مکمل واقعہ بیان کر دیا ہے۔" ثروت نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ "وہ دھندلا غبار جسم میں خاصا بڑا تھا۔ کم از کم آٹھ فٹ اونچا ہو گا اور جیسا کہ ریاض صاحب نے بیان کیا چہرے پر نظر آنے والے تاثرات انتہائی خوفناک تھے۔ تاہم ذاتی طور پر میرا احساس یہ ہے کہ وہ کسی دس سالہ بچے کا چہرہ تھا۔ اور وہ چیخ......! اوہ میں تا زندگی اس پر سوز چیخ کو نہیں بھلا سکوں گی......"

"کیا یہ شے اس سے پہلے بھی کبھی دیکھنے میں آئی تھی۔ آپ نے برف باری اور جھکڑ کا ذکر کیا تھا۔" شامی نے کہا۔

"غالباً یہ جھکڑ پہلی مرتبہ چلا تھا۔"

"گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس پراسرار منظر کا جھکڑ سے کوئی تعلق ہے۔" شامی نے کہا۔

"محض ایک قیاس ہے۔ حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" ریاض نے کہا۔ "یہ علاقہ یہاں سے کتنی دور ہے؟"

تقریباً ایک سو تیس میل...... جس میں ساٹھ میل کا پہاڑی راستہ بھی شامل ہے۔"

"بظاہر یہ معاملہ میرے دائرہ کار سے باہر ہے۔" شامی نے کہا۔

"شامی صاحب اگر آپ نے انکار کیا تو ہمیں بہت مایوسی ہو گی۔" ثروت نے کہا۔

"میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ اس کیس میں کچھ باتیں ایسی ہیں جو براہ راست میرے نظریات سے ٹکراتی ہیں۔ اگر معاملہ ویسا ہی ثابت ہوا جیسا آپ نے بیان کیا ہے تو مجھے یقیناً اپنے نظریات میں کچھ تبدیلی کرنی پڑے گی۔"

"گویا آپ نے یہ کیس منظور کر لیا ہے۔" ثروت نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "آپ کی فیس؟"

شامی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "فیس کے بارے میں کوئی تردد نہ کیجئے۔ اس میں حسب ضرورت کمی بیشی کی جا سکتی ہے۔" پھر اس نے ایک کاغذ اور قلم ریاض حسین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس پر زریں منزل کے سابقہ مالک کا نام اور پتہ تحریر کر دیں۔"

"سابقہ مالک کا نام عباس گل ہے۔" ریاض نے کاغذ پر پتہ لکھتے ہوئے کہا۔ "آج کل وہ ایبٹ آباد میں رہتا ہے۔"

"ممکن ہے دو تین روز تک میں خاصکوٹ میں آ کر آپ سے ملاقات کروں۔"

''میں آپ کو ساتھ ہی لے کر جانا چاہتا تھا۔''

ریاض نے کہا۔

''میں پہلے عباس گل سے ملوں گا۔ پھر خاص کوٹ آؤں گا۔''

ایبٹ آباد کی گلیاں اور بازار نسبتاً سنسان پڑے تھے۔ قرب و جوار کی پہاڑیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ شمال کی طرف سے ٹھٹھرا دینے والی ہوائیں چل رہی تھیں۔ عباس گل کا مکان شہر کے گنجان علاقے میں واقع تھا۔ کامران شامی نے اپنی گاڑی گلی کے کونے پر کھڑی کر دی اور ایک ایک مکان دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے دارالحکومت سے فوکس ویگن کے ذریعے وہاں پہنچا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ مطلوبہ مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ پھر دروازے پر دستک دینے کے بعد وہ انتظار کرنے لگا۔

دروازہ کھولنے والا عباس ہی تھا۔ اس کا قد چھوٹا، جسم مضبوط اور آنکھیں سیاہ تھیں، جن میں خاص قسم کی چمک پائی جاتی تھی۔ داہنے ہاتھ کی بڑی انگلی خود کار طریقے پر گھنی مونچھوں کا زاویہ درست کرنے میں مصروف تھی۔ مجموعی طور پر وہ خاصا تندخو نظر آتا تھا۔ ابتدائی تعارف کے بعد وہ شامی کو بیٹھک میں لے آیا۔ پھر گرم گرم قہوہ پیش کرنے کے بعد کہا۔

''آپ زریں منزل کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔''

''دراصل ہمارے ملک میں توہم پرستی بہت پائی جاتی ہے۔'' شامی نے قہوے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ''زریں منزل کا موجودہ مالک میرے پاس ایک ایسا مسئلہ لے کر آیا ہے جس میں بظاہر بھوتوں کا عمل دخل معلوم ہوتا ہے۔ تاہم میں ایک دوسرے انداز سے اس مسئلہ پر غور کر رہا ہوں۔''

''حیرت انگیز بات ہے۔'' عباس گل نے کہا۔ ''یہ مکان میرے پاس تقریباً تین سال تک رہا ہے مگر میری کسی بھوت سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

''آپ نے یہ مکان کس سے خریدا تھا؟''

''دراصل یہ مکان ٹاؤن کمیٹی کی ملکیت تھا اور عرصہ دراز سے خالی پڑا تھا۔'' عباس گل نے کہا۔ ''میں نے تفریح اور شکار وغیرہ کے لئے اسے خرید لیا تھا اور اپنے دوستوں کے ہمراہ اکثر وہاں ٹھہرا کرتا تھا۔ تاہم میں نے کبھی اسے رہائش کے لئے استعمال نہیں کیا۔''

''کیا آپ سردیوں میں بھی وہاں ٹھہرا کرتے تھے؟''

''صرف ایک مرتبہ سردیوں میں وہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تھا۔''

''اس دوران آپ کو بے خوابی یا ذہنی کھنچاؤ تو محسوس نہیں ہوا؟''

''میرے ساتھ تین اور دوست بھی تھے۔ ہم نے صرف دو راتیں وہاں گزاری تھیں۔ جہاں تک بے خوابی کا تعلق ہے اس کی شکایت ضرور ہوتی تھی کیونکہ ہم چاروں ایک ہی کمرے میں سوتے تھے اس لئے جگہ کی تنگی کے باعث اچھی طرح نہیں سو سکے تھے۔''

''مکان کے اندر کوئی تہہ خانہ بھی ہے؟''

''نہیں......کیوں؟''

''یونہی پوچھ لیا۔'' شامی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے قہوے کا بہت بہت شکریہ۔''

زریں منزل پر خاموشی چھائی تھی۔

کامران شامی نے اپنی فوکس ویگن صدر دروازے کے سامنے کھڑی کر دی اور کھڑکی سے آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ ہر طرف سفید سفید برف کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کے ساتھ اس کا دیرینہ دوست جوزف برینن بھی تھا۔ قدرے توقف کے بعد دونوں گاڑی سے باہر آ گئے۔ جوزف نے بھاری اور پرانی وضع کے دروازے پر دستک دی۔ ایک منٹ کے بعد دروازہ کھلا اور ریاض حسین نے باہر جھانک کر دیکھا۔ اس کے پیچھے ثروت بھی کھڑی تھی۔ شامی کو دیکھ کر ان کے چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

آتش دان کے سامنے بیٹھ کر تھوڑی دیر تک رسمی گفتگو ہوتی رہی۔ ثروت نے کافی بنا کر انہیں پیش کی پھر

اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے شامی نے پوچھا۔
"سنایئے رات کیسی گزری؟"
"حسب معمول بے خوابی کی شکایت رہی۔" ریاض نے جواب دیا۔ "لیکن نسبتاً آرام رہا۔ کیونکہ گزشتہ رات برف باری نہیں ہوئی۔"
"عمارت کے اندر کوئی تہہ خانہ بھی ہے؟" شامی نے پوچھا۔
"تہہ خانہ تو کوئی نہیں۔" ثروت نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ نے ابھی تک ہمارے بیان کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔"
"ایسی بات نہیں۔ بلکہ میں اس معاملے کی کوئی قابل قبول توجیہہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"
"یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ آپ بذات خود مکان کا جائزہ لے لیں۔" ریاض نے کہا۔
"میں یہ بات کہنے ہی والا تھا۔" شامی نے کہا۔
پھر وہ دونوں ریاض کی رہنمائی میں مکان کے مختلف حصوں کو دیکھنے لگے۔ "مکان تو بالکل سیدھا سادا ہے۔" جوزف نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی خفیہ گوشہ یا کمرہ نہیں۔ اگر کسی بھوت یا روح سے ملاقات نہ ہوئی تو سخت مایوسی ہوگی۔"
"ریاض صاحب کیا یہ ممکن ہے؟" شامی نے کہا۔
"کہ آج کی رات آپ کسی دوست یا عزیز کے ہاں قیام کرنے کا انتظام کر لیں۔ ہم تنہا یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ میں اور جوزف۔"
"جیسے آپ مناسب سمجھیں۔" ریاض نے جواب دیا۔
"میرے خیال میں یہ بات بالکل نامناسب ہے۔" جوزف نے کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ وہ بھوت بھی ان کے ساتھ ہی چلا جائے۔"
تب..... شامی نے پوری سنجیدگی سے کہا۔ "اس گتھی کو سلجھانا مزید آسان ہو جائے گا۔"
"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" ریاض نے حیرت سے کہا۔

"یہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ پُراسرار روح کا تعلق مکان سے نہیں آپ کی ذات سے ہے۔"
ریاض اور ثروت چونک کر شامی کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں پر خوف کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ تاہم انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس وقت وہ خواب گاہ سے ملحقہ کمرے میں کھڑے تھے۔
"یہ وہ کمرہ ہے جس میں دھندلا غبار نظر آیا تھا۔" ریاض نے کہا۔
"کیا آپ ٹھیک ٹھیک اس جگہ کا تعین کر سکتے ہیں جہاں سے وہ غبار اٹھنا شروع ہوا تھا۔"
"تقریباً اس جگہ سے....." ریاض نے ایک جگہ پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔
شامی نے فرش پر بچھا ہوا قالین اس جگہ سے ہٹا دیا اور اکڑوں بیٹھ کر فرش کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک اس نے چونک کر کہا۔
"جوزف اس فرش کو ذرا غور سے دیکھو۔ کیا اس میں تمہیں کوئی عجیب بات نظر آتی ہے؟"
جوزف آنکھیں جھپکتے ہوئے فرش کو گھورنے لگا۔
"میرا خیال ہے کہ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔" اس نے کہا۔ "یہ ایک عام سا فرش ہے۔"
"واپسی پر تمہاری آنکھیں ٹیسٹ کروانی پڑیں گی۔" شامی نے کہا۔ "کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ فرش کا یہ حصہ باقی فرش سے مختلف ہے۔ واضح طور پر اسے دوبارہ توڑ کر بنایا گیا ہے۔" ریاض اور ثروت بھی اس حصے کو آنکھیں پھاڑ کر گھورنے لگے۔
"آپ کے پاس ہتھوڑی یا اس قسم کی کوئی چیز ہوگی؟" شامی نے ریاض کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"کیا آپ فرش توڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" ثروت نے کہا۔
"فی الحال نہیں۔" شامی نے جواب دیا۔ "تاہم ہوسکتا ہے کہ اس کی ضرورت بھی پڑ جائے۔"
تھوڑی دیر بعد ریاض نے ایک ہتھوڑی لا کر شامی کے ہاتھ میں تھما دی۔

شامی نے ہتھوڑی سے فرش کے مختلف حصوں کو بجا کر دیکھنا شروع کر دیا پھر وہ سیدھا کھڑا ہو کر ریاض کو گھورنے لگا۔

''آپ نے کہا تھا کہ اس عمارت میں کوئی تہہ خانہ نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کیا آپ نے نقشہ دیکھا تھا یا محض قیاس سے یہ بات کہی تھی؟''

''نقشہ تو نہیں دیکھا تھا'' ریاض نے جواب دیا۔ ''اور میں سمجھتا ہوں کہ نقشہ محفوظ بھی نہیں رہا ہوگا۔''

تھوڑی دیر کے بعد چاروں ڈرائنگ روم میں آ کر آتش دان کے سامنے بیٹھ گئے، کئی لمحوں تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ ہر شخص کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

''موسم تیزی سے بدل رہا ہے۔'' شامی نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''طوفان کی آمد کے آثار نظر آ رہے ہیں۔''

ثروت اور ریاض کے چہرے پر خوف کی لہر دوڑ گئی۔ دونوں شامی کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے باہر دیکھنے لگے۔ شامی نے مزید کہا۔

''میرا خیال ہے کہ اب آپ کو اپنے کسی دوست کے ہاں جانے کی تیاری شروع کر دینی چاہئے۔ اگر طوفان شروع ہوگیا تو جانا مشکل ہو جائے گا۔''

نصف گھنٹے کے بعد ریاض اور ثروت اپنے ایک عزیز کے گھر چلے گئے۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر شامی اور جوزف آتش دان کے سامنے بیٹھ کر کافی پینے لگے۔ باہر ہلکی ہلکی برف باری شروع ہوگئی تھی اور ہوا بتدریج طوفان کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔ ایک طویل خاموشی کے بعد جوزف نے کہا۔

''دوست سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ مجھے اپنا دل بیٹھتا محسوس ہو رہا ہے۔''

''کچھ گھٹن سی محسوس ہو رہی ہے۔ شاید کمرے میں آکسیجن کی کمی واقع ہو رہی ہے۔'' شامی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں خفیف سی گھبراہٹ شامل تھی۔

''ممکن ہے کھڑکی کھولنے سے کچھ فرق پڑ جائے۔'' پھر وہ کھڑکی کے قریب جا کر چند لمحوں تک باہر گرتی ہوئی برف کو دیکھتا رہا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے کھڑکی کھول دی۔ اس کے ساتھ ہی یخ بستہ اور تیز ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی اندر داخل ہونا شروع ہوگئی۔ ایک لمحے کے بعد اس نے دوبارہ کھڑکی بند کر دی۔

''شاید میرا خیال غلط ہے۔'' اس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''اس گھٹن کا سبب کچھ اور ہے۔''

معاً ایک مدھم آواز، جو کسی پرسوز آہ سے ملتی جلتی تھی، ہوا کے دوش پر آتی محسوس ہوئی۔

''شامی!'' جوزف نے تیزی سے کہا۔ ''یہ آواز کیسی تھی؟''

''ٹھہرو ٹھہرو۔'' شامی نے آواز کی طرف کان لگاتے ہوئے کہا۔

ایک ثانیے کے بعد دوبارہ آواز سنائی دی۔ جوزف کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ اس نے اپنا آٹومیٹک پستول نکال لیا اور اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

''میرے دوست یہ کوئی سازش ہے، سازش۔'' اس نے چیخ کر کہا۔

''پستول واپس رکھ لو۔'' شامی نے قدرے سختی کے ساتھ کہا۔ ''سازش کرنے والے آہیں نہیں بھرا کرتے۔''

جوزف نے پستول واپس رکھ دیا اور نڈھال ہو کر کرسی پر گر گیا۔ باہر شدید برف باری ہو رہی تھی اور تیز ہواؤں نے جھکڑ کی صورت اختیار کر لی تھی۔

''شامی۔ اس خاموشی سے مجھے وحشت ہو رہی ہے۔'' جوزف نے کہا۔ ''خدا کے لئے کچھ بات کرو۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔''

''جوزف، ذرا سوچو کہ اگر اس وقت ہم نے اس ذہنی کھنچاؤ کا تجزیہ نہ کیا تو کبھی حقیقت نہیں جان سکیں گے۔ اس لئے اپنے حواس کو کنٹرول میں رکھو اور اس کیفیت کی کوئی قابل فہم توجیہہ معلوم کرنے کی کوشش کرو۔''

سسکی کی آواز پھر سنائی دی۔ اب وہ آواز زیادہ

واضح تھی۔ کچھ وقفے کے بعد وہ آواز مسلسل سنائی دینی شروع ہوگئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ پوری کائنات سسکیاں لے رہی ہے۔ اچانک شامی نے جوزف کا بازو پکڑلیا۔

''جوزف ادھر دیکھو۔'' اس نے ملحقہ کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہاں پر زرد رنگ کا دھندلا سا غبار کمرے کی تاریکی میں چمکتا نظر آرہا تھا۔ وہ فرش سے موم بتی کے مدھم شعلے کی مانند لرزتا ہوا ہولے ہولے بلند ہورہا تھا۔ اوپر اٹھنے کے ساتھ ساتھ اس کے حجم میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ وہ مخصوص انداز میں جنبش کرتا اور بل کھاتا نظر آرہا تھا۔ کم وبیش آٹھ فٹ تک بلند ہونے کے بعد اس کا بڑھنا اور پھیلنا رک گیا۔ اب وہ ایک انسانی جسم کا خاکہ اختیار کرچکا تھا۔

شامی اور جوزف زمان و مکان کی حدود و قیود سے بے خبر کسی سحر زدہ انسان کی مانند اسے گھور رہے تھے۔ اس مافوق الفطرت وجود کے بل کھاتے ہوئے جسم سے نفرت وحقارت اور انتقام وعناد کی چنگاریاں نکل کر دونوں کے دل وجود پر حاوی ہوتی جارہی تھیں۔ معاً اس کے چہرے پر کسی جیتے جاگتے انسان کے نقوش نمایاں ہوگئے۔ اس کے چہرے پر انتہائی کرب واذیت کے تاثرات پائے جاتے تھے۔ پھر اس نے اپنا منہ آسمان کی جانب بلند کرکے ایک دردناک چیخ بلند کی۔ اس کی آواز ساری فضا میں گونجتی سنائی دی۔ پھر وہ غبار تیزی کے ساتھ تاریکی میں تحلیل ہوکر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

شامی اور جوزف نے خوفزدہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ نڈھال سے ہوکر اپنی اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ دونوں ہی اس پراسرار غبار کے بارے میں سوچ رہے تھے......

☆......☆......☆

معمر ٹاؤن کلرک نے چشمہ درست کرتے ہوئے شامی اور جوزف کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے شامی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''جناب اس مکان کی تفصیل بتانا بہت مشکل ہے۔ ہمارے ریکارڈ کے مطابق تقریباً تیس سال قبل اس کے اندر ایک پرائمری اسکول ہوا کرتا تھا، بعد میں اسکول بند کردیا گیا اور مکان طویل مدت تک غیر مستعمل پڑا رہا۔ پھر کچھ سال پہلے اسے فروخت کردیا گیا۔''

''اسے فروخت کیوں کیا گیا تھا؟'' شامی نے پوچھا۔

''بیکار پڑا تھا۔ فروخت کردیا۔''

''کیا مکان کے اندر کوئی تہہ خانہ بھی ہے؟''

''میرے خیال میں نہیں ہے۔'' ٹاؤن کلرک نے جواب دیا۔ ''لیکن آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''ہم دارالحکومت سے ایک معاملے کی تحقیقات کے لئے یہاں آئے ہیں۔'' جوزف نے کہا۔

دارالحکومت کا نام سن کر ٹاؤن کلرک کچھ سنبھل گیا۔ بلکہ اس کے چہرے پر گھبراہٹ نظر آنے لگی۔ دارالحکومت اور تحقیقات دو ایسے الفاظ ہیں جو کسی بھی ملازم کو نروس کردینے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔

''آپ حضرات تشریف رکھیں۔'' اس نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو اس مکان کی فائل دکھاتا ہوں۔ اس میں آپ کو ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔'' تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک سال خوردہ اور گرد آلود فائل جھاڑتا ہوا لے آیا، شامی اور جوزف اطمینان سے بیٹھ کر فائل دیکھنے لگے۔

مکان کی تعمیر تقریباً ساٹھ سال قبل ہوئی تھی۔ نقشے کے اندر تہہ خانہ بھی دکھایا گیا تھا۔ جسے بعد میں بند کردینے کا ذکر تھا۔

''اس نقشے کے مطابق مکان میں تہہ خانہ بھی بنایا گیا تھا۔'' شامی نے ٹاؤن کلرک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آگے چل کر لکھا ہے کہ اس تہہ خانے کو بعض تعمیری خامیوں کے باعث بند کردیا گیا تھا۔ کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ تہہ خانہ بند کرنے سے کیا مراد ہے؟ تہہ خانہ کو مٹی سے پر کردیا تھا یا صرف داخلی راستہ بند کردیا تھا؟''

"یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ خاصی چھان بین کرنی پڑے گی۔"

"کیا آپ کسی ایسے شخص کے بارے میں بتاسکتے ہیں جو اس زمانے میں اس عمارت یا اسکول سے وابستہ رہا ہو؟"

"ایک صاحب ہیں۔" ٹاؤن کلرک نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ "شاید وہ کچھ مدد کرسکیں۔ ان کا نام سلیمان ہے اور وہ کسی زمانہ میں اس اسکول میں استاد تھے۔"

"ان کا پتہ کیا ہے؟"

"اتفاق سے وہ قریب ہی رہتے ہیں۔" ٹاؤن کلرک نے کہا۔ "یہاں سے داہنے ہاتھ کی تیسری گلی میں چوتھا مکان ان کا ہے، گلی کے کونے پر پرچون کی دکان ہے۔ وہاں سے معلوم کرلیجئے۔"

سلیمان کی عمر ستر کے لگ بھگ تھی۔ جسم درمیانہ اور صحت خاصی کمزور تھی۔ شامی اور جوزف کو دیکھ کر اس نے رسمی آداب کا تکلیف کئے بغیر بولا۔

"آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

"آپ کسی زمانے میں ٹاؤن کمیٹی کے پرائمری اسکول میں پڑھاتے رہے ہیں۔" شامی نے براہ راست مطلب کی بات کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو یاد ہوگا کہ پرائمری اسکول اس زمانے میں زریں منزل میں ہوا کرتا تھا۔ میں اس عمارت کے بارے میں کچھ باتیں آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

سلیمان کے چہرے کا رنگ قدرے متغیر ہوگیا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" اس نے ناگواری سے کہا۔ "آپ کہاں سے آئے ہیں اور کس ضمن میں یہ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہم دارالحکومت سے آئے ہیں۔" جوزف نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ہم ایک پرائیویٹ......"

سلیمان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ پولیس سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"نہیں۔" جوزف نے کہا۔

"محترم آپ نے یہ سوال کیوں کیا۔"

"میرا خیال ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔" سلیمان نے جواب دیا۔ "آپ کے یہاں آنے کا اصل مقصد کیا ہے؟"

"میں نے عرض کیا نا کہ ہم زریں منزل کے بارے میں کچھ باتیں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔" شامی نے دوبارہ وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اس عمارت میں کچھ عرصہ پہلے پرائمری اسکول تھا اور آپ وہاں مدرس رہ چکے ہیں۔"

سلیمان کے چہرے پر الجھن اور گھبراہٹ کے آثار نظر آنے لگے۔

"شاید آپ یہ عمارت خریدنا چاہتے ہیں۔" اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "جناب میں معذرت چاہتا ہوں، اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔"

"آپ کا اندازہ درست نہیں ہے۔" شامی نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "ہمیں عمارت خریدنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ دراصل ہم عمارت کے اندر رونما ہونے والے بعض عجیب وغریب واقعات کی تحقیقات کے لئے آئے ہیں اور یہ تحقیقات عمارت کے موجودہ مالک کی درخواست پر کررہے ہیں۔ ہم آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتے، چندایک سوالات ہیں۔" شامی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "مثلاً یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا زریں منزل کے نیچے کوئی تہہ خانہ بھی تھا۔"

"اگر تھا تو......"

"میں کہہ چکا ہوں کہ میں آپ کی مدد نہیں کرسکتا۔" سلیمان نے غصے سے کہا۔ "آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔"

"کمال ہے صاحب آپ تو......"

"آپ فوراً میرا مکان خالی کردیں۔" اس نے چیخ کر کہا۔ "میرے پاس فضول باتوں کے لئے وقت نہیں ہے۔"

"کیا مطلب......؟"

"مطلب وطلب کچھ نہیں۔ میں کہتا ہوں یہاں سے نکل جاؤ۔" فرط جوش سے سلیمان کی آواز کانپ رہی تھی۔

"اچھی بات ہے۔" شامی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ کو ہمارا آنا اتنا ہی برا لگا ہے تو ہم چلے جاتے ہیں۔ ناراض نہ ہوں۔"

یہ کہہ کر دونوں دروازے کی طرف جانے لگے۔ سلیمان ایسے شخص کی طرح سر جھٹک رہا تھا جو کسی اندرونی کرب میں مبتلا ہو۔

"ٹھہریئے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ دونوں رک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ "بیٹھ جائیں۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "مجھے اپنے رویے پر افسوس ہے امید ہے آپ مجھے معاف کردیں گے۔"

چند لمحوں تک وہ خلا میں گھورتا رہا۔ اس کا چہرہ دفعتاً کسی قریب المرگ شخص کی مانند ہوگیا تھا۔ اس نے مدھم آواز میں کہنا شروع کیا۔

"میں بوڑھا ہوچکا ہوں۔ نہ معلوم کون سا دن میری زندگی کا آخری دن ثابت ہو۔ اس لئے میں اب یہ بوجھ یہ اذیت اور ضمیر کی ملامت مزید برداشت نہیں کرسکتا۔"

کسی اچانک خیال کے تحت اس کا جسم بری طرح لرز گیا۔ شامی اور جوزف خاموشی سے بیٹھ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"تقریباً پچیس سال پہلے کی بات ہے۔" اس نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"جیسا کہ آپ نے کہا، میں زریں منزل میں واقع پرائمری اسکول میں پڑھایا کرتا تھا۔ میرے شاگردوں میں ایک لڑکا انتہائی شریر اور ضدی تھا اس کا نام سیفی تھا۔ گو وہ ذہین اور ہوشیار تھا پر اس کی ساری ذہانت نت نئی شرارتوں میں صرف ہوتی تھی۔ اس کے دماغ میں نجانے کیا چیز داخل ہوگئی تھی، وہ کبھی شرارتوں سے نہیں تھکتا تھا۔ چھوٹے سے اسکول میں اس کی وجہ سے ہنگامہ مچا رہتا تھا۔ بچے اسے تفریح کا ذریعہ سمجھتے ہوئے اسے ہر وقت شرارتوں پر اکساتے رہتے تھے۔"

"معاف کیجئے۔" شامی نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "کیا اس لڑکے کا عمارت سے کوئی تعلق ہے؟"

"آپ سنتے جائیں۔ ابھی معلوم ہوجائے گا۔"

سلیمان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے سیفی کو شرارتوں سے باز رکھنے کے لئے نرمی اور محبت کے تمام طریقے آزما ڈالے لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ میری قوت برداشت کے لئے ایک آزمائش بن گیا تو تنگ آکر میں نے اسے جسمانی سزا دینی شروع کردی۔ بچوں کے سامنے شرمندہ کیا۔ بعض اوقات چھڑی سے اسے بری طرح پیٹا کہ اس کے بدن پر نشان پڑ جاتے۔ اس کے والدین غریب آدمی تھے۔ انہوں نے بھی ہر طرح کے طریقے آزما ڈالے۔ لیکن سیفی پر ان تمام سزاؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ سزا سے وہ اور بھی ڈھیٹ اور خود سر ہوگیا۔ پھر میں نے چشم پوشی اور درگزر کے ذریعے اس کی اصلاح کی، پر یہ بھی بے اثر ثابت ہوئی۔"

قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔

"سردیوں کی ایک صبح اس کا رویہ قطعی ناقابل برداشت ہوگیا۔ اس روز وہ دن بھر شرارتیں کرتا رہا۔ اس کی وجہ سے سارا دن کلاس میں ہنگامہ، شور، قہقہے اور طوفان برپا رہا۔ کوئی بچہ پڑھنے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔ اس روز موسم بہت خراب تھا اور طوفان کی آمد کے آثار نظر آرہے تھے۔ میں حتیٰ الامکان اس کی شرارتوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن آخر کار میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

چھٹی ہونے میں تھوڑی دیر رہ گئی تھی اور سیفی کی وجہ سے ایک منٹ کے لئے بھی پڑھائی نہیں ہوسکی تھی تب میں نے ایک مضبوط چھڑی کے ساتھ اسے بری طرح پیٹا۔ یہ دیکھ کر کلاس روم میں سناٹا چھا گیا۔ تمام لڑکے خوفزدہ نظر آنے لگے۔ تاہم سیفی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

اتنی مار کھانے کے بعد نہ تو اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور نہ ہی منہ سے کوئی آواز نکلی۔ وہ خاموشی سے پٹتا رہا اور عجیب نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ مار کھانے

کے بعد گو وہ خاموش ہو گیا مگر پڑھنے پر بھی آمادہ نہ ہوا۔ بس اپنی سیٹ پر بیٹھ کر انتہائی نفرت اور حقارت بھری نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ اس کا یوں نفرت سے گھورنا میرے لئے اور بھی تکلیف کا باعث تھا۔ میں اندر ہی اندر ذہنی کرب اور کھنچاؤ سا محسوس کرنے لگا۔ یہ بات اس کی شرارتوں سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھی، چھٹی کے بعد میں نے اسے روک لیا۔

اس وقت برف باری شروع ہو چکی تھی اور ہوا کا زور بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ نا معلوم اس وقت میرے اندر کون سی شیطانی روح سما گئی تھی کہ مجھے کچھ ہوش نہ آیا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔

اب یہ بات نہایت احمقانہ نظر آتی ہے۔

لیکن اس وقت میرا احساس یہ تھا کہ میرے اور سیفی کے مابین قوت ارادی کا مقابلہ ٹھن گیا ہے اور مجھے بہرصورت یہ مقابلہ جیتنا ہے۔ بصورت دیگر میری معلمانہ حیثیت ختم ہو جائے گی اور بچوں پر سے رعب جاتا رہے گا۔

دوسری طرف سیفی یہ سمجھ رہا تھا کہ اسے ایک اور شدید قسم کی مار پڑنے والی ہے، وہ پوری طرح مار کھانے کے لئے تیار کھڑا تھا اور انتہائی سرد اور ٹھہری ہوئی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے خوف یا گھبراہٹ کے بجائے نفرت ظاہر ہو رہی تھی۔ لیکن میں اسے ایک اور اذیت ناک سزا دینے کا ارادہ کر چکا تھا۔

اسکول کے عملے میں کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ عمارت کے نیچے ایک تہہ خانہ بھی ہے۔ تہہ خانے میں داخل ہونے کا صرف ایک ہی فرشی دروازہ تھا جو میری میز کے نیچے بچھے ہوئے قالین کے نیچے پوشیدہ تھا۔ اس فرشی دروازے پر اتفاقاً میری نظر پڑ گئی تھی۔

ایک روز چھٹی کے بعد صفائی کے خیال سے میں نے قالین ہٹایا تو وہاں پر تقریباً ڈیڑھ مربع فٹ سائز کا ایک فرشی دروازہ نظر آیا۔ بوجہ تجسس اسے کھول کر دیکھا تو اندر کی جانب ایک انتہائی سالخوردہ چوبی زینہ نظر آیا، نیچے تاریکی اور سردی تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ابتدا میں عمارت کے نیچے تہہ خانہ تعمیر کیا گیا تھا جس کے داخلی دروازے کو بعض وجوہات کی بنا پر اینٹیں چن کر بند کر دیا گیا تھا اور غالباً اس فرشی دروازے پر کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ میں نے بھی اس دروازے کے بارے میں کسی کو بتانا مناسب نہیں سمجھا...... کاش مجھ پر اس دروازے کا انکشاف نہ ہوتا۔ بعد میں اس دروازے کو بھی سیمنٹ سے بند کر دیا گیا تھا۔

اس روز میں نے تہہ خانہ کو استعمال کرنے کا ارادہ کر لیا۔ جب اسکول خالی ہو گیا اور تمام بچے اسکول کی حدود سے نکل گئے تو میں نے قالین ہٹا کر فرشی دروازہ کھولا اور سیفی کو تہہ خانہ دکھاتے ہوئے کہا کہ ”یا تو، تو اپنی شرارتوں سے توبہ کر لے یا پھر تہہ خانے کے اندر داخل ہو جا۔“ چند لمحوں تک وہ سرد نگاہوں سے مجھے گھورتا رہا...... ”دیکھو توبہ کر لو۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اس میں تمہارا ہی بھلا ہے لیکن اگر تم توبہ نہیں کرنا چاہتے تو تہہ خانے میں اتر جاؤ اور یاد رکھو جب تک تم پچھلی حرکتوں کی معافی نہیں مانگو گے اور آئندہ کے لئے شرارتوں سے باز رہنے کا وعدہ نہیں کرو گے میں تمہیں باہر نہیں نکالوں گا۔“

وہ احتجاج کئے بغیر خاموشی سے تہہ خانے میں اتر گیا۔

میں نے شدید غصے کے ساتھ ڈھکنا بند کر کے اوپر قالین پھیلا دیا اور کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ چند منٹوں کے بعد وہ اپنی شکست تسلیم کر لے گا اور چیخ چیخ کر معافی مانگتے ہوئے باہر نکلنے کی درخواست کرے گا۔

تہہ خانہ تاریک اور کولڈ اسٹوریج کی مانند سرد تھا۔ جہاں چند منٹ گزارنے انتہائی مشکل تھے......

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے نصف گھنٹہ گزر گیا پر اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ گویا میری قوت ارادی شکست

کھاتی جا رہی تھی۔

پھر ایک گھنٹہ گزر گیا لیکن سیفی نے باہر نکلنے کے لئے کوئی درخواست نہیں کی۔

اس اثنا میں برف باری اور جھکڑ خاصی شدت اختیار کر گیا تھا، تیز ہوائیں کسی ماتمی ساز کی مانند چیختی ہوئی گزر رہی تھیں......

اس وقت شاید میں براہ راست شیطان کے تصرف میں تھا۔ میں نے سیفی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور خاموشی کے ساتھ وہاں سے نکل گیا۔''

شامی اور جوزف کے چہرے پر خوف اور بے یقینی کے تاثرات ابھرتے دیکھ کر اس نے کہا۔

''بظاہر یہ ایک ظالمانہ فیصلہ نظر آتا ہے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ جب سردی ناقابل برداشت ہو جائے گی تو سیفی فرشی دروازہ کھول کر باہر نکل آئے گا اور کمرہ خالی پا کر سیدھا اپنے گھر بھاگ جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے بوڑھے سلیمان کی آواز بھرا گئی۔ اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''خدا میرے گناہ معاف کرے، جو سانحہ اس بچے پر گزرا، میں نے ہرگز ویسا ارادہ نہیں کیا تھا۔ میں گھر جاتے ہوئے راستے میں اس قدر غصے کی حالت میں تھا کہ برف باری اور طوفان کی شدت پر مطلق غور نہ کر سکا۔ مجھے رہ رہ کر سیفی کی ضد اور ہٹ دھرمی پر غصہ آ رہا تھا۔ اس رات کئی سال کے بعد شدید برف باری ہوئی تھی جس کی وجہ سے کچھ دیر کے بعد تمام راستے مسدود ہو گئے۔

اگلی صبح مجھے اپنی حرکت پر سخت ندامت ہوئی۔ تمام شرارتوں اور حماقتوں کے باوجود سیفی، بہرحال ایک کمزور بچہ تھا۔ اور بزرگانہ شفقت کا مستحق تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ تہہ خانے سے نکل کر ضرور گھر پہنچ گیا ہوگا۔ اگلے روز اسکول کی چھٹی تھی۔

دوپہر کے وقت مجھے معلوم ہوا کہ سیفی اپنے گھر نہیں پہنچا۔ ان کا ایک پڑوسی مجھ سے سیفی کے بارے میں معلوم کرنے آیا تھا، گھر والوں کا خیال تھا کہ وہ طوفان کی وجہ سے راستہ بھٹک گیا ہوگا۔

دوسرے بچوں کے ذریعے یہ بات عام ہو چکی تھی کہ میں نے سیفی کو چھٹی کے بعد روک لیا تھا، صورت حال بہت نازک تھی، پس میں نے جھوٹ بولنے میں ہی عافیت سمجھی اور کہا کہ ''چند منٹوں کے بعد میں نے سیفی کو رخصت کر دیا تھا، بلکہ وہ کچھ دور تک میرے ساتھ ہی گیا تھا۔''

میرا یہ جھوٹ گاؤں والوں نے آسانی کے ساتھ تسلیم کر لیا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا، سیفی نے دانستہ جنگل کا راستہ اختیار کیا ہوگا اور یا تو برف باری کے طوفان میں ہلاک ہو گیا ہوگا یا کہیں چھپا ہوا ہوگا۔

تاہم چند لوگ ایسے بھی تھے جنہیں میرے بیان پر شک تھا۔ پر ان کی تعداد بہت کم تھی۔

ذاتی طور پر میرا خیال یہ تھا کہ ''دیر تک تہہ خانے میں انتظار کرنے کے بعد وہ باہر نکل کر گھر کے لئے روانہ ہوا ہوگا اور راستے میں برف کے نیچے دب کر ہلاک ہو گیا ہوگا۔'' یہ خیال آتے ہی مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ فرشی دروازہ کھلا چھوڑ گیا ہوگا۔ اور اگر کسی نے تہہ خانہ کا کھلا ہوا دروازہ دیکھ لیا تو میرے لئے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

شام سے کچھ دیر پہلے میں چپکے سے اسکول پہنچ گیا۔ وہاں یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ ہر شے اپنی جگہ پر موجود تھی، فرشی دروازہ حسب معمول قالین سے ڈھکا ہوا تھا، میری کرسی بھی اسی حالت میں پڑی تھی۔

یہ دیکھ کر میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی میں نے جلدی سے قالین ہٹا کر فرشی دروازہ کھولا اور تہہ خانے میں جھانکنے لگا۔ دروازے کی راہ سے داخل ہونے والی روشنی میں، میں نے اندر ایک ہولناک منظر دیکھا۔ سالخوردہ چوبی زینہ ٹوٹا ہوا تہہ خانے کے فرش پر پڑا تھا۔

قریب ہی سیفی اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا۔

اس امید پر کہ شاید اس کے جسم میں زندگی کی کوئی رمق باقی ہو، میں نے جلدی سے اپنی پگڑی کا ایک سرا ڈیسک کے ساتھ باندھا اور اس کے سہارے تہہ

خانے میں اتر گیا۔ اندر یخ کر دینے والی سردی تھی۔ سیفی سردی سے ٹھٹھر کر مر چکا تھا۔

آس پاس کا جائزہ لینے کے بعد اس کے ساتھ پیش آنے والے حالات کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ اندر کی ناقابل برداشت سردی کی وجہ سے اس نے تھوڑی ہی دیر بعد باہر نکلنے اور معافی مانگنے کا ارادہ کرلیا ہوگا۔ یہ سوچ کر اس نے سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کیا ہوگا۔ چند سیڑھیاں طے کرنے کے بعد سالخوردہ چوبی زینہ ٹوٹ گیا ہوگا اور اس کے ساتھ ہی وہ بھی فرش پر گر گیا اور اس کی ایک ٹانگ زخمی ہوگئی۔ اس کے باوجود وہ باہر نکلنے کے لئے جدوجہد کرتا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں زخمی تھیں اور ناخن مٹی سے بھرے ہوئے تھے۔

زینہ ٹوٹنے کے بعد اس نے زور زور سے مجھے آوازیں دی ہوں گی لیکن شاید برف باری اور پرشور ہواؤں کے باعث میں اس کی آواز نہیں سن سکا تھا۔ پر وہ انتہائی مایوسانہ انداز میں دیواروں کو کھرچتا ہوا باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرتا رہا تھا۔ اس کا اندازہ دیواروں پر پائے جانے والے ناخنوں کے نشانات اور اس کی زخمی انگلیوں سے ہوتا تھا۔ بالآخر نہایت اذیت کے ساتھ سردی میں ٹھٹھر کر مر گیا ہوگا۔

کمرے سے آتی ہوئی مدھم روشنی میں اس کے چہرے پر ناقابل بیان اذیت اور غصے کے تاثرات نظر آتے تھے۔

اوہ آج بھی اس دہشت ناک منظر کو یاد کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نے تہہ خانے کے ایک کونے میں چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس کی لاش کو وہاں دفن کر دیا۔ پھر باہر نکل کر قالین کو فرشی دروازے پر پھیلا دیا اور خاموشی سے گھر واپس آ گیا۔ پھر بعد میں تہہ خانے کا منہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔

کچھ عرصے بعد سیفی کی گمشدگی ایک بھولی بسری داستان ہوگئی۔ چونکہ وہ غریب والدین کا بیٹا تھا اس لئے کسی نے اس معاملے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ بعد میں جب میں کرسی پر بیٹھ کر بچوں کو پڑھاتا تو بعض اوقات یوں محسوس ہوتا کہ نیچے سے سیفی کی آواز آ رہی ہے۔ وہ چیخ چیخ کر مجھ پر لعنت کر رہا ہے۔ نفرت اور حقارت کا اظہار کر رہا ہے اور انتقام انتقام پکار رہا ہے، بسا اوقات وہ آواز اتنی نمایاں سنائی دیتی کہ میں کلاس میں بیٹھے ہوئے بچوں کی طرف دیکھنے لگتا اور خیال کرتا کہ شاید وہ بھی یہ آواز سن رہے ہیں۔

دھیرے دھیرے وہ آواز کسی بھٹکی ہوئی روح کی مانند میرے دل و دماغ پر مسلط ہونی شروع ہوگئی۔ مجھے یقین کی حد تک محسوس ہونے لگا کہ سیفی کی روح بدستور تہہ خانے کے اندر موجود ہے اور انتقام کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ میرا خوف اس حد تک بڑھا کہ میں تنہا اسکول میں جاتے ہوئے گھبرانے لگا۔

اگلے موسم سرما میں، میں نے زبردست خوف، دہشت اور ذہنی کھنچاؤ محسوس کرنا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا کہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ برف باری اور طوفان کے وقت میری حالت پاگلوں کی سی ہو جاتی۔ یوں معلوم ہوتا کہ سیفی میرے سامنے کھڑا ہے اور ٹھہری ہوئی نظروں سے مجھے گھور رہا ہے۔ اس کی آنکھوں سے نفرت اور انتقام کی چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ ایسے مواقع پر میری قوت برداشت جواب دے جاتی اور جی چاہتا کہ تمام واقعہ بے کم و کاست بچوں کو سنا دوں تاکہ کچھ تو ذہنی بوجھ ہلکا ہو۔ پھر کسی نادیدہ خوف کے تحت ایسا کرنے سے باز رہتا۔

پچیس سال سے میری زندگی اس دائمی عذاب میں مبتلا ہے۔ شاید تادم حیات یہ سزا موقوف نہیں ہوگی۔ میں فی الفوقت اس سزا کا مستحق ہوں، اس اذیت کے مقابلے میں اب موت بھی بے حقیقت چیز معلوم ہوتی ہے۔"

قدرے توقف کے بعد اس نے مزید کہا۔ "اب مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ بستی کے لوگ حقیقت کے انکشاف پر کیا ردعمل ظاہر کرتے ہیں لیکن اعتراف

جرم کے بعد میرے سینے سے بہت بڑا بوجھ ہلکا ہوگیا ہے اور میری آخری خواہش یہ ہے کہ سیفی کی لاش کو۔ یا جو بھی ہڈیاں اس کی بچی ہوئی ہوں انہیں پورے احترام کے ساتھ دفن کردوں شاید اس سے اس کی بھٹکی ہوئی روح کو کچھ قرار آ جائے۔''

زرین منزل کے قرب و جوار میں تیز ہواؤں کے ساتھ برف باری ہورہی تھی۔ شامی اور جوزف بوڑھے سلیمان کے ہمراہ اس کمرے میں کھڑے تھے جس کے نیچے مبینہ طور پر تہہ خانہ واقع تھا......

ایک طرف ریاض اور اس کی خوبرو بیوی ثروت کے علاوہ بستی کے دو معزز اور ذمہ دار افراد بھی وہاں موجود تھے۔

سلیمان نے ایک مقام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ ''کسی زمانے میں اس جگہ فرشی دروازہ تھا۔'' یہ وہی جگہ تھی جہاں سے دھندلا غبار اٹھتا ہوا دیکھا گیا تھا۔

باہمی مشورے کے بعد وہاں سے فرش توڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔ پھر ایک مزدور کا انتظام کیا گیا جس نے تقریباً ایک گھنٹے کے بعد تہہ خانے میں داخل ہونے کا راستہ بنادیا۔ پھر ایک سیڑھی نیچے اتاری گئی۔

سلیمان کا اصرار تھا کہ سب سے پہلے وہ تہہ خانے میں داخل ہوگا۔

بہرحال کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی اور ویسے بھی دہشت کی وجہ سے کوئی بھی اندر داخل ہونے پر تیار نہیں تھا۔ پس وہ سیڑھی کے ذریعے نیچے اترنا شروع ہوگیا۔ خوف کی وجہ سے اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ ابھی اس نے تیسرے یا چوتھے ڈنڈے پر ہی قدم رکھا تھا کہ سیڑھی پھسل گئی اور سلیمان کو لئے ہوئے ایک دھماکے سے فرش پر گرگئی۔

عین اس وقت ایک مافوق الفہم واقعہ پیش آیا جس نے جملہ حاضرین کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔

سیڑھی گرنے کے ساتھ ہی سلیمان نے ایک دردناک چیخ بلند کی جس کے فوراً بعد اندر سے بھیانک قہقہہ کی آواز سنائی دی، چند لمحوں تک ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر ساکت ہوکر رہ گیا۔ پھر سب سے پہلے شامی کا جسم حرکت میں آیا۔

''جوزف......'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''جلدی سے کسی رسی کا انتظام کرو۔'' جوزف رسی ڈھونڈنے کے لئے دوسرے کمرے کی طرف بھاگا اور شامی جھک کر اندر دیکھنے لگا۔ دفعتاً وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔

اندر سے زرد رنگ کا دھندلا سا غبار باہر نکل رہا تھا۔ نصف منٹ کے بعد وہ غبار کمرے کی فضا میں تحلیل ہوگیا۔ تہہ خانے میں مکمل سناٹا تھا۔

شامی نے سوراخ کے قریب منہ کرکے بلند آواز سے ''سلیمان۔ سلیمان'' پکارا لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔

اس اثنا میں ریاض ایک بڑی سی ٹارچ لے کر آ گیا اور نیچے روشنی ڈال کر دیکھنے لگا۔ وہاں ایک ناقابل یقین منظر سب کا منتظر تھا۔

سلیمان اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا۔ اس کے اوپر ایک انسانی ڈھانچہ جس کی لمبائی بمشکل چار فٹ ہوگی پھیلا پڑا تھا۔ اس ڈھانچے کے دونوں ہاتھ سلیمان کی گردن میں پیوست تھے اور سلیمان مرچکا تھا۔

''شامی صاحب، یہ قہقہے کی آواز کیسی تھی؟'' ریاض نے پوچھا۔

شامی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اسی بھیانک قہقہے کی آواز خواب گاہ سے آتی سنائی دی۔ تمام لوگ چونک کر اس طرف دیکھنے لگے، ایک ثانیے کے بعد وہ آواز صحن سے سنائی دی۔ پھر وہ آواز فضا میں قہقہے بکھیرتی ہوئی دور ہوتی چلی گئی۔

شامی نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ریاض صاحب اب آپ کو بے خوابی اور بے چینی کی شکایت نہیں ہوگی۔ بے چین کرنے والی روح اپنی اصل منزل کی طرف چلی گئی ہے۔''

مجازی محبت

شکیل نیازی-میانوالی

نوجوان اور ایک خوبرو حسینہ آپس میں باتیں کررہے تھے اور جس کے متعلق باتیں ہورہی تھیں وہ آیا اور اپنا نام سنتے ہی دروازے کے باہر ٹھٹک کر رک گیا وہ بات اس کے کان میں پڑتے ہی وہ دھل گیا۔

انسانی زندگی پر سب سے زیادہ محبت کا اثر ہوتا ہے-اس کے مصداق یہ حقیقی روداد ہے

سرخ وسفید رنگت چہرے پر معصومیت اور شفاف لباس میں ملبوس وہ کوئی فرشتہ نظر آرہا تھا۔اس کے ہاتھ میں موجود قلم تیزی کے ساتھ کاپی کی چکنی سطح پر پھسلتا جارہا تھا۔''زین شام تک ہوجائے گا۔'' دوسرے لڑکے نے کہا جو اس کا ہم عمر ہی تھا وہ صوفے پر تقریباً لیٹا ہوا تھا۔ دونوں ٹانگیں سامنے پھیلا رکھی تھیں اور ساتھ ساتھ وہ سگریٹ کے گہرے گہرے کش بھی لگا رہا تھا۔اس کے مخاطب کرنے پر اس لڑکے کا قلم رک گیا اور اس نے اپنی سبز رنگت رکھنے والی آنکھوں کو ایک ادا کے ساتھ اٹھا کے اسے گھورا۔''ارے تمہاری ایسی ہی اداؤں نے میڈم نازیہ کو تمہارا دیوانہ بنا رکھا ہے بے چاری سارا پیریڈ زین العابدین کی تعریف میں گزار دیتی ہے۔''

''ایسا نہیں بولتے دس سال ہوگئے ہیں ان کی شادی کو ان کی اولاد نہیں ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ توجہ دیتی ہیں۔'' زین العابدین نے کاپی اور قلم ایک طرف رکھ کر کہا۔

''ہاں ہاں پوری کلاس میں تم ہی تو ہو جس میں اسے اپنا ہونے والا بیٹا نظر آتا ہے۔'' ندیم نے منہ بنا کے کہا اور زین اسے صرف گھور کے رہ گیا۔

''او کے میں چلتا ہوں، پانچ ہوگئے ہیں اور عصر کی نماز بھی پڑھنی ہے، زین نے گھڑی کی طرف دیکھ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

''مسٹر زین جیسے کہ آپ کو پتہ ہے کہ کل آپ کے اکلوتے دوست کی سالگرہ ہے اور اگر حضور اس بار بھی اپنے سابقہ ریکارڈ کی طرح غیر حاضر پائے گئے تو اس بار آپ کو اپنے اکلوتے دوست سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔'' ندیم نے بڑے سنجیدہ انداز میں کہا۔

''ندیم تمہیں تو پتہ ہے کہ ابو شام کے بعد باہر جانے کو کتنا برا سمجھتے ہیں۔'' زین نے فکر مند ہو کے کہا۔

''کوئی بات نہیں اگر انکل نے آنے کی اجازت نہ دی تو پھر اپنے بیٹے کو ساری عمر ہی اپنے گلے سے لگا کے رکھیں۔''

''نہیں اس بار اجازت دے دیں گے۔'' زین نے کچھ سوچ کر کہا تو ندیم نے سر ہلا دیا۔

زین العابدین کے والد امین اللہ جامع مسجد کے امام تھے۔انتہائی نیک اور شریف انسان تھے۔ محلے کے لوگ ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے،ان کا دھیمہ مدھم لہجہ سننے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا تھا۔ امین اللہ کی ایک بیٹی پاکیزہ اور ایک بیٹا زین العابدین تھا۔ان کی بیوی کا انتقال زین کی پیدائش کے وقت ہوگیا تھا۔

پاکیزہ اس وقت صرف بارہ سال کی تھی۔ لیکن اس نے ایک ماں کی طرح زین کی ساری ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اس کی اس انداز سے تربیت کی کہ وہ ہی اپنے ابا جان کا اصل جانشین بنے۔ اس نے کبھی زین کو ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ امین اللہ پاکیزہ کی جلد از جلد شادی کرنا چاہتے تھے لیکن پاکیزہ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ”جب تک زین میٹرک نہیں کر لیتا اس وقت تک وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ امین اللہ بھی زین کی وجہ سے زیادہ نہیں بولتے تھے۔

زین بالکل اپنی ماں پر گیا تھا وہی ہلکی سبز رنگت رکھنے والی آنکھیں، وہی ناک، وہی حسن و جمال، امین اللہ اپنی بیوی رابعہ سے بہت محبت کرتے تھے، اس لئے دوسری شادی نہ کر پائے۔ ویسے بھی پاکیزہ نے ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔ ان کو کبھی زین کی طرف سے شکایت نہ ہونے دی۔ زین حسین ہی نہیں بہت ذہین بھی تھا۔ ہر کلاس میں پوزیشن ہولڈر تھا۔ وہ نہم میں پڑھ رہا تھا۔ وہ بہت کم کسی کے ساتھ بولتا تھا۔ اسی حساب سے اس کے دوست بھی کم تھے۔ ندیم سے اس کی بہت اچھی دوستی تھی۔ لیکن دونوں کے شوق جدا تھے۔ زین شاعری، فلسفہ، سفر نامہ و تاریخ کے موضوع پر کتابیں پڑھنے کا شوقین تھا، جبکہ ندیم ریسلنگ، کرکٹ اور فلمیں دیکھنے کا جنون کی حد تک شوق رکھتا تھا۔ ندیم کے والد عباس صاحب شہر کے مشہور بزنس مین تھے، دولت گھر کی لونڈی تھی۔ اس لئے ندیم کو ہر طرح کی عیاشی میسر تھی۔

☆......☆......☆

زین پچھلے ایک گھنٹے سے پاکیزہ کو ابا جان سے اجازت لے کر دینے کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ ”زین تمہیں پتہ ہے نا کہ ابا جان کو ایسی محفلوں سے کتنی نفرت ہے۔“ پاکیزہ نے کہا۔

”باجی پلیز! ایک بار اجازت لے دیں اگر اس بار میں نہ گیا تو ندیم بہت خفا ہوگا اور پھر ایک ہی تو دوست ہے میرا، پلیز! میرے لئے ابو سے بات کریں ناں۔“ زین نے منت کرنے والے انداز سے کہا۔

”نہیں میں ابو سے ایسی ویسی کوئی بات نہیں کرنے والی، تمہیں دوستوں کے بجائے اپنی پڑھائی پر توجہ دینی چاہئے۔“ پاکیزہ نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے نہیں جاتا لیکن آج کے بعد میں بھی آپ سے بات نہیں کروں گا۔“ زین نے ناراضگی سے کہا۔ ”زین اب ناراض نہ ہو۔“ پاکیزہ نے پریشان ہو کر کہا۔

"آپ کو کیا فرق پڑتا ہے میں راضی ہوں یا ناراض۔" زین نے منہ بنا کر کہا۔

"ٹھیک ہے میں ابو سے بات کروں گی، لیکن یہ پہلی اور آخری بار ہوگی۔" پاکیزہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے باجی اس کے بعد کبھی نہیں کہوں گا۔"

زین نے خوش ہو کر کہا اور پاکیزہ نے سر ہلا دیا۔

خیر شام کے کھانے کے بعد پاکیزہ نے ابو سے بات کی تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ "پاکیزہ بیٹا تمہیں تو پتہ ہے نا کہ آج کل کے ماحول کا، مانا کے ندیم زین کا دوست ہے لیکن عباس صاحب کی فیملی بہت ایڈوانس ہے، میں نہیں چاہتا کہ زین کے دامن پر کوئی دھبہ لگے اور پھر سالگرہ جو کہ ہے ہی گناہوں کا پلندہ، عباس صاحب کی فیملی میں تو پردے کا تصور بھی محال ہے، ایسی مخلوط محفل کا زین پر برا اثر پڑے گا۔"

"نہیں ابا جی میں نے زین کو ماں بن کے پالا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ وہ کیسی سوچ رکھتا ہے، وہ کبھی بھی آپ کے دیئے ہوئے سبق کو نہیں بھول سکتا اور رہا سوال یہ کہ وہ محفل مخلوط محفل ہے تو ابا زین ابھی بچہ ہے اسے ایسی سوچ کیسے آ سکتی ہے۔ آپ کو اس پر بھروسہ کرنا چاہئے وہ آپ کا بھروسہ کبھی نہیں توڑے گا۔" پاکیزہ نے زین کی بھرپور وکالت کی۔

"ٹھیک ہے لیکن اس سے کہنا کہ گھر جلدی واپس آئے۔" ابو نے کہا اور عشا کی نماز پڑھنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆......☆......☆

عباس صاحب کا بنگلہ ایسے لگ رہا تھا جیسے ندیم کی سالگرہ نہیں شادی ہو رہی ہو۔ پارکنگ ایریا میں رنگ برنگی کاروں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ ندیم کا گھر زین کے گھر سے دو گلیوں کے فاصلے پر تھا۔ اسلئے زین پیدل ہی ندیم کے گھر تک آیا تھا۔ اندھیرا اچھا خاصا پھیل چکا تھا۔ اندر سے بہت سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ زین کے لئے کسی محفل میں جانے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس لئے وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا عباس صاحب کو سامنے پایا۔ "زین بیٹا کیا حال ہیں۔" عباس صاحب نے خوشگوار انداز سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں انکل۔" زین نے بھی جواباً مسکرا کر کہا، اتنے میں ندیم بھی وہاں آ گیا۔ "زین یہ تم ہو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا، تمہارے ابو نے کیسے اجازت دی۔"

"بس کسی نہ کسی طرح اجازت مل گئی۔" زین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عباس صاحب نے آنے والے مہمانوں کو ویلکم کیا۔ "آؤ میں تمہیں اپنے کزنز سے ملاتا ہوں۔" ندیم زین کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک طرف لے گیا اور مختلف لوگوں سے اس کا تعارف کرانے لگا، ایک تو زین کی خوبصورتی اور دوسری اس کی سادگی سے سبھی کو اس کا دیوانہ بنا ڈالا۔ خصوصاً وہاں موجود اونچے اور آزاد گھرانوں کی لڑکیوں نے ایسی سادگی اور حسن کو پہلے نہیں دیکھا تھا جو بھی اسے دیکھتی فوراً ہاتھ آگے بڑھا دیتی۔ "ہائے آئی ایم تانیہ" ایک خوب صورت لڑکی نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"ندیم کے بچے کس مشکل میں ڈال دیا تمہیں پتا ہے نا مجھے لڑکیوں سے کتنی الرجی ہے۔" زین نے ندیم کے کان میں کہا۔

"اوکے گرلز بعد میں بات کرتے ہیں ذرا ہم دوسرے لوگوں سے بھی مل آئیں۔" ندیم نے زین کی مجبوری کو سمجھتے ہوئے اسے لے کے آگے بڑھ گیا۔ "بے شرمی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" زین نے غصے سے ندیم کو کہا۔

"او بھائی اس میں لڑکیوں کا کوئی قصور نہیں ہے تم لگتے ہی اتنے قاتل ہو کہ بندے کا دل خود بخود قتل ہونے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔" ندیم نے اسے مسکرا کے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ خود شرما کے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

لان میں بہت سی میزیں لگی ہوئی تھیں اور ایک طرف اسٹیج بھی لگا ہوا تھا جہاں آلات موسیقی رکھے ہوئے تھے۔ "حضرات آپ سب کا بہت بہت مشکور ہوں کہ آپ ہماری دعوت پر آئے۔ آپ سب کی تفریح کے لئے ایک محفل موسیقی کا انتظام کیا ہے اور میں میڈم ماہ نور کو آپ کی

بھرپور تالیوں میں اسٹیج پر آنے کی دعوت دیتا ہوں۔'' عباس صاحب نے کہا اور لان تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔

''زین یہ شہر کی مشہور و معروف گلوکارہ ہیں جس محفل میں جاتی ہیں چار چاند لگ جاتے ہیں اس محفل کو۔'' ندیم نے زین کی معلومات میں اضافہ کیا، ہلکے گلابی رنگ کے فراک میں وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ اس کی عمر لگ بھگ بیس سال کی رہی ہوگی لیکن ایسا حسن بہت کم کم ہی نظر آتا ہے، گہری سیاہ موٹی آنکھیں، نم دار پلکیں، گلاب کی پتیوں کی مانند ہونٹ، اونچی ناک، انگاروں کے مانند دہکتے گال اور اونچا قد جو اس کی شخصیت کو اور زیادہ پرکشش بنا رہا تھا۔ جن لوگوں نے اسے پہلے نہیں دیکھا تھا، انہوں نے پرجوش انداز سے تالیاں بجائیں اور جن لوگوں نے اسے پہلے دیکھا تھا وہ تالیاں بجانا ہی بھول گئے، جو تالیاں بجانا بھول گئے ان میں زین بھی شامل تھا۔ وہ نہ چاہنے کے باوجود اسے دیکھنے پر مجبور تھا۔

ماہ نور نے اسٹیج پر آتے ہی اپنا ہاتھ پیشانی تک لے جا کے جھکے ہوئے انداز میں آداب کیا اور اس کے ساتھ ہی ساز بج اٹھے۔ ماہ نور نے بڑی نزاکت کے ساتھ مائیک ہاتھ میں لیا اور ایک غزل چھیڑی۔

''اے دوست میرے ہمدم مجھے تم چھوڑ مت جانا
کبھی غصے میں آ کے تم چہرہ یہ موڑ مت جانا''

زین کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ غزل نہیں گا رہی بلکہ اس پر جادو کر رہی ہے اور لفظوں سے اسے اندیکھے جال میں جکڑ رہی ہے۔ وہ جوں جوں غزل گاتی چلی گئی، زین کو لگا وہ جیسے کسی دریا کی موجوں کے ساتھ ساتھ بہتا جا رہا ہے۔ وہ تب اپنی سوچوں سے باہر نکلا جب وہ غزل ختم کر چکی تھی اور سامعین تالیاں بجا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی عباس صاحب نے کیک کاٹنے کا اعلان کیا۔

ندیم نے زین کے ہاتھ کو تھاما اور لان کے درمیان موجود بڑی میز کے پاس لے آیا جس پر ایک بڑے سائز کا کیک پڑا تھا۔ سب لوگ میز کے گرد جمع ہو گئے اور عباس صاحب کے کہنے پر ماہ نور آگے بڑھی اور ندیم کے ہاتھ کو تھاما جس میں ندیم چھری پکڑ چکا تھا۔ ''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔'' کی آوازوں کے ساتھ ہی کیک کا ایک ٹکڑا الگ ہو گیا۔ ماہ نور نے وہ ٹکڑا اٹھا کر ندیم کی طرف بڑھایا اور جیسے ہی ندیم نے منہ کھولا تو ماہ نور نے وہ ٹکڑا تیزی کے ساتھ زین کے منہ میں ٹھونس دیا۔

زین جو اس کے چہرے کو دیکھنے میں گم تھا جلدی میں پوری طرح منہ بھی نہ کھول سکا اور کیک پر لگی کریم نے اس کے چہرے پر مونچھیں بنا ڈالیں۔ ندیم شرمندہ سی ہنسی ہنس پڑا اور لان قہقہوں سے گونج اٹھا۔ زین بھی شرمندہ انداز میں رومال سے منہ صاف کرنے لگا۔ ''ایسے ہی رہنے دو مرد لگ رہے ہو۔'' تو زین نے اور شرمندگی محسوس کی۔ زین کو لگا وہ اسے دیکھ رہا تھا تو اس بات کو محسوس کر کے ماہ نور نے اس کی کم عمری پر طنز کیا ہے۔

''دیکھو کیسے چونچلے کر رہی ہے کیوں کہ عباس صاحب کے ساتھ اچھا بھلا اسکینڈل چل رہا ہے اس کا آج کل۔'' ایک خاتون نے طنزیہ انداز میں کہا تو زین نے بھی سن لیا۔

''عباس صاحب کی اولاد بھی جوان ہے اور ان کو اپنی عمر کا بھی احساس نہیں۔'' ایک اور عورت بولی۔

''دو سال ہو گئے بیوی کو فوت ہوئے، شادی تو ویسے ہی کرنی ہے کیوں نہ ماہ نور سے کرلیں۔ ایک اور خاتون نے خاموشی توڑ دی۔ اسی طرح کے بہت سے فقرے زین کے کانوں میں پڑے لیکن وہ کچھ نہ سمجھ پایا۔

تھوڑی دیر بعد ماہ نور چلی گئی تو زین کو بھی ہوش آیا کہ ابا نے گھر جلدی آنے کا بولا تھا۔ زین نے جلدی سے ندیم سے اجازت لی اور باہر نکلا، ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ ایک کار نے پاس آ کر ہارن بجایا۔ وہ ایک طرف ہوا تو کار اس کے ساتھ آ کر رک گئی۔ ''ارے آپ! وہ بھی پیدل۔'' ماہ نور نے کار کا دروازہ کھول کے کہا۔

زین کو لگا کہ وہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ ''جی وہ میرا گھر پاس ہی ہے۔'' زین نے نہ جانے کس طرح فقرہ مکمل کیا ورنہ تو اس کے ہوش ہی اڑ گئے تھے۔

''آیئے آپ کو راستے میں چھوڑ دیں گے۔'' ماہ نور نے ایک ادا سے کہا۔ ''نہیں کچھ قدم کا فاصلہ ہے۔''

زین نے قدرے شرما کے کہا۔
"اوہو آپ تو تکلف میں پڑ گئے۔ اگر آپ کی رفاقت میں ہم دو قدم طے کرلیں گے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔" ماہ نور نے ادا سے کہا، تو زین جھجکتے ہوئے اس کے ساتھ بیٹھ گیا اسے لگا جیسے وہ کسی گلستان میں ہو۔

گاڑی میں مدہوش کردینے والی ہلکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ زین اس کے ساتھ بیٹھ تو گیا تھا لیکن وہ خود ہی شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا کہ اگر ابا کو اس بات کی ذرا بھی بھنک لگ گئی تو ان کے دل پر کیا گزرے گی۔ "لگتا ہے آپ ہمارے ساتھ بیٹھ کر پریشان ہیں۔" ماہ نور نے اس کی چوری پکڑلی۔

"نہیں تو۔" زین نے فوراً کہا۔
"تو پریشان کیوں لگ رہے ہیں۔"
"وہ تھوڑا لیٹ ہوگیا ہوں تو باجی تھوڑا پریشان ہو رہی ہونگی۔ اسی لئے تھوڑا پریشان ہوں۔" زین نے کہا۔
"ہر وقت پریشان رہنا خوبصورتی کو متاثر کرتا ہے۔" ماہ نور نے کہا۔ تو وہ کسی لڑکی کی طرح شرما گیا۔
"بس یہیں اتار دیں۔" زین نے گلی کے نکڑ کی طرف اشارہ کرکے کہا اور فوراً اتر گیا۔
"کیا بات نہیں کریں گے۔" ماہ نور نے اسے کہا تو وہ شرمندگی سے واپس مڑا۔ "اللہ حافظ۔"
"کیا ہم اتنے اجنبی ہیں کہ ایک دوسرے سے ہاتھ بھی نہیں ملا سکتے۔" ماہ نور نے کار سے اتر کر کہا اور اپنا نرم و نازک ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ زین کو لگا جیسے اس کا خود پر اختیار نہ رہا ہو اس نے بھی بے اختیاری سے ہاتھ آگے بڑھایا تو ماہ نور نے دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھ کو تھام لیا اس گرم جوش مصافحہ سے زین کا پورا جسم کانپ اٹھا۔ ماہ نور نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "بہت جلد ملاقات ہوگی۔"
"انشاء اللہ" زین کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس نے زین کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور تیزی سے مڑ کر گاڑی میں بیٹھی اور آگے بڑھ گئی۔ زین کھوئے کھوئے انداز سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جب گاڑی اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تو اس نے گھبرا کے اردگرد دیکھا اور جب کسی کو نہ پایا تو آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔

وہ گھر آیا تو اس کے ابو تھوڑی طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے سوچکے تھے لیکن پاکیزہ اس کے انتظار میں ابھی جاگ رہی تھی۔ "زین خیریت تو تھی بہت دیر کردی۔ ابا جان تمہارا انتظار کرتے کرتے سو گئے ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔" پاکیزہ نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "زین مجھے تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔" پاکیزہ نے فکرمندی سے کہا۔
"نہیں باجی آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔" زین نے کہا اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ "اسے جاتا دیکھ کر پاکیزہ سوچ میں پڑ گئی۔"

دوسرے دن زین جلدی جلدی اسکول پہنچا لیکن ندیم نہیں آیا۔ زین اس کا انتظار کرتا رہا۔ حتیٰ کہ اسمبلی ہوگئی۔ آج پہلی بار زین نے ندیم کا اتنی شدت سے انتظار کیا تھا۔ اسے ندیم پر غصہ بھی آرہا تھا کہ وہ آیا کیوں نہیں۔ آخر خدا خدا کرکے دو بجے چھٹی ہوگئی۔ زین نے جلدی سے گھر کا رخ کیا۔ گھر آکے فریش ہونے کے بعد ندیم کے گھر کا رخ کیا۔ چوکیدار سے معلوم ہوا ندیم گھر پر ہی ہے۔ لیکن سویا ہوا ہے۔ گھر کے ملازم زین کو ندیم کے دوست کے طور پر اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لئے زین کو ڈرائنگ روم بیٹھایا اور تھوڑی دیر بعد ندیم بھی آنکھیں ملتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ "آج اسکول کیوں نہیں آئے جانتے ہو کتنا پریشان ہوا میں۔" زین نے اس کے داخل ہوتے ہی کہنا شروع کردیا۔
"کیوں خیریت تو تھی ناں۔" ندیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"خاک خیریت تھی آج اسکول میں اتنا بورا ہوا کہ تمہیں اندازہ نہیں ہے۔"
"اچھا اب لڑنا چھوڑو بولو کیا پیو گے ٹھنڈا یا گرم۔"
"نہیں مجھے کچھ نہیں پینا۔" زین نے مصنوعی غصے سے کہا۔
قربان جاؤں غصے پر اور بھی قاتل لگتے ہو۔ اگر

میں لڑکی ہوتا تو اب تک سو بار تم سے عشق کر چکا ہوتا۔" ندیم نے کچھ ایسے انداز سے کہا کہ زین کی ہنسی نکل گئی۔ "اصل میں رات گئے تک جاگتا رہا، اس لئے طبیعت ذرا ٹھیک نہیں تھی، اسی لئے نہیں آ پایا۔ زین خیریت تو ہے نا مجھے تم تھوڑے پریشان نظر آ رہے ہو۔" ندیم نے فکر مند ہو کر کہا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"نہیں مجھے پتا ہے کچھ نہ کچھ ضرور ہے میں تمہاری طبیعت سے بچپن سے واقف ہوں، اپنے دوست کو نہیں بتاؤ گے۔" ندیم نے دوستی کا حق جتا دیا تو "زین نے ڈرتے ڈرتے ساری بات بتا دی۔"

"واہ زین صاحب ویسے تو ہم نے فلموں میں دیکھا ہے یا کتابوں میں پڑھا ہے لیکن تم تو چھپے رستم نکلے۔" ندیم نے مسکرا کے کہا تو زین کا سر شرم سے مزید جھک گیا۔ "قصور تمہارا نہیں ہے ماہ نور کو پہلی دفعہ دیکھنے والوں کا اکثر یہی حال ہوتا ہے۔"

"ویسے یہ ماہ نور کہاں رہتی ہے۔" زین نے جھجک کے پوچھا۔

یہ ان گلیوں کی باسی ہے جہاں شرفا دن کو جانے کو برا سمجھتے ہیں اور رات کو اپنے تمام لبادے اتار کر پہنچ جاتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ چوبارے بڑے بدنام ہوا کرتے تھے لیکن آج ان گلیوں کے لوگ کسی آرٹسٹ کے طور پر جانے جاتے ہیں۔" ندیم نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا تو زین کے خیال میں فوراً اس محلے کا نام گونج اٹھا۔

"جس کا نام لینا بھی کوئی شریف آدمی گناہ سمجھتا تھا۔"

"کیا تم مجھے ان کا پتہ دے سکتے ہو ایک بار میں ان سے ملوں گا۔" زین نے بے اختیار ہو کے کہا تو ندیم نے ایک طویل سانس لی اور اسے پتہ بتانے لگا۔

☆......☆......☆

بلیک کلر کی پینٹ اور وائٹ کلر کی شرٹ میں ملبوس زین اس محلے کی اس گلی کے سامنے اترا جہاں ماہ نور کا چھوٹا مگر عالیشان گھر تھا۔ گلی تقریباً سنسان تھی اور زین کے علم کے مطابق یہاں پر راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں۔ زین آج اسکول کے بجائے یہاں چلا آیا تھا اور ہر بات ندیم کے علم میں بھی تھی، گھر والوں کے سامنے وہ اسکول کی تیاری کر کے نکلا تھا اس لئے وہ اسکول یونیفارم میں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے کندھے پر شولڈر بیگ بھی تھا۔ اس کا دل تیزی کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے بیل بجائی تو تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی ایک موٹی تازی عورت دکھائی دی۔ "کس سے ملنا ہے؟" اس نے تقریباً غراتے ہوئے پوچھا۔

"جی وہ ماہ نور سے ملنا ہے۔"

"زین نے اپنی لرزش پر قابو پاتے ہوئے بڑی مشکل سے کہا۔ عورت نے بنا کچھ بولے اس کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ زین تقریباً ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا اور سامنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا کر عورت نے کہا۔ "آپ بیٹھیں میں بی بی جی کو جگاتی ہوں۔"

ڈرائنگ روم پورے کا پورا ہال تھا۔ جس میں صوفے بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے اور ایک کونے میں بوتلوں کا چھوٹا سا ریک رکھا تھا۔ جس میں رنگ برنگی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر خوب صورت پینٹنگ سجی ہوئی تھیں۔ جو وہاں کے مکینوں کے ذوق کی آئینہ دار تھیں۔ تقریباً بیس منٹ بعد اندر کا دروازہ کھلا تو زین کو یوں محسوس ہوا جیسے کمرے میں بہار آ گئی ہو۔ گیلے چہرے پر سیاہ کھلے بال چپکے ہوئے تھے جو اس بات کا ثبوت تھا کہ کچھ دیر پہلے ہی چہرہ دھویا گیا ہے۔ لیکن چہرہ دھونے کے باوجود آنکھوں میں نیند کا خمار ابھی بھی تھا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس بغیر میک اپ کے وہ اور بھی خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ زین غیر ارادی طور پر کھڑا ہو چکا تھا۔ "آپ آئے ہمارے غریب خانے پر، یا خدا ہم کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے۔" ماہ نور نے مخصوص مسکراہٹ سے کہا۔

"وہ میں نے سوچا کہ رات کو آپ نے مجھے گھر ڈراپ کیا تو اس کے لئے آپ کا شکریہ ادا کروں۔" زین کو سمجھ نہ آئی کہ یہاں آنے کی کیا وجہ بتائے۔

"تو آپ دو منٹ کی لفٹ دینے پر 40 منٹ کا سفر طے کر کے اس لفٹ کا صرف شکریہ ادا کرنے آئے

ہیں۔'' ماہ نور نے کہا تو زین کو لگا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے ہی رات کو آپ کو رات بھر یاد نہیں کیا بلکہ آپ نے بھی ہمیں یاد کیا۔'' ماہ نور نے مسکرا کے کہا تو زین کو اس بات سے تھوڑا حوصلہ ملا۔

''وہ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ'' اس سے آگے زین کچھ نہ بول پایا تو ماہ نور نے کہا۔ ''جو بھی کہنا ہے بغیر ڈرے کہہ دیجئے' کہ آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ اور یہ کہ مجھے آپ سے محبت ہوگئی ہے۔''

''مجھے پتہ ہے یہ بات بہت بری ہے کہنے میں لیکن اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔'' زین نے بے بسی سے کہا تو ماہ نور اپنی جگہ سے اٹھ کر صوفہ پر اس کے پاس آ بیٹھی، اتنی پاس کہ زین کو اس کے جسم کی حرارت محسوس ہونے لگی۔ زین کا چہرہ مارے شرم کے انار کی طرح سرخ ہوگیا۔ اس کے یوں قریب بیٹھ جانے سے زین نے دوسری طرف سرکنے کی کوشش کی تو ماہ نور نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اپنا منہ اس کے کان کے قریب کر کے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''زین محبت گناہ نہیں ہوتی۔ محبت اختیار میں نہیں ہوتی کیونکہ محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔'' یہ کہہ کر ماہ نور نے زین کے دہکتے گالوں کو اپنے گلابی ہونٹوں سے چوم لیا۔

زین کو یوں لگا جیسے اس کے گال پر کسی نے انگارے رکھ دیئے ہوں۔ اس نے گھبرا کے ماہ نور کو دیکھا تو اس کے چہرے پر شرمندگی کے بجائے مسکراہٹ تیر رہی تھی۔ زین کو یوں لگا جیسے وہ کسی نشے میں ہو۔ ''میرے خیال میں مجھے چلنا چاہئے۔'' زین نے کہا۔

''پھر کب ملیں گے۔'' ماہ نور نے بے قراری سے پوچھا۔ تو زین خاموش ہوگیا۔ وہ اسے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ ''خدا حافظ'' ماہ نور نے کہا تو زین نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن کہہ نہ پایا۔ وہ سر کو جھٹک کے تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا اور ماہ نور کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

اس واقعہ کو دو روز ہو چکے تھے لیکن زین کا دماغ اس ملاقات میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ ابھی تک اس کے بارے میں فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ اس کا یہ قدم صحیح تھا یا غلط۔ اس کے معمولات بری طرح متاثر ہو چکے تھے۔ پڑھائی میں دل نہ لگا پا رہا تھا اور نہ ہی کوئی اور کام ڈھنگ سے کر رہا تھا۔ ندیم کو اس نے سرسری طور پر ہی ملاقات کے بارے میں بتایا تھا۔ پاکیزہ نے اسے الجھایا ہوا پایا تو اس نے پوچھا لیکن زین نے پڑھائی کی ٹینشن کہہ کے جان چھڑالی۔ تیسرے دن اسکول سے چھٹی ہونے پر وہ اسکول سے باہر نکل آیا۔ وہ روز پبلک ٹرانسپورٹ کے ذریعے آتا جاتا تھا اس لئے اس کے قدم خود بخود بس اسٹاپ کی طرف اٹھ رہے تھے کہ اچانک پیچھے سے کسی کار نے ہارن بجایا وہ ایک سائیڈ پر ہوگیا کار اس کے قریب آ کر رکی۔ کار ماہ نور ڈرائیو کر رہی تھی۔

ماہ نور کے اشارے پر وہ غیر ارادی طور پر دروازہ کھول کے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ''بڑے روٹھے روٹھے میرے محبوب نظر آتے ہیں۔'' ماہ نور نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' زین نے دھیرے سے کہا۔

''تو پھر اتنے خفا کیوں نظر آ رہے ہو؟''

''آپ کو ایسا لگ رہا ہے۔'' زین نے جلدی سے جواب دیا۔

''تم ملنے کیوں نہیں آئے۔'' ماہ نور آپ سے تم پر آ گئی۔

''ٹائم ہی نہیں ہوتا۔'' زین بدستور دھیمے لہجے میں بول رہا تھا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہاں چلنے کا ارادہ ہے۔''

''نہیں باجی ویٹ کر رہی ہونگی گھر پر۔'' زین نے اس بار تھوڑی اونچی آواز میں کہا۔

''اوہو ایک تو ہر وقت جلدی میں رہتے ہو، آج کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ آج تم لنچ میرے ساتھ کرو گے۔'' ماہ نور نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو زین خاموش ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد ماہ نور نے ایک بڑے ہوٹل کے سامنے کار پارک کی، ہوٹل کا عملہ شاید ماہ نور کی حیثیت سے اچھی طرح

واقف تھا اس لئے اسے بڑی عزت سے ویل کم کر رہے تھے۔ ماہ نور نے زین سے اس کی پسند پوچھی اور آرڈر دے دیا۔ زین نے بڑی مشکل سے کھانا کھایا۔ "تم کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہے ہو، جو بھی مسئلہ ہے مجھے بتا دو ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی حل ہو میرے پاس۔" ماہ نور نے سنجیدگی سے کہا۔

تو زین تھوڑی دیر بعد بولا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ اگر ابا جان باجی کو پتہ چل گیا تو کیا ہوگا۔"

"دیکھو زین پہلی محبت تو ہو کر رہتی ہے، میرے یا تمہارے پریشان ہونے سے تقدیر کے فیصلے نہیں بدل جائیں گے۔ اور رہی بات یہ کہ تمہارے ابا جان اور باجی کو نہ پتہ چلے تو یہ تمہاری روٹین ہے۔ اگر تم ان کے ساتھ پہلے جیسا نارمل ماحول یا رویہ رکھو گے تو ان کو تم پر کبھی شک نہیں ہوگا، اور ہم دونوں بھی ملاقات کے مسئلے میں احتیاط سے کام لیں گے تو کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ سمجھے میری ننھی سی جان۔" ماہ نور نے آخر میں لاڈ پیار سے کہا تو زین کو اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ "ہنستے رہا کرو، ہنستے وقت تمہارے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔" ماہ نور نے نشیلے لہجے میں کہا تو زین کا چہرہ مارے شرم کے سرخ ہو گیا۔ ماہ نور نے زین کے کہنے پر ہی اسے گھر کے قریب ہی ڈراپ کیا تھا۔

وہ معمول سے پورا ایک گھنٹہ لیٹ ہو گیا تھا۔ پاکیزہ نے گھر آتے ہی اس سے پوچھا۔ "زین خیریت ہے نا آج بہت دیر سے گھر آئے ہو۔"

"ہاں واپسی پر ندیم کے گھر چلا گیا تھا۔" زین نے اپنے چہرے کو چھپاتے ہوئے کہا اور جلدی سے اندر کپڑے چینج کرنے چلا گیا۔

"کھانا لگاؤں۔" پاکیزہ نے پوچھا۔

"نہیں آج ندیم کے ساتھ راستے میں چاٹ کھالی تھی۔"

"زین تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ چاٹ سے دور رہا کرو۔ پچھلی بار بھی چاٹ کھانے کی وجہ سے تم بیمار ہو گئے تھے۔" پاکیزہ نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

"آج کے لئے سوری، آئندہ نہیں کھاؤں گا میری پیاری آپی۔" زین نے پاکیزہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا ایک طرف ہو تمہارا یونیفارم دھولوں۔" پاکیزہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو زین ایک طرف ہٹ گیا۔ "زین تمہارے یونیفارم سے پرفیوم کی خوشبو آ رہی ہے اور اگر میں غلطی پر نہیں تو یہ لیڈیز پرفیوم کی خوشبو ہے۔"

یہ سنتے ہی زین کو یوں لگا جیسے اس پر چھت آن گری ہو لیکن وہ فوراً سنبھل گیا۔ دراصل واپسی پر ندیم کے ساتھ جنرل اسٹور پر گیا تھا ندیم پرفیوم پسند کر رہا تھا تو میں نے بھی تھوڑا سا لگا لیا اب مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ لیڈیز پرفیوم ہے۔" زین نے تیز تیز کہا۔

"اچھا اچھا اتنا اونچا کیوں بول رہے ہو، میں نے تو یوں ہی مذاق کیا تھا۔" پاکیزہ نے کہا اور کپڑے دھونے کے لئے آگے بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

وقت کا پتہ نہ چلا اور آٹھ ماہ بیت گئے۔ اس دوران زین مسلسل ملتا بھی رہا، کبھی کبھار پارک میں کبھی دریا کنارے، کبھی ہوٹل میں اور کبھی ماہ نور کے گھر پر، لیکن زیادہ تر ملاقاتیں ماہ نور کے گھر پر ہی ہوتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی ان کے درمیان ایک دیوار حائل رہی۔ اگرچہ ماہ نور نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ اس دیوار کو گرا دے لیکن زین کی تربیت اس انداز سے کی گئی تھی کہ باوجود ماہ نور کی کوششوں کے زین کی وہ حد عبور نہ کر سکی۔ امتحان سر پر آ گئے تھے۔ لیکن زین کا پڑھائی کی طرف بالکل دھیان نہیں تھا وہ پڑھ ضرور رہا تھا۔ لیکن صرف گھر والوں کو دکھانے کی حد تک، تیاری صفر تھی، اس بار پوزیشن لینا اس کے بس کی بات نہیں تھی اور اس بات کا زین کو بھی اچھی طرح علم تھا۔ لیکن وہ ماہ نور کی محبت میں اتنا آگے جا چکا تھا کہ اس کے پاس اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

آخر کار امتحان میں صرف دو دن رہ گئے اور زین تیاری نہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھا۔ اسکول کی چھٹیاں

ہو چکی تھیں اس لئے وہ بارہ بجے کے قریب پریشانی کے عالم میں ندیم کے گھر کی طرف چل پڑا۔

جب ندیم کے گھر پہنچا تو گیٹ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ اس گھر میں آتا رہتا تھا اور ویسے بھی اس گھر میں کوئی عورت تو رہتی نہیں تھی کہ وہ شرماتا۔ وہ کھلے دروازے سے اندر آ گیا۔ سامنے ڈرائنگ روم کا دروازہ تھا جو نیم وا تھا اور اس سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ زین فوراً پہچان گیا کہ اندر ماہ نور اور ندیم ہیں۔ پھر اس نے جو کچھ سنا وہ سب سن کے اس کا زندہ رہنا معجزے سے کم نہیں تھا۔

''ندیم بہت ہو گیا اب مجھ سے اور نہیں ہوتا یہ ڈرامہ۔'' ماہ نور نے بے زاری سے کہا۔

''ابھی ہماری معاہدے کی مدت پوری نہیں ہوئی۔'' ندیم نے سگریٹ کا گہرا کش لگاتے ہوئے کہا۔

''تم نے کہا تھا کہ امتحان تک چلے گا، یہ سب کچھ اور اب امتحان میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔'' ماہ نور نے بدستور بے زاری سے کہا۔

''دیکھو میڈم اگر تم چاہتی ہو کہ میرے باپ سے شادی کر کے اس کی دولت پر عیش کر سکو اور میں سب کچھ ہوتا دیکھ کر شور نہ مچاؤں تو تمہیں وہ سب کرنا پڑے گا جو میں نے کہا اور جہاں تک مجھے پتہ ہے ابھی تک وہ کچھ نہیں ہوا جس کا میں طلب گار تھا۔ زین کا دامن اب بھی صاف ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسے تم سے محبت ہو گئی ہے۔'' ندیم نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

''تو تم کیا چاہتے ہو میں اس کے ساتھ زبردستی کروں۔ ندیم یقین مانو وہ لڑکا بہت ہی معصوم اور نیک انسان ہے، ورنہ ماہ نور کو دیکھ کر کوئی شریف نہیں رہتا۔''

''بند کرو یہ بکواس زین معصوم ہے شریف نیک ہے لائق ہے یہ میں بچپن سے سنتا آ رہا ہوں، کان پک چکے ہیں یہ بکواس سن سن کے، کیوں مجھ میں وہ کون سی خوبی نہیں جو زین میں ہے، وہ کون سی چیز ہے جو اس کے پاس تو ہے مگر میرے پاس نہیں۔ اگر وہ حد سے زیادہ خوب صورت ہے تو یہ قدرت کا کمال ہے۔ اگر وہ لائق ہے تو قسمت کی بات ہے۔ کیوں کہ میرے باپ نے میرے اور قریبی لوگوں نے اسے میرے لئے رول ماڈل بنا دیا ہے کیوں مجھے احساس کمتری کی گہرائیوں میں دھکیل دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ چلتا ہوں تو کیوں مجھے اپنا آپ چھوٹا لگتا ہے کیوں۔'' ندیم نے غصے کی شدت میں جلتی سگریٹ کو اپنی مٹھی میں مسل دیا۔

''یہ صرف حسد ہے اور کچھ نہیں۔'' ماہ نور نے منہ بنا کے کہا۔

''ہاں ہاں یہ حسد ہے تو حسد ہی سہی لیکن اس میں قصور زمانے کا ہے میرا نہیں، کاش زمانے نے اس میں اور مجھ میں کوئی فرق نہ رکھا ہوتا تو آج یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ بس ماہ نور کچھ دن اور صبر کر لو، خیر میں خود ابو سے کہوں گا کہ وہ تم سے شادی کر لیں۔ بس اس کو ایک بار میں برابر دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں جس شرمندگی کا سامنا بچپن سے کرتا آ رہا ہوں وہ بھی اس شرمندگی کا سامنا کرے وہ بھی کم نمبروں میں پاس ہو تا کہ اسے احساس ہو کہ کتنا دکھ ہوتا ہے خود کو کسی سے کمتر دیکھنا۔'' ندیم کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو چکا تھا۔

''ٹھیک ہے کچھ دن اور سہی لیکن اس کے بعد تم نے کوئی چکر چلایا تو یہ مت بھولنا کہ میں کوٹھے والی ہوں۔ ماہ نور نے زہرخند لہجے میں کہا۔

''ہاں پتہ ہے تمہاری حیثیت کا اسی لئے تو یہ کام تمہارے ذمے لگایا ہے۔'' ندیم نے شاطر انداز میں مسکرا کر کہا۔

اس گفتگو کو سننے کے بعد زین کو ایسا لگا جیسے وہ کسی تپتے صحرا میں کھڑا ہے، جہاں دور دور تک کسی انسان کا نام و نشان نہیں ہے۔ زندگی کی اس ناکامی کے بعد اسے لگا کہ وہ زندگی میں کبھی کامیاب ہی نہیں ہوا تھا۔ جیسے وہ سب کچھ کھو چکا ہو اس کا دامن شروع سے خالی تھا۔ اسے یہ بھی علم نہ ہو سکا کہ وہ کس طرح چپکے سے گھر واپس آ گیا۔ بنا ان دونوں سے کچھ کہے بنا کچھ بولے، بنا کوئی شکوہ نا ہی شکایت، اگر تھی تو بس ایک لامتناعی خاموشی اور وہ شعور کی دنیا میں تب واپس آیا جب گھر میں داخل ہوا تو ابا جان کو چارپائی پر لیٹے ہوئے دیکھا۔

ابا جان کی سوالیہ نگاہوں کو دیکھ کر اس کے ذہن

میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے آیا وہ جلدی سے ابا جان کے نزدیک ان کے گھٹنوں سے لگ کے بیٹھ گیا۔
''کیوں بیٹا خیریت تو ہے کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟'' انہوں نے زین کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ تو اس نے سرخ اور نمدار آنکھوں سے اپنے شفیق ابو کو دیکھا اور کہا۔ ''ابا میرا دل اب دنیاوی تعلیم سے بے زار ہو چکا ہے۔ میں آپ کی طرح ایک عالم بننا چاہتا ہوں۔ اور پھر اماں کی بھی تو یہی خواہش رہی تھی کہ ان کا بیٹا ایک عالم دین ہو۔'' زین کی بات سن کے ابا اسے کچھ دیر دیکھتے رہے اور پھر یک دم اسے کندھوں سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

''مجھے فخر ہے بیٹا تم پر، بہت سے موقعوں پر میں یہ بات تم سے کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں پایا، میں نے سوچا اگر اللہ نے تمہیں اپنا بندہ بنانا ہوگا تو خود بنائے گا اور اگر اس ذات کا فیصلہ تمہارے حق میں کچھ اور ہوا تو پھر میرا کہنا بھی بے کار ہے۔ آج تم نے فرزندی کا حق ادا کر دیا ہے۔ بے شک وہ اللہ ہی ہے جو انسان کے دلوں کے حال جانتا ہے۔ بیٹا میں آج ہی اپنے ایک دوست سے بات کرتا ہوں۔ بہت بڑا مدرسہ ہے ان کے شہر میں۔ تم وہیں رہ کر پڑھو گے۔ ''انشا اللہ'' اللہ بہت جلد تمہیں تمہارے نیک مقصد میں کامیاب کرے گا۔''

''انشا اللہ'' زین کے منہ سے بھی بے اختیار نکلا۔

☆......☆......☆

میں نے سگریٹ کا آخری گہرا کش لگایا اور اسے چلتی ٹرین کی کھلی کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔ ساتھ ہی سامنے کی سیٹ پر براجمان اس روشن اور نورانی چہرے والی ہستی کو دیکھنے لگا جو مجھے آپ بیتی سنا چکی تھی۔

معاف کیجئے گا مولانا صاحب ''یعنی مولانا زین العابدین'' کیا اس آخری دن کے بعد آپ کا اپنے دوست یا ماہ نور سے سامنا ہوا۔

میرے سوال پر وہ کھڑکی سے باہر اندھیرے میں ڈوبی ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھنے لگے۔ ''نہیں بس اتنا پتہ چلا کہ ماہ نور کی شادی عباس صاحب سے ہوگئی، بعد میں ماہ نور اور ندیم کا گھر میں اکثر جھگڑا رہتا تھا جس سے تنگ آ کر عباس صاحب نے ندیم کو نہ صرف گھر سے نکال دیا بلکہ اپنی جائیداد سے بھی عاق کر دیا۔ بعد میں ندیم کا اپنے ہی ایک دوست سے جھگڑا ہوگیا اور ندیم نے اسے قتل کر دیا۔ اب وہ جیل میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہے۔ شادی کے بعد اب تک ماہ نور بھی طرح طرح کی بیماریوں کا شکار رہی ہے۔ اس نے بہت بار مجھ سے مل کے معافی مانگنے کی کوشش کی لیکن ابا جان کی وفات کے بعد میں نے وہ گھر چھوڑ دیا۔ ساتھ ساتھ باجی پاکیزہ کی شادی ہو چکی تھی اس لئے میں نے بھی مدرسے میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ مستقل سکونت اختیار کر لی۔

استاد محترم بہت بار شادی کرنے پر زور دے چکے ہیں لیکن میں ہر بار یہ کہہ کے جان چھڑا لیتا ہوں کہ ''میں کسی سے شادی کرنے کے قابل نہیں۔ پتا نہیں شاید مجھ میں وہ اعتبار کرنے کی صلاحیت ختم ہوگئی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئے اور میں ان کو دیکھتا رہا۔ ''آخری عرض تم سے یہ ہے نوجوان دنیا کی لذتیں عارضی ہیں ان کی خاطر آخرت کے نا ختم ہونے والے انعامات کو کھو مت دینا، مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ جب تم جیسے نوجوانوں کو سگریٹ پیتے دیکھتا ہوں جو تمہاری صحت کے ساتھ ساتھ تمہاری سیرت کو بھی داغ دار کر رہا ہے۔

مولانا صاحب نے کچھ اس طرح سے کہا کہ میں تڑپ اٹھا، میں نے فوراً جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکالی اور اسے دونوں ہاتھوں سے مروڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ ''وعدہ رہا مولانا صاحب آئندہ کبھی اس گندی چیز کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔'' میں نے پرعزم لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دیئے۔ تھوڑی دیر بعد ان کا مطلوبہ اسٹیشن آ گیا تو وہ اترتے وقت مجھ سے گرم جوشی سے گلے ملنا نہ بھولے۔ ''اگر کبھی یاد آؤں تو میرے حق میں دعا کرنا۔'' یہ کہہ کر وہ گاڑی سے اتر گئے۔ اور میں خیالوں میں گم ہوگیا۔

عشق ناگن

ایم الیاس

قسط نمبر:16

چاهت خلوص اور محبت سے سرشار دلوں کی انمٹ داستان جو که پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی که دل کے هاتھوں مجبور اپنی خواهش کی تکمیل کے لئے بے شمار جان لیوا اور ناقابل فراموش مراحل سے گزرتے هوئے بھی خوشی محسوس کرتے هیں اور اپنے وجود کے مٹ جانے کی بھی پروا نهیں کرتے۔ یه حقیقت کهانی میں پوشیده هے۔

یہ دنیا رہے نہ رہے لیکن کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔ انہی الفاظ کو احاطہ کرتی دلگداز کہانی

وہاں تین بہت اونچے اونچے چوبی ستون ملا کر اس طرح کھڑے کئے گئے تھے کہ ان سے پھانسی کا کام لیا جاسکتا تھا۔ ان کے ملے ہوئے اوپری سروں کے قریب ایک بہت ہی وزنی چرخی موجود تھی جس کے ایک سرے پر پھندا نظر آیا تھا اور اس کا دوسرا سرا وہاں کھڑے دو بدہیبت اور خون خوار جلادوں کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔ اسی جگہ کئی بڑی بڑی چٹانیں بہت ہی موٹی اور مضبوط رسیوں سے بندھی ہوئی تھیں۔

پھانسی کا مفہوم تو وہ سمجھ گیا۔ لیکن چٹانوں کا مقصد اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس نے اپنے چہرے سے یہ تاثر دیا کہ وہ اس منظر سے خوف زدہ اور ہراساں نہیں ہے اور اس کے دل میں موت کی دہشت بالکل نہیں ہے۔ لیکن اس کے دل میں ایک انجانا سا خوف اسے لرزا سا دے رہا تھا۔ اس نے جل کماری کی طرف بے خوفی سے دیکھا۔

جل کماری اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے ہونٹوں پر ایسی استہزائیہ مسکراہٹ چپکی ہوئی جو اس بلی کی طرح جو چوہے کو شکار بنانے سے قبل ناامیدی اور مایوسی کی سی حالت میں ادھر ادھر دوڑتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی وحشیانہ چمک کہہ رہی تھی کہ اس سے بچنا ناممکن ہے۔

''تیار ہوجا مورکھ......!'' جل کماری نے اس سے انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ ''اب جو سمے تجھ پر ٹوٹنے والا ہے وہ تیرے شریر پر بڑا بھاری گزرنے والا ہے جسے تو سہہ نہ سکے گا۔''

اس لمحے آکاش کی حالت ایسی ہورہی تھی اسے بیان کرنے سے اس کی زبان قاصر تھی۔ وہ لحہ بہ لحہ دگرگوں ہونے لگی تھی۔ اعصابی انتشار کا آغاز ہوچکا تھا اس کی قوت ارادی پانی کے کسی حقیر بلبلے کی طرح بیٹھ چکی تھی لیکن وہ اس سنگین صورتحال کا مقابلہ کرنے پر مجبور تھا۔ اس کے سامنے ایسا کوئی راستہ نہیں تھا جس پر چل کر وہ جل کماری سے سمجھوتہ کرسکتا تھا یا اس کے اس مذموم عزائم پر عمل پیرا ہونے سے باز رکھ سکتا۔

جل کماری نے اس کے قریب کھڑے ہوئے مکروہ صورت جلادوں کو کسی نامانوس سی آواز میں کوئی حکم دیا۔ ان کے قدم بیک وقت مشینی انداز میں حرکت میں آئے اور وہ فضا میں تیرتے اس پر ٹوٹ پڑے۔

اس نے دفاع میں انہیں روکنا چاہا لیکن اچانک ہی اس کا بدن لرزہ سا گیا۔ نہ جانے وہ موت کا خوف تھا یا جل کماری کے کسی پراسرار حربے کا اثر کہ ان دونوں سے کوئی مزاحمت نہیں کرسکا اور انہوں نے اسے بڑی آسانی

سے اسے یوں بے بس کرلیا جیسے وہ محض موم کا پتلا ہو۔
اسے زمین پر گرادیا گیا تھا۔ پھر ان دونوں نے اس کی ایک ٹانگ پکڑلی اور سنگلاخ زمین پر گھسیٹتے ہوئے اسے ادھر لے چلے جہاں پھانسی کا پھندا جھول رہا تھا۔

آکاش کو ایسا لگا جیسے پتھروں کی نوکیں اس کے بدن کو چھلنی کر گئیں۔ وہ بے اختیار چیخنے لگا۔ لیکن وہ بہروں کی طرح چیخ وپکار پر کان دھرے بغیر اسے بے دردی سے گھسیٹتے رہے۔

پھانسی کے پھندے کے نیچے پہنچ کر ان میں سے ایک پھرتی سے اس کے سینے پر چڑھ گیا۔ اور رسی کا پھندا اس کی گردن میں ڈال کر اس کی گرہ اس طرح باندھنے لگا کہ جھٹکے کے ساتھ اسے اوپر لٹکانے کی صورت میں وہ پھندا مزید تنگ نہ ہوسکے۔ جوں ہی ڈھیلا پھندا تیار ہوا وہ اس کے سینے سے اتر گیا۔ اس نے تڑپ کے زمین سے اٹھنا چاہا لیکن اسی وقت دوسرے جلاد نے رسی کا دوسرا سرا تھاما۔ اور پھر اسے دور تک کھینچتا لے گیا تو آکاش کا تڑپتا بدن تیزی کے ساتھ فضا میں اونچا معلق ہوتا چلا گیا۔

اس کی چیخیں بڑی دردناک تھیں۔ اس کا بدن زخموں سے لہولہان ہوچکا تھا۔ گردن ڈھیلے پھندے میں پھنسی ہوئی تھی اور اسے دوران خون کے دباؤ کے باعث اپنی پیشانی کی رگیں پھٹتی ہوئی محسوس سی ہورہی تھیں۔ اس کا شعور جواب دے چکا تھا۔ اس کی عقل کام نہیں کررہی تھی۔ لیکن موت کا خوف بہت ہی ہیبت ناک ہوتا گیا۔
اس کے ہاتھ پھندے والی رسی پر پڑ گئے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے وہ رسی تھامی اور پورا بوجھ ہاتھوں پر ڈال کر چرخی کے ذریعے اوپر اٹھتی ہوئی رسی میں لٹک گیا تاکہ گردن کا کھنچاؤ کم ہوسکے اور وہ اپنی قوت کو مجتمع کرسکے۔

زمین سے کئی گز کی بلندی تک اٹھانے کے بعد اسے آہستہ آہستہ نیچے لایا گیا لیکن اس کے پیر زمین سے ٹکنے نہیں دیئے۔ ایک شخص رسی کا دوسرا سرا تھامے اسے معلق کئے رہا اور دوسرے مکروہ صورت جلاد نے اس کے قریب آکر اطمینان کے ساتھ وزنی چٹانوں سے بندھی ہوئی رسیوں کے سرے سے اس کی ٹانگوں اور ہاتھوں سے باندھنے شروع کردیئے۔

ان کے عزائم کی بو پاتے ہی وہ اچھل پڑا۔ پوری قوت سے تڑپ کے خود کو بچانا چاہا لیکن زمین سے پیروں کا اتنا فاصلہ تھا کہ وہ پیر ٹکا نہ سکا۔ اس جلاد نے بڑی بے دردی کے ساتھ چار وزنی چٹانیں اس کے ہاتھ اور پیروں سے باندھ دیں۔ جس سے وہ اور بے بس اور معذور سا ہوگیا تھا۔

جب دوسرا جلاد بھی اسے اوپر اٹھانے کے کام میں اپنے ساتھی کا ہاتھ بٹانے کے لئے آگے بڑھا تو وہ خود پر قابو نہ پاسکا۔ اور پھر اس نے خوشامدانہ لہجے میں اسے پکارنا شروع کیا۔ اس میں محبت کی مٹھاس بھردی۔

”میرے من کی رانی......! میری جان تمنا......! میری پیاری جل کماری......! میری محبت...... میرے سپنوں کی رانی......! تم بھول رہی ہو کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں...... دن رات ہم نے کس محبت سے گزارے ہیں...... ہم ایک دوسرے کی جان رہے ہیں...... یک جان دو قالب...... مجھے اس عذاب سے نجات دو...... ان شیطانوں سے چھٹکارا دلاؤ...... اپنی خواب گاہ میں لے چلو...... میں...... میں ایک غلام کی طرح تیری سیوا کروں گا...... میں...... تیرے چرنوں میں رہوں گا...... تو دنیا کی سب سے حسین اور سندر عورت ہے......“

”تو میری شان میں کویتا کہہ رہا ہے......“ وہ ہذیانی لہجے میں بولی اور پھر استہزائیہ سی ہنسی ہنس کے بولی۔ ”کیا تو مجھے بے وقوف سمجھ رہا ہے کہ میں تیری چال بازی کے فریب میں آجاؤں گی کہ اپنے حسن کی تعریف سن کے اپنے انتقام کی آگ بجھادوں گی اور تجھ پر مہربان ہوکے فیاضی سے نوازوں گی...... عورت بار بار دھوکا نہیں کھاتی ہے...... تو اپنی مدد کے لئے پکار اپنی سنگیت کو جو نچھاور ہوتی رہی تھی...... اپنی امرتا رانی کو سہائتا کے لئے بلا جو تجھے اپنی آغوش میں لے لے......“

پھر اس نے توقف کرکے زور زور سے قہقہے لگائے اور پھر اس نے دونوں جلادوں کو اشارہ کیا کہ وہ اپنا کام شروع کریں۔ ان جلادوں نے حرکت کی تو آکاش کا بدن آہستہ آہستہ اوپر اٹھنا شروع ہوا۔ اذیت ناک موت کے

بعد اسے اس کے منہ سے بے معنی چیخیں اور آوازیں نکلنے لگیں۔ پھر اس نے اپنی ٹانگوں میں برقی جھٹکے سے محسوس کئے۔ ایسا ہی اس نے اپنے ہاتھوں پر بھی محسوس کیا۔ اس کے ساتھ ان چاروں میں سے ایک ایک چٹان کا بوجھ اس کے ہاتھ اور پیر سے بندھا اٹھنے لگا۔ بڑے کرب ناک لمحات تھے...... وہ اذیت سے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ اسے اپنے ٹخنوں، گھٹنوں، کولہوں، کلائیوں، کہنیوں اور بازوؤں کے جوڑ نکلتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کا جسم تڑپنے تک کے احساس سے محروم ہو چکا تھا۔

گردن تک بندھے ہوئے ڈھیلے پھندے کی رسی اس کی کھال میں کسی چاقو کی دھار کی طرح اتری جا رہی تھی۔ لیکن اس ظالم اور اجنبی سرزمین پر کوئی ایسا نہ تھا جو اس پر رحم کھاتا اور اسے اس اذیت سے نجات دلاتا۔

چند گز اوپر لے جا کر ان دونوں نے رسی چھوڑ دی اور اس کی آنکھوں کے سامنے سیاہ دائروں کا ایک بھنور سا گھوم گیا۔ وہ ان چٹانوں میں بندھا پوری شدت سے زمین پر گرا۔ ان دونوں نے اسے سنبھلنے اور سانس لینے کی بھی مہلت نہیں دی اور پھر اسے اوپر اٹھانا شروع کر دیا، ان کی یہ حرکت بڑی ظالمانہ تھی۔

اس کے بدن کی ساری رگیں اور پٹھے جواب دینے لگے۔ جس عذاب میں اسے مبتلا کیا گیا وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بے رحمی اور شقاوت کی یہ صورت حال بالکل ہی بے مثال تھی۔

اس بار انہوں نے اسے کچھ اوپر لے جا کر رسی چھوڑی اور پوری سنگ دلانہ مہارت کے ساتھ چٹانوں کے زمین پر لگنے سے قبل ہی ہاتھ روک لئے...... اس کے پورے وجود پر قیامت گزر گئی۔ بدن میں درد کی ناقابل برداشت ٹیسیں دوڑ گئیں۔ ہڈیوں کے چٹخنے کی سی آوازیں فضا میں کڑکڑائیں اور وہ اندوہناک چیخیں مارتا بے ہوش ہو گیا۔

واقعی جل کماری نے سچ کہا تھا کہ اس کے عتاب سے وحشت زدہ ہو کر اسے موت کی خواہش ہونے لگے گی اور زندگی اس کا روگ بن جائے گی۔ وہ مہیب جھٹکا اور ہڈیوں کی کڑکڑاہٹیں اس کی موت کا پیغام نہ بن سکیں۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ وہ بے ہوشی کی شفیق آغوش میں زیادہ دیر تک کھویا نہ رہ سکا۔

جب وہ بیدار ہوا تو اس نے خود کو زمین پر پڑا ہوا پایا۔ اس کے گلے میں ابھی تک رسی کا پھندا پڑا ہوا تھا۔ ہاتھ پیر چٹانوں سے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے بدن کو حرکت دینے کی کوشش کی تو اس کی بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ اس کے بدن کے سارے جوڑ اتر چکے تھے اور وہ مکمل طور پر معذور اور اپاہج ہو چکا تھا۔

”جل کماری......!“ اس نے اذیت میں ڈوبی چیخوں کے دوران میں گناہوں اور عذاب کی اس سرزمین کی ملکہ کو پکارا جو بدچلن...... بدکار...... آوارہ...... ہوس پرست اور ظالم قسم کی تھی۔ جو اس وقت وہ اس کی دسترس میں تھا۔

اس کی کرب ناک آواز کی بازگشت جل منڈل کے غار کی سنگین چٹانوں سے ٹکرا کے دیر تک گونجتی رہی۔ لیکن اسے اس کا کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ وہاں شاید اکیلا پڑا رہ گیا تھا۔ کوئی ہوتا تو اس کی یہ چیخیں سن کے ضرور آتا۔

اس کی حالت مردوں سے بھی بدتر تھی۔ وہ بے حس و حرکت پڑا تھا لیکن بری طرح چیختا ہی جا رہا تھا۔ اور شدت سے بے ہوشی کی آرزو بھی کرنے لگا۔ لیکن درد کی ناقابل برداشت ٹیسیں بھی اسے بے ہوش نہ کر سکیں۔

جو چند لمحے تھے اس پر اس حالت میں صدیاں بن کے گزرنے لگے۔ ایک ایک پل اس پر قیامت بنا رہا۔ پھر اسے جل کماری ایسی حالت میں نظر آئی کہ جو توبہ شکن تھی...... وہ حیوان نظر آتی تھی۔ یہ حالت اس نے آکاش کو جلانے کی غرض سے کی تھی۔ اس کا چہرہ فتح مندانہ مسکراہٹ سے گلنار ہو رہا تھا۔ اس کے عقب میں وہی دو جلاد کسی کھولتے ہوئے سیال کا بھاپ اڑاتے برتن سنبھالے چلے آ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اس سیال سے اسے جھلسا کے مار دیں گے۔

”سنگیت کیسی سندر اور شعلہ مجسم ناری تھی۔“ جل کماری نے اس کے قریب آ کر زہر میں بجھی ہوئی آواز

میں کہا۔

"وہ جو بھی جیسی بھی تھی لیکن تمہارے سامنے کچھ بھی نہ تھی......" وہ پوری قوت سے بولا۔ "تم مجھے ختم کردو...... مجھے صرف موت چاہئے۔ میں ایک پل بھی زندہ رہنا نہیں چاہتا......"

"نہیں میری جان آکاش جی......!" وہ حقارت بھرے لہجے میں بولی۔ "ہم پاپ نہیں کرتے۔ بلکہ مہمانوں کی بڑی عزت اور سیوا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ تم جیسے لوگ یوں بھی بڑی لمبی عمریں پاتے ہیں...... ہم ابھی تمہیں ایک عرصہ مہمان رکھیں گے...... جل منڈل کی دھرتی کتنی سندر ہے۔ اس کا اندازہ تمہیں ہوگیا ہوگا۔ میں نہیں چاہتی کہ اسے تمہارے خون سے پلید کردوں۔"

"جل کماری......" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں پھر نفسیاتی حربہ آزمایا۔ "تم بلاوجہ اور ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو رہی ہو۔ تم ذرا ٹھنڈے دل سے بچار کرو...... زندگی بڑی حسین، رنگین اور عیش سے گزارنے کے لئے ہوتی ہے نہ کہ اسے انتقام کی نذر کرنے کے لئے...... تم شما کردو گی اور محبت کی بھیک دو گی تو میں ایک ایسا جیون ساتھی ثابت ہوں گا جو تمہارے چرنوں میں جیون کا ایک ایک لمحہ گزاروں گا...... دیکھو...... سوچو...... اس سنسار میں تم...... چودھویں کے چاند سے کہیں حسین ہو......"

"تم کتنی پیاری پیاری باتیں کرتے ہو اور اس میں کتنی مہارت رکھتے ہو......؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "زندگی کا سپنا دکھا رہے ہو...... میں تمہیں کسی حالت میں مرنے نہیں دوں گی...... تمہیں ایک ایسی زندگی دوں گی جس کا تم وہم و گمان بھی نہیں کرسکتے ہو...... میرے آکاش جی......! ابھی میرے یہ سیوک کھولتا ہوا تیل تمہاری آنکھوں اور تمہارے کانوں میں ڈالیں گے پر تم زندہ رہو گے...... میں وچن دیتی ہوں کہ تمہیں اس سے تک مرنے نہیں دوں گی جب تک میرے بس میں ہوا......"

آکاش کا بدن لرزنے لگا۔ کپکپاہٹ کے ساتھ ہی اترے جوڑوں میں درد کی ناقابل برداشت لہریں ابھریں اور وہ کسی ذبح ہوتے ہوئے بھیڑیے کی طرح چیخنے لگا۔

اس کی مصیبت پہلے ہی کچھ کم نہ تھی اب سزاؤں کا نیا دور شروع ہونے والا تھا۔ کانوں اور آنکھوں میں کوئی تیل ڈالنا واقعی ایک اچھوتا شیطانی خیال تھا۔ اس وقت تک اس کی آتما خوف و دہشت سے لرز رہی تھی۔ اس سے انجانے میں جو ایک حماقت ہوگئی تھی وہ اس کے باعث یہ سزا بھگتنے پر مجبور تھا۔

وہ دونوں جلاد کھولتے ہوئے تیل کا برتن لئے اس کے قریب آبیٹھے۔ اس نے انہیں دھکیلنے کی کوشش میں ہاتھوں کو حرکت دینی چاہی اور تکلیف کی شدت سے تڑپ اٹھا۔ اس کی مجبوری اور کسمپرسی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور اس ہولناک مصیبت سے نجات کی کوئی صورت اور تدبیر دور دور نظر نہیں آرہی تھی۔

ان میں سے ایک جلاد نے پتلی سی نلکی میں بھر کے کھولتا ہوا تیل برتن میں سے نکالا اور اس کی طرف بڑھا۔ آکاش ہلنے جلنے سے معذور تھا بس چیختا ہی رہا۔

"چیخ کیوں رہے ہو......؟" جل کماری کی ہنسی بڑی زہریلی تھی۔ "تم آخری بار مجھے اور میرا حسین اور گداز بدن دیکھ لو۔ اس لئے اندھے ہونے کے بعد اسے تصور میں دیکھتے رہو...... دیکھو...... میں کتنی حسین اور قیامت لگ رہی ہوں...... میرے انگ انگ سے کیسی مستی ابلی پڑتی جارہی ہے......"

"تو...... تو کتیا لگ رہی ہے......" آکاش نے نفرت، غصے اور حقارت سے کہا۔ "کمینی...... رذیل...... بدچلن...... کاش......! میں مرتے مرتے تیرا گلا دبا سکتا...... تیرے منہ پر تھوک سکتا...... تجھے ایک لات رسید کرسکتا......"

"تم دونوں کیا تماشا دیکھ رہے ہو......؟ میں نے تمہیں تماشا دیکھنے کے واسطے بلایا......؟" وہ چراغ پا ہوگئی۔ "دیکھ نہیں رہے ہو مجھے کیسی بے ہودہ گالیاں بکتا جارہا ہے...... تم سنتے جارہے ہو۔"

"سب سے پہلے اس کی کون سی آنکھ ضائع کریں۔" ایک جلاد نے پوچھا۔

''پہلے اٹی آنکھ میں......'' اسے جل کماری کی سرد سفاک آواز سنائی دی۔ ''پہلے اس کے دیدے پھوڑ دو جن سے یہ سنگیت کے بدن کو بڑی محبت اور ندیدی نظروں سے دیکھتا اور اس پر ٹوٹ پڑتا تھا۔''

اس کی ایک طویل اور کرب ناک چیخ کے ساتھ ہی اس کی بائیں آنکھ میں وہ کھولتا ہوا تیل ڈالا گیا۔ اس نے ایسا محسوس کیا جیسے اس کی آنکھ میں انگارے بھر دیئے گئے ہوں۔ اس کی بینائی جاتی رہی۔ ایسی شقاوت تھی جس کی انتہا نہ تھی۔ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور بلک کر رقت آمیز آواز میں پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا...... پھر اس نے بڑی دل سوزی سے ایشور کو پکارا۔ جس نے اسے اس کے گناہوں کی پاداش میں اسے حقارت، تذلیل اور اذیت کے اس عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ مصیبت اور تنہائی کے اس پر ہول عالم میں گڑگڑا کے اسے کرپا کے لئے پکارتا اور روتا جا رہا تھا...... اور جل کماری اس کی بے بسی دیکھ کے ہذیانی انداز میں زور زور سے قہقہے لگاتی رہی جس میں تسکین اور آسودگی نمایاں تھی۔

''اب اس کی دوسری آنکھ لے لو......'' چند ثانیوں کے بعد جل کماری کی آواز گونجی۔ ''یہ آنکھ صرف اور صرف امرتا رانی پر مرکوز ہوتی تھی...... اس کی آنکھ میں میں نے ہر لحہ امرتا رانی کا عکس دیکھا ہے...... اب بھی اس میں وہ کمینی بسی دکھائی دیتی ہے...... پھوڑ دو...... تیل سے جلا کے ضائع کر دو...... اب وہ سنگیت کو اور نہ امرتا کو دیکھنے کے قابل رہ سکے گا۔''

اس پر ہراس اور اضطراب کی وہ کیفیت تھی اور اس کا دماغ مفلوج ہو چکا تھا کہ جل کماری کے الفاظ کا اس پر کوئی ردعمل نہ ہو سکا...... وہ جو وقفہ وقفہ سے اس پر ایذا اور تشدد کر رہی تھی جس کے نتیجے میں اس انتہائی منزل کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ بس اس اذیت کا لامتناعی احساس باقی رہ جاتا ہے۔ اس کی شدت کوئی معنی نہیں رکھتی۔

عین اس وقت جب جل کماری کا ایک گرگا کھولتے ہوئے تیل سے بھری نلکی اس کی داہنی آنکھ میں ڈالنے والا تھا کہ اس کی پرارتھنا قبول کر لی گئی۔ ایک ثانیہ کے لئے وہ اپنی تکلیف کو بھول کے...... خوش، ششدر حیران رہ گیا۔ اسے یقین نہ آیا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے سپنا نہیں ہے وہ حقیقت ہے۔

امرتا رانی اپنے انسانی روپ میں سنگیت سمیت آ پہنچی تھی۔ اس کے چہرے پر غصہ تھا۔ وہ سرخ ہو رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھی۔ جن میں قہر و غضب ظاہر ہو رہا تھا۔

امرتا رانی نے ان دونوں مکروہ اور گھناؤنی صورتوں کی طرف ہاتھ لہرایا۔ ایک شعلہ کوندا بن کے ان کی طرف لپکا اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا گوشت جلنے کی تیز چراند سے بھر گئی۔ پل بھر میں دھواں صاف ہوا تو وہاں ان دونوں کا نام و نشان نہ رہا تھا۔

''امرتا رانی......!'' جل کماری کی گرج دار آواز گونجی۔ ''تو جل منڈل میں اپنی شکتی کا زور دکھا کے ہتیا مول لے رہی ہے...... اس مورکھ ہرجائی کے لئے...... تو ہٹ جا...... دفع ہو جا...... میرے منہ نہ لگ...... یہ تجھ سے اپنا وچن نہ نبھائے گا...... اگر تو نہیں ہٹی تو میرے سیوک ہی تجھے ٹھکانے لگا دیں گے۔''

''میں جان کر جل منڈل آئی ہوں کہ اس بار تجھ سے کھلی یدھ ہوگی...... مجھے مار کے ہی تو آکاش جی کو چھو سکے گی......'' وہ غضب ناک لہجے میں بولی اس کی آواز غیر متزلزل سی تھی۔

''اچھا تو...... تو...... مجھ سے مقابلہ کرے گی؟'' جل کماری کی وحشیانہ آواز ابھری۔

پھر بے اختیار آکاش کی چیخیں نکل گئیں۔ کیوں کہ جل کماری نے کوئی منتر پڑھ کے اس پر پھونک ماری تو اس کا بدن ان چٹانوں سمیت امرتا رانی پر گرنے کے لئے تیزی سے زمین سے اٹھا تھا۔

امرتا رانی کسی نامانوس سی زبان میں ہذیانی انداز سے چیخ کر سرعت سے آکاش کی طرف لپکی اور اس پر گر پڑی تو اس کے گرنے اور بوجھ سے آکاش کی پے در پے چیخیں نکل گئیں۔ اس نے لمحے کے لئے ایسا محسوس کیا کہ اس کا دل ڈوبتا جا رہا ہے۔ آکاش کو ایسا لگا کہ جل کماری

نے اس پر کوئی منتر پڑھ کے پھونکا ہے تاکہ وہ امرتا رانی اسے موت کا نشانہ بنادے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ امرتا رانی کے ہاتھ میں منکا تھا۔ جسے وہ تیزی سے آکاش کے جسم پر پھیر رہی تھی۔

منکے کا لمس اس کے لئے ایک نئی زندگی کی نوید بن گیا۔ آن کی آن میں سارے زخم بجلی کی سرعت سے ایک ایک کرکے اس طرح سے مندمل ہوگئے جیسے کوئی زخم نہ تھا۔ اور نہ ہی کوئی جوڑ بری طرح درد کررہا تھا۔ جسم پر جو خراشیں وہ ایسی مندمل ہوئیں جیسے ان کا وجود ہی نہ تھا۔ پھر گلے سے رسی نکل گئی۔ پھر امرتا رانی نے اس کی متاثرہ آنکھ کو جذباتی انداز سے بے تحاشا چوما اور پھر اس پر منکہ پھیرا۔ جس سے درد اور جلن تو ختم ہوگئی۔ امرتا رانی کے شیریں اور گداز ہونٹوں اور منکہ نے اس کی آنکھوں کی ساری جلن اور درد کو جذب کرکے فرحت سی دوڑادی تھی لیکن اس کی بینائی واپس نہ آسکی۔ پھر جب امرتا رانی اپنا چہرہ اوپر اٹھانے لگی تو اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں بھر کے اس کے شیریں لبوں پر اپنے ہونٹ رکھ کے رخساروں کو بوسہ دیا۔

امرتا رانی ان لمحات کو شاید طول دے دیتی اور امر بنا دیتی اگر جل کماری اس کی جان پر بنی ہوتی اور ایک ان جانا سا خطرہ نہ منڈلا رہا ہوتا...... وہ اپنی بینائی کے زائل ہونے کے غم کا خیال زیادہ نہ کرسکا۔ کیوں کہ اب جل کماری اور امرتا رانی ایک دوسرے کے مقابل جانی دشمنوں کی طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈالے غرا رہی تھیں۔

اب چوں کہ اس کی توانائی بحال ہوچکی تھی۔ درد اور کمزوری بالکل بھی نہیں رہی تھی۔ وہ کسی صحت مند انسان کی طرح محسوس کررہا تھا۔ اس لئے پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور سنگیت کے پہلو میں پہنچ گیا۔ سنگیت کے چہرے پر تشویش کی گھٹا سی تھی۔ اس نے سنگیت کا ہاتھ محبت بھرے انداز سے تھام لیا اور اس کے رخسار تھپ تھپا کے اسے دلاسا دیا۔

امرتا رانی کے چہرے پر اعتماد اور غیض وغضب کا ایک بے کراں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس کی دہکتی ہوئی سرخ آنکھیں جل کماری کے بدن کی ہر جنبش پر مرکوز تھیں۔ ادھر جل کماری کی حالت ایسی تھی کہ وہ قطعی اپنی دشمن امرتا رانی سے جیسے خائف نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر عزم کے ساتھ جھن جھلاہٹ بھی چھائی ہوئی تھی۔ وہ کسی خون خوار درندے کی سی کیفیت امرتا رانی کو اس طرح گھو رہی تھی جیسے پھاڑ کھا جائے گی۔

اچانک امرتا رانی نے اپنی دونوں منجمد آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس نے کسی منتر کا جاپ کیا اور آسمان کی طرف پھونک ماری تو فضا عقابوں جیسی بڑی سیاہ چمگادڑوں سے بھرنے لگی۔ وہ چمگادڑیں عجیب سی وحشت ناک آوازیں نکالتی ہوئی تیزی سے جل کماری کی طرف لپکیں جس کے تن پر ایک دھجی تک نہ تھی۔ ایک کتیا کی سی حالت میں کھڑی تھی۔ لیکن وہ ذرہ برابر بھی خائف نہ ہوئی۔ چمگادڑوں کے قریب آتے ہی اس نے منہ فضا میں اٹھا کے پھونک ماری اور خون آشام پرندوں کا وہ ہجوم اس طرح غائب ہوگیا جیسے وہ دھویں کا غبار رہا ہو اور ہوا کا تیز جھونکا اسے اڑا کے لے گیا ہو۔

امرتا رانی کے اس حملے کو ناکارہ کرکے جل کماری نے ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا اور اپنی داہنی ٹانگ تحقیرانہ انداز سے اچھالی۔ اس کا فوری ردعمل ہوا۔ جل منڈل کی سرخی مائل زمین کی چھاتی شق ہونے لگی اور جگہ جگہ سے خون آشامی سخت جان بھیڑیے نکل کر امرتا رانی کی طرف بڑھنے لگے۔ جو قد آور، جسیم تھے اور خون کے پیاسے اور بے حد خوں خوار...... ان کے پنجے اتنے بڑے تھے کہ وہ ایک بڑے کتے یا بکری بھیڑ کو دبوچ لیں تو ان کی گرفت سے نکل نہ پائیں۔ امرتا رانی جیسے پہلے ہی سے جوابی حملے کے لئے تیار تھی۔ جیسے اسے اندازہ تھا کہ جل کماری اس پر کون سا وار کرے گی۔ پھر یک لخت فضا سے ان خون آشامیوں، سخت، نوکیلے اور دس دس کلو کے پتھروں کی بارش شروع ہوگئی۔ ان پتھروں نے انہیں شدید زخمی اور لہولہان کردیا اور وہ بری طرح کراہتے اور تڑپتے ہوئے مرنے لگے۔ جو جو جانور زخمی ہوجاتا تھا وہ زمین میں پانی کی طرح جذب ہوجاتا۔ اس طرح ایک ایک کرکے وہ

ایسے تحلیل ہوئے کہ مٹی خون آلود ہوتی گئی۔ پھران کا نام و نشان رہا اور نہ ہی ان کا خون......

امرتا رانی کی ساری توجہ جل کماری کے ہر حربے کو ناکام بنانے اور اسے عبرت ناک شکست دینے پر مرکوز تھی اور اکاش سکتے کی سی حالت میں کھڑا ان دونوں کا مقابلہ دیکھ رہا تھا۔ سنگیت اس کا ہاتھ محبت اور مضبوطی سے تھامے لگ کر کھڑی ہوئی تھی۔ اس مقابلے کے نتیجے اور امرتا رانی کی کامیابی پر اس کی زندگی کا دار و مدار تھا...... اگر کسی وجہ سے جل کماری کامیاب ہوتی تو اذیت اور تکلیف کا ایک نیا سلسلہ اس کا مقدر بن جاتا۔ جب کہ امرتا رانی کی فتح مندی اس کی زندگی اور سلامتی تھی۔ اور پھر جل منڈل کی اسیری سے رہائی اور نیلم کی بازیابی اور پھر خوش و خرم ازدواجی زندگی جو خواب ناک ماحول کا خوش گوار پیغام ہوتی جس کے سپنے کا عکس اس کی آنکھوں میں لہراتا دکھائی دیتا تھا۔

معاً جل کماری نے اس کی طرف دیکھا اور امرتا رانی کو غافل پا کر تاریکی میں اپنے ہاتھوں کو پراسرار انداز سے حرکت دی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آسکا۔ اس سے پہلے کہ وہ سمجھنے کی کوشش کرتا، سنگیت بڑے زور سے چیخ پڑی، اس نے فوراً ہی سنگیت کو سنبھالنا چاہا۔ کیوں کہ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ سنگیت پر کیا بیتی ہے۔ جل کماری کے اس پراسرار کے باعث ان دونوں کے پیر زمین جم کر اس کا حصہ بن کے رہ گئے تھے اور وہ ایسے جامد ہوئے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے ہلنے تک سے معذور ہوگئے تھے۔

سنگیت کے اس اچانک اور غیر متوقع چیخنے چلانے پر امرتا رانی چونکی۔ جیسے ہی اس کی توجہ پل بھر کے لئے سنگیت کی جانب مبذول ہوگئی جل کماری کو اپنا داؤ آزمانے کا موقع جیسے مل گیا۔ اس نے جیسے ہی اپنے ہاتھ پر کوئی منتر پڑھ کر پھونکا ایک دم سے اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ لمبا سا چابک آگیا۔ اس نے لہرا کے امرتا رانی کے بدن پر رسید کیا۔ شڑاپ کی پرشور آواز امرتا رانی کی تلملاتی ہوئی چیخ میں ڈوب گئی۔ اور وہ اس اچانک وار سے اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ چابک کئی بل کھا کے اس کے بدن پر اس طرح لپٹ چکا تھا جیسے اسے کسی نے اپنی آغوش میں لے لیا ہو۔ جل کماری نے اسے جو بے بس پایا تو اسے اپنی جانب بے رحمی سے لپیٹنے لگی تھی۔

''آکاش تجھے اپنی بانہوں میں بھر کے تیرے چہرے اور ہونٹوں سے خوش کرتا رہا ہے۔'' استہزائیہ انداز سے بولی۔ ''لے اب اس چابک کے مزے...... بڑا مزا آرہا ہوگا......!''

امرتا رانی مغلوب ہوچکی تھی۔ ایسے اس چابک کے پھندے سے نجات مشکل ہی نظر آتی تھی۔ اس سے دیکھا نہ گیا۔ وہ سخت مضطرب ہوگیا۔ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا اور اس نے اضطراری کیفیت میں سنگیت کا گداز ہاتھ پوری قوت سے اپنی کانپتی ہوئی ہتھیلیوں کے درمیان بھینچ لیا۔

جل کماری اپنی اس کامیابی پر اس قدر خوش، سرور اور نازاں ہوگئی تھی، وحشیانہ انداز میں قہقہے لگارہی تھی۔

''دیکھ میں تجھے کیسا ناچ نچاتی ہوں...... پھر اس چابک سے اس کی کھال اور گوشت ادھیڑتی ہوں کہ تم دونوں کا عشق خاک میں مل جائے گا۔'' وہ بڑے تکبر سے بولی۔

اس کی بے ربط بکواس جاری تھی کہ اچانک اس نے امرتا رانی کے ہاتھ میں دیا ہوا منکہ فضا میں اڑ کے جل کماری کی طرف جاتے دیکھا، جل کماری اس منکہ کو اپنی سمت آتا دیکھ کے سراسیمہ اور حد درجہ خائف ہوگئی۔ چابک اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے غائب ہوگیا اور وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپانے لگی لیکن اس کی کوشش ناکام سی رہی۔ منکہ خاصی تیز آواز کے ساتھ اس کی پیشانی پر بھنوؤں کے وسط میں لگا۔ اس قدر زوردار چوٹ تھی کہ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی وہ کراہ کے پیچھے الٹ گئی۔ اس کی پیشانی کے زخم سے خون کی موٹی سی دھار ابل پڑی۔

ادھر امرتا رانی غیض و غضب میں بل کھاتی سیدھی ہوچکی تھی۔ اس کا منکہ جل کماری کو زخمی کر کے فضا میں تیرتا ہوا دوبارہ اس کے پاس واپس پہنچ چکا تھا۔

امرتا رانی قہر آلود آواز میں کسی نامانوس سی زبان میں چلائی۔ دوسرے لمحے کسی سمت سے گھٹے ہوئے

جسموں اور دیوہیکل چھاتیوں والے تین آدمی نمودار ہوئے اور بھوکے درندوں کی طرح جل کماری کے بے حجاب بدن پر ٹوٹ پڑے تو جل کماری ان کی دسترس سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کی غرض پیر پٹخنے اور جدوجہد کرنے لگی۔ وہ دیو قامت شخص تھے اور چٹانوں کی طرح سخت جان تھے جن کے قابو سے نکلنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ ایک ایسا دل خراش منظر تھا جو درندگی میں ہو...... سنگیت کا نرم و نازک دل جل کماری کی حالت دیکھ کے ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔ ان تینوں میں سے دو نے جل کماری کو اس قدر مضبوطی سے بے بس کیا ہوا تھا کہ وہ مخصوص انداز میں کروٹ لے کے جل ناگن کے روپ میں نہیں آسکتی تھی۔

درد و اذیت میں ڈوبی ہوئی جل کماری کی پے در پے چیخوں نے اس کے وجود میں ایک نیا جوش پیدا کردیا تھا۔ آکاش کے دل میں ایک انجانی خواہش نے جنم لیا کہ وہ اپنی جگہ سے دوڑتا ہوا جل کماری کو درندگی کا نشانہ بنانے والوں کے پاس جاکر ان کی پیشانی کو چوم لے۔ جل کماری نے اس پر ظلم و ستم کے کیسے کیسے پہاڑ توڑے تھے، بینائی زائل کردی تھی، وہ کسی شقی القلب درندہ بنی ہوئی تھی۔ لیکن وہ اپنے ارادے پر عمل کرنے سے قاصر تھا۔ کیوں کہ اس کے قدم زمین پر جمے ہوئے تھے اور وہ جل کماری کو نفرت اور غصے سے دیکھے جارہا تھا۔

جل کماری پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس کا چہرہ خون آلود ہونے لگا تھا اور امرتا رانی پرسکون انداز میں کمر پر ہاتھ رکھے اسے دیکھے جارہی تھی۔ اچانک جل کماری نے روتے روتے زور سے کچھ اجنبی الفاظ کہے اور فضا میں بھیانک پھنکاریں گونج اٹھیں۔ ہر سمت سے جل ناگوں کے غول کے غول امڈ پڑے۔ اور ان تینوں وحشی صفت آدمیوں پر ٹوٹ پڑے جنہوں نے جل کماری سے اپنی حسرت اور تمام ارمان ہر طرح سے پورے کئے تھے۔

یہ رنگ دیکھ کے امرتا رانی لمحے کے لئے سراسیمہ سی ہوگئی۔ پھر اس نے امرتا رانی کو کسمساتے دیکھا۔ پھر وہ اس کے سنگیت کے درمیان آگئی۔ پھر ان دونوں کے قدم زمین نے جو جکڑ رکھے تھے انہیں اپنے بندھن سے آزاد کردیا۔

ساتھ ہی جل ناگوں کے ہجوم پر خرگوش صورت جیسی صورت والے کالے کالے چوپایوں نے حملہ کردیا۔ ایک عجیب و غریب حیوان جو کہ چھڑ چکا تھا۔ جل کماری کا اس ہجوم میں کہیں پتا نہیں تھا۔ وہ روپوش ہوچکی تھی لیکن امرتا رانی کو اس کی اور سنگیت کی فکر تھی۔ وہ اس بھیڑ کے درمیان سے نکل کے ان کے قریب آئی اور ان کے ہاتھ پہلوؤں میں دبا لئے۔

"تم دونوں میرے ساتھ بھاگتے ہوئے آؤ...... یہاں مہان شکتیوں کا یدھ چھڑ چکا ہے۔ کچھ بھروسا نہیں کہ شکتیوں کے اس ٹکراؤ میں ساگر کا چنگھاڑتا پانی...... گپھا کے ٹکڑے اڑا کے جل منڈل میں گھس آئے...... اس لئے اب یہاں رکنا ہتیا کے برابر ہے...... میرے ساتھ بھاگتے آؤ...... دیر نہ کرو......" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں جلدی جلدی بولی۔

سنگیت نے ان کا ہاتھ بڑی مضبوطی سے تھام لیا اور وہ دونوں امرتا رانی کے پیچھے دوڑ پڑے۔

وہ تینوں بڑی تیز رفتاری سے دوڑتے رہے۔ جل منڈل کی سرزمین پر ہر طرف جل ناگوں اور عجیب الخلقت سیاہ چوپایوں کے درمیان گھمسان کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ لیکن امرتا رانی کے سنگ ہونے کے باعث وہ کائی کی طرح جھپٹ کے ان کے لئے راستہ بناتے جارہے تھے۔

ذرا ہی دیر میں سنگیت بری طرح ہانپنے لگی۔ لیکن اسے اپنی زندگی جان سے کہیں عزیز تھی۔ آکاش نے امرتا رانی کی طرف دیکھا تو وہ آکاش کے خیالات بھانپ گئی۔

"جانے اس یدھ کا انجام کیا ہو......؟ میں کچھ بتا نہیں سکتی...... اس بے چاری کو چھوڑنا اچھا نہیں ہوگا...... تم ایسا کرو کہ اسے گود میں اٹھالو یا پھر کمر پر لادلو۔" امرتا رانی نے دوڑتے دوڑتے کہا۔

پھر آکاش نے جھک کر سنگیت کو اپنی پشت پر کسی گٹھری کی طرح لادلیا۔

وہ اپنی پوری قوت سے دوڑتے رہے۔ عجیب و غریب حیوانی جنگ جل منڈل کے چپے چپے پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کا زور ٹوٹنے کے دور دور تک آثار نظر نہ آتے تھے۔

آخر کار انہیں سمندری پانی کے تنگ گپھا سے گزرنے کا شور سنائی دینے لگا۔

وہ پرشور آواز اس وقت اسے پرکشش محسوس ہوئی تھی کیوں کہ وہی اس کی رہائی اور آزادی کا نغمہ تھی۔ جل منڈل کی خوف اور خون آشام سرزمین سے نجات کا راستہ۔

پھر وہ جل منڈل والے خشک غار اور سمندری گپھا کے سنگم سے اتنے قریب پہنچ گئے کہ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کی پھوار ان کے جسموں پر پڑنے لگی۔ سنگیت اس کے کندھوں پر بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کا جسم بھی تھکن سے خستہ ہو رہا تھا۔ سانس سینے میں سما نہیں رہا تھا لیکن وہ محض جذبے کے سہارے نجات پانے کے لئے اور آرزو کو شرمندہ تعبیر کرنے کے مقصد سے دوڑ رہا تھا۔

اور جب سمندری گپھا کا دہانہ چند قدم رہ گیا تو امرتا رانی کے دوڑتے ہوئے قدم زمین پر جم کے رہ گئے۔

اس کی حالت کسی ذبح ہونے والے بکرے جیسی تھی۔ کیوں کہ جل کماری خوف ناک اور فیصلہ کن تیوروں کے ساتھ کھڑی تھی۔ درمیان میں سمندری گپھا تھی۔

بے اختیار سنگیت اس کے کندھوں سے پھسل کے گر پڑی اور فوراً ہی ہوش میں آ گئی۔

''لو میری جان آکاش پیارے......!'' امرتا رانی نے اپنا منکہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور پھر اس نے اپنا چہرہ بڑے پیار سے سرگوشی کی۔ ''سنگیت کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رہنا اور سنگیت تم بھی...... اور ہاں ہوشیار اور چوکنا رہنا...... میرا اشارہ پاتے ہی ساگر کے دھارے میں تم دونوں فوراً ہی چھلانگ لگا دینا...... سوچنا نہیں...... کیوں کہ لمحہ لمحہ بہت ہی اہم اور قیمتی ہے۔''

منکہ ہاتھ میں آتے ہی آکاش کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس نے نیا جنم لیا ہو اور اس کے دل کو ایک عجیب سی تقویت اور فرحت کا احساس ہوا منکہ اس کی مٹھی میں کیا آیا اپنے آپ کو دنیا کا طاقت ور ترین اور نیا انسان محسوس کرنے لگا۔ اس کی کھوئی ہوئی ساری توانائی بجلی کی روئیں کی طرح رگ وپے اور پوروں میں اتر گئیں۔ اس نے محسوس کیا کہ دس جل کماری کیا دس شیوناگ بھی اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ اس نے فوراً ہی منکہ کو لولی پوپ کی طرح چوسا اور اس کا چند لمحوں تک چوسنا ہی کافی تھا۔

پھر اس نے منکہ گلے میں پہن لیا۔ اس نے دوسرے لمحے سنگیت کی طرف دیکھا جو بے سدھ سی زمین پر پڑی تھی۔ اس کی جسمانی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ جو اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ لیکن اس کے چہرے پر کرب واذیت تھی۔ سنگیت کے کارن تو اسے ایک نئی زندگی ملی تھی۔ اگر اس نے بڑے حوصلے سے دشوار گزار اور عذاب ناک سفر کر کے امرتا رانی کو صورت حال سے آگاہ کیا تھا۔ ورنہ بھگوان جانے اس کا حشر نشر ہوتا۔ جل کماری تو اس کی زندگی کتے کی موت سے بھی بدتر کر دیتی۔

اس کے جی میں آیا کہ سنگیت کو ان کے اپنے بازوؤں کے حصار میں قید کر کے اس کے چہرے پر بکھرے بالوں کو ہٹائے اور انہیں سہلاتا رہے۔ چہرے پر محبت بھرے انداز سے ہاتھ پھیرتا رہے۔ پھر چہرے پر جھک جائے۔ اسے امرتا رانی کا خیال آیا جس نے ہوشیار اور چوکنا رہنے کے لئے کہا تھا کہ اشارہ پاتے ہی دونوں ساگر میں چھلانگ لگا دو۔ پھر اس نے سنگیت کے رس بھرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ چند ساعتوں کے لئے رکھ دیئے جس سے سنگیت نے بڑا سکھ سا محسوس کیا۔ آکاش نے سوچا کہ کیوں نہ سنگیت کی حالت معمول پر لانے کے لئے منکہ اس کے منہ میں ڈال دے۔ تاکہ اسے اچھی طرح چوس لے۔ جس سے سنگیت فوراً ہی بہتر حالت میں آ جائے گی۔ لیکن پچھلے تجربے کے بارے میں جو انتہائی تلخ، زہرناک اور روح فرسا تھا سوچ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ منکہ سنگیت کے منہ میں چلا جانے کے سبب ہی اسے روح فرسا عذاب میں مبتلا ہونا پڑا تھا اور ایک آنکھ سے محرومی مقدر بن گئی تھی۔ اس لئے اب وہ دوبارہ سنگیت کے منہ میں منکہ ڈالنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ حالاں کہ منکہ اس کے گلے میں چرمی ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔ پھر بھی وہ محتاط سا تھا۔

ادھر امرتا رانی دھیرے دھیرے جل کماری کی طرف پیش قدمی کر رہی تھی۔

جل کماری کا بدن ابھی تک بے پردہ اور خون آلود ہو رہا تھا۔ اس کی پیشانی کے پھولے ہوئے زخم سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ اور وہ اپنے مکروہ حلیے کی بنا پر کسی بھوانی دیوی کی کوئی خون آشام پجارن لگ رہی تھی۔ خون تو اس کی آنکھوں میں بھرا ہوا تھا جو نفرت اور انتقام کا تھا۔

''کمینی..... حرافہ..... اگر تو یہ سوچ رہی ہے کہ آکاش کو لے جاسکے گی۔ یہ تیری بھول ہے۔'' جل کماری نے سرد اور سفاک لہجے میں کہا۔ ''تو اپنی اس خوش فہمی اور فریب کو دل سے نکال دے..... چڑیل.....! تو نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟ میں تجھے چیونٹی کی طرح مسل دوں گی۔''

''میں آکاش کو کیوں نہیں لے جاسکتی.....؟''

امرتا رانی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں تکرار کیا۔ ''مجھے اس پر تجھ سے کہیں زیادہ ادھیکار ہے..... ڈائن.....!''

''اس لئے کہ یہ میرا ہے۔'' جل کماری نے سینہ تان کر کہا۔

''وہ کیسے تیرا ہوگا.....؟ کہاں سے آگیا؟ امرتا رانی معنی خیز انداز سے مسکرادی۔

''کیا تجھے پل پل کی کوئی خبر نہیں.....؟ کیا تو ذرا ذرا سی بات کو نہیں جانتی ہے کمینی.....!'' جل کماری زہر خند بولی۔ ''کیا میں نے اپنی تمام محبت، اور جوانی اس کے چرنوں میں نہیں ڈالی تھی.....؟ لیکن اس نے جی بھر کے تمام ارمان پورے کئے اور پھر مجھ سے دھوکا کیا.....؟ کیا تو یہ سمجھتی ہے کہ میں شما کردوں گی.....؟ نہیں..... نہیں..... میں اس سے بھرپور انتقام لوں گی۔ میں اسے ایسی عبرتناک موت ماروں گی کہ جو دیکھے گا اس کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں گے..... اس کے پاپی خون کا بلیدان کئے بغیر مجھے سکھ نہیں ملے گا۔ میرے دل کو شانتی اور قرار نہیں..... اس لئے میں کہتی ہوں کہ تو میرے راستے سے ہٹ جا..... تو خاموشی سے لوٹ جا.....''

''میرا تجھ سے کبھی کوئی بیر نہیں تھا'' امرتا رانی نے غضب ناک لہجے میں جواب دیا۔ ''تو نے خود ہی مجھ سے بیر مول لیا۔ مجھ سے نفرت اور چھیڑ مول لی..... پھر شیو ناگ کو جل منڈل میں میرے مقابلے پر لائی یعنی اوٹی نگر میں..... اب میں ہر اس بات کی کاٹ کروں گی جس سے تیری آتما کو شانتی اور سکھ ملتا ہو..... میں اپنے من کو دیوتا..... آکاش جی کو ہر قیمت پر یہاں سے لے کے رہوں گی..... تو دیکھ لینا.....''

''تو اس بات سے انکار نہیں کرے گی کہ بھاگ کا لکھا اوش ہر صورت اور ہر قیمت پر پورا ہوتا ہے۔'' جل کماری نے فوراً ہی پینترا بدلا۔ ''تیری موت شاید میرے ہاتھوں لکھی ہوگی..... چل میں اس کے لئے تیار ہوں۔ تو بھی تیاری کرلے تاکہ بعد میں یہ نا کہنا کہ میں نے تجھے دھوکا دیا؟''

''اس سمے ہماری شکتیاں جل منڈل میں یدھ کر رہی ہیں۔'' امرتا رانی نے جیسے داؤ چلایا۔ ''یہاں تیری میری طاقت اور ذہانت کا ٹکراؤ ہوگا..... میں ہر طرح سے تیار ہوں۔''

جل کماری نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور تمسخر سے بولی۔

''یہ بات تو بہت اچھی طرح جانتی ہے کہ اگن ناگ کی سہائتا میرے ساتھ ہے۔''

''لیکن میرے پاس ذہانت کا جو مہلک ہتھیار ہے اس کے سامنے کسی کا بھی ساتھ ہو وہ کسی کام کا نہیں..... چل..... تو اس سہائتا کو آزمالے اور میں اپنی ذہانت کو..... دیکھیں کامیابی کس کے چرن چھوتی ہے؟''

امرتا رانی بڑے عزم و حوصلے اور اعتماد سے اس کے سامنے ڈٹ گئی۔

جل کماری نے غرا کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ جیسے اس پر حملہ کرنے کے لئے پر تول رہی ہو۔ پھر اس نے چشم زدن میں امرتا رانی پر حملہ کردیا جو اس کے لئے غیر متوقع تھا۔

امرتا رانی کا خیال تھا کہ وہ اس کے قریب آکے اس پر ٹوٹ پڑے گی۔ جو غلط ثابت ہوا تھا۔

پھر ان دونوں زہریلی ناگنوں کے درمیان میں ایک سخت مقابلے کا آغاز ہوگیا۔

ان دونوں میں سے ایک کوشش، تدبیر اور جدوجہد

کو نیچا دکھانے کے لئے جتن یہ تھا کہ کسی کیڑے مکوڑے کی طرح روند دے...... مسل دے اور تمنا کر ڈالے۔ نیست و نابود کر کے رکھ دے۔

جسمانی اعتبار سے تو جل کماری، امرتا رانی کے مقابلے میں توانا اور مضبوط دکھائی دیتی تھی۔

جل کماری چوں کہ تین خون آسام وحشیوں کی بہیمانہ بے حرمتی کا نشانہ بننے کے باعث کمزور سی دکھائی دیتی تھی۔ اس لئے امرتا رانی کو پوری طرح زیر نہیں کر پا رہی تھی اور جب کہ امرتا رانی کے لئے اس پر حاوی آنا خاصا مشکل نظر آتا تھا۔ آکاش نے محسوس کیا کہ جل کماری پر اسرار نادیدہ طاقت سے کام لے رہی ہے۔

معاً اسے منکے کا خیال آیا۔ جل منڈل میں چھڑی ہوئی خونی جنگ کسی بھی لمحہ نتیجہ خیز ہو کر ختم ہو سکتی تھی۔

اس جنگ سے آکاش کو یہ اندیشہ اور تشویش لاحق ہو گئی کہ جل کماری کی ساری شکتیاں لوٹ کے آ گئیں اور پھر ان کا جل منڈل سے فرار ہو جانا ناممکن ہو کے رہ جائے گا۔ پھر اس نے سوچا کہ جل کماری پر اسے کوئی تدبیر آزمانا چاہئے۔ شاید کوئی داؤ چل جائے۔

آکاش کو ماضی کا ایک واقعہ پل بھر کے لئے یاد آ گیا۔ اس وقت اس کی عمر بارہ پندرہ برس کی ہو گی۔ لیکن وہ اس عمر میں بھی قد کے باعث نوجوان مرد دکھائی دیتا تھا۔ وہ کسرتی بدن کا تھا۔ چوں کہ اسے پہلوانی کا شوق بھی تھا اور اکھاڑے ہر شام جا کر کسرت کیا کرتا اور ہم عمروں سے کشتیاں کر کے انہیں پچھاڑ دیتا۔ ایک دو بار اس نے اپنے گاؤں کے دو بڑے اور نام ور پہلوانوں کو ایک دنگل میں پچھاڑ دیا تو سنسنی پھیل گئی اور اس کی شہرت جنگل کی آگ کی طرح قریب اور گرد و نواح کے مقابلوں میں پھیل گئی۔ جب وہ لنگوٹ کس کے اکھاڑے میں اترتا تھا تو بڑا خوب صورت دکھائی دیتا تھا۔ اس کا بدن مضبوط اور اس قدر توانا تھا کہ لڑکیاں عورتیں کیا لڑکے اور مرد بھی دیکھتے رہ جاتے تھے۔ وہ دوسرے عام اور مختلف پہلوؤں سے اچھا اس لئے دکھائی دیتا تھا کہ وہ ان کی طرح موٹا بھدا اور بے ڈول نہیں تھا اور نہ ہی اس کی توند باہر نکلی پڑتی تھی۔ اس نے اس لئے کشتی سے کنارہ کشی کر لی تھی کہ اس کے پتا جی بہت ناراض تھے اور اس سے کہتے تھے کہ یہ ذریعہ معاش نہیں بن سکتا۔ سنگ تراشی ان دنوں آمدنی کا بہترین ذریعہ تھا۔ شاید وہ ان کی بات نہیں مانتا لیکن اس واقعے نے اسے دور کر دیا تھا۔

نوجوان لڑکیاں اور شادی شدہ عورتیں بھی اسے جن انجان نظروں سے دیکھتی اور نگاہوں کی زبان سے جو کہتی تھیں وہ ان کا مفہوم کچھ سمجھتا اور کچھ نہیں...... ان میں بڑی پیاس اور دعوت ہوتی تھی۔ اس لئے بھی کہ وہ اپنی بستی کا سب سے خوب صورت لڑکا بھی تھا۔ ایک روز سہ پہر کے وقت اس کی بستی کی ایک عورت وردھنا اسے بہلا پھسلا کے جھیل پر لے جا رہی تھی کہ دوسری عورت کماری راستے میں مل گئی۔ یہ دونوں عورتیں شادی شدہ تھیں لیکن بے اولاد تھیں۔ وہ دونوں اس کے حصول کے لئے آپس میں لڑنے اور اس پر اپنا حق جتانے لگیں۔ جھیل کنارے دونوں آپس میں بری طرح گتھم گتھا ہو کے الجھ پڑیں۔ پھر دیکھتے ہی ان دونوں پر جنون سوار ہو گیا۔ اور وہ آپے میں نہیں رہیں۔ نہ صرف ان دونوں کے لباس تار تار ہو کر دھجیاں بن گئیں اور جسموں پر گدھ کی طرح ٹوٹ پڑیں۔ وہ جسموں کو نہ صرف لہولہان کرنے لگیں بلکہ ان کے چہرے اور سراپا کو اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے اس طرح نوچنے لگیں کہ وہ مسخ ہو جائیں اور بے کشش...... اور بدنما اور عیب دار...... بالوں کو کھینچنے لگیں۔ جسموں پر خراشیں ڈال کر اس کا ستیاناس کر دیا۔ ان کی چیخیں سن کر بستی کے راہ گیر نہ آتے تو یہ خونی جنگ جانے کب تک جاری رہتی...... ان دونوں نے ایک دوسرے کا ایسا حشر نشر کیا تھا کہ وہ دونوں کئی دنوں بستی کے وید جی کے زیر علاج رہی تھیں۔ لیکن ان کے چہرے خراشوں سے بدنما ہو گئے تھے۔ اور ان پر ایسے گہرے نشان پڑ گئے تھے کہ ان کی طرف دیکھنے کو دل نہیں کرتا تھا۔

لیکن جل کماری اور امرتا رانی کی جنگ...... اس جنگ سے کہیں خطرناک تھی لیکن ان کی مزاحمت اور دفاع نے انہیں ابھی تک محفوظ رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک دوسرے کا بال تک بیکا نہیں کر پائی تھیں لیکن جل کماری اپنی حریف پر

بھاری پڑ رہی تھی۔ آکاش نے سنگیت کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا اور آگے بڑھا...... جل کماری...... امرتا رانی کے سینے پر سوار تھی اور اس کا گلا دبوچنے کی کوشش کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ اس بات کی بھی کوشش کرتی جارہی تھی کہ امرتا رانی کے چہرے کو ناخنوں کی خراش سے حلیہ بگاڑ دے...... اس سے پہلے کہ جل کماری...... امرتا رانی کی آنکھ پھوڑ ڈالتی آکاش نے بھانپ کر منکہ دائیں ہاتھ میں تھاما اور پوری قوت سے اس کی کھوپڑی کے عقب میں زوردار ضرب لگائی۔

ضرب اس قدر زوردار تھی کہ اس کی کھوپڑی چٹخ سی گئی، امرتا رانی کی نہ صرف آنکھ زائل ہونے اور چہرہ لہولہان اور خراشوں سے بچ گیا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ ایک دردناک چیخ مار کے زخمی پرندے کی طرح تڑپی اور بے جان سی ہو کر نیچے گر گئی۔ امرتا رانی بری طرح ہانپتی ہوئی اٹھی۔ اس کے سینے میں سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اس نے اپنے اوسان بحال کر کے اپنے بال درست کئے اور جل کماری کو نفرت اور حقارت سے گھور کر دیکھنے لگی۔

''کیا یہ ڈائن مرگئی......؟'' آکاش نے اس کے بدن پر ٹھوکر مار کے اسے سیدھا کیا اور پھر امرتا رانی کی طرف متوجہ ہو کے پوچھا۔ پھر اس نے امرتا رانی کو قریب کر کے اس کے چہرے اور بدن سے مٹی صاف کی۔

''یہ ڈائن...... مرنے والوں میں سے کہاں ہے؟'' امرتا رانی نے نفرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ صرف بے ہوش ہوئی ہے...... کاش! مرجاتی......؟ لیکن مرنے سے رہی۔''

''مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ یہ مرگئی ہے......'' آکاش نے اس کے سراپا پر نظر ڈالی۔

''مرتے سمے ہر ناگ، ناگن اپنے اصلی روپ میں آجاتے ہیں۔'' امرتا رانی نے اسے بتایا۔

''اگر نہیں مری ہے تو کیوں نہ میں اسے موت کی بھینٹ چڑھا دوں؟'' آکاش بولا۔ ''اسے زندہ رہنے دینا اور مصیبت کو دعوت دینا ہے۔ موقع بڑا اچھا ہے۔''

''اب یہ وچار چھوڑو...... اب یہ سب کچھ سوچنے کا وقت ہے۔'' امرتا رانی کے قریب ہو کر بولی اور پھر اسے محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگی۔ ''جلدی سے ساگر میں کودنے کی تیاری کرو۔''

آکاش نے سنگیت کی کمر میں ہاتھ ڈال کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کے چہرے پر بلا کی طمانیت تھی اور آنکھوں سے گہرا سکون جھانک رہا تھا۔ اس نے اپنے خوش نما سر کو جنبش دے کر امرتا رانی کی تائید کی۔

آکاش نے منکہ اپنے منہ میں ڈال لیا۔ اس نے اپنے سارے بدن میں بے پناہ توانائی پھر سے محسوس کرنے لگا۔ امرتا رانی نے اپنی پراسرار قوت کے سہارے اسے ایک ایسی چرمی ڈوری فراہم کی تھی جس کی مدد سے اس نے منکہ گلے میں لٹکا لیا۔ یہ ڈوری بہت ہی مضبوط اور خوب صورت بھی تھی۔

امرتا رانی سے بلا مزاحمت منکہ واپس مل جانے پر اسے نہ صرف حیرت اور بے پناہ مسرت ہوئی تھی۔ وہ کوئی سندر سا سپنا دیکھ رہا ہو۔ اسے کتنی ہی دیر تک یقین نہیں آیا تھا۔ سنگیت کے ذریعے ایک بار منکہ امرتا رانی کے پاس پہنچ جانے کے بعد اگر امرتا رانی اس سے منہ موڑ لیتی تو وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا بلکہ جل منڈل ہی میں جل کماری کے ہاتھوں بے موت مارا جاتا۔ یہ منکہ کوئی حقیر اور معمولی سی شے نہیں تھی...... یہ اچانک نایاب، انمول اور قیمتی شے تھی جس کی خاطر کوئی بھی اپنی جان کی بازی تک لگا سکتا تھا۔ بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا تھا۔

امرتا رانی نے وہ منکہ جیسے اس کے چرنوں میں رکھ کے ثابت کر دیا تھا کہ وہ اپنے قول کی پکی ہے بلکہ اس کا عشق کسی گہرے جذبے کا ثبوت ہے...... وہ کس قدر بے لوث، بے غرض اور مخلص اور ہم درد ہے۔ امرتا رانی نے اسے جو وچن دیئے اس سے منہ نہیں موڑا تھا اسے نبھا رہی تھی۔

اس کے دل کے کسی کونے میں ایک اور خیال نے جنم لیا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ امرتا رانی اس کی خوشی مرضی اور حکم کے بغیر اس منکہ کو اپنی ملکیت بنا لے۔ ایسی بات نہیں تھی۔ امرتا رانی پراسرار اور نادیدہ قوتوں کی مالک تھی اس کا منکہ پر قابض ہو جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ چوں کہ وہ اس

سے جنون کی حد تک محبت کرتی تھی۔ اس لئے اس کی زندگی اور سلامتی کے لئے دوڑی دوڑی آئی تھی۔ بہر حال وجہ کچھ بھی رہی ہو امرتا رانی کی اس عظمت، اس وقار اور وفادارانہ رویے نے اس کے دل میں اس کی عظمت اور احترام کو جنم دے دیا تھا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ وہ اس قدر عظیم اور اونچی ہے...... اور وہ اس کے سامنے اپنے آپ کو چھوٹا سا محسوس کرنے لگا تھا۔

''سانس روک لو......'' امرتا رانی نے اسے ہدایت کی۔ ''اب ہمیں نہایت برق رفتاری سے ساگر میں سفر کر کے کالی بھومی پہنچنا ہے۔''

امرتا رانی نے یہ کہا تو اس کے خیالات کا سلسلہ بکھر گیا۔

پھر اس نے سنگیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''سنگیت......؟''

''تم سنگیت کی چنتا نہ کرو ہم اسے بھی سنگ لے کے چلیں گے......'' امرتا رانی نے جواب دیا۔

''لیکن کیسے......؟'' آکاش نے پوچھا۔ ''کیا وہ اس ساگر میں آسانی سے سفر کر سکے گی؟ اس لئے کہ سفر نہ صرف لمبا بلکہ طوفانی لہروں کے درمیان طے کرنا ہے۔ کیا یہ ممکن ہوگا؟''

''ہتیا کے کارن چوں کہ وہ شکتیوں سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی لیکن اس کے کالی بھومی پہنچنے پر مجھے علم ہوا تو میں فوراً ہی ایک چھوٹا اور نہایت زوردار گیان کرایا جس سے اس کی نہ صرف یادداشت واپس آچکی ہے بلکہ اب اس کی شکتیاں لوٹ چکی ہیں۔ اب یہ میرے اور تمہارے درمیان ساگر میں تیر سکے گی۔ اس لئے فکر مند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں......'' امرتا رانی نے اسے جواب میں بتایا۔

آکاش نے جل کماری کے خون آلود جسم کو دیکھا جو بے حس وحرکت زمین پر کسی نیم مردہ جانور کی سی حالت میں بے ترتیب بکھرا پڑا تھا۔ اگر اس کے سینے میں سانس نہ چل رہی ہوتی تو وہ بے جان سی لگتی...... پھر وہ تینوں اسے بے ہوش چھوڑ کے بڑھے۔ ان تینوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے تھے۔ گپھا میں بہنے والے پانی کا ہیبت ناک شور کانوں کے پردے پھاڑے دیتا تھا اور موجوں کے طوفانی ریلوں سے اڑنے والے پھوار کا دباؤ اتنا شدید تھا کہ زمین پر قدم جمائے رکھنے میں شدید دشواری کا احساس ہو رہا تھا۔

نہ جانے کیوں اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا۔ پہلے ہی وہ کالی بھومی سے اسی راستے میں جل منڈل یعنی اوٹی نگر تک آیا تھا۔ لوگ اسے جل منڈل ہی کہتے تھے۔ اور زدعام تھا۔ لیکن اسے تب ایسی دہشت نہیں ہوئی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ سفر ایک طرح سے یادگار اور ناقابل فراموش تھا۔ اس لئے کہ امرتا رانی اور سنگیت کی معیت نے اسے رنگین بنا دیا تھا اور ان کے قرب سے اس کے دل کے کسی کونے میں ڈر اور خوف کا شائبہ تک نہیں رہا تھا۔

لیکن وہ اس کا پہلا تجربہ تھا اور سمندر کے کنارے ناگ بھون کا راجہ کھڑا ان کے لئے سمندر میں اگن جال پھینک رہا تھا۔ درحقیقت تو اسے اس وقت خوشی ہونی چاہئے تھی کہ وہ جیسے اپنے انسانوں کی دنیا میں لوٹ رہا تھا۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں اس کے جذبات کچھ عجیب سے ہو رہے تھے۔

امرتا رانی نے بلند آواز میں یک لخت چیخ کے اسے ہدایت کی وہ وہی نامانوس کلمات دہرائے جو اس نے آتے وقت کالی بھومی پر ادا کئے تھے۔ اس نے فوری طور پر امرتا رانی کی بات پر عمل کیا۔ پھر ایک جانب سے اس نے اور دوسری جانب سے امرتا رانی نے سنگیت کا ہاتھ تھاما اور وہ تینوں بیک وقت سمندری گپھا کے طوفانی منجدھار میں کود پڑے۔

پانی میں پہنچتے ہی آکاش نے اپنے سینے پر ایک دھچکا سا محسوس کیا تھا اور ایک لمحے کے لئے اس کی اکیلی آنکھ کے سامنے گھپ اندھیرا سا چھا گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھ کھولی تو اس میں پانی نہیں گھسا اور ساتھ ہی ساتھ دھچکے کا اثر ختم ہو چکا تھا۔ اس بار وہ گپھا کے طوفانی بہاؤ کی مخالف سمت میں جانے کے لئے کودے تھے۔ اس لئے سینوں پر انہوں نے دھچکے محسوس کئے تھے جو پانی میں ڈوبتے ہی وہ ختم ہو گئے۔

وہ تینوں پوری قوت کے ساتھ گپھا میں پہنچنے کی

سمت تیز رفتاری سے تیرنے لگے جہاں گپھا کا دہانہ تھا اور جہاں سمندر کی تہ میں جھاگ جیسا طوفان پانی گرجدار زناٹوں کے ساتھ گپھا میں داخل ہوتا تھا۔

اس کا سفر ان دونوں حسیناؤں کے قرب میں جاری رہا۔ اس کے یا ان کے لئے کسی پریشانی یا افتاد کا سبب نہیں بنا...... اس لئے وہ جلد ہی اپنی اس خلش کو بھول گیا جو گپھا میں کودتے وقت اندیشوں اور وسوسوں نے پریشان کیا تھا۔ وہ بے حد خوف زدہ بھی ہوگیا تھا۔

چوں کہ یہ سمندر بہت طویل تھا۔ اگر امرتا رانی اور سنگیت سنگ نہ ہوتیں تو یہ صدیوں کی طویل مسافت بن جاتی اور اذیت ناک بھی...... پھر آخر کار پانی پیدا ہونے والے خطرناک بھنور سے اسے اندازہ ہوا کہ گپھا سے نکلنے کا راستہ قریب ہی آ پہنچا ہے...... معاً امرتا رانی نے اس کی جانب دیکھا۔ ان کی نگاہیں چار ہوئیں۔ امرتا رانی کی نشیلی آنکھوں میں ایسی محبت، جنون عشق اور چاہت بھری تھی کہ اس کے وجود میں ایک نیا عزم اور حوصلہ جنم لینے لگا۔ سمندری سفر اور پانی کے شدید دباؤ سے شل ہوتے ہوئے اعصاب میں بجلی سی بھر گئی۔ پھر وہ جان توڑ انداز میں پانی کاٹنے لگا۔ اس سفر کے دوران نہ صرف سنگیت بلکہ امرتا رانی بھی اس کا ہاتھ تھامے رہی تھیں۔ جن کے لمس سے وہ تھکن محسوس نہیں کر رہا تھا۔

اس سفر کے دوران اسے جل کماری کا ایک دھڑکا سا بھی لگا رہا تھا۔ امرتا رانی اور سنگیت کے ہم سفر ہونے کے باعث اس نے اندیشوں کے زہریلے ناگوں کو دل سے نکال پھینکا تھا۔ اسے یہ خوف وخدشہ لاحق ہوچکا تھا کہ جل کماری نے ہوش میں آنے کے بعد اسے، امرتا رانی اور سنگیت کو نہ پانے کے بعد اپنی ساری شکتیوں سمیت تعاقب میں چلی آئے گی تاکہ اس سے انتقام لے سکے...... ایک انتقام تو یہ تھا کہ اسے اذیت دے دے کر اور مار مار کر زندہ رہنے دے۔ جب اس کی نفرت اور انتقام کی بھڑاس دل سے نکل جنے تو پھر اسے اپنے بستر کی زینت بنا کے ایک کھلونے کی طرح کھیلتی رہے۔ جل کماری نے اسے اپنی خواب گاہ میں محبت کے نام پر تمام ارمان پورے کئے تھے۔ لیکن اس نے محسوس کرلیا تھا کہ جل کماری اس کا تعاقب نہیں کرے گی۔ کیوں کہ اس کے پاس جو منکہ ہے وہ جل کماری کے تمام حوصلے پست کردے گا۔

ادھر سنگیت کی آنکھوں میں بھی محبت کے ان گنت دیئے جل رہے تھے۔ وہ اس بات سے خوش ہی نہیں بلکہ سرشار بھی تھی کہ اس کی محبت اور اس کا محبوب جو جل کماری کے چنگل سے نکل آیا۔ وہ فاتح اور مسرور اس بات سے بھی تھی کہ اس کے کارن اس کی محبت نے جل کماری کو نیچا دکھایا تھا۔ اس نے سفر کے دوران دو ایک موقع پر آکاش کے ہاتھ تھام کے انہیں نہ صرف چوم لیا تھا بلکہ انہیں آنکھوں کا عنوان بھی بنایا تھا۔ امرتا رانی کے دل کے کسی کونے میں حسد کا شائبہ تک نہ ہوا تھا بلکہ وہ خوش بھی ہوئی تھی کیوں کہ وہ محبت سے آشنا تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ عشق جنون کیا ہوتا ہے۔ اسے محسوس کیا جاتا ہے الفاظ نہیں دیئے جاسکتے ہیں۔

آخر کار وہ سفر کے سب سے ہول ناک مرحلے سے کسی بھنور میں گھرے یا چٹان سے ٹکرائے بغیر عافیت سے گزر گئے۔ اسے امرتا رانی کے دماغ سے خیالات کی برقی لہریں خارج ہوکر اپنے دماغ میں اترتی محسوس ہوئیں جو وہ اسے کھلے سمندر میں نکل آنے کا مژدہ دے رہی تھی۔ اس کے لئے مقناطیسی لہروں کے ذریعے بات کرنے کا یہ تجربہ نیا اور انوکھا نہیں تھا۔ اور پھر جل منڈل کے سفر پر آئے ہوئے بھی امرتا رانی نے سمندر میں اس طرح سے اس سے بات چیت کا سلسلہ جاری رکھا تھا جیسے اس کا قرب اور ہر لحہ مصیبت میں گزرتا جارہا ہو۔

وہ جل منڈل والی بھیانک گپھا سے باہر ضرور آچکے تھے لیکن ان کے سفر کا خاصا بڑا حصہ باقی تھا۔

وہ سمندر کی سطح سے ڈیڑھ ہزار قدم نیچے گہرائیوں میں تھے۔

پانی کا دباؤ بہت شدید تھا۔ اگر وہ اس وقت غیر مرئی اور پراسرار قوتوں پر قادر نہ ہوتے تو ان کے جسموں کے پرخچے اڑ چکے ہوتے اور ایک ٹکڑا بھی نہیں ملتا۔ اتنی گہرائی میں پانی کا دباؤ ہر چیز کو برباد اور مسخ کردینے کا دباؤ کافی ہوتا ہے۔

لاکھوں ٹن پانی نکلنے والی گپھا ان کے پیچھے رہ گئی تھی۔ آکاش نے مڑ کے اس ہیبت ناک دہانے کی طرف دیکھا جو سیاہی مائل سبز کائی اور سمندری گھاس سے ڈھکا ہوا تھا...... سیپ اور مونگے کی وہ دھار دار چٹانیں نظر آئیں جن پر پانی کی کاٹ سے تلوار جیسی تیزی آچکی تھی۔

اس نے امرتا رانی کی جانب محبت پاش نظروں سے دیکھا جن میں وارفتگی تھی۔

امرتا رانی کی بڑی بڑی خوب صورت سیاہ آنکھوں میں رقص کا افق وحشیانہ سرخی نمایاں تھی۔ یہ سرخی خود سپردگی اور والہانہ پن کی نہیں تھی۔ وہ اپنی خوب صورت صراحی دار گردن گھمائے اس کی پیشانی کے وسط میں دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایسا محسوس کیا کہ امرتا رانی اپنی سحر زدہ نگاہوں کی مسکراتی قوت کے ذریعے اسے خاموش رہنے کی پراسرار انداز سے کوئی انجانی ہدایت دے رہی ہو۔

"میرے من کے دیوتا......! آکاش جی......! تم ہر پل ہوشیار اور چوکنا رہنا...... میری شکتی بتا رہی ہے کہ ہر آنے والا سمے تم پر بھاری ہے...... جانے کیا ہونے والا ہے۔"

اس کی بے آواز ان جانی ہدایت نے اس کے دل و دماغ کو ہلا کے رکھ دیا۔

اس کے وسوسے اور اندیشے بے معنی نہیں تھے...... امرتا رانی کی ماورائی قوتیں اس کے اندیشوں پر صاد کر رہی تھیں۔ اس نے سوچا۔ ایشور جانے آنے والے لمحوں میں کیا کچھ ہونے والا ہے......؟ اس پر ایک عجیب سی بے چینی اور گھبراہٹ طاری ہونے لگی...... بے اختیار اس کا دل چاہا کہ سنگیت اور امرتا رانی کے ہاتھوں کو سینے سے لگا کے ایک گہرا سانس لے ان کا لمس ان جانے خوف کو شانتی میں ڈھال دے لیکن وہ اپنے اس ارادے پر عمل نہ کرسکا۔ گہرے سمندر میں گہرا سانس لینے کا مطلب مکمل تباہی اور بربادی تھی...... نہ جانے کس قدر پانی اس ایک سانس میں اس کے بدن میں داخل ہوجاتا اور وہ تڑپے بغیر ہی موت کی ہولناک آغوش میں سما جاتا۔

امرتا رانی اس کی گھبراہٹ اور پریشانی کا اندازہ لگا چکی تھی اس لئے وہ بہت محتاط اور سنبھل سنبھل کے نہایت آہستہ آہستہ تیر رہی تھی۔

ان لمحوں کی بے یقینی کیفیت سے اس کے دل پر خوف کا سا غبار چھانے لگا۔

وہ اپنی پرسکون زندگی کے ابتدائی دنوں ہی میں بدنصیبی اور مصائب کا شکار ہو چکا تھا۔ مگر اب وہ اپنی نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ اس کی بدنصیبی وہاں بھی جیسے اس کی منتظر تھی۔ اس کی جوان، حسین اور وفا شعار بیوی نیلم اس سے چھینی جا چکی تھی۔ وہ اوٹی نگر کی دھرتی پر جو خوب صورت اور عالی شان ان موذی جانوروں کے دیوتا کا محل تھا اس میں نظر بند تھی۔ جیسا کہ اسے امرتا رانی نے بتایا تھا کہ اماوس کی تاریک راتیں آنے والے بھیانک خوابوں سے زیادہ ہول ناک تھیں۔ اس کی نیلم اس سے قطعی بے خبر تھی کہ وہ غیر انسانی قوتوں کی قیدی ہے۔ ناگ راجہ اسے متاثر کرنے، اپنی طرف مائل کرنے اور بستر کی زینت بنانے کے لئے اس پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ اس کا زور اور جادو نیلم پر اس لئے نہیں چل سکا تھا کہ اس میں نیلم کی مرضی، خوشی اور چاہت نہیں تھی۔ جب تک نیلم نہیں چاہے گی اس وقت تک ناگ راجہ اپنے گھناؤنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔

دوسری طرف نیلم اپنے خون سے اس بچے کو سینچ کے پروان چڑھا رہی تھی۔ محض اس امید اور انتظار میں کہ وہ ایک دن اس کے پاس جائے گا اور اسے وہاں کی اذیت ناک اسیری سے نکال لے جائے گا۔ امرتا رانی نے اسے یہ بھی بتایا کہ ناگ راجہ ایسے ایسے خوب صورت، وجیہ اور تصوراتی راج کمار کے بہروپ بھرتا ہے کہ نیلم اس کی جھولی میں پکے پھل کی طرح ٹپک پڑے...... اگر نیلم کی جگہ کوئی اور ہوتی تو کب کی پھسل چکی ہوتی۔

چوں کہ ادھر اس کے مقدر میں چکر اور پریشانیاں لکھی جا چکی تھیں اور وہ نیلم کی بازیابی کی فکر میں...... نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھان رہا ہے...... دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا اور خوار ہو رہا تھا۔ عقل اور حواس اور دماغ

کو معطل کر دیتے، ہولناک تجربے قدم قدم پر اس کے تعاقب میں رہے تھے۔ اس نے اپنی زندگی میں اور نیلم کو اپنانے اور اپنانے کے بعد بھی یہ عہد کیا ہوا تھا کہ وہ کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھے گا اور نہ ہی سوچے گا۔ کوئی بھی نہ تو ورغلا سکے گی اور نہ اپنا جادو اس پر چلا سکے گی...... وہ اس پر کاربند رہا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو جانے کب کا پھسل کے غلاظت کے ایسے دلدل میں جا گرتا پھر وہ کبھی نہ نکل پاتا...... نیلم کو کھونے کے بعد اس نے جو سوچا اور چاہا وہ نہ ہو سکا تھا۔

ان جانی دنیاؤں کی آوارہ مزاج قوتیں حسین، انتہائی پرکشش اور نسوانی پیکر دھار کے اس کے حیوانی جذبات کے سہارے کھیلتی رہی تھیں...... محض اور صرف...... صرف نیلم کو پانے اور حصول کی خاطر ان کا آلہ کار بن گیا تھا۔ ان کے جادو اور نادیدہ پراسرار سفلی علوم نے قابو میں کر کے بے بس کر دیا اور اس کے ہوش معطل کر دیئے تھے۔ اس خیال اور احساس سے بھی کہ نیلم عورت ہے۔ عورت مرد کی ہر لغزش کو نظر انداز اور معاف کر دیتی ہے۔ اس نے یہ سب کچھ دانستہ نہیں کیا تھا۔ اسے مجبور کیا گیا تھا بھٹکنے کے سوا چارہ بھی تو نہیں رہا تھا۔

دوسری جانب شیوناگ جیسا موذی، مکار اور شیطانی فطرت کا ذلیل اور کمینہ اس کی گھات میں تھا۔ وہ حالات کے اس بھنور میں بالکل کسی معذور، اپاہج اور ناکارہ کی طرح بے بس ہو کے رہ گیا تھا۔

اسے ہر لمحہ یہ محسوس ہوتا رہا کہ وہ اوٹی نگر کی پراسرار اور خوف ناک دھرتی پر پہنچنے والا ہے۔ لیکن اسے ہمیشہ یہ خود فریبی محسوس ہوا۔ اس کی منزل ہر لمحہ قریب آنے کے باوجود صدیوں جیسی مسافت پر دور ہوتی جا رہی تھی۔ اسے معاً ایک خیال سا آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کہیں وہ کسی مہیب صحرائی سراب کے پیچھے آنکھیں بند کیے بھاگا جا رہا ہو اور اسے اوٹی نگر اس بھون میں پہنچنے کے بعد یہ علم میں آئے کہ نیلم...... اس کی نیلم مر چکی ہے۔ اس سے سدا کے لئے روٹھ کے پرلوک جا چکی ہے۔ اور پھر اس سے ملنے کے لئے اسے بھی سہانتا کرنا ہوگا......

یہ کرب ناک انگیز خیال آتے ہی اس کے اعصاب پر ناقابل بیان تناؤ طاری ہو گیا، جو ناقابل برداشت ہونے لگا تھا۔ کیوں کہ فوراً ہی اس کے معدے میں درد کی ایک شدید لہر اٹھی۔ یہ ایسا اذیت ناک درد تھا جیسے کسی نے اس کے پیٹ میں چھری بھونک دی۔ اس کی حالت کسی زخمی پرندے کی سی ہونے لگی اور پھر اسے اندازہ نہ تھا کہ کٹھن لمحات کے نرغے میں وہ آ جائے گا جس سے اسے چھٹکارا نہ ہو سکے گا۔

اس کے جو زہریلے قسم کے وسوسے درست ثابت ہو رہے تھے وہ جانتا تھا کہ کسی بھی وقت ایسا ہوگا۔ امرتا رانی کی تنبیہ دماغ میں ابھری لیکن وہ سب زیادہ دیر تک نہ سوچ سکا۔ اگن پوجا کے تہوار پر سوچوں کے روپ میں اس کے بدن میں گھسنے والے جن باریک باریک سانپوں کو وہ یکسر بھلا بیٹھا تھا۔ وہ اس کے پیٹ میں کلبلانے لگے تھے۔ ان شیطانوں کی جنبش اسے بہت شدت سے اپنے وجود کا احساس دلا رہی تھیں۔

پل بھر میں درد کی وہ لہر ناقابل برداشت ہونے لگی تھی۔

جب برداشت کرنے لگا تو ایک چیخ اس کے بند ہونٹوں کے درمیان ہی دم توڑ گئی۔ وہ فرط اذیت سے بری طرح تڑپا اور سنگیت کا جو نرم و نازک ہاتھ گرفت میں لیا ہوا تھا وہ گرفت سے نکل گیا۔ اس نے پھر اس ہاتھ کو گرفت میں لے کر تھامنے کے لئے ہاتھ مارے لیکن وہ پھر اسے پکڑ نہ سکا تھا۔

کیوں کہ اس کی نظروں کے سامنے گہرے تاریک بڑے بڑے دھبے ناچنے لگے تھے اور اس کا جسم پال کے اچھال میں بل کھاتا تیزی سے اوپر اٹھنے لگا۔ اسے اس سے اتنا بھی ہوش نہ رہا تھا کہ اس گمنام سمندر کی ان بے کراں گہرائیوں میں ناگ رانی اور سنگیت پر نظر رکھے اور انہیں اوجھل نہ ہونے دے۔ لیکن اب وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس میں اس کی کوئی غلطی نہ تھی۔ درد کی شدت کے باعث سنگیت کا ہاتھ تھامے نہ رہ سکا تھا۔

پھر اس کی نگاہوں میں ایک لرزہ خیز موت کی

دیوی رقص کرنے لگی تھی۔ اسے اپنی پھولی ہوئی اور مردہ خور مچھلیوں کی ادھیڑی ہوئی لاش کا تصور رگوں میں لہو منجمد کرنے لگا تھا...... اس کے معدے میں گھسے سانپوں کی ایذا رسانی اسے چیخیں مارنے پر تڑپا اور مجبور کر رہی تھی...... ہر سمت اسے موت کا رقص دکھائی دیتا تھا۔ اسے کچھ اندازہ نہ تھا کہ وہ درد کی شدت کی تاب نہ لا کر بے موت مرجاتا ہے یا پھر سمندری پانی کے بوجھل اور طوفانی موجیں اس کے منہ ناک اور جسم میں گھس کر اس کے پرخچے اڑا دینے والی ہیں۔ ادھر بھی موت تھی اور ادھر بھی۔ وہ کرے تو کیا کرے؟

اسے اگن پوجا کے موقع پر اسے جو نئی زندگی ملی تھی اور اس کی جان بخشی گئی تھی وہ بڑی مہنگی پڑتی لگی تھی۔ بھینٹ چڑھنے والی موت جو بڑی دردناک تھی اور سینکڑوں میل گہرے سمندر میں کسمپرسی اور اذیت کی موت یقیناً سہل ہوتی جو اب تیزی سے اپنی سفاک طاقت ور گرفت میں دبوچنے کے لئے دبے پاؤں بڑے جارحانہ انداز سے بڑھ رہی تھی وہ اس سے کسی قیمت پر بچ بھی نہ سکتا تھا۔

اب اس کا جسم سمندری لہروں میں کسی حقیر تنکے کی طرح بل کھاتا درد کی اذیت سے بے قابو ہو کر بری طرح تڑپا اور پر اٹھنے لگا تھا، اس کا رکا ہوا سانس سینے کو کسی خنجر کی طرح چاک کرنے کے لئے جیسے تڑپ رہا تھا۔ لیکن اس نے اپنی تمام تر قوت محض اس کوشش اور جدوجہد پر مرکوز کردی تھی کہ اس کی سانس کسی قیمت پر نہ ٹوٹنے پائے اور نہ روئے زمین کی کوئی قوت اسے موت سے ہمکنار ہونے سے بچا سکے گی۔ سانس ہی تو زندگی ہوتی ہے۔

اذیت اور بے چارگی کا وہ وقفہ یقیناً عام حالات میں مختصر ہی تھا مگر اس وقت اسے وہ شیطان کی آنت کی طرح لگا تھا۔ اس کے معدے میں اٹھنے والے درد کی ناقابل برداشت ٹیسیں میٹھی کسک میں بدل کے آخرکار یکسر معدوم ہوتی گئیں۔ اس تک سانس باقی تھا اور چل رہا تھا۔ اس نے اس ناگہانی مصیبت سے جان چھوٹنے پر اسے یوں لگا کہ اسے ایک بہت بڑے عذاب سے نجات ملی ہو۔ اس نے نہ صرف بڑا سکون اور اطمینان محسوس کیا اور پھر اپنا بدن بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا، ایک طرح سے اس کی جان میں جان آگئی تھی۔

اس نے اپنی اکلوتی آنکھ کی مدد سے آس پاس کا جائزہ لیا...... لیکن سنگیت اور امرتا رانی کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ وہ اطمینان کے ساتھ چند ہی لمحے کاٹ سکا۔ کیوں کہ اسے ان دونوں سے بچھڑ جانے کی وحشت ستانے لگی۔ اسے اجل بھومی کے زیر آب راستے کا علم نہیں تھا۔ اس اجل بھومی کو کالی بھومی بھی کہنے والے کہتے تھے۔ بہرحال جو بھی بھومی تھی۔ بہرکیف وہ بس پانی کے تلاطم میں الجھا ہوا اوپر اٹھتا جارہا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہی صورت حال بے قرار رہنے کے نتیجے میں ساحل سے کتنی دور ابھرے گا۔ یہ خیال تھا جو اسے برابر ستائے جارہا تھا۔

وہ کتنے گھنٹوں تک اسی طرح اوپر اٹھتا رہا اسے کچھ صحیح اندازہ نہ ہوسکا تھا۔ اس کا سارا وجود تھا کہ بری طرح شل ہونے لگا۔ اور پھر اسے سانس روکے رکھنا بھی دشوار نظر آیا تھا۔ اس کے قیاس کے مطابق واپسی کا یہ سفر اتنا طویل نہیں ہونا چاہئے تھا...... لیکن امرتا رانی کی رہنمائی سے محروم ہونے کا خمیازہ بہرحال اسے ہی تو آخرکار بھگتنا تھا۔

اب جب کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ امرتا رانی سے ذہنی رابطہ قائم کرے، جیسا کہ اس سے پیشتر وہ ایک مرتبہ اس کا تجربہ کرچکا تھا۔ اس تجربے کی روشنی میں اسے یقین تھا کہ اس مرتبہ اور سمندر کے سفر میں بھی امرتا رانی سے رابطہ قائم ہوجائے گا اور وہ فوراً نیچے پہنچے گی۔ جب اس نے ذہنی طور پر رابطہ کیا تو صرف چند ساعتوں کے بعد اس کی امید بر آئی اور پھر اسے امرتا رانی اوپر سے غوطہ مارتی دکھائی دی، لیکن سنگیت اس کے ساتھ نہیں تھی۔

پھر امرتا رانی کے ذہن نے اس کے ذہن کو پیغام دیا۔ "میں کالی بھومی یعنی اجل بھومی پر تمہارا انتظار کررہی تھی۔"

آکاش کے وجود پر ایک عجیب سی سرشاری کی

کیفیت طاری ہونے لگی...... پھر امرتا رانی نے فوراً ہی اس کے پاس آ کر اس کا دایاں ہاتھ تھام لیا اور پھر ترچھی ہو کر اوپر بڑھنے لگی۔ امرتا رانی کا سہارا مل جانے کے سبب اس کے تیرنے کی رفتار میں نمایاں اضافہ ہو چکا تھا اور پھر اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ بہت جلد بھومی پہنچ جائے گا۔

کچھ دیر بعد وہ مبارک اور شبھ ساعت بھی آ پہنچی اور اس کی دلی مراد بر آئی۔

آکاش نے حیرت اور مسرت سے ایک لمبا سانس لیا۔ کیوں کہ ایک طویل عرصے کے بعد اس نے نیلے چمکدار آسمان کا نظارہ کیا تھا۔

سورج کا مغربی سفر شروع ہو چکا تھا۔ اس کی اپنی دنیا اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ کبھی سمندر سے سپنے کی طرح...... تاحد نظر سمندر کا ٹھاٹھیں مارتا پانی پھیلا ہوا تھا اور مشرق کی سمت میں تھوڑے ہی فاصلے پر ایک ننھے سے جزیرے کے آثار دکھائی دیئے...... جو یقیناً کالی بھومی تھا۔ اسے لوگ اجل بھومی کیوں کہتے ہیں اسے امرتا رانی نے شاید بتایا تھا کہ یہاں صدیوں فرشتہ اجل کی حکمرانی رہی تھی اس لئے اس کا نام اجل بھومی پڑ گیا۔ سابقہ نام کالی بھومی تھا۔ لیکن اسے نام سے کیا لینا دینا تھا۔

اپنی دنیا کی آزاد فضاؤں میں سانس لیتے ہی بے اختیار اس کے دل پر رقت طاری ہونے لگی۔

اسے اپنے ایشور کی عظمت اور برتری کا احساس ہوا کہ جس نے سمندر کی سطح سے ڈیڑھ ہزار میل کے نیچے پراسرار قوتوں کے مالک جہنمی کیڑوں سے حفاظت کے وسیلے پیدا کئے تھے اور اسے ایک مرتبہ پھر زندہ سلامت اپنی دنیا...... اپنے جیسے انسانوں کی دنیا میں لوٹ آنے کے قابل بنایا تا کہ وہ اپنی پیاری نیلم کے حصول کا مشن پورا کر سکے۔ اگر ایشور نہیں چاہتا تو اس کے لئے اپنی دنیا کی گرد پانا بھی ناممکن سا ہو جاتا۔

اس لمحے اس کا کھویا ہوا اعتماد بحال ہو چکا تھا۔ جس سے اس کی زندگی میں خوشیوں کے رنگ تھے۔

امرتا رانی نے شاید اس کے دل میں ابھرنے والے مقدس اور عظیم جذبات کو بالکل بھی نہ چھیڑا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ بس دھیمے دھیمے انداز اور زاویے بدل بدل ہاتھ پاؤں چلاتی اور اس کے آس پاس ترچھی اور سیدھی ہو کر تیرتی رہی۔ امرتا رانی نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ساری توجہ اس پر مرکوز ہو جائے۔

''کیا یہ یہی کالی بھومی ہے......؟'' آکاش نے پہلے تو ایک ڈبکی لگائی۔ پھر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے قریب کر کے پوچھا۔ وہ اس کی مزید تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ یہ یہاں اسے واحد جزیرہ نظر آیا تھا۔

''ہاں...... آؤ...... اس طرف چلیں...... سنگیت اس جزیرے پر اکیلی ہے اور انتظار میں پریشان ہو رہی ہوگی۔'' امرتا رانی نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا اور اس کے بازوؤں میں کسمسائی۔

وہ شوخی اور زندگی کے ایک نئے احساس و جذبے سے سرشار ہو گیا۔ اس نے سہارا لینے کے لئے ہاتھ بڑھا کے اور امرتا رانی کو قریب کر لیا۔ اس وقت اسے جل منڈل میں اور وہاں گزارے ہوئے دن ایک ڈراؤنے خواب لگ رہے تھے۔ پھر اس نے یہ سوچ کر پھریری لی اور سوچا کہ اگر ان کا یہ فرار ناکام رہتا...... وہ ڈائن ہوش میں آ کر اپنی تمام شکتیوں سے ان کا تعاقب کرتی تو ان پر گہرے سمندروں میں کم از کم اس پر نہ جانے کیا کچھ بیت جاتا......

''میری جان......! امرتا رانی......!'' اس نے تیرتے تیرتے امرتا رانی سے کہا۔

''جی میرے دیوتا......!'' امرتا رانی نے اس کا ہاتھ اور مضبوطی سے تھام لیا۔

''میرے دل کی رانی......! کیا تم بتا سکتی ہو کہ میں جل منڈل میں کتنے دن رہا ہوں۔''

''چار مہینے اور چھ دن...... جن میں ایک مہینہ دس دن اس ڈائن کے ساتھ ایک ماہ تین دن......'' امرتا رانی نے سوچ کے جواب دیا۔ ''آخر تمہیں اس وقت کیوں اور کس لئے اس کا دھیان آ گیا...... کیا جل کماری کی یاد آ رہی ہے؟''

''میں تمہاری اس بات کا جواب جزیرے پر چل کے دوں گا۔'' آکاش نے شوخ لہجے میں جواب دیا۔

وہ دونوں نپے تلے انداز میں نئی زندگی کے سحر میں ڈوبے کالی بھومی کی جانب بڑھتے رہے۔ اس سے اسے نہ جانے کیوں جل منڈل کا خیال آیا...... وہ جب تک اس سرزمین پر رہا تھا۔ اس کے متعلق اس قدر خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس وقت اسے جل منڈل ایک ڈراؤنا خواب محسوس ہو رہا تھا...... صدیوں پرانا ایک آسیبی اور ڈراؤنا خواب جس کی بھولی ہوئی پرچھائیاں تک انسان کو ہلا کے رکھ دیتی ہیں۔

وہ دونوں ہمرکاب شوخیاں، سرگوشیاں اور محبت بھری باتوں اور حرکتوں، تیرتے اور ڈوبتے سورج کی لہو رنگ شعاعوں کے الوکاسی وہ زیرزمین آب نظر آنے لگی تھی۔ سمندر کی بے کراں گہرائیاں اب معدوم ہو چکی تھیں اور انہیں سمندر کے ہلکورے لیتے ہوئے پانی کی نیلاہٹوں کے پیچھے چٹانیں بھی نظر آ رہی تھیں جو صدیوں سے وہاں موجود تھیں۔

امرتا رانی اس وقت بڑے پرسکون انداز میں اس کے ساتھ تیر رہی تھی۔

''امرتا رانی......!'' اچانک آکاش نے اسے متوجہ کیا جو ساحل پر نگاہیں مرکوز کیے ہوئے تھی۔

''کیا میری جان......!'' امرتا رانی نے خود سپردگی کے لہجے میں کہا۔ ''میں پاس تو ہوں۔''

''تمہیں وہ اندھیری رات یاد ہے جب سون ہاٹ کے نواحی جنگلات میں تم نے مجھے سنگیت کے جنگلی پھولوں سے مہکے ہوئے جھونپڑے میں چھوڑا تھا...... پھر ہم دونوں تنہا اور ساتھ اس میں رہے تھے......؟ کیا تمہیں یاد ہے؟'' آکاش نے سرگوشی کی۔

''ہاں...... یاد تو ہے......'' وہ بولی۔ ''میں اس بات کو کیسے بھول سکتی ہوں۔''

''کیا کالی بھومی پر ویسا ہی کوئی مہکتا ہوا جھونپڑا نہیں ہے......؟''

''ہاں...... ہے تو ضرور......'' وہ پرخیال آواز میں بولی۔ ''کیا تم وہ سہانا سمے یہاں بھی اس کے ساتھ گزارنا چاہتے ہو؟''

''کس کے ساتھ......؟'' آکاش نے اس کے چہرے پر جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''سنگیت...... بڑی موہنی اور وہ بڑی سندر لڑکی ہے۔'' امرتا رانی کے لہجے میں ہلکی سی پژمردگی تھی۔ ''اور پھر وہ محبت کرنا جانتی ہے...... اس کی محبت میں کتنی گہرائی ہے...... اور پھر وہ بالکل بھی رقابت یا جلن محسوس نہیں کرتی ہے۔ وہ تمہیں کتنا چاہتی ہے۔ مجھے اس کا احساس اور اندازہ ہے۔ تم بڑے خوش نصیب ہو کہ وہ تم سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔ اس کی محبت میں کوئی غرض، تصنع اور کھوٹ نہیں ہے......''

''نہیں امرتا رانی......! اب اس کے ساتھ نہیں...... مگر وہی ہوگا...... میں آزادی کی پہلی رات کا جشن تمہاری ان ریشمی زلفوں میں گزاروں گا...... تمہارے ناتے یہ جو آزادی ملی ہے اس کی خوشی اور جشن کسی اور اس کے ساتھ کیسے منا سکتا ہوں...... جب کہ میں یہ جانتا ہوں کہ تمہارا دل حسد و جلن سے صاف ہے...... تم نے خود مجھے سنگیت سے ملایا اور تنہا چھوڑا تھا۔''

جب اس نے اپنی بات ختم کی تو معاً اس کی نگاہ امرتا رانی کے بالوں پر جم گئی۔ اس کی حسین اور ریشمی زلفوں کا ایک کٹا ہوا گچھا اسے ان لمحات کی یاد دلا رہا تھا جب وہ کسی اور روپ میں اس کی دسترس میں بے بس رہی تھی اور اس نے اس کی زلفیں تراش کر اسے ہمیشہ کے لئے اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ اب وہ امرتا رانی تھی۔ دل کی رانی بھی تھی۔

''سنگیت کہاں چلی گئی......؟'' امرتا رانی نے جزیرے کے ساحل پر نگاہیں دوڑائیں، پھر چونک کے بولی۔

''دیکھو...... ڈوبتے سورج کی روشنی میں جزیرے پر آگ سی معلوم ہو رہی ہے۔'' آکاش نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ وہ دل بہلانے کہیں نکل گئی ہو...... شاید انتظار سے وہ بے زار ہو گئی ہو گی۔''

''چلو...... وہ بھی آ جائے گی......'' امرتا رانی نے خشکی پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس جزیرے پر جنگلی جانور نہیں ہیں۔ اس لئے خطرے والی کوئی بات نہیں......''

''میرے دیوتا......!'' امرتا رانی نے چند

ثانیوں کے سکوت کے بعد اپنے بھیگے رخسار اس کے بازو سے رگڑتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تمہارے بازوؤں میں میری پیاسی آتما کو بڑا سکھ اور شانتی ملتی ہے۔ تم واقعی دیوتا ہو میری جان!“

آکاش کی سانس الجھنے لگی۔ ڈوبتے سورج کی سرخی میں وہ جزیرہ اس وقت محبت کی سرزمین معلوم دیتا تھا...... ہر طرف اکتاہٹ آمیز ویرانی کا راج تھا...... فضا میں اکا دکا سمندری پرندوں کے غول کے علاوہ بس سرکش لہروں کی گونج ہی سنائی دے رہی تھی۔

”چند قدم طے کرنے کے بعد جنگلی درختوں کا ایک کنج نظر آیا

درختوں کے اس کنج میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا تھا جو جنگلی پھولوں کی تیز مہکار میں بسا ہوا تھا جو ست کئے دے رہا تھا۔

”کیا یہ جھونپڑا پہلے سے یہاں موجود تھا......؟“ اس نے امرتا رانی سے سوال کیا۔

”میں نے تمہاری دلی آرزو پوری کرنے کے لئے اپنی شکتی سے یہ سب تیار کیا ہے۔“ امرتا رانی نے جواب دیا۔ ”مجھے صرف یہ شکتی حاصل نہیں تھی کہ تمہیں اور سنگیت کو اس کے زور سے جل منڈل سے یہاں پہنچادوں۔ ورنہ یہ سفر اس قدر اذیت ناک اور لمبی مسافت کا نہ ہوتا۔ مجھے اس بات سے دکھ بھی ہوا تھا۔“

”لیکن میں اس سفر سے بڑا محظوظ ہوا تھا اور میں دل میں دعا کررہا تھا کہ بھگوان کرے یہ سفر صدیوں تک جاری رہے۔ اور میری منزل کبھی نہ آئے۔“ آکاش نے شوخ لہجے میں کہا۔

”کیا......؟“ امرتا رانی نے حیرت سے اپنی لانبی لانبی پلکیں جھپکائیں۔ ”وہ کس لئے؟“

”اس لئے کہ اس سمندری سفر میں تم جو ہمراہ تھیں میں تم پر سے پل بھر کے لئے بھی نگاہ نہیں ہٹا سکا...... تمہارا یہ حسن اور انگ انگ پانی میں آگ لگاتا رہا......“

امرتا رانی کا چہرہ سرخ ہوگیا اور اس کا حسن دوچند ہوگیا اور چہرے پر ایک ایسا عجیب سا نکھار جو بڑا دل آویز تھا...... آکاش کو جیسے خود پر اختیار نہیں رہا۔ اس نے اس نکھار کو ہونٹوں میں جذب کرلیا۔

”میں تمہارے لئے کھانے کے لئے کچھ لے آتی ہوں۔“ امرتا رانی اس کا ہاتھ تھام کے فرش پر بیٹھ گئی۔ فرش پر پتوں کا جو نرم پیال تھا۔ وہ پھولوں کی سیج کی گداز اور مہکتا محسوس ہوا۔ اس تاریکی میں امرتا رانی کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں دو ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس کا چہرہ چاند کی طرح روشن تھا۔ ”کیا تمہیں بھوک پیاس نہیں لگ رہی ہے؟“

”سفر کے دوران تمہیں اور سنگیت کو دیکھ دیکھ کے اپنی بھوک پیاس بھول بیٹھا تھا۔“ آکاش نے جواب دیا۔ ”اس سمے بھوک پیاس بڑے زور کی لگ رہی ہے۔ لیکن وہ اور ہے۔“ آکاش مسکرادیا۔

”امرتا رانی اس سمے جھونپڑے سے نکلی۔ کچھ دیر بعد آئی تو ایک بڑی سینی میں دودھ، پھل اور میوہ جات بھی تھے اور ایک دیا بھی لے آئی تھی جس کی روشنی اس قدر تیز تھی کہ جھونپڑے میں جو تنکا تنکا تھا وہ صاف دکھائی دینے لگا۔ پھر اس نے دو پھل کھائے جو جانے کون سے تھے۔ وہ سیب سے مشابہ تھے۔ بہت ہی رس بھرے اور میٹھے تھے۔ لذیذ بھی تھے۔ دو پھل کھا کے اس نے دودھ پیا جو وہ بھی بہت میٹھا اور فرحت بخش تھا جس نے معدے میں پہنچ کے اسے بڑا سکون دیا۔

”یہ دودھ بکری کا ہے۔“ امرتا رانی نے خالی سینی ایک طرف ہٹادی۔ ”یہ پھل بہت میٹھے اور رس بھرے تھے نا؟“

”ہاں......“ آکاش نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”میرے دیوتا......! تمہاری ایک آنکھ کے ضائع ہوجانے کا مجھے اتنا دکھ ہے کہ میں بتا نہیں سکتی...... تمہارے ساتھ یہ بڑا انیائے ہوا ہے...... کاش......! ایسا نہ ہوتا۔“ امرتا رانی جیسے سسک پڑی۔

”جو نہیں ہونا تھا وہ ہوگیا...... اب رونے دھونے سے کیا حاصل......؟“ آکاش نے گہرا سانس لیا۔

(جاری ہے)

دردِ دل

پیا سحر۔ مدینہ سیداں گجرات

بزرگ نے جیسے ہی کلام الٰہی پڑھنا شروع کیا تو کمرے میں زبردست ہوا کے جھکڑ چلنے لگے اور پھر اچانک کمرے میں جیسے زلزلہ آگیا ہر چیز الٹ پلٹ ہونے لگی پھر ایک مہیب ڈرائونی آواز گونجی۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان ہی نہیں بلکہ نادیدہ مخلوق بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہیں

"یہ ساحر کون ہے؟" ڈاکٹر نے مہران سے ساری بات جان کر اسے کمرے سے باہر بھیج دیا۔ اور ماہین سے نرمی سے پوچھا۔

"پتہ نہیں ڈاکٹر میں نہیں جانتی۔" اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔

"وہ میرا......" بات ماہین کے منہ میں ہی رہ گئی کیونکہ اطراف میں ایک مانوس سی خوشبو پھیل گئی تھی اور ماہین کے دل و دماغ پر چھاگئی۔ کمرے میں سوائے ڈاکٹر عزیز اور ماہین کے کوئی نہ تھا۔ کمرے کا ماحول ایسا تھا کہ ماہین کا ذہن سکون کے گہوارے میں ہلکورے لینے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سر آرام دہ کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

جب سے مہران کے ساتھ اس کی شادی ہوئی تھی حالات تب سے ہی ٹھیک نہ تھے اس کی بیماری کچھ پراسراری ہوتی جاتی تھی، مہران کو لگتا تھا کہ ماہین کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہے ماہین الگ اپنی کیفیت سے پریشان تھی۔ سو آج ڈاکٹر عزیز سے ٹائم لیا تھا۔

"ڈاکٹر مجھے لگتا ہے یہ میرا وہم ہے، اور مہران کا بھی، وہ کہتے ہیں کہ میں سونے میں کسی ساحر سے باتیں

کرتی ہوں، انہوں نے یہ بات اتنی مرتبہ دہرائی ہے کہ اب تو میں بھی اسی وہم میں مبتلا ہوگئی ہوں کہ شاید ساحر سچ میں میرے آس پاس ہے، میں اسے محسوس کرنے لگی ہوں۔"

"ہوں۔" ڈاکٹر عزیز نے ہنکارہ بھرا۔ "کچھ دوائیں لکھ کر دے رہا ہوں۔ ریگولر لیتی رہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ڈاکٹر نے تیزی سے لکھتے ہوئے کہا۔

اس نے ڈاکٹر سے بھی جھوٹ بولا تھا۔ مہران بھی کئی بار پوچھ چکا تھا کہ "آخر یہ ساحر ہے کون؟" لیکن ماہین کی زبان پر جیسے تالے پڑ جاتے۔

ساحر کے نام پر زبان جیسے تالو کے ساتھ چپک جاتی، ساحر کے نام سے ہی اسے چڑ تھی اور ساحر ہی ہر شخص کی زبان پر تھا۔ ماہین اس نام سے تنگ آ گئی تھی۔

کلینک سے آنے کے بعد اس نے مہران سے کوئی بات نہ کی، چپ سی یہی سوچتی رہی کہ آخر کیوں ساحر اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا؟ وہ انہی سوچوں میں الجھتی ہوئی سونے کے لئے بیڈ پر دراز ہوگئی اور مہران اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھا آفس کا کام کرنے لگا۔

☆......☆......☆

کمرے کا ماحول یکدم بدلا تھا جیسے ساری فضا مہک اٹھی ہو، وہ دلفریب سی خوشبو ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔

پیار جو حد سے بڑھ جاتا ہے
ہر اک شے میں نظر آتا ہے

"ہر اک شے میں نظر آتا ہے، ہر اک شے میں نظر آتا ہے......" آواز اب بے ہنگم شور میں بدل گئی۔ "پیار جو حد سے بڑھ جاتا ہے...... پیار جو حد سے بڑھ جاتا ہے۔" اوہ یہ آواز، یہ شور، ماہین نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے، کرب سے اس کی آنکھیں جیسے ابل پڑی تھیں، کانوں پر ہاتھ رکھنے کے باوجود شور بدستور قائم رہا، وہ آواز ماہین کو ایک درد سے آشنا کرتی تھی، ایسے درد سے جو اس کی روح کو چھلنی کر کے رکھ دیتا، آواز میں ایسی شدت تھی جو ماہین کی برداشت سے باہر تھی۔ اس نے شور کی شدت کو کم کرنے کے لئے کانوں پر تکیہ رکھ لیا، پر شور تھا کہ کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی گیا، وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی، دل جیسے کسی کی مٹھی میں آ گیا تھا، درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا، جب برداشت سے باہر ہوا تو وہ چیخ پڑی۔ "بند کردو، بس کردو، میرا دل پھٹ جائے گا۔"

اس کے ملیح چہرے کی سرخیاں زردی میں ڈھل گئیں۔ دیوانہ وار چیخ جاری تھی۔ "بس کردو خدا کے لئے۔" تکلیف کی شدت اس کے انگ انگ سے عیاں ہو رہی تھی۔ اور حواس ساتھ چھوڑنے لگے۔

ایسے میں کسی نے اسے تھام لیا تھا۔ بس بند ہوتی آنکھوں سے اتنا ہی دیکھا کہ مہران کی بانہوں میں ہے، اس کے بعد وہ ہوش کھو چکی تھی۔

مہران نے اسے بستر پر لٹا دیا، اور تاسف بھری نگاہ سے دیکھا، نجانے کیسی دردناک اذیت سے دوچار تھی وہ کہ ہوش میں نہ ہوتے ہوئے بھی سر ادھر ادھر پٹخ رہی تھی۔

مہران نے انتہائی پریشان ہو کر سگریٹ سلگا لیا۔ فائل بند کردی اور کھڑکی بند کرنے کی غرض سے کھڑکی کی طرف مڑا، کھڑکی میں کوئی سایہ سا لہرایا تھا جیسے کوئی کھڑا ہو اور مہران کے متوجہ ہوتے ہی پلٹ گیا۔ ایک لمحے کو مہران کا ماتھا ٹھنکا، پھر یہ سوچ کر کہ شاید کوئی گھر کا ملازم ہو اور ماہین کی آواز سن کر ادھر آیا ہو اس نے کھڑکی بند کردی اور پردے برابر کر دیئے۔ اس نے بیڈ پر لیٹ کر رخ ماہین کی طرف ہی موڑ لیا۔ اس کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ اس لئے وہ سکون سے سو گئی۔ مہران نے بھی ہاتھ بڑھا کر لیمپ آف کر دیا اور سوچتے سوچتے نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

اس کے سوتے ہی پردے خود بخود سائیڈ پر سرک گئے اور کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ کھڑکی کھل گئی اور وہی سایہ کھڑکی میں آن وارد ہوا اور جم کر کھڑا ہو گیا۔

ماہین کی دراز پلکیں سوتے میں لرزنے لگیں اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھرنے لگے۔

رات بھیگ چکی تھی ہر طرف ہو کا عالم، وہ سایہ ساری رات وہیں کھڑا رہا اور ماہین کرب کے مراحل سے گزرتی رہی۔

اگلے دن سورج طلوع ہوا اور معمولات زندگی کی

شروعات ہوگئی لوگ اپنے کام دھندے پر جانے لگے، بچوں نے بھی اسکول کا ارادہ باندھا۔ ماہین بالکونی سے یہ تمام مناظر دیکھ رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ ”زندگی کتنی خوب صورت ہے، لیکن میری زندگی اتنی بے رنگ کیوں، اور پھیکی سی کیوں ہے یہ دلکش اور حسین مناظر میری آنکھوں کو بھلے کیوں نہیں لگتے۔ کیا کمی ہے کس چیز کی کمی ہے میری زندگی میں؟“ وہ خود سے پوچھ پوچھ کر تھک گئی مگر جواب ندارد۔

مہران نے آفس جاتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ ”آج وہ ڈرائیور کے ساتھ اپنے میکے حاصل پور روانہ ہوجائے کہ شاید آب وہوا کی تبدیلی اس کی صحت پر اچھا اثر ڈالے، سو ماہین نے بیگز تیار کیے اور ڈرائیور کے ساتھ حاصل پور کے لئے نکلی۔

حاصل پور کی حویلی میں اس کی آمد پر خوب خوشیاں منائی گئیں۔ حیدر ملک اپنی اکلوتی بیٹی سے مل کر اتنے خوش ہوئے کہ بہت سی دولت اس کے سر پر سے وار کر خیرات کردی۔ حاصل پور کے لوگ حیدر ملک کی فیاضی سے اتنے خوش رہتے کہ دعاؤں کے ڈونگرے برساتے نہ تھکتے۔ آج بھی جب منزہ ملک نے گاؤں کی چند عورتوں کو اناج سے بھرے تھیلے دیئے تو ماہین بھی ماں کے ساتھ ہی تھی جب وہ عورتیں ڈھیروں دعائیں دیتی ہوئیں اپنے گھروں کو لوٹیں تو ماہین ان کی زبان سے اپنے لئے اتنی دعائیں سن کر الجھ سی گئی وہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ اتنی دعاؤں کے ساتھ میں رہتی ہوں پھر بھی ذہنی ودلی سکون کو ترستی رہی ہوں یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہورہا ہے، کیا میں بہت گناہ گار ہوں جو مجھ پر دعائیں بھی اثر نہیں کرتیں، مہران بھی کیا سوچتے ہوں گے، جب سے شادی ہوئی ہے، ایک دن بھی سکون سے نہیں گزرا اور یہ ساحر، یہ کیوں میرے حواس پر چھا گیا ہے، آخر کیوں؟“ اس کیوں کا جواب وہ ایک بار پھر نہ تلاش کر پائی تھی۔

حویلی میں آکر ماہین کی طبیعت کچھ بہتر تھی نہ تو سوتے میں ساحر سے باتیں کرتی نہ ہی وہ خوشبو مسام جاں سے ٹکراتی تھی یعنی مہران کا خیال درست تھا کہ آب وہوا کی تبدیلی نے ماہین پر اچھا اور خوشگوار اثر مرتب کیا تھا۔ وہ خود تو کاروبار کے سلسلے میں مصروف رہا، ماہین کے ساتھ نہ آسکا، اسے تنہا بھیج دیا اس وعدے کے ساتھ کہ وہ بہت جلد آنے کی کوشش کرے گا۔

☆......☆......☆

آج پرانی راہوں سے کوئی مجھے آواز نہ دے
درد میں ڈوبے گیت نہ دے غم کا سسکتا ساز نہ دے

وہ صبح سے ہی یہ گانا گنگنائے جارہی تھی۔ مہران بھی آج بہت یاد آرہا تھا، اس کی طبیعت بھی کافی فریش تھی اس نے سوچا کیوں نہ کچھ کیا جائے، لیکن کیا؟ وہ سوچ میں پڑگئی، ساتھ ہی گنگناہٹ جاری تھی۔

اس کی گنگناہٹ کو یکدم بریک لگ گئے، کیونکہ وہ روح میں اترتی ہوئی خوشبو ہرسو پھیل گئی تھی۔ ماہین نے اس کو اپناؤ، ہم سمجھا اور کمرے کی صفائی کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اس کا کمرہ کافی دنوں سے بکھرا پڑا تھا اور ملازمین کو اس کے کمرے میں آنے کی اجازت نہ تھی سو اس نے صفائی کرنے کی ٹھان کر دوپٹہ کمرے کے گرد کس کر باندھ لیا، اور کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک نگاہ دوڑائی۔

”بکھرا ہوا کمرہ، بکھری ہوئی چیزیں، ادھوری باتیں، میری شخصیت کا خاصہ ہیں۔“

وہ دلکش آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ تو اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔

کسی کو نہ پاکر سر جھٹکا اور کتابوں کی الماری کی طرف بڑھی، سب سے پہلی چیز جو اس کے ہاتھ آئی، وہ سرخ جلد والی ایک خوب صورت سی ڈائری تھی۔ اس ڈائری کو دیکھ کر ماہین کی رنگت متغیر سی ہوئی۔ پھر بے اختیار اس نے وہ ڈائری اٹھالی۔ پہلے صفحے پر لکھا تھا۔ ماہی کے نام۔

تمہارے غم نے کیا مجھے خوار ماہی
مجھے مل جاؤ . اک بار ماہی
جنون کی حد تک میں نے تم سے
عشق کیا اور پیار ماہی

تمہارا ساحر

وہ جیسے کہیں کھو سی گئی۔ ذہن ماضی کے دوش پر سفر کرنے لگا۔

اسے لگا جیسے ابھی کل ہی کی بات ہو...... وہ اپنی

سہیلی کے ساتھ یونہی ٹہلنے کو نکلی تھی تو کسی بات پر خفا ہو کر سہیلی کے پیچھے بھاگی۔ سہیلی تو تیز بھاگنے کی وجہ سے نکل گئی مگر ماہین دوپٹہ جھاڑیوں میں الجھنے کی وجہ سے وہیں رک گئی۔ دوپٹہ ایسا الجھا تھا کانٹوں میں کہ نکلنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ ایسے میں ساحر سامنے آیا۔ دوپٹہ چھڑوانے میں اس کی مدد کی۔ ''آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟'' ماہین نے دوپٹہ درست کر کے اوڑھتے ہوئے کہا۔

''نام سے کیا فرق پڑتا ہے محترمہ، ویسے بندے کو ساحر کہتے ہیں اور آپ؟'' ساحر نے اپنا نام بتا کر اس کا نام پوچھا۔

''ماہین ملک۔'' مختصر سا جواب ملا۔

ساحر جیسے کھو سا گیا اس کی رعنائی میں۔ پھر ماہین نے کھنکار کر اس کو متوجہ کیا تو وہ جیسے ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔ ''بہت اچھا نام ہے، آپ حیدر ملک کی بیٹی ہیں، پھر تو ہماری مالکن ہوئیں۔''

ماہین کی گردن احساس تفاخر سے اکڑ ہی گئی۔ حسن اگر مغرور نہ ہو تو عشق کبھی پاگل نہیں ہوتا، پھر یہ تو صدیوں کی ریت ہے، نجانے کب سے چلی آ رہی ہے۔

ساحر اگر مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا تو وہ بھی تو ہزاروں میں ایک تھی، طرہ یہ کہ وہ ایک معمولی کسان کا بیٹا اور ماہین مالکن، مالک کبھی ملازموں کو شکریہ نہیں کہتے، سو وہ بھی ساحر کو شکریہ کہے بغیر ہی چل دی۔

وقت گزرتا گیا اور ماہین ساحر کو بھول گئی، لیکن ساحر کے تو جیسے دل میں گھر کر گئی وہ اکثر اس ایک ملاقات کو سوچتا اور سوچتا ہی رہ جاتا۔ ''کتنی عجیب تھی وہ، کاش پھر ملتی، مگر کیوں ملتی، مل بھی سکتی ہے، لیکن کیسے؟'' وہ اپنی ہی سوچوں میں الجھ سا جاتا۔ وہ بہت بے چین رہنے لگا۔ ماہین کا چہرہ نگاہوں میں ایسا بس گیا کہ اسے کچھ اور نظر ہی نہ آتا، دن بہت بے چین اور راتیں جیسے جسم و جاں کو سلگانے لگی تھیں۔

وہ سوچتا رہتا کہ کیا کرے اس کو دیکھنے کی خواہش اتنی شدت پکڑ گئی کہ ایک دن قدم خود بخود اس کی حویلی کی طرف بڑھنے لگے۔ ان دنوں بارشوں کی وجہ سے سورج ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اس لئے موسم خوشگوار تھا۔ ساون کا مہینہ، ایسے میں تو ہوائیں بھی مستانی ہو جاتی ہیں، ساحر کو موسم کی خوب صورتی و بدصورتی سے کوئی غرض نہ تھی اس کے سب موسم تو اس کے دل کے موسم کے حساب سے حسین ہوتے۔

وہ میرے ساتھ ہی رہتا ہے جہاں تک جاؤں
میں ہوں دریا تو ہے وہ شخص کنارا میرا

وہ بس ماہین کی سوچوں میں مگن جا رہا تھا کہ اس کی سوچ کے سلسلے کو ایک کتے کے بھونکنے کی آواز نے توڑا، ساحر نے چونک کر ارد گرد غور کیا تو وہ حیدر ملک کی حویلی کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ کتے کے بھونکنے کی آواز حویلی سے ہی آ رہی تھی۔ وہ مسلسل بھونکے جا رہا تھا ابھی ساحر اس بارے میں کچھ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ اچانک حویلی کا گیٹ کھلا اور اس میں سے ایک شخص برآمد ہوا اس نے سارے جسم کو چادر سے ڈھانپ رکھا تھا حتیٰ کہ چہرہ تک مکمل چھپا رکھا تھا، وہ شخص تیزی سے چلتا ہوا ساحر سے ٹکرا گیا اور اس ٹکراؤ میں اس کے ہاتھ سے کچھ چھوٹ کر نیچے گرا تو وہ جلدی سے جھکا اور گرے ہوئے نوٹ سمیٹنے لگا۔

ایک پل میں ساحر کو ساری صورتحال سمجھ گئی اس نے فوراً اس آدمی کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اتنے میں حویلی سے کچھ لوگ بھاگتے ہوئے آئے اور اس آدمی کو پکڑ کر اندر لے گئے۔ ساحر بھی اسی افراتفری میں ان کے ساتھ حویلی میں داخل ہو گیا کہ دیکھے تو سہی کہ کیا معاملہ ہے، شاید وہ دشمن جاں بھی دکھائی دے جائے۔

وہ سب ایک لمبی سی راہداری سے گزر کر ایک ہال کمرے میں داخل ہوئے، کمرے میں داخل ہو کر سب ادب سے کھڑے ہو گئے، ساحر بھی چپ چاپ ایک سائیڈ پر کھڑا ہو گیا، چور اور رقم حیدر ملک کے سامنے پیش کیے گئے تو انہوں نے چور کو خود کچھ نہ کہا، تھانے فون کیا پولیس کو بلایا اور چور اس کے حوالے کر دیا۔ اس ساری کارروائی سے فارغ ہو کر ان کو جب پتہ چلا کہ چور کو ساحر نے پکڑا ہے تو وہ بہت شکر گزار ہوئے اور ممنون نگاہوں سے تکتے ہوئے بولے۔

''نوجوان بہت شکریہ، کرتے کیا ہو کس کے بیٹے ہو؟''

ساحر ان کے آدھے سوال کا جواب گول کر گیا اور

بولا۔ "کچھ بھی نہیں کرتا، نہ گھر ہے نہ ٹھکانہ، سوچتا ہوں کسی کے گھر میں ملازمت کرلوں، سر چھپانے کو چھت بھی مل جائے ملازمت بھی۔" ایسا اس نے مصلحتاً کہتا تھا تاکہ وہ جان نہ سکیں کہ وہ کس کا بیٹا ہے، وہ اپنے ہی لہجے کی عاجزی و مسکینی پر خود حیران رہ گیا اس کی انا اس کی خودی کبھی گوارا نہ کرتی کہ وہ کسی سے اتنا گر کر بات کرتا یہ تو ماہین کو دیکھنے کی چاہت کی شدت تھی کہ اسے گرنے پر مجبور کردیا، ملک صاحب کو اس کی آنکھوں سے جھانکتی خودداری اور دوٹوک بات کرنے کا انداز اتنا بھایا کہ اس کو اپنے ہی گھر میں اوپر کے کاموں کے لئے ملازم رکھ لیا۔

اس کے تو جیسے دل کی کلی ہی کھل گئی جیسے بن مانگے مراد مل گئی کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ قسمت اس قدر مہربان بھی ہوسکتی ہے اس کے گھر میں رہ کر وہ جب چاہے اس کو دیکھ کر اپنے دل اور آنکھوں کو ٹھنڈا کرسکتا تھا۔

ماہین ایک الگ ہی دھوپ چھاؤں جیسے مزاج کی لڑکی تھی خوش ہوتی تو خوب ہنستی، شوخیاں، شرارتیں اس کے حسن بلاخیز کو چار چاند لگا دیتیں اور جب سنجیدگی اختیار کرتی تو ایسے جیسے بولنے کے فن سے آشنا ہی نہ ہو۔

ساحر کا دل سلگنے لگتا وہ بہت دعائیں کرتا کہ ماہین ایسے ہی ہنستی مسکراتی رہے مگر ساحر کی یہ دعا کبھی درجہ قبولیت تک نہ پہنچی، کیونکہ ماہین خاص طور پر ساحر کے سامنے ہی ایسے خاموش رہتی جیسے بولنے پر پابندی ہو۔

بہت سے دن ہوگئے تھے ساحر کو حویلی میں آئے وہ بہت خوش رہتا، ایک ماہین کو دیکھنے کے بدلے اس کو جو بھی کام کرنے پڑتے تھے وہ بخوشی کرنے پر تیار ہو جاتا۔

ایک دن تو ساحر پر جیسے خوشیوں کی برسات سی ہوگئی۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں کسی کام سے آیا تھا۔ اور جھک کر دراز سے کچھ تلاش کررہا تھا کہ اس کے کانوں نے روح پرور جانفزا آواز سنی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ بھی وہاں موجود ہوگی۔

"سنو ساحر ادھر آؤ۔" ساحر کی تو مانو جیسے روح فضاؤں میں رقص کرنے لگی، دل ایسے زور زور سے دھڑکنے لگا جیسے پسلیوں کا پنجرہ توڑ کر باہر نکل آئے گا، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں کے مصداق وہ ماہی کی جانب ایسے بڑھا جیسے پتنگ ڈور کو کھینچی ہے۔ "جی" وہ اس کے قریب ایسے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا جیسے وہ جنم جنم سے اس کا غلام ہو۔

ماہین نے نگاہ اٹھا کر ساحر کو دیکھا ساحر کی نظریں ماہین سے ملیں تو وہ کانپ سا گیا۔

اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔

"کیا وہ سو نہیں پائی یا رو تی رہی ہے۔" ساحر نے دل ہی دل میں ان گلابی ڈوروں کی وجہ جاننے کی کوشش کی مگر وہ مٹی کا مادھو عورت کے دل کے بھید کیا جان سکتا تھا۔

"میرے دوست بنو گے؟" ماہین کی بات سے ساحر پر جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور پھر جیسے پل بھر میں ہی بن بادل برسات ہوگئی ہر طرف جل ترنگ بجنے لگے روح کا قلندرانہ رقص پھر سے شروع ہوگیا وہ ابھی اس کی پہلی بات کے ہی نشے میں چور تھا کہ وہ پھر گویا ہوئی۔

"اچھے انسان ہو تم، تمہاری آواز مجھے بہت اٹریکٹ کرتی ہے، تو کیا تم مجھ سے دوستی کرو گے؟" وہ سراپا سوال تھی۔

اب کہ ساحر گڑبڑا گیا کچھ سمجھ ہی نہ آیا کہ کیا ہے، بس اتنا ہی کہہ سکا "کروں گا ضرور کروں گا اور جان سے بھی بڑھ کر وفا کروں گا۔"

"بس تو پھر ڈن، تم پہ اعتماد ہے مجھے، اور دیکھو خود سے زیادہ اعتماد ہے، میرا یقین کبھی مت توڑنا۔" ماہین سر جھکائے بول رہی تھی، اس نے نظریں اپنے ہاتھوں پہ گاڑ رکھی تھیں اور ساحر کے تو جیسے پر ہی نکل آئے وہ ہواؤں میں اڑنے لگا۔ ماہین اسے ہر بات میں شریک کرتی ہر کام میں ساتھ رکھتی بس ایک ہی خامی اس کی ساحر کو کھٹکتی کہ وہ کبھی ساحر کے ساتھ اپنے دل کی باتیں نہیں کرتی تھی۔

وہ پاگل ایک عورت کے دل کے بھید جاننا چاہتا تھا۔ اس نے ماہین پر اپنا آپ ایک کتاب کی طرح کھول کر رکھ دیا، اپنے دل کی ساری باتیں کہہ دیں، ساری محبت لٹادی، لیکن ماہین کبھی اس کے ساتھ ایک حد سے زیادہ بات نہ کرتی وہ منتظر ہی رہتا۔ اس کا دل بہت دکھتا پر اس بات کی خوشی بھی بہت ہوتی کہ وہ اسے اپنا دوست سمجھتی ہے۔

دن جیسے پر لگا کر اڑنے لگا۔ ساحر نے تو دنوں کا

حساب رکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی ماہی کا دیدار اور آنکھ لگنے تک ماہی کا تصور دل ماہی ماہی کی تکرار تکرار رہتا، باقی سب کچھ بھول گیا تھا، زندگی ماہی سے شروع ہو کر ماہی پر ہی آ کر ختم ہو جاتی۔

نہ ہے ابتدا میرے عشق کی نہ ہے انتہا میرے عشق کی
میرا عشق ہی ہے میرا خدا مجھے اور کوئی خدا نہ دے
مجھے بار بار صدا نہ دے میری حسرتوں کو ہوا نہ دے
میرے دل میں آتش عشق ہے میری آگ تجھ کو جلا نہ دے

☆......☆......☆

محبت ایک بار پھر پینترا بدل کر وار کر رہی تھی اس پر، خوش فہمی کا وار۔ سرمستی اور سرشاری ایک نیا موڑ لے رہی تھی۔ ساحر کی محبت ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو رہی تھی کہ وہ جذب کی سی کیفیت میں رہنے لگا، ماہی مجسم اس کی روح میں حلول کر گئی تھی۔

عجیب سی کیفیت تھی اس کی وہ اکیلا ہوتا تو ماہی کو اپنے پاس پاتا۔ بھیڑ میں بھی اپنے ساتھ محسوس کرتا وہ جو دیکھتا۔ اسے لگتا ماہی بھی اس کے ساتھ وہی دیکھتی ہے جو سنتا اسے لگتا ماہی اس کے کانوں سے سن رہی ہے۔ حتیٰ کہ ماہی نے اس کی سوچوں تک پہ پہرے بیٹھا دیئے تھے۔ وہ جو سوچتا اسے ایسا محسوس ہوتا کہ ماہی یہ سب سوچیں پڑھ رہی ہے۔ عجیب فقیرانہ سا حال ہو گیا تھا اس کا۔

ادھر ساحر کی محبت جنون کی حدوں کو چھو رہی تھی تو وہاں ماہی کی بے زاری میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دن بدن ساحر سے ذہنی و جسمانی طور پر دور ہوتی گئی، اس نے ساحر کو بری طرح نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔

ساحر حیران و ششدر رہ گیا۔ ہر روز ماہی کی طرف سے ایک نئے طرز کا ستم ایجاد ہو رہا تھا۔

ہر روز ایک نیا چہرہ سامنے آتا ماہی کا، اس کا یوں دور دور رہنا ساحر کو بہت دکھ دیتا وہ اس کے سامنے آنے سے بھی گریز کرتی، اگر کبھی سامنا ہو بھی جاتا تو تلخ کلامی اور سرد مہری سے ساحر کا دل چیر کر رکھ دیتی، وہ پھر بھی والہانہ محبت کرتا رہا، ماہی کو کانٹا بھی چبھتا تو ساحر کی راتوں کی نیند اڑ جاتی وہ پاگلوں کی طرح ماہی کی فکر میں غلطاں رہتا۔ اگر کبھی اتفاق سے سامنا ہو بھی جاتا تو ماہی کی سرد مہری اور روکھے رویے سے ساحر کا دل کرچی کرچی ہو جاتا۔ وہ اس سے اتنے برے سلوک کی وجہ پوچھتا رہ جاتا اور ماہی اپنی ازلی خاموشی میں ٹال دیتی۔

اور پھر ایک دن ساحر نے آخری فیصلہ کر ہی لیا کہ "ماہی سے دوٹوک بات کر کے ہی رہے گا۔"

اور جب صبر کا دامن چھوٹ گیا، برداشت کی حدیں ختم ہو گئیں تو ایسا طوفان آیا کہ سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے گیا...... ساحر بری طرح ٹوٹ گیا ایسا کہ پھر بہت کوشش کے بعد بھی اپنے نارمل افکار کو نہ پا سکا۔ وہ ماہی سے بات کرنے کے لئے مناسب موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔ گھنٹوں اس کا انتظار کرتا رہا، ماہی جہاں اس کو پاتی راستہ ہی بدل کر گزر جاتی۔

ساحر بہت اداس اور پریشان رہنے لگا اس کا کسی کام میں دل نہ لگتا، بس چوبیس گھنٹے ماہی جو اس پر سوار رہتی، سوچوں کے سلسلے بے پایاں سمندر جیسے دراز ہو گئے۔ زندگی میں ایک عجیب سی ویرانی اور وحشت ٹپکنے لگی، ساحر کی بے زاریت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ وہ خود سے بھی بیگانہ ہو گیا، بڑھی ہوئی شیو، ملگجا لباس، مستقل خاموشی اس کا خاصہ بن کر رہ گئی، اردگرد کے لوگ بھی چونکنے لگے اس کے حلیئے سے، حیدر ملک بھی کئی بار کہہ چکے تھے کہ طبیعت ٹھیک نہیں تو ڈاکٹر کو دکھا آؤ۔"

ملک صاحب نے ساحر کو کیاریوں کی صاف صفائی کا کام سونپا تھا وہ پچھلے کافی دنوں سے کام میں لاپرواہی برت رہا تھا۔ ملک مزاج کے نرم تھے اس کی لاپرواہی کو طبیعت کی خرابی پر محمول کیا۔ نرم گرم سی دھوپ جہاں راحت بخش تھی، وہیں اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو گئے۔ اس کا وجدان اسے خبردار کر رہا تھا کہ وہ کسی کی نظروں کے حصار میں ہے وہ خوب جانتا تھا کہ یہ کس کی نظروں کی تپش ہے پھر بھی وہ جان کر بھی انجان بنا رہا۔

ساحر بالآخر اسے اپنی پشت پر کھنکار سنائی دی۔ وہ خاموش رہا اور نظریں زمین پر ہی گاڑے رکھیں۔ پھر بھی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔ وہ اپنی دلی کیفیت کو

ماہی پر آشکار نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ "اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟"

ساحر دنگ رہ گیا اسے لگا جیسے وقت رک سا گیا ہے اور وہ اسی ایک جملے میں قید ہوگیا ہے۔ اس دشمن جاں نے کیا پوچھ لیا تھا۔ پہلے زخم زخم کرنے کے بعد اب مرہم کا سامان، بیک وقت اذیت وراحت کا احساس ہوا تھا اسے۔

"پہلے سے بہت بہتر ہے۔" وہ ایک گہری آہ بھر کر بولا۔ خاموشی ایک بار پھر سے طاری ہوگئی، اس خاموشی کی دیوار کو توڑنے کی ہمت وہ خود میں نہیں پارہا تھا۔ لیکن وہ یہ موقع کھونا نہیں چاہتا تھا سو بولا۔ "مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے ماہی۔"

"بولو۔" ماہی نے مختصراً کہا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے؟"

"نہیں۔" پھر مختصر جواب ملا۔

"تو پھر آپ مجھے نظر انداز کیوں کرتی ہیں؟" ساحر کا لہجہ شاکی سا تھا۔ وہ یہ دیکھے بغیر کہ ماہی کا موڈ آف ہوگیا ہے، بولتا رہا۔ "ہم دوست ہیں تو پھر کیوں آپ نے دور دور رہنا شروع کردیا ہے؟"

"ایکسکیوز می، ہم دوست نہیں ہیں۔" اس بات پر تو ماہی جیسے تپ ہی گئی۔

"آپ مجھے دوست نہیں سمجھتیں لیکن میں تو سمجھتا ہوں ناں، بلکہ میں تو اس حویلی میں آیا ہی آپ کے لئے ہوں، آپ کو بتا چکا ہوں کہ میری سوچوں، میرے خیالوں، میری امید اور ناامیدی میں آپ ہو، ہر پل ہر آن میرے دل میں دھڑکن بن کر دھڑکتی ہو میری رگوں میں خون بن کر بہتی ہو...... میری ہر آتی جاتی سانس میں آپ بستی ہو ماہی، آپ میری روح میں اتر گئی ہو، میرے روز وشب بہت مضطرب ہیں ماہی۔"

"تو میں کیا کروں۔" ساحر کی بات ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ ماہی یکدم ہی چیخی تھی۔ "کیا چاہتے ہو تم مجھ سے، مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتے تم، مجھے اکیلا چھوڑ دو، مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے، تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں کچھ نہیں چاہتا ماہی، میں صرف آپ کی خوشیاں چاہتا ہوں۔" وہ کمزور سی آواز میں بولا۔

"تمہیں میری اتنی فکر کیوں ہے؟" وہ بولی۔

"میں آپ سے محبت کرتا ہوں حد سے زیادہ۔"

"مجھے تمہاری محبت کی ضرورت نہیں ہے، ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اور تم اپنی حد میں رہو۔" وہ بہت ہی غصے میں آگئی تھی۔

"آپ کیوں مجھ سے اتنا چڑتی ہیں؟" وہ بھی اپنی بات پر ڈٹا رہا اس نے ٹھان لی تھی کہ وہ آج وجہ جان کر ہی رہے گا...... "مجھے وجہ بتائیں بس میں سوچ سوچ کر پاگل ہوگیا ہوں کہ آخر مجھ سے ایسی کیا غلطی ہوگئی ہے جو آپ نے مجھے یوں ٹھکرا دیا۔"

"سننا ہی چاہتے ہو تو سنو، مجھے نفرت ہے تم سے اور تمہاری محبت سے، مجھے تمہاری باتوں سے نفرت ہے۔ میری جان چھوڑ دو، میری زندگی سے دور چلے جاؤ خدا کے لئے۔" یہ الفاظ بجلی بن کر گرے تھے۔ ساحر کچھ لمحے تو کچھ بول نہ سکا، گہرے صدمے سے اس کی آواز گنگ ہوگئی، کچھ دیر بعد بولا تو یوں۔ "آپ تو میری سانسوں کی ضامن ہیں پھر آپ...... ماہی آپ کیسے اس طرح کہہ سکتی ہیں۔" اس کی آواز رندھ گئی۔ "میں آپ سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔"

"میں نے نہیں کہا تھا مجھ سے اتنی محبت کرو۔" ماہین کے انداز میں حد درجہ سفاکی تھی۔

"میں کسی صلے کے لئے تھوڑی ہی...... میں تو بس...... میں تو آپ کے......" اس کے الفاظ بے ربط ہوگئے لہجہ بکھر سا گیا وہ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ ماہین کے غصے کی تیزی وتندی کا مقابلہ کیسے کرے۔

"میں تم سے تنگ آچکی ہوں، خدا کے لئے میری جان چھوڑ دو، تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تم میری زندگی سے چلے جاؤ" ماہی بولتی رہی، ساحر کی آنکھیں بھیگنے لگیں وہ یہ دعا کرتا تھا کہ ماہی بولتی رہے اور آج جب وہ بولی تو ساحر کی دل کی دنیا ہی تاخت وتاراج کرکے رکھ دی۔

"مجھے معاف کردیں ماہی میں جانتا نہیں تھا کہ آپ مجھ سے اتنی تنگ ہیں......

میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں یہ خواہش آپ کی میں ضرور پوری کروں گا، مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے تھا آپ کے سوا، میں تو بس آپ کو دیکھ کر زندہ ہوں، اب اگر آپ ہی نہیں تو کچھ بھی نہیں......'' آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے، آپ نہیں تو کچھ بھی نہیں...... کچھ بھی نہیں۔'' ہچکیوں سے اس کا سانس ڈولنے لگا۔

ماہی کے لبوں پر مسکان تھی، وہ ہنس رہی تھی، ٹوٹا بکھرا ساحر شاید اس کی انا اس کے جذبہ غرور کو تسکین دے رہا تھا۔ وہ مسکراتی رہی۔ وہ ماہی کو کسی قیمت پر چھوڑ نہیں سکتا تھا لیکن ماہی کی نفرت نے اسے سب کچھ چھوڑنے پر مجبور کردیا تھا پھر تو وہ ملک صاحب کے لاکھ روکنے پر بھی نہ رکا اور حویلی چھوڑ کر چلا گیا۔

نہ دشمنی کسی دن سے اب نہ دوستی کسی رات سے
بچا ہی کیا جو وہ لے گیا چھین کر میری ذات سے
یہ مقام ہی تھا عجیب سا میں خود کو بھی نہ بچا سکا
نہ میں پاس اس کو بلا سکا نہ میں دل کی بات بتا سکا

☆......☆......☆

ماہین کی دھوپ چھاؤں سی طبیعت اسے کہیں ٹھہرنے نہ دیتی تھی۔ ساحر کا خلوص اس کی وفا کو ماہی برداشت ہی نہ کرپائی۔ سچ ہے محبت کی زیادتی بھی انسان کو دکھ دیتی ہے اسے ساحر کا بلک بلک کر رونا یاد آتا رہا۔ اس کے سوا وہ ساحر سے کوئی ہمدردی نہ جتا سکتی تھی۔

انہی دنوں حیدر ملک نے اپنے بھانجے مہران ملک سے ماہین کی شادی طے کردی۔ ماہین کوئی احتجاج نہ کرسکتی تھی سو بلا چوں چراں باپ کا فیصلہ مان لیا کیونکہ یہ تو طے تھا ایک نہ ایک دن تو یہ دن آنا ہی تھا۔ وہ ساحر کو بھول جانا چاہتی تھی لیکن اگر ہر چیز انسان کے بس میں ہوتی تو قدرت کے فیصلوں کی کیا اہمیت رہ جاتی۔ مہران شہر سے آیا تو اسے شکار کا شوق چرایا اس نے ماہین کو بھی دعوت دے ڈالی جسے اس نے بخوشی قبول کرلیا، کیونکہ وہ خود شکار اور نشانے بازی کی شوقین تھی۔ یوں اس کا شوق بھی پورا ہوجاتا اور مہران کی دعوت کا مان بھی رہ جاتا۔ سو زور و شور سے شکار کی تیاری کی اور جنگل کی طرف چل دیئے۔ وہ حاصل پور کے باہر جنگل میں موجود تھے۔ مہران نے بہت سارے چھوٹے موٹے شکار کیئے جن میں زیادہ تر پرندے شامل تھے۔ ماہین نے ابھی تک رائفل کندھے سے اتاری نہ تھی۔ چلتے چلتے وہ اچانک رک گئی گھنی جھاڑیوں میں اس کو خرگوش دکھائی دیا۔ مہران آگے بڑھ گیا وہ ماہین کے رکنے سے انجان تھا۔ ماہین نے رائفل لوڈ کی اور فوراً خرگوش کو نشانے پر لیا، ایک لمحے کے لئے اس کا ہاتھ کانپ گیا۔ ساحر کا خیال آگیا، اس نے تو رائفل چلانا سکھایا تھا اسے، اس نے نخوت سے سر جھٹکا اور ہاتھوں کی لرزش کی پروانہ کرتے ہوئے ٹریگر دبادیا۔ اتنے میں مہران بھی آگیا۔ ایک کراہ ابھری۔ ''یہ آواز کیسی ہے؟'' مہران نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیسی آواز، میں نے تو کوئی آواز نہیں سنی۔'' ماہین نے کہا۔ اس کی نگاہیں زخمی خرگوش کو تلاش کررہی تھیں مگر وہ ایسے غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

کراہ ایک بار پھر ابھری، اب کہ آواز قدرے اونچی تھی۔

☆......☆......☆

ماہین چونک گئی اور ماضی کے سفر سے لوٹ آئی، ہر طرف ہوشربا خوشبو پھیلی ہوئی تھی، ساحر کی آخری یاد اس کی ڈائری جسے ساحر نے اپنے خون جگر سے سجایا تھا واپس رکھ دی، گراؤنڈ فلور سے تیز تیز بولنے کی آواز آرہی تھی۔ ماہین نے غور کیا۔ تو تیزی سے باہر کی طرف بھاگی۔ ساحر کی آواز۔ ''کیا وہ واپس آگیا؟'' دل میں سوچا تھا اس نے سورج اپنی آخری منزل کی طرف روانہ ہورہا تھا۔ سائے لمبے ہورہے تھے۔

جب وہ لان میں پہنچی تو ساحر سچ مچ وہاں موجود تھا ماہین اس کی طرف بڑھی، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی ساحر پلٹا جب دونوں کی نظر ملی تو وہ جیسے پتھرا گئی کچھ بھی کہنے سننے کی حالت میں ہی نہ رہی۔ ساحر کی آنکھوں میں آگ سی جلتی ہوئی نظر آئی، اتنی گرمی، اتنی تپش کہ ماہین کو وہ تپش اپنی آنکھوں میں منتقل ہوتی محسوس ہوئی، ماہی کو یوں لگا جیسے اس کا دماغ جل اٹھا ہے وہ تیورا کر گری اور بے ہوش ہوگئی، مہران حویلی کے گیٹ سے داخل ہوا تو اس نے ماہین کو اکیلے

کھڑے اور پھر گر کر بے ہوش ہوتے دیکھا تو بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا۔

حویلی کے مکینوں پر تو جیسے قیامت ہی ٹوٹ پڑی، ماہین ان کی اکلوتی اولاد تھی، جس کی ہنستی بستی زندگی کو کسی حاسد کی نظر لگ گئی تھی۔

اگلی صبح ماہین ہوش میں آ گئی تھی، مگر اس کی ازلی خاموشی بھی لوٹ آئی تھی وہ بالکل گم صم ہو کر رہ گئی، ڈاکٹروں اور حکیموں کے علاج کے باوجود بھی اس کی حالت میں کوئی سدھار نہ آیا اس کی آنکھوں کی سرخی نہ جاتی تھی نہ گئی، زبان کے تالے نہ ٹوٹنے تھے نہ ٹوٹے، زندگی کا سارا نظام جیسے درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔

منزہ ملک اسے دوپہر کا کھانا کھلا کر دوا دے کر سلا کر آئی تھیں کہ اچانک ہی پوری حویلی ماہین کی چیخوں سے لرزنے لگی۔

سب لوگ اپنے کام چھوڑ کر اس کے کمرے کی طرف دوڑے، وہ جب اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو ایک روح فرسا منظر ان کا منتظر تھا۔ کمرے کی ہر چیز بکھری پڑی تھی۔ یہاں تک کہ بیڈ کی چادر اور تکیے ڈریسنگ ٹیبل کے پاس پڑے تھے اور ڈریسنگ ٹیبل پر پرفیوم کی بہت سی شیشیاں ٹوٹی پڑی تھیں اور ماہین...... وہ ایسے کربناک انداز میں چلا رہی تھی، جیسے کسی کو زندہ کاٹا چلایا جاتا ہے۔ اس دلخراش منظر کو دیکھ کر سب تڑپ کر رہ گئے۔

منزہ تو رونے لگیں۔ حیدر اور مہران، ماہین کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن وہ کہاں کسی کے قابو میں آنے والی تھی۔ مسلسل چیختی اور دیوار سے سر ٹکراتی رہی۔ سر سے خون بہہ کر سفید لباس کو سرخ کرنے لگا اس کی اضطرابی حالت دیکھی نہ جاتی، پھر وہ گر کر بے ہوش ہو گئی۔

اب تو اکثر ہی یہ ہونے لگا، یا تو وہ خاموش اور گم صم پڑی رہتی، یا پھر چیختی چلاتی، چیزیں توڑتی اور خود کو بھی نقصان پہنچانے سے گریز نہ کرتی۔

ڈاکٹروں نے بھی یہ کہہ کر اس کے علاج سے ہاتھ کھینچ لیا کہ ''ہم جسمانی روگ کا علاج تو کر سکتے ہیں، روحانی روگ ہمارے بس سے باہر ہے۔ آپ ماہین کو کسی روحانی معالج کو دکھائیں۔''

بہت بھاگ دوڑ نے کے بعد ایک روحانی عالم سید صاحب کو بلایا گیا۔ پہلے تو انہوں نے آتے ہی کچھ حساب لگایا پھر پانی پر دم کر کے ماہین کو پلایا جس سے اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی۔ پورے سات دن تک ماہین کا علاج چلتا رہا۔ سید صاحب سارا سارا دن اور ساری ساری رات تلاوت کرتے اور ماہین کو پانی دم کر کے پلاتے۔

سات دن گزرنے کے بعد سید صاحب نے سب کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور حقیقت کی نقاب کشائی کی۔ ''ملک صاحب آپ کی بیٹی پر قوم جنات کے سردار کے بیٹے کا سایہ تھا، ماہین کی کسی غلطی یا نادانی کی وجہ سے اس کو نقصان پہنچا تھا مگر اب اللہ کے کرم اور پاک کلام کی برکت سے سب ٹھیک ہے، وہ ماہین کو چھوڑ کر چلا جائے گا، آج میں بھی جا رہا ہوں، میرے جانے کے بعد ایک رات اور ایک دن ماہین سے کوئی نہ ملے، اسے اس کے کمرے میں بالکل اکیلا چھوڑ دیں۔''

☆......☆......☆

ماہین کی آنکھ بہت لطیف لمس سے کھلی تھی۔ وہ اس کے پاس بیٹھی اس کے بال سہلا رہی تھی۔ ''آپ کون؟'' ماہین نے نحیف سی آواز میں پوچھا۔

میرا نام نمداشہ ہے اور یہ میرے شوہر ہیں۔'' اس عورت نے اپنا تعارف کروایا اور اس بندے کا بھی جو ماہین کے پائنتی کھڑا تھا۔ ماہین نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک عجیب سا سکون محسوس ہو رہا تھا۔

''اٹھو میرے ساتھ چلو، یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔'' اس عورت نے ماہین کا ہاتھ پکڑا اور اسے ہلکا سا دبا دیا۔ ماہین نے سوالیہ نظروں سے نمداشہ کو دیکھا۔

''ہم تمہیں کچھ دیر کے لئے کہیں لے جانا چاہتے ہیں۔'' نمداشہ کے شوہر نے کہا۔

نمداشہ نے ماہین کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور کہا۔ ''آنکھیں بند کر لو'' ماہین نے آنکھیں بند کر لیں۔

چند لمحے بعد آنکھیں کھولنے کو کہا گیا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ حاصل پور کے باہر جنگل میں کھڑے تھے، ماہین کو کچھ سمجھ نہ آیا کہ ماجرا کیا ہے۔ ''آپ

لوگ کون ہیں اور مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟"

ماہین کے سوال پر نمداشہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ گھنی جھاڑیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ایک جگہ پہ وہ رک گئے، وہ بہت بڑا درخت تھا جس کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اس کے نیچے بہت گھنی جھاڑیاں تھیں، درخت کی شاخیں چاروں طرف سے ایسے جھکی ہوئی زمین تک آرہی تھیں کہ ایک چاردیواری کا سا گماں ہوتا تھا۔ جھاڑیوں کے بیچوں بیچ ایک چبوترہ سا بنا تھا۔ ماہین کو کچھ سمجھ نہ آرہا تھا کہ یہ لوگ کون ہیں اور اسے یہاں کیوں لے کر آئے ہیں؟

نمداشہ نے اس کی یہ حیرت بھی دور کردی۔ چبوترے کی طرف اشارہ کرکے بولی۔ "اس پر اپنے مذہب کے مطابق فاتحہ پڑھو۔"

ماہین کچھ نہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھی وہ کوئی جیسے مزار تھا، جب اس کی نظر کتبے پر پڑی تو اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی اور زبان سے بے اختیار نکلا۔ "میں نے ایسا کب چاہا تھا۔"

کتبے پر لکھا تھا۔ "ماہی تمہارا ساحر۔" پھر بے اختیار ماہین کی آنکھوں سے آنسو امڈ آئے اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ بہت سا وقت ایسے ہی گزر گیا وہ سسکیاں بھرتی رہی۔

آخر نمداشہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بس کرو یوں تو تم ساری زندگی بھی آنسو بہاتی رہو تو اس کی محبت اور اپنی لاپرواہی یا نظر اندازی کا بوجھ ہلکا نہیں کرسکتی، ہمارے پاس وقت کم ہے۔

"وہ تمہیں چھوڑ کر یہاں آبسا تھا۔ روتا رہتا تھا بہت بے چین رہتا، ہر وقت "ماہی، ماہی" ہم لوگ اسی درخت پر رہتے ہیں، اس نے درخت کی طرف اشارہ کیا، ہم حیران تھے کہ لوگ دنیا چھوڑ کر جنگل میں آبستے ہیں اور ہر وقت دنیا بنانے والے کو یاد کرتے ہیں اور یہ عجیب جن ہے، طاقتور ہوتے ہوئے بھی روتا ہے، پاگلوں کی طرح بلکتا ہے اور ماہی ماہی کرتا ہے۔

ہمیں اس پر بہت ترس آتا، جنات ہوکر بھی، مگر تمہیں انسان ہوکر بھی اس پر ترس نہ آیا، خیر ہم نے اس کا درد بانٹنے کے لئے انسانی روپ میں اس کے پاس آنے کا فیصلہ کرلیا۔

جس دن، ہم انسانی روپ میں اس کے پاس آنے والے تھے۔ اسی دن تم نے اسے ماردیا، تم نے اس کے دل میں گولی اتاردی جس میں صرف تم اور تمہاری محبت بستی تھی۔"

ہم فوراً اسے بچانے کے لئے بڑھے تو جانتی ہو اس نے کیا کہا؟"

ماہی نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ سر نفی میں ہلادیا۔

نمداشہ پھر گویا ہوئی۔ اس نے کہا۔ "مجھے مرجانے دو مجھے ماہی نے مارا ہے، یہ خوشبو بتارہی ہے کہ ماہی نے مجھے مارا ہے وہ آس پاس ہے۔ میری خواہش اور دلی خوشی ہے کہ میرے قبیلے اور نسل والے ماہی یا اس کے گھر والوں سے دور رہیں۔" اور وہ مرگیا، مرتے مرتے بھی یہ کہہ رہا تھا کہ "میں ماہی کی خوشی میں خوش ہوں۔"

ہم چاہتے تو تمہارے لوگوں کو تمہاری داستان سناتے لیکن مرنے والا تمہاری عزت کرتا تھا، اس لئے ہم نے بھی تمہیں بے عزت نہ ہونے دیا...... تمہارے گھر جانے کا وقت ہوگیا ہے، ہم چاہتے تو تمہیں کڑی سزا دیتے مگر تمہیں بچالیا گیا، آنکھیں بند کرو اور جاؤ اس سے پہلے کہ ہم اپنا ضبط کھوبیٹھیں۔" جن زادہ بہت غصے میں تھا۔

ماہین نے آنکھیں بند کرلیں اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ اپنے کمرے میں تھی۔ شدت کرب سے دل پھٹنے کے قریب تھا، آنکھیں رو رو کر سرخ ہوچکی تھیں مگر تکلیف و اذیت کم نہ ہورہی تھی۔ "میں مجبور تھی، تمہاری ماہی مجبور تھی میرے ساحر، مجھے معاف کردو...... معاف کردو۔"

وہ اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسکنے لگی۔

یہ بھی ٹھیک ہے وہ چلا گیا مجھے بند رستے پر چھوڑ کر
یہ بھی ٹھیک ہے نہ آئے گا وہ کبھی بت انا کا توڑ کر

مسکراہٹ

عثمان غنی-پشاور

رات کا اندھیرا ہر سو مسلط ہوچکا تھا، موسم کے تیور بھی بہت خطرناک تھے کہ اتنے میں ایک عورت نے ایک عورت کی خوشیوں کو ڈس لیا، خون میں لتھڑی دوشیزہ کی فلک شگاف چیخ ابھری اور پھر......

کبھی کبھی انسان مطلب پرستی میں تمام حدیں پھلانگ جاتا ہے-کہانی پڑھ کر دیکھیں

تیری مسکراہٹ پر فدا ہوگئے
تیری خاطر ہم سب جدا ہوگئے

وہ جب ہنستی ہے تو میں پاگل ہوجاتا ہوں، اس کی مسکراہٹ دنیا کی سب سے حسین مسکراہٹ ہے، میں، میں نہیں رہا۔ میں بدل گیا ہوں۔

"تمہیں پتہ ہے کنول! میرا دل میرا نہیں رہا۔" پر دل اتنا بے وفا ہوتا ہے کہ خود وفا نہیں نباہ سکتا اور دوسروں سے وفا مانگتا پھرتا ہے۔"

سلمان نے کھوئے کھوئے لہجے میں اپنی بچپن کی دوست کنول کو بتایا۔ مگر کنول کا دل بھی اپنا کب رہا تھا۔ وہ تو دھڑکن بن چکا تھا۔ سلمان کے نام پر دھڑکتا رہتا تھا۔ کنول جو کہ ان دنوں سوچوں میں گم رہتی کہ کب سلمان اسے حال دل سناتا ہے۔ مگر اس وقت سلمان تو کوئی اور رام کہانی سنا رہا تھا۔ جسے سن کر کنول کا دل رنجیدہ ہو رہا تھا۔

ایک خوف اس کے دل میں بیٹھ رہا تھا کہ سلمان کسی کی مسکراہٹ پر دل ہار چکا ہے مگر سلمان ایسا کیسے کرسکتا ہے۔ وہ کنول کا دل کیسے کسی کی مسکراہٹ پر ہار سکتا ہے۔

مگر ایسا ہو چکا تھا۔ فیصلہ ہو چکا تھا وہ سلمان کے دل میں جگہ بنا چکی تھی، اور کنول کتنی بے خبر تھی، اسے پتہ بھی چلا تو سلمان سے! جسے وہ اپنا آپ دل کہتی تھی۔

کنول غیر یقینی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کنول تمہیں پتہ ہے، اس جیسی حسین مسکراہٹ کسی کی بھی نہیں ہے۔'' اور کنول کا دل چاہا کہ وہ اس انجان مسکراہٹ والی لڑکی کو زندہ قبر میں دفن کردے، وہ کمال فن سے خود پر جبر رکھ کر بیٹھی ہوئی تھی اور اپنی رقیب کی مسکراہٹ کی تعریف سن رہی تھی۔

''سلمان میں جب اس سے ملوں گی، تب یقین کروں گی کہ تم جس کی مسکراہٹ کی تعریفیں کررہے ہو وہ اس قابل ہے بھی یا نہیں۔'' کنول نے سلمان کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

''اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ میں تمہیں اس سے ضرور ملواؤں گا، تمہیں بھی بہت پسند آئے گی۔''

''ہاں دیکھ کر بتاؤں گی۔'' کنول مسکرائی مگر اس کا دل جل رہا تھا، گھٹن بڑھ رہی تھی۔ ابھی اسے مسکراہٹ والی لڑکی کا نام تک معلوم نہیں تھا۔ مگر دل میں جیسے اس کے آگ لگ گئی تھی۔ وہ اپنے دل میں لگی آگ سے اس انجان لڑکی کو جھلسا کر راکھ کردینا چاہتی تھی۔

''اس کے ہونٹ بہت حسین ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی کے اتنے گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نرم و نازک یاقوتی ہونٹ کبھی نہیں دیکھے۔''

''سلمان، وہ تمہیں کہاں ملی تھی؟ اور کیا تم نے اس سے حال دل بیان کردیا۔''

کنول کے لہجے میں بظاہر مٹھاس بھرا تھا، وہ اشتیاق کے عالم میں پوچھ رہی تھی، مگر سلمان نہیں جانتا تھا کہ کنول ان دیکھی آگ میں جھلس رہی ہے۔

''وہ میرے آفس میں کام کرتی ہے۔ پہلے پہلے تو میں اس کے ہونٹوں کو دیکھا کرتا تھا۔ پھر ایک دن، اس کی مسکراہٹ کی تعریف کردی۔ تمہیں پتہ ہے کنول اس نے کیا کہا؟''

''کیا کہا؟'' کنول نے آہستہ آواز میں پوچھا۔

اب اس کا لہجہ پست تھا اور آواز دھیمی تھی۔

اس نے کہا۔ ''میری مسکراہٹ کی تعریف ہر کوئی کرتا ہے جب کوئی میرے مسکرانے کی تعریف کرتا ہے، تو میں ایک نقطہ، اپنی ڈائری میں ڈال دیتی ہوں۔ اور آج ان نقطوں کی تعداد دوسو ہو جائیگی۔''

اور تمہیں پتہ ہے کنول میں اس بات پر کھلکھلا کر ہنسا تھا اور اس نے میرا ساتھ دیا تھا۔'' سلمان اسے اپنائیت بھرے لہجے میں بتا رہا تھا۔ اور کنول کو لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے دل پر چھری چل رہی ہے۔

''کیا نام ہے اس کا؟''

''مسکان! سلمان نے مسکرا کر بتایا۔ اس کے دل میں جل تھل بجنے لگا تھا، اور کنول طوفان کی زد میں کھڑی تھی، اور جیسے طوفان ہائی رفتار سے اس کے اوپر سے گزر رہا ہو۔

''مجھ سے نہیں جیت سکتی! ہر مقام پر مجھ سے جیتنے والی مسکان مجھ سے محبت میں نہیں جیت سکتی۔'' کنول کا دل چیخ چیخ کر اسے باور کرا رہا تھا، کنول نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔

''میری محبت میں کمی ہوگی، تبھی سلمان مسکان پر دل ہار بیٹھا، خیر ابھی کچھ نہیں ہوا، مسکان کا میں کچھ نہ کچھ بندوبست کردوں گی۔''

''کیا سوچنے لگی کنول؟'' سلمان نے ہاتھ سے کنول کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی۔ ''کچھ نہیں! اور بہت کچھ۔'' کنول مسکرائی۔

سلمان نے ناسمجھی سے کنول کو دیکھا اور پھر وہ اٹھ کر جانے لگی۔

''میں سمجھا نہیں!'' وہ کنول کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

''جلد سمجھ جاؤ گے۔'' کنول مسکرائی۔ اور افسردہ چال چلتی ہوئی چلی گئی۔

☆......☆......☆

وہ بڑے تجسس سے پوچھ بیٹھے میرے غم کی وجہ
پھر ہلکا سا مسکرائے اور کہا محبت کی تھی ناں

سلمان اور کنول بچپن کے دوست پلس کزن تھے، دونوں ایک جیسا سوچتے، ایک جیسی گفتگو کرتے۔

وقت جلد گزرتا ہے، وقت نے ان دونوں کو بڑا کیا، کب کنول کے دل پر سلمان قابض ہوگیا، کنول کو پتہ تک نہ چل سکا، اس کا دل سلمان کے نام کی مالا جپنے لگا، جب سلمان ہائیر اسٹڈیز کے لئے لندن جارہا تھا، تب کنول زندگی میں پہلی بار بہت روئی تھی، اوراس کی واپسی تک، اس نے ایک ایک دن صدیوں پر محیط گزارا تھا۔ جب چند سال بعد سلمان لوٹا، تب وہ ہینڈسم ہوچکا تھا، وہ بھرپور مرد بن چکا تھا۔ کنول کی نظریں اس سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جب تک سلمان کو جاب نہیں مل جاتی، تب تک وہ حال دل بیان نہیں کرے گی، سلمان کو جاب ملتے ہی پیار بھی مل جائے گا۔

زندگی میں کچھ لوگ پسندیدگی کی سند لیتے ہیں، تو کچھ سے بے تحاشا نفرت بھی کی جاتی ہے، وجہ کچھ بھی رہی ہو، نفرت اور محبت دو مختلف اور الٹ جذبے ہیں۔

مسکان سے کنول کو شدید نفرت تھی۔

ایک وجہ نہیں بلکہ کئی وجوہات تھیں، مسکان سے نفرت کرنے کی، پہلی وجہ وہ کالج کی سب سے حسین لڑکی ٹھہرائی گئی، دوسری وجہ وہ ٹاپ پر تھی، ٹاپ پر رہتی، پوزیشن ہولڈر کبھی پوزیشن سے نیچے نہیں آئی اور پھر ہر لڑکی اس کی مسکراہٹ کی تعریف کرتی۔

کنول اس کی مخالف تھی، اسے ہرانا چاہتی تھی، اور پھر کنول نے دن رات پڑھائی میں ایک کردیئے، حتیٰ کہ وہ بیمار پڑگئی، مگراس نے پڑھنا چھوڑا نہیں۔

اس سال، کالج میں کنول کو امید تھی کہ ٹاپ پر آئے گی، مسکان سے زیادہ اس نے محنت کی تھی، پرچے اس کے بہت اچھے ہوئے، رزلٹ کے بعد اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ وہ سیکنڈ تھی۔ مسکان پھر جیت چکی تھی۔ کنول نے کوئی خوشی نہیں منائی، وہ چند نمبرز سے سیکنڈ آئی تھی۔

اس نے تو پرچوں میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ کہاں اس سے چوک ہوئی۔ اس رات وہ سونہ سکی!

مسکان جس میں ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ لڑکیوں کی من پسند لڑکی تھی۔ لڑکیاں اس سے دوستی کرنے کے لئے منتیں کرتی تھیں، اور یہی بات کنول کو پسند نہیں تھی۔

مسکان جس سرگرمی میں حصہ لیتی۔ کنول خود بخود اس سرگرمی کا حصہ بن جاتی، مگر کبھی مسکان کو ہرانہ سکی۔

جب مسکان اپنی فتح کو مسکراہٹ کے ساتھ مناتی، تب کنول کو وہ طنزیہ مسکراہٹ لگتی کہ مسکان کامیاب ترین لڑکی اس پر مسکراتی ہے۔ جو مسکان کی خوبیاں تھیں، کنول کی نظر میں وہ خامیاں تھیں اوراب یہی مسکان کنول سے اس کا بچپن کا پیار چھیننے کے لئے آگئی تھی۔ اسے ایک اور مات دینے!

☆......☆......☆

قینچی ہاتھ میں پکڑے، کنول کچھ سوچ رہی تھی، قد آدم آئینے میں، اس کا اپنا سراپا بھرپور طریقے سے اسے نظر آرہا تھا۔

میں کنول زمان بھرپور ہوش و ہواحواس میں یہ اعتراف کرتی ہوں کہ میں سلمان سے بہت زیادہ پیار کرتی ہوں، مگر سلمان مجھ سے پیار نہیں کرتے، مجھ کو نہیں چاہتے، وہ اس مسکان کو چاہتے ہیں، وہ اس کی مسکراہٹ پر فدا ہیں۔ میں وہ مسکراہٹ چھین لوں گی۔ وہ آئندہ کبھی مسکرانہ سکے گی، ہاہا...... ہاہا......" کنول نے بھرپور قہقہہ لگایا۔

"ایسے چھینوں گی اس کی مسکراہٹ!" قینچی کو کنول نے اپنے ہونٹوں پر رکھی، اس کے دونوں ہونٹ قینچی کی زد میں آگئے اور کٹ سے میں قینچی چلادوں گی۔"

کتنا مزہ آئے گا، بے چاری آئندہ مسکرا بھی نہیں سکے گی، اور سلمان بنا ہونٹوں کے اسے کبھی قبول نہیں کرے گا، میرا پیار میرا رہ جائے گا، اور آئندہ کوئی مسکان کی مسکراہٹ کی تعریف نہیں کرسکے گا۔ لوگ اس سے دور، دور بھاگیں گے، وہ بنا ہونٹوں کی کتنی بدہیت لگے گی، ہا

ہا..... ہاہا.....'' شیطانی منصوبہ اس کے ذہن نے بھرپور اپنایا۔

شیطان نے اسے کیسی عجیب راہ دکھائی۔ شیطان بھٹکانے پر آئے تو وہ بھٹکا دیتا ہے۔ کبھی بدلے کے نام سے، اور کبھی پیار کے نام سے۔

محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے اور جنگ سے محبت زیادہ اہم ہوتی ہے۔

☆......☆......☆

بہت روکا خود کو تمہیں یاد کرنے سے
لیکن دل میرا میری طرح فرمان نکلا

کنول سے کئی بار سلمان ملنے آیا۔ مگر کنول اس سے نہیں ملی، یہ سوچ کر اس کی روح کانپ جاتی کہ ''مسکان سلمان کے ساتھ ہوگی اور اس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سمندر کنارے پر چہل قدمی کرتی ہوگی، سلمان اس سے باتیں کرتا ہوگا اور مسکان مسکرا رہی ہوگی۔''

''مجھے ان دونوں میں جدائی ڈالنی ہوگی، شادی سے پہلے۔ اگر اس کی شادی ہوئی تو میں جیتے جی ہار جاؤں گی، مر جاؤں گی، ختم ہو جاؤں گی۔'' وہ کیسے سلمان کی جدائی برداشت کرتی۔

مجھے کوئی قتل تو اسے کرنا نہیں...... صرف اس کی مسکراہٹ چھیننی ہے۔ پھر سب کچھ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا، پھر سلمان میرا ہو جائے گا۔ وہ مسکرائی۔

سلمان کو میں پسند تھی، میں اسے اچھی لگتی تھی، یہی سچ تھا۔

جو چیز کسی دوسرے کی ہو، اس کے لئے پریشان نہیں ہوا کرتے، ضد بھی نہیں کرتے، وہ اس کا پہلا پہلا پیار تھا۔

میں، سب کچھ ٹھیک کر دوں گی، سب کچھ پہلے جیسا کر دوں گی، سلمان میرا ہو جائے گا، وہ دل ہی دل میں خود کو تسلی دیتی۔ اس کی سوچ سلمان سے شروع ہو کر سلمان پر ختم ہو جاتی۔ آج اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا یا ہو چکا تھا، ہر راستہ بند نظر آ رہا تھا مگر بند نہ تھا۔

کنول نے قینچی کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔

''یہ قینچی اب میرے کام آئے گی۔''

☆......☆......☆

''اٹھو آج میں تمہیں مسکان سے ملواتا ہوں، تم بہت کہہ رہی تھی کہ میں مل کر بتاؤں گی کہ کیسی ہوگی۔'' کنول بیڈ پر لیٹی تھی، اور سلمان اس کے سر پر کھڑا کمبل کھینچ رہا تھا۔

سلمان ''لیومی'' مجھے مسکان سے نہیں ملنا، وہ بہت خوب صورت ہوگی اور جس کا نام مسکان ہو، اس کی مسکراہٹ، کیوں خوب صورت نہیں ہوگی۔'' کنول نے خود پر دوبارہ کمبل تان لیا۔

''کنول میں مسکان سے بات کر چکا ہوں کہ آج تمہیں اس سے ضرور ملواؤں گا، اگر تم نہیں گئی تو میں ناراض ہو جاؤں گا۔ کیا سوچے گی مسکان کہ میری کیسی کزن ہے جو ملنے نہیں آئی۔''

''یار، میں نہیں ملنا چاہتی، تو کیوں زبردستی ملوا رہے ہو۔'' کنول نے تنگ کر کہا۔

''اوکے، میں آئندہ تم سے کوئی بات نہیں کروں گا۔'' سلمان نے کمبل چھوڑ کر کہا۔

''رکو، میں چل رہی ہوں، اتنی سی بات پر ناراض ہو کر جا رہے ہو۔'' کنول سلمان کو ناراض نہیں دیکھ سکتی تھی، اس نے کمبل پھینکا، اور اٹھ گئی۔ ''تم بیٹھو، میں تیار ہو کر آتی ہوں۔''

کنول نے بیگ میں قینچی ڈالی اور واش روم میں گھس گئی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنا تنقیدی جائزہ لیا اور پھر منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی اور پھر تیار ہو کر سلمان کے سامنے آ گئی۔ ''ارے واہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔'' سلمان تعریف کئے بنا نہ رہ سکا۔

یہ سن کر کنول نے کندھے اچکائے، پھر دونوں گیراج کی طرف چلے گئے۔ کنول فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی، سلمان نے اپنی گاڑی نکالی، دونوں کا رخ اسی سائیڈ پر تھا۔

''تمہیں پتہ ہے کنول، مسکان کی مسکراہٹ، مونا لیزا سے بھی پیاری ہے۔ جس کی دنیا دیوانی ہے۔''

"میں تم سے مخاطب ہوں۔" سلمان قدرے اونچی آواز میں بولا۔

"سن رہی ہوں، دیکھ کر بتاؤں گی، کبھی کبھی ہم پہاڑ کھودتے ہیں اور چوہا نکلتا ہے۔"

سلمان ناسمجھی سے کنول کو دیکھنے لگا۔ "سامنے دیکھو ڈفر، ایکسیڈنٹ کروانا ہے کیا۔" اور سلمان مسکرا کر سامنے دیکھنے لگا۔ کنول کی چیخ اچھی خاصی بلند تھی۔

ادھری سائیڈ کے قریب بنے شاندار سے ہوٹل میں مسکان ٹیبل پر بیٹھی ان کی منتظر تھی۔ وہ دونوں چلتے ہوئے مسکان کی ٹیبل تک آ پہنچے، مسکان ان کے استقبال کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی، کنول نے اس سے ہاتھ ملایا۔ جبکہ مسکان گلے لگانے کا سوچ رہی تھی۔ سلمان نے دونوں کا تعارف کا مرحلہ طے کیا۔ مسکان نے اسے خوش دلی سے ویلکم کیا اور تینوں ٹیبل کے اردگرد بیٹھ گئے۔

مسکان اسے پہچان نہ سکی۔ کالج میں وہ مسکان کی مخالف تھی۔ مگر وہ مقابلہ یکطرفہ طور پر طے کرتی، مسکان سے وہ کبھی نہیں پوچھتی تھی، وہ مسکان سے کبھی مخاطب نہیں ہوئی تھی اور نہ اس سے بات کرنا پسند کرتی تھی۔

کنول کے خیال کے مطابق وہ اسے پہچان نہ سکی، ہر بات کنول کے لئے بونس تھی، ورنہ اگر وہ اسے پہچان جاتی تو یقیناً اس کی دکھتی رگ کالج کی پرانی باتیں شروع کردیتی۔

"تمہیں پتہ ہے کنول آج مسکان کی برتھ ڈے ہے، اور ہم اس کی برتھ ڈے سیلی بریٹ کرنے آئے ہیں۔" سلمان کی بات پر مسکان مسکرانے لگی، اور کنول غور سے اس کے مسکرانے کے انداز کو دیکھنے لگی، واقعی ایسی دلکش مسکراہٹ کسی کی بھی نہیں ہوگی، سفید موتیوں کی طرح دانت چمک رہے تھے اور ہونٹ بنا لپ اسٹک کے گلابی تھے۔

"ڈفر، پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں مسکان کے لئے کوئی گفٹ تو لے آتی۔ دیکھئے مسکان! یہ اس نالائق کی غلطی ہے۔ بے وقت بتا دیتا تو۔" کنول نے ناراضگی سے سلمان کو گھورا۔

"اٹس او کے، تم آئیں، تو ایسا لگا، جیسے تم ہی میرا گفٹ ہو۔ سلمان اکثر تمہارا ذکر کرتا رہا ہے۔" مسکان نے سلمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اچھا، رئیلی لیکن جب میرے ساتھ ہوتا ہے، صرف تمہاری مسکراہٹ کی تعریفیں کرتا ہے اور تم سے مل کر مجھے لگا کہ سلمان جھوٹی تعریفیں نہیں کرتا۔"

کچھ دیر کے بعد ٹیبل پر کیک سج چکا تھا اور کیک کے اوپر شمع روشن ہوگئی تھی۔ "ہیپی برتھ ڈے، مسکان" کیک کے اوپر لکھا تھا۔ کنول ان کے درمیان خود کو مس فٹ سمجھ رہی تھی۔

مسکان نے روشن شمع کو پھونک مار کر بجھا دیا، اور سلمان، کنول تالیوں کے شور میں ہیپی برتھ ڈے مسکان، وش کرنے لگے۔

مسکان نے کیک چھری سے کاٹا اور پیس بنا کر سلمان کے منہ میں ڈال دیا تو کنول کے دل پر جیسے مسکان چھری پھیر رہی تھی، اور اس کے دل کے ٹکڑے جیسے سلمان کو کھلا رہی تھی۔

اگلا ٹکڑا کر کے اس نے کنول کی طرف بڑھا دیا تو کنول نے اس کے ہاتھ سے ٹکڑا لیا۔ اور ذرا سا چکھا۔ اور پھر وہیں رکھ دیا۔ مسکان نے کنول سے دوستی کرلی۔ اور اپنا ٹیلی فون نمبر بھی دے دیا۔

سلمان دونوں کو شاپنگ پر لے گیا، اور پھر پہلے مسکان کو گھر ڈراپ کردیا۔ کنول نے اس کا گھر نوٹ کرلیا۔

پھر دونوں اپنے گھر چلے آئے۔

☆......☆......☆

کنول کو سب کچھ بہت برا لگ رہا تھا۔ مگر کمال حیرت سے اس نے سلمان کے سامنے مسکان کی کسی بات کا الٹا جواب نہیں دیا اور نہ ایسا ظاہر کیا کہ اسے مسکان کی موجودگی سے تکلیف ہورہی ہے۔ جب تک مسکان نامعلوم تھی وہ اور سلمان سیدھی لائن کی طرح تھے۔ لائن کے ایک سرے پر کنول کھڑی تھی اور دوسرے پر سلمان، دونوں میں بظاہر فاصلہ بہت تھا۔ مگر ان کا ایک ایک قدم

ایک دوسرے کی طرف اٹھتے تھے۔ کنول کو یقین تھا کہ جلد یا بدیر یہ فاصلہ سمٹ جائے گا۔ لیکن فاصلہ ختم ہونے سے پہلے ہی مسکان نے سیدھی لائن ٹرائنگل (تکون) میں بدل دیا۔ اب تینوں سرے پر وہ تینوں مضبوطی سے کھڑے تھے اور تینوں کی پوزیشن مضبوط اور مستحکم تھی۔

"تمہیں مسکان کیسی لگی؟" سلمان نے کنول کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"بہت اچھی، بہت خوب صورت، کاش اگر میرا کوئی بھائی ہوتا، تو میں اسے بھابی بنالیتی۔" کنول نے دل کے بجائے دماغ سے کام لینا شروع کردیا تھا۔

"تو میں تمہارا بھائی نہیں ہوں کیا، مجھ سے شادی کرکے وہ تمہاری بھابی بن جائے گی۔" سلمان نے کہا۔ تو اندر ہی اندر کنول زخمی ناگن کی طرح پھنکارتی رہ گئی۔

"نہیں سلمان تم میرے کزن ہو، بھائی نہیں، میری شادی تم سے ہوسکتی ہے۔ آئندہ میرا بھائی غلطی سے بھی نہ بننا۔" کنول نے اسے ہلکا سا اشارہ دیا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔" سلمان مسکرایا۔ سمجھدار تھا سمجھ گیا۔

کنول نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

"ہم بچپن سے ساتھ ہیں، تم نے مجھے پہلے ایسا کرنے کے لئے کیوں نہیں بتایا۔"

"ان باتوں کو اب جانے دو، تمہاری زندگی میں مسکان ہے، میرے لئے گنجائش پیدا نہیں ہوسکتی۔" کنول نے مخالف سمت میں دیکھا۔

"ویسے ایک بات پوچھوں، مسکان تمہیں کیوں پسند ہے؟"

"وہ دل کو اچھی لگتی ہے، مجھے اس کی مسکراہٹ پسند ہے، وہ بہت زیادہ حسین ہے اور بہت ذہین بھی، تمہیں پتہ ہے کنول اسے بہت سارے لوگ پسند کرتے ہیں، مگر وہ مجھے پسند کرتی ہے۔"

کنول کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی، وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"اور میں جو تمہیں پسند کرتی ہوں۔" کنول کے دل نے چپکے سے کہا۔

"کنول مجھے پتہ ہے تم مجھے پسند کرتی ہو، مگر میرا دل مسکان کو چاہتا ہے۔" سلمان نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔

☆......☆......☆

جب دل شدت سے کسی کو چاہے اور وہ کسی اور کا ہونے جارہا ہو تو دل ہرگز یہ گوارا نہیں کرسکتا، محبت، ٹھنڈک کا احساس ہوتی ہے اور نفرت آگ کا، آگ سے کھیلنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ مگر کنول آگ میں جل کر راکھ کے بجائے کندن بن جانا چاہتی تھی، وہ اس وقت آگ سے کھیل رہی تھی، آگ سے ہر ایک کھیل بھی نہیں سکتا، اس نے اشارے میں سلمان کو اپنی پسندیدگی بتادی تھی۔ مگر سلمان اسے نہیں مسکان کو چاہتا تھا، سو اس کے لئے یہ پسندیدگی غیر معمولی تھی۔

کنول نے اپنے بیگ سے سیل فون نکالا اور مسکان کے نمبر پر کال کردی۔ بیل جارہی تھی۔ مگر مسکان نے اٹھائی نہیں۔

ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری مرتبہ بھی مسکان نے فون ریسیو نہیں کیا تو غصے سے کنول نے فون ہی پٹخ دیا، وہ غصے سے صوفے پر بیٹھ گئی، کچھ پل بیت گئے۔

کنول کا موبائل بجنے لگا، کنول نے مسکراتے ہوئے سیل فون کی طرف دیکھا۔ دوسری طرف مسکان تھی۔

"ہیلو!" کنول نے فون لیس کرکے کان سے لگالیا۔

"آپ کی کالز آئی تھی، میں واش روم میں تھی، ابھی باہر آئی تو کالز دیکھ کر آپ کو فون کردیا۔"

"دراصل مجھے آپ سے بات کرنی تھی، گھر میں کوئی دوسرا نہیں ہے کیا، وہ بھی فون اٹینڈ کرسکتا تھا۔"

"ہاں ہوتے تو ہیں، بھائی اور مما شادی پر گئے ہیں، آج میں اکیلی ہوں۔ ویسے کیا بات کرنی تھی آپ کو؟"

''کچھ خاص نہیں، آپ کا حال احوال پوچھنا تھا۔'' کنول نے سنبھل کر کہا۔

''جی میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ کا بہت بہت شکریہ! کہ آپ نے یاد کیا۔''

''اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔'' کنول مسکرائی۔ ''میں ہمیشہ تمہیں یاد رکھوں گی۔'' رابطہ منقطع ہوچکا تھا، خاموشی چھا چکی تھی۔

کنول گہری سوچ میں گم تھی۔ ''مسکان گھر پر اکیلی ہے۔ اچھا موقع ہے۔'' وہ اٹھی۔ اسٹور روم میں گھس گئی۔ پرانے کپ بورڈ سے اس نے ایک بدہیت سا ماسک نکالا۔ جو گرد سے اٹا پڑا تھا۔ پھر اس نے وہ بدشکل ماسک اچھی طرح جھاڑا۔ پھر گاڑی میں بیٹھ کر مسکان کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ اس کو مسکان کا گھر معلوم تھا۔

راستے میں وہ ایک میڈیکل اسٹور پر رکی، اس نے سیلز مین کو اچھی خاصی رقم دی، بدلے میں سیلز مین نے اسے ایک دوائی دی، بے ہوشی کی دوا، کلوروفارم!

رومال پر کلوروفارم ڈال کر اس نے رومال پرس میں رکھ دیا۔ مسکان کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر اس نے گاڑی روک دی۔ بیگ اٹھایا اور چل پڑی، وہ گیٹ کے قریب پہنچ گئی، اس نے گلی میں ادھر ادھر دیکھا، کوئی نہیں تھا، اس نے اپنے بیگ سے ماسک نکالا اور پہن لیا، وہ اس ماسک میں اچھی خاصی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔

مسکان کے گھر کا مین دروازہ اس نے دھکیلا، خوش قسمتی سے وہ کھل گیا، وہ اندر چلی گئی، گھر میں داخل ہوتے ہی وہ الرٹ ہوگئی، جیسے مشن ایمپاسیبل کو پاسیبل کرنے کی کوشش کر رہی ہو، مین گیٹ سے ہو کر اس نے لان عبور کیا، پھر گھر کے داخلی دروازے پر پہنچ گئی، اس نے پرس سے دستانے نکالے، اور پہن لئے، داخلی دروازے پر اس نے دباؤ ڈالا، مگر دروازہ بند تھا، اس نے ہینڈل پورے زور سے گھمایا مگر بات نہیں بنی۔

داخلی دروازے پر دستک ہونے لگی۔

''لگتا ہے سلمان آگئے۔'' مسکان مسکرائی، وہ جلدی سے اٹھی اور ہنستی مسکراتی دروازے پر پہنچ گئی اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ کوئی اور ہوسکتا ہے۔ سلمان نے تو ایک گھنٹے میں آنے کا کہا تھا۔ اور ابھی 15 منٹ بھی بمشکل گزرے تھے۔

جیسے ہی دروازہ کھلا، سیاہ دستانے میں چھپا ہاتھ برآمد ہوا۔ مسکان سنبھلی بھی نہیں تھی، بدہیبت شکل کے بوسیدہ ماسک پہنے ہوئے کوئی تیزی سے اندر داخل ہوا۔

دوسرے لمحے میں ماسک مین کا ہاتھ مسکان کے منہ پر ہاتھ، کلوروفارم کی خوشبو نے مسکان کو سوچنے کا موقع تک نہیں دیا۔ وہ یہ تک نہ جان سکی کہ ماسک مرد نے پہن رکھا ہے یا کوئی عورت تھی۔

مسکان لہرا کر فرش پر گرتی چلی گئی۔ کنول نے وقت ضائع کیے بغیر اپنے بیگ سے تیز دھار قینچی نکالی اور دوسرے لمحے قینچی مسکان کے ہونٹوں پر وہ رکھ چکی تھی۔

شدت سے کنول نے بائیں ہاتھ سے مسکان کے ہونٹ پوری قوت سے کھینچے اور دائیں ہاتھ سے قینچی چلادی۔

اور پھر تیز دھار قینچی بیک وقت دونوں ہونٹوں کو کاٹ نہ سکی، البتہ اسے زخمی ضرور کرگئی، کنول نے قینچی نکالی اور خون آلود قینچی سے پہلے اس کا اوپری ہونٹ کاٹ دیا، بے ہوش مسکان جنبش تک نہیں کرسکی۔

پھر نچلا ہونٹ کاٹ دیا۔ بھل بھل خون کا فوارہ نکلا، خون آلود ہونٹ، جو مسکان کے خوبصورتی کا حصہ تھے، اب اس سے جدا پڑے تھے، بنا ہونٹوں کے اس کے دانت صاف نظر آرہے تھے۔

''اب میں دیکھتی ہوں، بنا ہونٹوں کے اس چڑیل کو سلمان کیسے اپناتا ہے۔''

کنول نے سر جھٹکا اور مسکان کے کٹے پھٹے ہونٹ اٹھا کر ڈسٹ بن میں پھینک دیئے۔

وہاں پر ایک سفید رنگ کا کاغذ پڑا تھا۔ جو عموماً پرنٹر میں استعمال ہوتا ہے۔ جسے ڈبل اے کاغذ کہتے ہیں۔

کنول نے وہ کاغذ اٹھایا اور دستانہ ہاتھ سے اتار کر مسکان کے جمتے خون میں اپنی انگلی ڈبودی۔

اس نے سفید کاغذ پر اپنی انگلی سے ''مسکراہٹ''

لکھا اور وہ بھی مسکان کے خون سے، اب یہ مسکرا نہیں سکے گی!

پھر اس نے دستانہ پہنا اور خوشی خوشی مسکان کے گھر سے نکل آئی۔ وہ مین گیٹ سے نکلی، تب تک وہ بوسیدہ ماسک بیگ میں سما چکا تھا، دستانے بھی بیگ میں چلے گئے تھے۔

گلی میں کوئی بھی نہیں تھا۔ کنول اپنی گاڑی میں بیٹھی اور چلی گئی۔ 15 منٹ میں اس نے مسکان کی سب سے خوب صورت چیز اس سے چھین لی تھی۔ اور مسکان اس ظالم چور کو پہچان بھی نہ سکی۔

☆......☆......☆

سلمان کا دل بری طرح گھبرانے لگا، پورے وجود میں عجیب بے چین کر دینے والی لہریں سی دوڑنے لگیں، کچھ برا ہونے کا احساس اس کے دل میں جاگا، وہ جو آدھے گھنٹے بعد جانے والا تھا، فوراً اٹھا، اور گاڑی کی طرف دوڑا، عجیب انہونی ہونے کا احساس اسے بے کل کر رہا تھا۔

گاڑی تیز رفتاری سے سڑک پر جیسے اڑ رہی تھی۔ وہ پلک جھپکتے ہی مسکان کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ آدھے گھنٹے کا راستہ سلمان نے پندرہ منٹ میں طے کیا، گاڑی سے اترا، دوڑتا ہوا مسکان کے گھر کے اندر داخل ہوا۔

خونی منظر اس کا دل دہلانے کے لئے کافی تھا۔ مسکان کو اس حالت زار میں دیکھ کر اس کا دل رو رہا تھا۔ اس کا چہرہ خون میں تربتر ہو چکا تھا۔ منہ خون سے بھرا تھا، سلمان نے اسے بانہوں میں اٹھایا اور گاڑی میں ڈالا، گاڑی کا رخ قریبی بڑے اسپتال کی طرف تھا۔

مسکان کی والدہ اور بھائی کو اطلاع دی جا چکی تھی، پولیس بھی تفتیش کے لئے آ چکی تھی، سلمان نے اپنا بیان دے دیا تھا۔ مسکان بے ہوش تھی۔ حتمی بیان مسکان ہی دے سکتی تھی۔ ڈاکٹرز اس کی صحت یابی کی پوری کوشش کر رہے تھے، پولیس اس معاملے میں ملوث ہو چکی تھی۔

مسکان کا بھائی بہت غصے میں تھا۔ اس شخص کو ہر قیمت پر جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتا تھا۔

مسکان کو چھ گھنٹے کے بعد ہوش آیا۔ اس کا پورا چہرہ سفید پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا، مسکان کے ہونٹ گہرائی میں جا کر کاٹے گئے تھے، اس لئے فی الحال وہ بول نہیں سکتی تھی۔

ہوش میں آنے کے بعد وہ ناسمجھی سے خود کو دیکھنے لگی، سلمان، ایاز اور اس کی والدہ ایک ساتھ کھڑے تھے۔

جہاں یہ واقعہ ہوا تھا پولیس وہاں تفتیش کر رہی تھی۔ ان کو خون سے لکھا ہوا ایک سفید کاغذ ملا، جس پر خون سے ''مسکراہٹ'' لکھا تھا۔

تین دن بعد مسکان پٹیوں کی قید سے آزاد ہوئی۔ یہ دن مسکان نے نہایت ہی اذیت میں مبتلا ہو کر گزارے تھے، ایک منظر اسے رات بھر سونے نہیں دیتا تھا، دستانے میں ملبوس ہاتھ، بدہیئت ماسک کے پیچھے چھپا چہرہ بار بار اس کی نظروں میں آ جاتا، جب بھی مسکان آنکھیں بند کرتی، وہ یہی سوچتی رہتی شاید اس کی خوب صورتی، اس نامعلوم شخص نے چھین لی ہے۔ یقیناً میرا چہرہ اس لئے چھپایا گیا ہے کہ مجھ پر تیزاب پھینک دیا گیا ہے۔

پولیس نے بیان لے لیا۔ مسکان کو اس دن آئینہ دکھایا گیا، یہ ایک تلخ حقیقت تھی، اسے چھپایا نہیں جا سکتا تھا۔ آئینے میں خود کو دیکھ کر مسکان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

''میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ جو اس ظالم انسان نے میرے ساتھ یہ عمل کیا۔'' سلمان نے مسکان کے ہاتھ سے آئینہ لے کر توڑ دیا۔

''مسکان اب تم تب تک آئینہ نہیں دیکھو گی، جب تک میں سب کچھ ٹھیک نہیں کر دیتا۔''

''اب کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو سکے گا، میری خوب صورتی کا راز، میری مسکراہٹ چھین لی گئی ہے۔ میں ایک مضحکہ خیز بن گئی ہوں۔''

''میرا یقین کرو، میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ بس کچھ دن اور تمہیں اس اذیت کو سہنا ہوگا۔''

مسکان کی والدہ جائے نماز بچھائے اس شخص کو بددعائیں دے رہی تھیں۔ جس نے ان کی بیٹی کا یہ حال کیا تھا۔

☆......☆......☆

کنول کو تیسرے دن سلمان نے فون کر کے سب کچھ بتادیا تھا۔ کنول نے سلمان سے بے صبری سے پوچھا۔ ''اب تم کیا کرو گے؟ مسکان کی مسکراہٹ تمہیں پسند تھی، اب وہی نہیں رہی۔''

''کنول میں مسکان کا علاج کراؤں گا، اسے بیچ منجدھار میں چھوڑ تو نہیں سکتا۔''

''سلمان تم بنا ہونٹوں کے اسے کیسے قبول کرو گے، مجھے تو سن کر وحشت ہو رہی ہے، اگر کوئی تم دونوں کو ساتھ دیکھے گا تو......!''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو، میں چاہتا ہوں، میں پریشان ہوں تم میرا ساتھ دو۔''

''میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں، تم مسکان کو چھوڑ دو! یہ اس کے گھر والوں کی ذمہ داری ہے، کہ وہ اس کا علاج کرائیں۔''

''میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ مجھے بنا ہونٹوں کے بھی قبول ہے۔''

''سلمان! اس وقت تم ہوش میں نہیں ہو، بعد میں بات کرتے ہیں۔'' کنول بولی۔

''اب تو ہوش میں آیا ہوں، سوچو، اگر تمہارے ساتھ کوئی ایسا کرتا، اور تمہارا ہونے والا منگیتر، تمہیں چھوڑ دیتا، تو تم ہونٹوں کے کٹ جانے پر اتنا غم زدہ نہیں ہوتی، جتنا اپنے منگیتر کی بے وفائی کا غم کرتیں، تمہیں پتہ ہے! مسکان کو نئے ہونٹ مل جائیں گے!''

''کک...... کک...... کیسے!'' کنول ہکلائی۔

اس کا دل مسوس کر رہ گیا۔ سلمان نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔ کنول محبت کی یہ بازی بھی ہار چکی تھی۔

''سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے۔ پلاسٹک سرجن ڈاکٹر ادریس نے مکمل یقین دہانی کروائی ہے کہ مسکان کو پلاسٹک سرجری کے بعد نئے ہونٹ لگ سکتے ہیں اور وہ بھی بہت حسین اور شاداب۔''

کنول آگے کچھ نہ بول سکی!

''مسکان پہلے سے زیادہ خوب صورت انداز میں مسکرائے گی۔'' اور کنول نے کال کاٹ دی۔

کنول ہاری بھی ایسے تھی کہ اس کا دل اندر سے ٹوٹ گیا تھا۔ اسی رات اس نے پاکستان چھوڑ دیا، حالانکہ وہ دنیا چھوڑ دینے کا ارادہ کیے ہوئے تھی۔

پولیس ناکام رہی، نامعلوم ملزم کو ڈھونڈا نہیں جاسکا، مسکان کے ہونٹ اگرچہ گہرائی میں کاٹے جاچکے تھے مگر ڈاکٹر ادریس نے پوری کوشش سے پلاسٹک سرجری کر کے اسے نئے ہونٹ دے دیئے تھے۔

مسکان اور سلمان کی شادی دھوم دھام سے ہوگئی۔ سلمان کو کنول کے یوں چلے جانے سے کوئی پرواہ نہیں تھی، وہ اپنی مسکان کے قریب بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔

''کبھی کبھی ہمارے بہت قریبی دوست اور اپنے ہمیں لاعلمی میں بہت بڑے نقصان سے دوچار کر دیتے ہیں۔ جیسے کنول نے مسکان کے ہونٹ کاٹ کر مجھے دکھ پہنچایا۔ خیر میں نے اسے معاف کر دیا۔ وہ جہاں بھی رہے خوش رہے۔''

سلمان نے جب سفید کاغذ پر خون سے لکھا ہوا مسکراہٹ دیکھا تو اسے فوراً پتہ چل چکا تھا کہ یہ لکھائی کنول کی ہے۔ وہ اور کنول جب کبھی ساحل سمندر پر جاتے، کنول ہمیشہ ساحل کی ریت پر اپنا اور اس کا نام انگلی سے لکھ دیتی، اور سمندری لہریں چوم چوم کر اسے مٹا دیتیں، وہ کنول کی لکھائی کیسے پہلی نظر میں پہچان نہ لیتا۔ اسے پتہ تھا کہ کنول اسے چاہتی ہے، کنول نے کوئی قتل نہیں کیا تھا مگر اس کا جرم بہت بڑا تھا، پھر بھی سلمان نے اسے شرمندہ ہونے سے بچالیا۔ یہ اس کا کنول پر ایک بہت بڑا احسان تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو۔'' مسکان مسکرا کر بولی۔

''یہی کہ تمہاری مسکراہٹ پہلے سے زیادہ خوب صورت ہوگئی ہے۔'' سلمان بولا اور مسکان کو بانہوں میں بھرلیا۔

حد بندی

ساجدہ راجا۔ ہنڈواں سرگودھا

دو دوست ایک میدان سے گزر رہے تھے کہ اچانک دونوں میں سے ایک غائب ہوگیا۔ اس کی فلک شگاف چیخ سنائی دینے لگی۔ مگر اچنبھے کی بات یہ تھی کہ وہ خود موجود نہیں تھا، وہ گیا تو کہاں گیا۔

انہونی اور حقیقت کو جھٹلانا اکثر زندگی کو عذاب سے دوچار کر دیتی ہے۔اس کا ثبوت کہانی میں ہے

ان دونوں کی عمر بالترتیب نو اور دس سال تھی اور اس تپتی دوپہر میں وہ دونوں کچے آم توڑنے جارہی تھیں، آم کے درخت ان کے گھر سے کچھ فاصلے پر تھے اور درمیان میں بالکل خالی میدان تھا جس کے بارے میں عجیب عجیب باتیں مشہور تھیں، اور ان درختوں تک جانے کے لئے اس میدان سے لازمی گزرنا پڑتا تھا، اس لئے آم کے درختوں تک کوئی نہیں جاتا تھا، لیکن وہ دونوں ہر بات سے بے نیاز چلی جارہی تھیں، ان کا بچپن ابھی ان باتوں سے مبرا تھا، انہیں بس وہ کچے آم ہی چاہئے تھے جنہیں وہ ہر روز للچائی نظروں سے دیکھتی تھیں لیکن گھر والوں کی پابندی کی وجہ سے وہاں جانہ پائیں۔

"بدقسمتی یا خوش قسمتی سے آج دونوں کے گھر والے دوپہر کی نیند لے رہے تھے اور ان دونوں کو گھر سے نکلنے کا موقع مل گیا۔

بڑے بڑے کچے آم لٹکے دیکھ کران کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور منہ میں پانی، نمک مرچ لگا کر کچے آم کھانے کا اپنا ہی مزہ تھا اور اسی مزے کو پانے کے لئے وہ گھر والوں کی پابندی کے باوجود گھر سے نکل آئیں۔

''جلدی چلو رانی۔ جلدی توڑ کے پھر واپس بھی آنا ہے۔'' رانی جو اپنے نام کی طرح بالکل رانیوں جیسی تھی تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

''تیرے پاس نمک تو موجود ہے ناں؟'' رانی نے تصدیق کے لئے روحی سے پوچھا تو اس نے اثبات اور جوش سے گردن ہلادی۔

''بالکل اور نمک میں زیادہ سرخ مرچیں بھی ڈال دی ہیں۔''

''واہ...... آج تو مزہ آجائے گا۔ میرے منہ میں تو ابھی سے پانی آ گیا۔'' رانی نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا اور وہ دونوں تیز قدموں سے میدان میں چلنے لگیں۔ گرم لو اور تیز دھوپ ان کا چہرہ جلائے دے رہی تھی اور پسینہ بہہ بہہ کر ان کے کپڑے بھگو رہا تھا لیکن انہیں بھلا اس کی پرواہ کب تھی وہ تو بس جلدی سے کچے آم توڑ کر وہیں بیٹھ کر کھانا چاہتی تھیں تا کہ گھر والوں کو ان کی خفیہ کارروائی کا علم نہ ہو سکے۔

درخت کے پاس پہنچ کر رانی جلدی سے اوپر چڑھ گئی اور کچے آم توڑ کر نیچے پھینکنے لگی، روحی نے جلدی سے انہیں اکٹھا کرنے لگی۔

''بس کرو رانی کافی ہیں......'' رانی نیچے آ گئی اور پھر وہ دونوں مزے سے آم کھانے لگیں اور جب پیٹ بھر گیا تو واپسی کے لئے قدم بڑھا دیئے۔

''روحی...... روحی۔'' رانی کی تیز آواز پر روحی نے مڑ کر دیکھا اور دھک سے رہ گئی۔ رانی کہیں بھی موجود نہیں تھی۔

رانی...... تم کہاں ہو......؟'' روحی نے خوف زدہ آواز میں پوچھا۔ کیونکہ دور تک سوائے خالی میدان کے کچھ نہ تھا۔

''روحی، خدا کے لئے مجھے بچالو، روحی۔'' رانی کی روتی ہوئی آواز مسلسل آ رہی تھی۔

''تم مجھے نظر کیوں نہیں آ رہی......؟'' روحی وحشت زدہ ہو کر آس پاس دیکھنے لگی۔

''رانی مسلسل روحی کو بلا رہی تھی اس کی روتی ہوئی آواز روحی کے اعصاب ہلا رہی تھی لیکن رانی اسے کہیں بھی نظر نہ آ رہی تھی۔

''مجھے بچالو روحی...... روحی...... روحی۔'' اور روحی سراسیمہ سی دوڑتی ہوئی وہاں سے بھاگ آئی اور گھر والے اس کی حالت دیکھ کر دھک سے رہ گئے۔ سرخ وحشت زدہ چہرہ اور پھولا ہوا سانس اور سب سے خوفناک وہ چیز جس نے گھر والوں کو حیران کر دیا وہ روحی کے سفید بال تھے...... اس کا سارا سر مکمل طور پر سفید ہو چکا تھا جبکہ وہ محض دس سال کی تھی اور پندرہ منٹ پہلے تک اس کے بال سیاہ تھے، گھر آتے ہی وہ بے ہوش ہو گئی۔

اور جب اسے ہوش آیا تو سب گھر والے سراسیمہ سے اس کے گرد موجود تھے اور گھر والوں کے پوچھنے پر اس نے روتے ہوئے سارا واقعہ ان کے گوش گزار کر دیا۔

وہ سب رانی کے گھر دوڑے تا کہ ان کو مطلع کر سکیں۔ رانی کی ماں اور باقی گھر والے ننگے پاؤں میدان کی طرف دوڑے لیکن وہاں خالی میدان ان کا منہ چڑا رہا تھا۔

''اماں...... اماں...... مجھے نکالو یہاں سے مجھے بچالو۔'' رانی کی اعصاب شکن جھنجوڑتی آواز نے سب کو ہلا دیا۔

''تو کہاں ہے میری رانی...... مجھے بتا......'' رانی کی ماں نے چلاتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں کہا لیکن وہاں سے کوئی جواب نہ آیا بس۔'' اماں مجھے بچالو۔'' کی آوازیں ان کا دل لرزاتی رہیں۔

پورا دن اور رات گزر گئی لیکن کوئی سراغ نہ ملا، کئی عامل آئے لیکن وہ بھی کچھ معلوم نہ کر سکے، چونکہ آواز زیر زمین سے آ رہی تھی، اس لئے وہ زمین بھی کھودی گئی بہت گہرائی تک لیکن ندارد...... رانی کی آواز اگرچہ دھیمی ہو گئی تھی لیکن وقفے وقفے سے آ رہی تھی۔

دن پر دن گزرتے گئے، یہ واقعہ بہت پھیلا، بہت سے لوگوں نے رانی کا سراغ لگانے کی کوشش کی لیکن سب ناکام رہے۔ نہ جانے رانی کو زمین کھا گئی کہ آسمان نگل گیا اور پھر سب کی توجہ اس سے ہٹ گئی۔ رانی کی آواز اب آنا ختم ہوچکی تھی اور لوگ بھی کب تک وہاں رہتے، تلاش کا ہر حربہ ناکام ہوگیا تھا اس لئے سب نے چپ سادھ لی، بس رانی کی ماں ہی تھی جسے صبر نہیں آرہا تھا وہ ہر وقت اسی جگہ موجود رہتی اور رانی رانی پکارتی رہتی......! یقیناً وہ پاگل ہوچکی تھی......! یا ہونے والی تھی۔

☆......☆......☆

اکرم کی عمر نو سال تھی اس نے بہانہ بنا کر اسکول سے چھٹی کی اور اب اپنے باپ کے ساتھ کھیتوں کی طرف جارہا تھا، ساتھ میں باتیں کر کے باپ کا دل بھی بہلا رہا تھا۔

اکلوتا تھا سو خوب لاڈلا تھا اور کبھی کبھی اس لاڈ کا بہت اچھی طرح فائدہ اٹھاتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں اس کی پیاری بکری کی رسی بھی تھی وہ اپنی اس بھورے رنگ کی بکری سے بہت پیار کرتا تھا اور اسکول کے علاوہ ہر وقت اسے اپنے ساتھ چپکائے رکھتا بلکہ بکری بھی اس سے بہت مانوس تھی جب تک وہ اسکول سے نہ آتا، میں میں کرتی رہتی اور جب اسے اکرم نظر آتا وہ میں میں کر کے گھر سر پر اٹھا لیتی اور اکرم کی طرف لپکتی۔ سب کو اکرم کے ساتھ اس کی وابستگی کا پتہ تھا۔

اب بھی اپنے باپ کے ساتھ باتیں بگھارنے کے علاوہ وہ گاہے بگاہے بکری کے سر پہ ہاتھ پھیر رہا تھا وہ ہلکا سا منمنا کر اپنی خوشی کا اظہار کرتی اس کے ساتھ چلتی آرہی تھی۔

وہ میدان کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اکرم کا باپ اس سے تھوڑا آگے چل رہا تھا۔

''ابا...... ابا'' کی پکار اور بکری کی زور کی منمناہٹ پر اکرم کے باپ نے چونک کر پیچھے دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کے قریب ہوگئیں۔

اکرم غائب تھا اور اس کی بھورے رنگ کی

پیالہ

ایک دفعہ کسی دعوت میں کسی امیر خاتون کا ہیروں کا ہار چوری ہوگیا۔ اس نے میزبان سے شکایت کی، میزبان نے اعلان کروادیا کہ ان محترمہ کا ہیروں والا ہار چوری ہوگیا ہے اور ہم ایک پیالہ بڑی میز پر رکھ دیتے ہیں اور جس صاحب کو ملا ہو اس پیالے میں رکھ دے، اور لائٹ آف کردی تاکہ کوئی دیکھے نہ اور لائٹ آف کردی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب روشنی کی گئی تو میز پر سے پیالہ بھی غائب تھا۔

(انتخاب: محمد اسحاق انجم۔ کنگن پور)

بکری بالکل سفید ہوچکی تھی جبکہ ''ابا ابا'' کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔

''اکرم...... اکرم بیٹے تم کدھر ہو......؟'' لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا بس۔ ''ابا مجھے بچالو۔'' کی تکرار اس کے دل کو لرزا دیتی تھیں۔

کچھ دن پہلے ہونے والا رانی کا واقعہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا اور اس کا دل خشک پتے کی مانند کانپ گیا۔

''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ میرا اکرم غائب نہیں ہوسکتا۔''

لیکن جو ہونا تھا وہ ہوچکا تھا اس کا اکلوتا لاڈلا بیٹا اس کے سامنے غائب ہوگیا اور وہ کچھ بھی نہ کرپایا، سب کو اس دل دوز واقعے کی خبر ہوگئی اور اکرم کی تلاش زور و شور سے جاری ہوگئی لیکن اکرم کو نہ ملنا تھا نہ ملا، تھک ہار کر سب چپکے ہو رہے، وہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ لیکن بکری کے بال بھی روحی کی طرح سفید ہونا ان کو حیران کرگیا۔ اکرم کے باپ کو پتہ بھی نہ چلا تھا کہ اکرم کب اس

میدان کی حدود میں داخل ہوا اور نہ وہ اسے ضرور روکتا۔

رانی کی طرح اس کی آوازیں بھی سنائی دیتی رہیں اور مدھم ہوتے ہوئے غائب ہوگئیں۔ پورے علاقے میں خوف اپنے پنجے گاڑ کر بیٹھ گیا جیسے وہ علاقہ اس کی ملکیت ہو۔ دہشت اس علاقے میں یوں راج کرنے لگی جیسے وہاں انسانوں کا بسیرا ہی نہ ہو۔ خاموشی نے آوازوں کو شکست دے دی گویا وہ لوگ کبھی بولے ہی نہ ہوں اور ہنسے تو جیسے صدیاں بیت گئی تھیں، عجیب خوف و ہراس نے اس علاقے کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا لوگ ڈرے ڈرے سہمے رہنے لگے، گھروں سے باہر جانا کم ہوتا اور اس میدان کے پاس تو بالکل ختم۔

بچوں کو خوفناک کہانیاں سنا کر یوں ڈرا گیا کہ وہ اس میدان کا نام سنتے ہی کانپنے لگتے اور یہ ان کے لئے ٹھیک بھی تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ دونوں غائب ہونے والے بچوں کی عمریں نو سال تھیں اور ان کے ساتھ موجود جاندار کے بال سفید ہوگئے، چاہے وہ جاندار انسان ہوں یا جانور۔

بہت سے عامل آئے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا ان کا عمل ایک حد سے آگے نہیں بڑھتا تھا صرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ کالے علم والے بھی آئے بہت سے توڑ کیے۔ بہت سے چلے کاٹے۔ بہت سی بھینٹیں دیں، لیکن سوائے اندھیرے کے کچھ نظر نہ آیا۔ وہ مایوس لوٹ گئے، سب کو صبر آ گیا سوائے ان بچوں کے والدین کے۔ وہ تو جیسے میدان کے پاس ڈیرا ڈال کے بیٹھ گئے اور اس جگہ کو تکتے رہتے جہاں ان کے بچے غائب ہوئے تھے۔

اور اس دوران انہوں نے ایک بات نوٹ کی کہ ہر رات درجنوں کے حساب سے مکھیاں اس جگہ بھنبھناتی رہتیں لیکن وہ مکھیاں جسامت میں عام مکھیوں سے بہت بڑی تھیں اور ان کی آواز کانوں کے پردے پھاڑتی معلوم ہوتی تھی۔ دن کو ان کا نام ونشان بھی نہ ہوتا لیکن آدھی رات کو وہ نہ جانے کہاں سے آن موجود ہوتیں اور ان کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی کہ ان کو دیکھ کر خوف محسوس ہونے لگتا۔

اک عامل نے اس دوران دعویٰ کیا کہ وہ ایسا عمل کرے گا کہ اس جگہ کی پراسراریت کھل جائے گی اور جو کچھ بھی ہوگا وہ سامنے آجائے گا۔

لوگوں کے خوفزدہ دلوں کو کسی حد تک چین آ گیا۔ لیکن پھر بھی وہ خوفزدہ سے تھے خوف اتنی آسانی سے کہاں پیچھا چھوڑتا ہے......؟؟؟ بالکل اسی طرح جیسے انسان کے کیئے گئے گناہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ لاکھ معافیاں مانگی جائیں ان گناہوں کا عکس ذہن کے پردے پر موجود رہتا ہے ہم لاکھ بھولنا چاہیں لیکن گناہ اپنے مالک کو نہیں بھولتے وہ کسی نہ کسی صورت اپنے مالک تک پہنچ جاتے ہیں بالکل اسی طرح جب خوف دل میں پنجے گاڑھ کر بیٹھ جاتا ہے تو آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتا۔

ایسا ہی حال اس علاقے کے لوگوں کا تھا اس عامل کے دعوے کے بعد وہ کسی حد تک نارمل ہو پائے تھے ورنہ کسی انہونی کا خطرہ ہر وقت دل دھڑکاتا رہتا......!!!! اور پھر اس عامل کا دعویٰ کسی حد تک سچا نکلا۔

پورے تین دن اس نے کوئی عمل پڑھا تھا اور جب کسی حد تک اسے اس جگہ کے اسرار کا پتہ چلا تو اس کی رنگت ہلدی کی طرح پیلی ہوگئی جیسے کسی نے یکدم اس کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا بالکل کسی خشک پتے کی مانند اور اس کی یہ حالت دیکھ کر لوگ غش کھانے کے قریب ہوگئے۔ اور بہت دیر بعد جا کر عامل کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو اس نے ڈرتے ڈرتے صرف اتنا بتایا۔

"وہ دونوں بچے واپس آجائیں گے اگر وہ واقعی بچے ہوئے تو......؟" کسی کو عامل کی بات کی سمجھ نہ آئی...... وہ بولتا رہا۔

"ہاں میرے بعد اتنا کرنا کہ اس جگہ کے گرد ایک مضبوط حد بندی قائم کردینا ورنہ اس جگہ کا دائرہ پھیلتے پھیلتے پورے علاقے پر محیط ہوجائے گا اور پھر کوئی بھی نہیں بچے گا اور اب میں بھی نہیں بچوں گا کیونکہ اس جگہ کا اسرار مجھ پر کھل چکا ہے اور جس پر اس جگہ کا بھید کھل جائے پھر وہ اس جگہ کا مکین بن جاتا ہے یا بننے پر مجبور

کردیا جاتا ہے اور میں بھی مجبور کردیا گیا ہوں اور اگر میں نے آپ کو اس جگہ کا بھید بتادیا تو پھر تم سب کو اس جگہ کا مکین ہونا پڑے گا اور اس جگہ کا مکین ہونے سے بہتر ہے انسان خودکشی کرلے اور موت کو گلے لگالے.....“

پھر وہ عامل اٹھا اور اس جگہ کے گرد نشانی لگائی۔

”اس جگہ حد بندی کرنا بالکل نہ بھولنا ایک مضبوط دیوار اس کا عمدہ حل ہے۔ دیکھو آج ہی سے حد بندی کردو جو تمہیں کل کے نقصان سے بچائے گی۔ میری بات کو بھولنا مت کیونکہ یہ بات نظر انداز کرنے کے بالکل قابل نہیں کیونکہ جو کچھ میں جان چکا ہوں اگر تمہیں معلوم ہوجائے تو ایک لمحہ بھی اس جگہ نہ رکو۔ فوراً عمل کرو اور دیوار بنانے کا کام ابھی سے شروع کردو۔“

کچھ لوگوں نے فوراً عمل کیا اور وہاں سے چلے گئے تاکہ ضرورت کا سامان دیوار بنانے کے لئے لاسکیں۔ ان کو گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک دل لرزا دینے والی بات ہوئی۔

جس جگہ وہ عامل کھڑا تھا وہاں سے ہلکا سا دھواں اٹھا اور عامل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور پھر لوگوں نے جو منظر دیکھا وہ نہایت دہشت زدہ کردینے والا تھا۔

عامل کا قد چھوٹا ہوتے ہوتے ایک بالکل نو سال کے بچے کے برابر ہوگیا۔ اور پھر اس کے منہ سے دلدوز نکلتی چیخوں نے سب کو ساکت و جامد کردیا۔

اور پھر عامل بھی اکرم اور رانی کی طرح غائب ہوگیا۔ لیکن اس کی چیخیں مسلسل سنائی دیتی رہیں اور پہلے والے واقعے کی طرح مدھم ہوتے ہوتے غائب ہوگئیں.....!!

اور پھر ایک اور دلدوز واقعہ پیش آیا جس نے سب کے ساکت وجود میں حرکت بھردی۔

کچھ عرصہ پہلے غائب ہونے والے اکرم اور رانی ان کے سامنے کھڑے تھے۔

لیکن کس حالت میں.....؟

ان کے جسم تو نو سالہ بچے جیسے تھے لیکن ان کا چہرہ.....؟ اوہ خدایا..... ان کا چہرہ کسی نوے سالہ بوڑھوں جیسا تھا سفید بال، سفید بھنویں جو کہ ان کو

اقوال

کوشش کرو کہ آپ دنیا میں رہو دنیا آپ میں نہ رہے کیونکہ جب تک کشتی پانی میں ہوتی ہے تو خوب تیرتی ہے لیکن جب پانی کشتی میں آجاتا ہے تو کشتی ڈوب جاتی ہے۔ (حضرت علی)

(انتخاب: ایس حبیب خان۔ کراچی)

عجیب بدہیئت سا بنا رہی تھیں۔ حتیٰ کہ ان کے والدین بھی ٹھٹک گئے لیکن پھر ان کے والدین لپک کر بے قراری سے ان تک گئے اور زور زور سے روتے ہوئے ان کو اپنے ساتھ لپٹا لیا لیکن وہ دونوں بے حس وحرکت کھڑے رہے اور منہ سے کچھ نہ بولے، ان کو گھر لے جایا گیا کھانا پیش کیا، وہ سارے کام کسی روبوٹ کی مانند کرتے رہے۔

لیکن ان کی خاموشی نہ ٹوٹی ان کے بوڑھے چہرے سب کے دل میں خوف بھرتے رہے لیکن ان دونوں کو کسی بات سے غرض نہ تھی۔

پھر اسی دن لوگوں نے عامل کی بتائی ہوئی جگہ پر دیوار تعمیر کرکے ایک حد بندی قائم کردی اور خاصی حد تک مطمئن ہوگئے لیکن جب جب وہ رانی اور اکرم کو دیکھتے ان کا خوف پھر سے عود کر آجاتا.....!!

وقت گزرتا رہا اور پھر اکتالیسویں شب گزرگئی۔ صبح کے وقت لوگوں نے دیکھا تو رانی اور اکرم دونوں اپنی اپنی جگہ راکھ کے ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے۔ ایسا کیوں ہوا، یہ ایک راز ہی رہا جس نے لوگوں کو حیران کرکے رکھ دیا تھا۔ پھر اس حد بندی کی وجہ سے کوئی بھی غائب نہ ہوا۔

قلبی اذیت

نور محمد کاوش۔سرگودھا

اکثر احکام خداوندی سے چشم پوشی، بے رحمی، سفاکی اور سنگدلی انسان کا عبرت کا نشان بنا کر حقارت کا مجسمہ بنادیتی ہے اور کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا کہ اس کے ساتھ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہانی پڑھ کر تو دیکھیں۔

عقل وشعور کو حیرت میں ڈالتی اور حقیقت سے روشناس کراتی دل کو چھوتی روداد

شنکر اس وقت اپنی زمینوں میں کام کررہا تھا۔جب اسے دور سے ہی ایک تنگ سی پگڈنڈی پہ ایک نوجوان اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔اتنی تپتی دھوپ میں وہ پیہم تیز تیز قدم اٹھاتا اسی کی سمت لپک رہا تھا۔شنکر کو تجسس ہوا۔تو اس نے کام چھوڑا اور قریب ہی ایک گھنے درخت کی چھاؤں میں جا کر کھڑا ہوگیا۔مگر اس کی نگاہیں بدستور اسی نوجوان پر مرکوز رہیں۔دوسری طرف اس نوجوان کی نگاہیں بھی اسی پر لگی ہوئی تھیں۔

ادھر دوسری طرف اس کی پتنی دوپہر کا کھانا لیے آن وارد ہوئی۔

''اجی کی بات ہے بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو،کوئی پریشانی ٹوٹ پڑی ہے کیا۔۔۔؟''اس نے آتے ساتھ ہی اس سے پوچھا اور پھر اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے بولی۔''اجی کون ہے یہ کیا کوئی دور دور کا برادری کا چھوکرا ہے جسے اتنے لگاوٹ کے ساتھ دیکھے چلے جارہے ہو؟''

ساتھ لائی دری اس نے زمین پر بچھادی اور چنگیر میں رکھی ایک میلے کچیلے کپڑے میں لپٹی روٹیاں نکال کر سامنے رکھیں۔سالن ایک چھوٹے سے برتن میں رکھا ہوا تھا۔وہ بھی اس نے رکھا اور براجمان ہوگئی مگر جب شنکر براجمان نہ ہوا اور اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔تو غصے سے پھنکار اٹھی۔

''اجی ایسا بھی کونسا خاص ہے یہ لونڈا کہ میری بات کا جواب تک دینے کی توفیق نہیں ہورہی۔''

اب کی بار شنکر نے اس کی سمت گردن گھمائی اور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھتی نہیں کوئی راہ گیر ہے۔مگر جو بھی ہے میری طرف ہی آرہا ہے یہاں کوئی آبادی وبادی تو ہے نہیں اور اپنے گاؤں سے گزر کر سیدھا اسی طرف آرہا ہے مطلب یہ ہوا کہ اسے مجھ سے ہی کوئی کام ہے۔''

ان کی اتنی باتوں کے درمیان وہ نوجوان ان کے قریب پہنچ چکا تھا۔تیکھے نین نقش کا مالک وہ نوجوان چنداں سانولے رنگ کا تھا۔شاید کلین شیو کرواتا تھا مگر اب تھوڑی داڑھی مونچھوں کے بال باہر جھانک رہے تھے۔کشادہ پیشانی تھی اور ہلکے نیلے رنگ کی آنکھیں۔جن میں گہرا تجسس پایا جاتا تھا۔

وہ سیدھا شنکر کے پاس آیا اور آتے ساتھ دونوں کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔شنکر نے تو نہایت ہی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے پرنام کا جواب دیا جبکہ

اس کی پتنی نے پیشانی پہ سلوٹیں عیاں کرتے ہوئے چنداں ناگواری سے جواب دیا۔

''اجی بیٹھ جاؤ اور کھانا کھاؤ پہلے۔۔۔۔۔'' شنکر کی پتنی نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

''بیٹھو پہلے کھانا کھاؤ پھر میں تم سے تمہارے یہاں آنے کی وجہ دریافت کروں گا۔۔۔۔'' شنکر نے اس نوجوان کو بھی ساتھ بیٹھاتے ہوئے کہا۔ تو اس کی پتنی کے کان کھڑے ہوگئے اور جھٹ پٹ میں نوجوان کے آگے سے کھانا سرکالیا۔

''کیا کر رہی ہو بھاگوان تو دیکھ نہیں رہی کیا کہ ایسی سلگتی دھوپ میں یہ نوجوان ہمارے پاس آیا ہے۔ اور بھوک و پیاس سے اس کی بری حالت ہے۔۔۔'' شنکر نے خجالت محسوس کرتے ہوئے نہایت ہی حقارت سے پتنی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ یہ کہاں سے آیا ہے اور کیوں آیا ہے۔ میں نے بس تمہارے لیے کھانا پکایا ہے مجھ سے اس گرمی میں بار بار تمہارے لیے کھانا نہیں بنایا جاتا یہ کھانا بس تمہارے لیے ہے تم ہی کھاؤ۔۔۔۔'' پتنی کی اس بدتمیزی پر اسے بہت غصہ بھی آیا اور شرمساری بھی ہوئی۔ اس نے ایک بار پھر اس نوجوان کی طرف کھانا رکھا مگر اس کی پتنی نے فوراً اٹھالیا۔

''دیکھیئے آپ لوگ فکر نہ کریں میں یہاں کھانے کے لیے نہیں آیا بس ایک ضروری کام تھا اس کے لیے آیا ہوں۔۔۔۔'' بالآخر نوجوان نے احمد حیات میکن کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے خود ہی کہا۔

''بتاؤ میرے بچے تم کیسے آئے ہو۔۔۔۔؟'' شنکر نے نہایت ہی الفت بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔ نوجوان نے دل ہی دل میں اس کے اس اندازِ گفتگو کو بہت سراہا۔

''میں نیکی سے بھٹکا ہوا انسان ہوں۔ میں نیکی اور بدی میں فرق جاننے کا متمنی ہوں۔ کچھ دن پہلے میری ملاقات ایک سفید ریش مہاراج سے ہوئی۔ میں نے اپنی اس خواہش کا ان کے سامنے اظہار کیا تو انہوں نے مجھے آپ کا بتایا کہ آپ ہی وہ انسان ہیں جو مجھے نیکی اور بدی میں فرق بتا سکتے ہیں۔ میں بہت دور سے آیا ہوں مگر مجھے ایسی کسی بات کی کوئی چنتا نہیں ہے۔ میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہوں۔ بس آپ میری راہنمائی فرمائیں اور مجھے نیکی اور بدی میں فرق بتائیں۔۔۔۔'' نوجوان کی بات سن کر شنکر کی پتنی نے بھنویں اچکائیں اور ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو کر اس نوجوان کی طرف دیکھا اور پھر نگاہیں اپنے پتی پر ٹکا دیں کہ اب یہ اس نوجوان کی بات کا کیا جواب اسے دیتا ہے۔

شنکر نے نہایت توجہ سے اس کی بات سنی اور ایک ٹھنڈی اور لمبی سانس فضا میں خارج کی۔ پھر گویا ہوا:

''انسان حقیقتوں کو دیکھتے ہوئے بھی جب حقیقت کو جھٹلاتا ہے تو سمجھو کہ اس کے ایمان کی کمزوری ہے۔ ایمان سے دوری کے عوض آج ہم دربدر ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں۔ میرے بچے! آج اگر تمہیں نیکی سے آشنائی ہوتی تو امید واثق ہے کہ تم میرے پاس نہ آتے لیکن اب جب تم آ ہی گئے ہو تو میں تمہاری مدد ضرور کروں گا۔ مگر اس کے لیے تمہیں تھوڑی سی دقت اور برداشت کرنا پڑے گی۔''

اس کی بات سن کر نوجوان نے ناک سکیڑا اور سوالیہ آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا۔

''کیسی دقت۔۔۔۔؟'' اس نے دھیمے سے لہجے میں دریافت کیا۔ ''میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں نیکی اور بدی کا فرق جاننے کی خاطر ہر قسم کی تکالیف ومصائب سے دوچار ہونے کے لیے تیار ہوں بس آپ میری راہنمائی فرمادیں۔''

''ٹھیک ہے تو میری بات غور سے سنو۔۔۔۔'' شنکر نے آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سے سیدھا جنوب کی طرف چلنا شروع کردو ٹھیک ایک گھنٹے بعد تم ایک دیہات میں پہنچ جاؤ گے۔ اس دیہات کا ٹھاکر بلرام ہے۔ اس کی شادی

کو عرصہ دراز بیت چکا ہے مگر اولاد جیسی نعمت سے محروم ہے۔ ڈاکٹر، حکیم، پنڈت ہر جگہ سے چیک اپ کروا چکا ہے۔ مگر بے سود۔ وہ اب اس نعمت سے محروم ہے اور یہی سمجھتا ہے کہ اس کی تقدیر میں اولاد جیسی نعمت نہیں ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی قسمت میں نہایت فرمانبردار اولاد لکھی ہے۔ اس کو اولاد کیوں نہیں ہو رہی اس کی ایک خاص وجہ ہے۔

اس کی محل نما حویلی کے مین گیٹ کے بالکل سامنے ایک جادو کی کھوپڑی دفن ہے۔ جب تک اس کھوپڑی کو وہاں سے نکال کر گنگا میں ڈالا نہیں جائے گا۔ اور جب تک چالیس دن تک اس حویلی میں غرباء کو کھانا نہ کھلایا جائے تب تک اس شخص کو اولاد نہ ہوگی۔ تم جاؤ اور اسے اس حقیقت سے آشنا کرو۔

جب وہ ان باتوں پر یقین رکھے گا تو ایشور اسے فرمانبردار پتر سے نوازے گا۔ جیسے ہی وہ بچہ پیدا ہو۔ تم نے اس بچے سے ملاقات کرنی ہے۔ اس بچے کے پاس ڈھیر ساری صلاحیتیں موجود ہونگی۔ تم نے اسے مخاطب کر کے اس سے یہی سوال کرنا ہے کہ میں نیکی اور بدی میں فرق جاننے کا متمنی ہوں تمہارے اس سوال کا جواب وہی دے گا۔ اب تم ایشور کا نام لے کر یہاں سے چلے جاؤ، بہت جلد تمہیں تمہارے سوال کا جواب مل جائے گا۔''

شنکر کی بات سن کر اس کی پتنی کی حیرت سے آنکھیں پھیل گئیں یہی نہیں اس نوجوان کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ دونوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ نوجوان نے مزید کچھ کہے سنے بنا ایک بار پھر کھڑا ہو کر نہایت ہی ادب و احترام سے پرنام کیا اور چلتا بنا۔ اس کے وہاں سے جاتے ساتھ ہی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن اس کی پتنی نے اسے مخاطب کیا۔

''اجی ایک بات تو بتاؤ ان سب باتوں کا تم کو کیسے پتہ۔ تم جانتے ہو کہ اگر تمہاری باتوں میں جھوٹ کا عنصر ہوا تو اس بے چارے کی تو ٹھا کر بلرام جان ہی لے لے گا۔ جانتے نہیں کتنا ظالم قسم کا انسان ہے وہ ۔۔۔۔؟'' اس نے ایک نظر لمبے لمبے ڈگ بھرتے اس نوجوان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم چھوڑو ان باتوں کو ایسی باتیں تمہاری عقل میں آنے والی نہیں ہیں۔ میں نے کوئی جھوٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ایشور جانتا ہے کہ میں نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ سچ ہے اور ایشور کبھی بھی مجھے اس کی نظروں میں گرنے نہ دے گا۔۔۔۔'' شنکر نے نوالا توڑ کر منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''مگر تمہیں کیسے معلوم یہ سب۔۔۔۔؟'' اس کی پتنی کی حیرت میں ابھی تک کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک اپنے سوال پر ڈٹی ہوئی تھی۔

''تم اس بات کو چھوڑو یہ بتاؤ تم نے اس نوجوان سے ایسا رویہ کیوں اپنایا کیا تمہیں نہیں معلوم کہ مہمان ایشور کا بھیجا ہوا ہوتا ہے۔'' شنکر ایک بار پھر نفرت بھرے انداز میں پتنی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''اجی میری بات سن لو۔ مجھ سے نہیں ہوتی یہ مہمان نوازیاں۔ اتنی گرمی میں اپنے لیے کچھ پکانا جان جوکھوں میں ڈالنا ہوتا ہے دوسروں کے لیے کیسے پکاؤں ایک بار خود پکاؤ ناں اپنے ان مہمانوں کے لیے تو ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔ ساری مہمان نوازی نکل جائے گی۔ تم لوگ کرتے ہی کیا ہو سارا سارا دن تو ہمیں خجل خوار ہونا پڑتا ہے۔ خود تو مزے سے پکی پکائی کھا کے گھوڑے گدھے سب کچھ بیچ کے سوتے ہو۔ سارا دن کام کر کر کے میرے پورے جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھتی ہیں کبھی پوچھا تک نہیں۔۔۔۔۔'' اس کی بات سنتے ہی اس کی پتنی نے ایک بار پھر اپنا پرانا طرزِ عمل اپنایا تو اب کی بار اسے بھی غصہ آ گیا۔

خوف کھاؤ۔ ایک کھانا ہی پکاتی ہو تم اور کرتی ہی کیا ہو۔ کون سے پہاڑ ہیں جو توڑتی ہو سارا۔ یہاں ایک دن ان کھیتوں میں کام کرو عقل ٹھکانے لگ جائے گی تمہاری۔ لے جاؤ اپنا یہ کھانا مجھے نہیں کھانا۔۔۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا نوالہ چنگیر میں رکھی

ایک روٹی کے اوپر پھینکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں ہاں سچی بات تو ہمیشہ کڑوی ہی لگتی ہے نہ کھاؤ یہ نہ کھاؤ بھاڑ میں جاؤ۔۔۔۔۔" اونچا اونچا اول فول بکتی پتنی کی باتیں سن اس کی آنکھیں نم آلود ہوگئیں اور وہ بے دلی سے چلتا ہوا اس کی کھیت کی طرف چل پڑا۔ جس میں وہ نوجوان کے آنے سے قبل کام کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

نوجوان نے راستے میں کہیں رکنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی سپیڈ اتنی تیز تھی کہ گھنٹے کی بجائے وہ چالیس پینتالیس منٹوں میں اس دیہات میں پہنچ گیا تھا۔ ایک دیہاتی سے پوچھنے پر اسے ٹھاکر بلرام کی حویلی کا پتہ مل گیا۔ پورے گاؤں کے اندر اس کی حویلی واقعی قابل دید تھی۔ جیسے ہی وہ حویلی کے صدر دروازے پہ پہنچا ایک دیہاتی اندر سے دوڑتا ہوا اس کی طرف آیا۔ صدر دروازے کے ساتھ والا چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جس میں سے دیہاتی نے اسے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

بلیو جینز اور ہاف وائٹ شرٹ والا شہری بابو لگتا تھا۔ اس لیے فوراً دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا۔

"شہری بابو لگتے ہو تم۔۔۔۔۔؟" اس نے آتے ساتھ پوچھا۔ "کس سے ملنا ہے۔؟"

"مجھے ٹھاکر بلرام صاحب سے ملنا ہے۔۔۔۔۔" اس نے اس کی طرف دیکھنے کی بجائے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

"مگر کس سلسلے میں۔۔۔۔۔؟" دیہاتی نے ایک اور سوال داغا۔

"یہ میں انہیں ہی اپنی آمد کی وجہ بتا سکتا ہوں۔۔۔۔۔" اس نے اب پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو وہ دیہاتی تھوڑا ہچکچایا۔

"پھر بھی کچھ پتہ تو چلے۔۔۔۔۔؟" دیہاتی متواتر اپنی بات پر قائم دائم تھا۔

"کیا تم میرا پیغام ٹھاکر صاحب تک پہنچا سکتے ہو۔ مجھے ایک نہایت ہی ضروری کام کے سلسلے میں ان سے ملاقات کرنی ہے۔۔۔۔۔" جواب میں دیہاتی نے کچھ کہنے کی بجائے اسے وہیں انتظار کرنے کا کہہ کر خود اندر چلا گیا۔ جلد ہی اس کی واپسی ہوئی۔

"آیئے تشریف لایئے۔۔۔۔" اس نے اندر سے ہی اس کے سامنے ہوتے ہوئے کہا۔

جواباً نوجوان اندر داخل ہوگیا۔ وہ بہت احتیاط سے قدم رکھ رہا تھا۔ دیہاتی نے اس بات کو بہت قریب سے نوٹ کیا۔ نوجوان یوں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ گویا نیچے بم دبایا گیا ہو جس پر پاؤں دھرتے ہی اس کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ دیہاتی نے ایک بار اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا ضرور مگر منہ سے بولا کچھ نہیں۔

شاید وہ اس نوجوان سے چنداں سہم گیا تھا۔ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ دیہاتی لوگ شہری لوگوں سے بات کرتے ہوئے بہت ہچکچاتے ہیں۔ اکثر تو شہری لوگوں کے سامنے بات کر ہی نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ دیہاتی لوگ شہری زندگی میں خود کو ٹھیک سے ایڈجسٹ نہیں کر پاتے۔ ان کی اسی ہچکچاہٹ کی وجہ سے ان کی پود پر بھی خربوزے کو دیکھ کر خربوزے والا رنگ چڑھتا ہے۔

"جی اس سامنے والے کمرے میں ٹھاکر صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔۔۔۔" اس نوجوان نے اب کی بار نہایت ہی شائستہ اور مدھم لہجے میں کہا۔ اس کے اس انداز پر وہ نوجوان زیر لب مسکرایا اور اندر داخل ہوگیا۔ اندر کا منظر دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ یہ سیٹنگ روم تھا۔ جسے نہایت ہی قیمتی سامان سے مزین کیا گیا تھا۔ شاید ٹھاکر بلرام کو شہری طور طریقوں سے آگاہی تھی۔ اس نوجوان نے حیرت سے چہار سمت ایک نگاہ دوڑائی تبھی اس کی نگاہیں سامنے صوفے پر نہایت ہی شان و شوکت سے براجمان ٹھاکر سے ٹکرائیں جس کی نگاہیں اسی پر مرکوز تھیں۔

نوجوان نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا ۔ٹھاکر نے زیرلب مسکرا کر اس کے پرنام کا جواب دیا۔لیکن اس نوجوان نے دیکھا کہ یہ مسکراہٹ ایسی تھی جیسے ہونٹوں نے کرب کے انداز میں کروٹ بدلی ہو۔گفت وشنید سے قبل ہی ایک خوبرو دوشیزہ ایک جگ میں دودھ میں کوئی ٹھنڈا شربت ڈالے آن وارد ہوئی۔گرمی کی شدت نے نوجوان کو تھکا کے رکھ دیا تھا۔بھوک وپیاس سے اس کا برا حال تھا۔وہ ایک ساتھ تین گلاس شربت کے حلق میں انڈیل گیا۔

ٹھاکر بلرام بدستور اسے دیکھ رہے تھے۔میٹھے اور ٹھنڈے شربت کا پیٹ میں جانا تھا کہ کچھ جان میں جان آئی۔اس نے تعریفی نظروں سے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔وہ دوشیزہ برتن اٹھا کر وہاں سے چلتی بنی۔تو ٹھاکر نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا مگر منہ سے بولا کچھ نہیں۔

نوجوان نے ایک گہری نگاہ ٹھاکر پر ڈالی۔کشادہ چھاتی اور نہایت ہی خوبرو نین نقش کا وہ مالک تھا۔اس کی بڑی بڑی مونچھیں اس کے چہرے کے رعب ودبدبے اور جلال میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔اس نے چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔داڑھی،مونچھوں بھنوؤں اور سر کے بالوں میں سفیدی کی جھلک واضح دکھائی دے رہی تھی۔

''میں یہاں ایک نہایت ہی اہم کام سے آیا ہوں ٹھاکر صاحب۔۔۔'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے اب کی بار ٹھاکر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''شاید آپ کو میری بات سن کر تجسس ہو مگر یہ حقیقت ہے جو میں آپ پر عیاں کرنے آیا ہوں۔''

''تم کھل کے بات کرو جو بھی کہنا چاہتے ہو۔۔۔''ٹھاکر نے بائیں ٹانگ اٹھا کر دائیں ٹانگ پر دھر کر اس جنبش دیتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کے ہاں جلد ایک ایک لڑکا پیدا ہوگا جسے ڈھیر ساری صلاحیتیں ملیں گی۔۔۔''اس سے قبل کہ نوجوان مزید کچھ بولتا ٹھاکر کا چہرہ غصے سے لال پیلا ہوگیا اور اس نے کھا جانے والی آنکھوں سے نوجوان کو دیکھا۔

''اگر مزید کچھ کہا تو تکہ بوٹی ایک کردوں اب مزید کچھ کہے سنے بغیر یہاں سے چلتے بنو۔۔۔۔''

ٹھاکر بلرام نے تقریباً گرجتے ہوئے کہا۔ایک بار تو اس کی بات سن کر اس نوجوان کے پیروں تلے زمین نکل گئی مگر جلد ہی اس نے اپنے حواس پر قابو پالیا۔

''اگر میری کسی بھی بات کے اندر جھوٹ ہو تو فوراً سے بھی پیشتر میرا سر کاٹ کر دیا جائے۔مگر ایک بار آپ میری بات سن لیں گے تو کیا حرج ہوگا۔۔۔؟''نوجوان نے سوالیہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو۔۔۔۔؟ ٹھاکر بلرام نے اس کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔''اگر تمہاری کسی بات میں جھوٹ کا عنصر ہوا تو میں حقیقت میں فوراً تمہارا سر کٹوادوں گا۔معافی کی کوئی گنجائش نہ ہوگی تمہارے لیے۔''

''مجھے سب قبول ہے۔۔۔''نوجوان نے حامی بھرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بولو۔۔۔۔''اب کی بار ٹھاکر کا ماتھا ٹھنکا اسے تردد ہوا تو اس نے اب کی بار چنداں نرم لہجے میں کہا۔

''آپ کے مین دروازے کے سامنے ایک کھوپڑی دفن ہے۔جو عرصہ دراز قبل کسی طرح زمین کے نیچے کسی دشمن نے دفن کیا تھا۔اسے پہلے آپ باہر نکالیے باقی بات میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔۔۔'' نوجوان کی بات سن کر ٹھاکر نے بھنویں اچکائیں اور نجانے کیوں اسے اب کی بار نوجوان کی باتوں میں سچائی دکھائی دی ۔تو وہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور کمرے سے باہر نکلا تو نوجوان بھی اس کے ساتھ باہر نکلا۔

باہر نکلنے کی دیر تھی کہ کچھ دیہاتی جو اس کے

شاید ملازم تھے دوڑ کر اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔

"فوراً کدالیں اٹھالاؤ۔۔۔۔۔" ٹھاکر نے ان کی طرف دیکھے بنا دروازے کی طرف چلتے ہوئے کہا۔ انہوں نے جواباً کچھ کہا تو نہیں لیکن ان کی پیشانیوں پر بہت سے سوال ابھر آئے تھے۔

ٹھاکر کے حکم کے مطابق اس کے ملازم کدالیں لے کر آگئے اور کھدائی شروع ہوگئی۔ اب کی بار نوجوان کو دھچکا لگا کہ اگر یہاں سے کوئی کھوپڑی نہ نکلی تو ٹھاکر فوراً اس کا سر کٹوا دے گا۔ ایسے پر ہیبت انسان سے معافی کی توقع رکھنا ہی بے وقوفیت تھا۔ نوجوان کا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ ٹھاکر کی آنکھیں متواتر اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی وہ تیزی سے کدالیں چلاتے اپنے ملازمین کو طائرانہ نظروں سے دیکھ لیتا تھا۔ جبکہ نوجوان کی نگاہیں متواتر کھودی جانے والی جگہ پر لگی ہوئی تھیں اس نے ایک بار بھی ٹھاکر کی طرف نہ دیکھا۔ اس کی حالت تو "کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہو" والی ہو چلی تھی۔ تبھی ٹھاکر کا ایک ملازم تقریباً چلاتے ہوئے بولا۔

"ٹھاکر صاحب یہ دیکھیے یہاں پر ایک کھوپڑی ہے۔۔۔۔۔" اچانک ٹھاکر نے بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہو کر اس ملازم کے ہاتھ میں کھوپڑی کو دیکھا۔

نوجوان کی سانس میں سانس آئی تو اس نے نہایت ہی تکبرانہ انداز میں ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ ٹھاکر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس کا گرویدہ ہوگیا اسے اس کی بات سچی معلوم ہونے لگی کہ وہ بہت جلد ایک حسین وجمیل چاند سے بیٹے کا باپ بنے گا۔ جو خواب برسوں سے وہ دیکھتا چلا آرہا تھا جس کو حقیقت میں بدلنے کے لیے اس نے بہت پر تولے تھے مگر ناکامی نے اس کا منہ چڑھایا تھا۔ اسے آج وہ خواب حقیقت کا روپ دھارتا ہوا نظر آیا۔

"ٹھاکر خوف سے کھوپڑی کو دیکھنے لگا پھر بولا۔

"اسے لے جا کر گنگا میں ڈال دو۔"

ٹھاکر صاحب اور کتنا کھودنا ہے؟۔۔۔۔۔" اچانک ایک ملازم کی بازگشت اس کی قوت سماعت سے ٹکرائی تو وہ یوں چونکا جیسے سویا ہوا انسان اچانک چونک کر اٹھ بیٹھتا ہے۔

"نہیں بس کرو بلکہ ایسا کرو اس مٹی کو اب اس گڑھے میں بھر کے اچھی طرح سے گڑھے کو بند کردو۔۔۔۔۔" اتنا کہہ کر وہ وہاں سے چلا آیا، نوجوان بھی بدستور اس کے پیچھے چلا آیا۔ جبکہ ملازموں نے کھا جانے والی آنکھوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ پہلے اتنی مشکل سے انہوں نے ایک گڑھا کھودا تھا اب اس گڑھے کو بند کرنے کا حکم دے کر یہ جا وہ جا۔

☆.....☆.....☆

"ہم نے تو امیدیں ہی ختم کر رکھی تھیں مگر آج تم ہمارے لیے ایک امید کی کرن بن کر آئے ہو۔ تمہارے ایک بات تو سچ نکلی اور اگر دوسری بات بھی سچ نکلی تو میں تمہیں سونے چاندی کے ساتھ لیس کر کے یہاں سے روانہ کرواں گا۔۔۔۔۔" ٹھاکر بلرام خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے بولا۔

اس وقت وہ ٹھاکر کے ساتھ اس کے گھر کے اندر اس کی پتنی کے پاس براجمان تھا۔ جسے یہ خبر سنتے ہی اپنی قوت سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"ہاں نوجوان! اگر ایشور نے ہمیں امید لگادی تو تمہاری سوچ سے بڑھ کے ہمارے پاس ایشور کا دیا ہے۔۔۔۔" ٹھاکر کی پتنی نے اپنے پتی کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میرے پاس ایشور کا دیا اتنا کچھ ہے کہ اس کے سامنے آپ کا یہ سب کچھ رتی برابر بھی نہیں میں یہاں اپنے مقصد کی خاطر آیا ہوں۔"۔۔۔۔ لڑکے نے نہایت ہی اطمینان سے دونوں کی بات سن کر جواب دیا تو دونوں نے محو حیرت سے اسے گھورا۔

''ہم کچھ سمجھے نہیں تم کیا چاہتے ہو۔۔۔۔؟'' ٹھاکر نے پہلے انگشت بدنداں ہوکر اپنی پتنی کی طرف دیکھا۔اس کی کیفیت بھی اس سے کم نہ تھی۔پھراسے مخاطب کیا۔

''میں کیا چاہتا ہوں وہ صرف آپ کا ہونے والا بچہ ہی مجھے دے سکتا ہے۔۔۔۔۔'' اس نوجوان نے متواتر اسی لہجے میں کہا۔

''کھل کے بات کرو۔۔۔۔۔'' ٹھاکر نے اب کی بارناک سکیڑ کرکہا۔

''آپ فکر مت کریں کوئی خاص بات نہیں بس میرا ایک سوال ہے جو اس پیدا ہونے والے بچے کے علاوہ کوئی نہیں دے سکتا۔۔۔۔'' نوجوان نے اب کی بار ٹھاکر کی پتنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا بول رہے ہو۔۔۔۔۔؟'' ٹھاکر نے پر تشویش لہجے میں پوچھا۔''ایک معصوم بچہ تمہارے سوالوں کا جواب کیا خاک دے گا جسے ٹھیک سے غوں غاں کرنا نہیں آتا۔''

''شاید آپ اس بات کو بھول رہے ہیں کہ میں نے پہلے ہی آپ کو بتادیا تھا کہ آپ کا بیٹا بہت صلاحیتوں کا مالک ہوگا۔۔۔'' اس نے اسے یاددلاتے ہوئے کہا۔جواباً ٹھاکر خاموش رہا۔مگراس کی حالت قابل دید تھی۔اسے یہ نوجوان کوئی پاگل مجنوں معلوم ہورہا تھا۔وہ اپنی بات کولفظوں کی مالا نہیں پہنانا چاہتا تھا کیونکہ یہ نوجوان اس کے لیے ایک امید کی کرن ثابت ہوا تھا۔

☆......☆......☆

غرباء میں لنگر تقسیم کرتے آج اکتیسواں دن تھا۔جب ڈاکٹری رپورٹ میں ٹھاکر کی پتنی کو حاملہ قرار دے دیا گیا۔ٹھاکر اوراس کی پتنی کو یقین نہیں ہورہا تھا۔وہ بار بار ڈاکٹر سے ان لفظوں کے سننے کے متمنی تھے۔جو برسوں سے سننا چاہتے تھے۔جنہیں سننے کی خاطرانہوں نے بہت پر تولے تھے۔لیکن آخر قسمت

کیسے کیسے لوگ

ایک آدمی حلوائی کے پاس گیا اور کہا کہ ایک سیر برفی دے دو۔ اس نے دے دی تو وہ واپس کر کے کہنے لگا کہ چلو ایک سیر لڈو دے دو، حلوائی نے لڈو دے دیئے تو وہ چل پڑا۔ حلوائی نے کہا پیسے تو دیتے جاؤ اس نے کہا۔''یہ تو میں نے برفی کے بدلے میں لئے ہیں۔تو حلوائی نے کہا اچھا تو برفی کے پیسے دے دو۔تو وہ آدمی بولا۔ برفی تو میں نے واپس کردی ہے۔

(انتخاب: ذیشان-کراچی)

کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔آج اچانک لیڈی ڈاکٹر نے جب یہ انکشاف کیا تو دونوں پتی، پتنی حیران وششدر رہ گئے۔

ٹھاکر نے لیڈی ڈاکٹر اور ہسپتال کے عملہ میں نہ صرف فوراً مٹھائی تقسیم کروائی بلکہ انہیں خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے نقدی سے بھی نوازا۔یہ بات دیہات میں جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ٹھاکر کے حریفوں کے منہ پھول گئے۔کیونکہ ان دونوں پتی پتنی کی موت کے بعد وہ اس ساری جائیداد کے وارث بنتے تھے۔وہ کوئی اور نہیں اس کے سگے بھتیجے، بھانجے تھے۔یہی نہیں خود اس کے دونوں بھائی بھی اس کے لیے دل میں کدورت کے جذبات رکھتے تھے۔جیسے یہ نوید ان کی قوت سماعت سے ٹکرائی ان کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔

شدت غم اور غصے کی وجہ سے انہوں نے بھائی اور بھابھی کو مبارکباد تک دینا گوارا نہ کیا۔ٹھاکر بلرام بھی ان کے تیور بہت اچھے سے پہچانتا تھا۔اس کے

بھائی، بھابیاں اور تینوں بہنیں جب اس کے گھر آتے تھے تو اس کی پتنی کو باتوں باتوں میں لعن طعن کرنے کے ساتھ ساتھ ٹوکا کرتے تھے۔ حالات کے سامنے دونوں مجبور تھے۔ ایک نہ ایک تو ہمیشہ ہی اس کے گھر میں قیام پذیر رہتا تھا۔ ٹھاکر بھی بخوبی جانتا تھا کہ یہ سب پیار محبت اس کی دولت ہتھیانے تک محدود ہے۔

آج اسے کچھ ہو جائے کل کو ان سب کے تیور بدل جائیں گے۔ سب سے پہلے تو وہ اس کی پتنی کو نکال پھینکیں گے۔ اسی خدشے کی وجہ سے اس نے بہت عرصہ قبل اپنی ساری جائیداد اپنی پتنی کے نام لکھ دی تھی۔ وصیت میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اگر ہم دونوں اس دنیا میں نہیں رہتے تو ہماری جائیداد کسی عناد آشرم کو دے دی جائے۔ اس بات کی خبر اس کے بہن بھائیوں کو بالکل نہ تھی۔ اور اس نے اپنے وکیل کو بھی خصوصی طور پر منع کر رکھا تھا۔ کہ ایسی کوئی بھی بات ان کے کانوں تک نہ پہنچنے پائے، ورنہ قبل از وقت وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں۔

آج اس کے سامنے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو چکا تھا۔ وہ اس کے لیے کتنی چاہت اور اپنائیت رکھتے تھے اس پر عیاں ہو چکا تھا۔ مگر اب اسے اپنی نہیں اپنے ہونے والے بچے کی چنتا لگ گئی۔ ممکن ہے کہ وہ اس کے ہونے والے بچے کو کوئی تکلیف پہنچائیں۔

رات کافی ڈھل چکی تھی مگر نیند تھی کہ ٹھاکر کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے کھڑکی کے دونوں پٹ ہٹا دیے۔ اس کا یہ کمرہ فرسٹ فلور پر تھا۔ یہ حویلی تین منزلہ تھی اور حقیقت کے اندر کسی محل سے کم نہ تھی۔ کھڑکی کے پٹ کھولنے کی دیر تھی کہ ٹھنڈی ہوا کے تیز جھونکوں نے اس کے قلب و ذہن میں راحت پہنچائی۔ ایک بار تو اس نے آنکھیں موند لیں شاید اس ٹھنڈی ہوا سے بھرپور استفادہ حاصل کرنا چاہتا تھا مگر جلد ہی اس نے آنکھیں کھول لیں۔

لیکن آنکھیں کھولنے کے ساتھ ہی وہ انگشت بدنداں رہ گیا۔ مسیحا بن کے آنے والے اس نوجوان نے گراؤنڈ فلور پہ کمرہ اپنے رہنے کے لیے صاف کروایا تھا۔ وہ کمرہ تو فرسٹ فلور سے دکھائی نہ دیتا تھا مگر اب تک اس کے اندر جلنے والی لائٹ جو صحن کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پٹوں سے باہر چھن چھن کر نکل رہی تھی دیکھ کر ٹھاکر کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ فوراً نیچے آیا کہ دیکھے تو سہی اتنی رات گئے وہ نوجوان کیا کر رہا ہے وہ بجائے دروازے پہ دستک دینے کے صحن کی طرف سے کھڑکی کی طرف گیا۔

جیسے ہی اس نے کھلی کھڑکی کے پٹوں میں سے اندر جھانکا تو ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ وہ کم سن نوجوان ایشور کے سامنے ماتھا ٹکائے پرارتھنا کر رہا تھا۔ اور ایک وہ تھا قریب المرگ اور آج تک اسے اپنے ایشور کے سامنے ماتھا ٹیکنے کی توفیق نہ ہوئی تھی۔ شدید ملامت کے احساس نے اسے پانی پانی کر دیا تھا۔ وہ آبدیدہ ہو گیا۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔

''میرے ایشور! میں کتنا مورکھ ہوں کہ تو نے مجھے ہر وہ نعمت عطا کی جس کی تمنا ہر کس و ناکس کو ہوتی ہے باوجود اس کے میں تیرا کتنا نافرمان بندہ ہوں، پھر تو نے اپنی عطاؤں کا یہ سلسلہ موقوف کیوں نہ کیا۔ ایشور! میں تیری عطاؤں کے نہیں سزاؤں کے قابل تھا۔''

اس کا دل بجھ سا گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ نوجوان پرارتھنا کر رہا ہے۔ پھر وہ اٹھ کر بستر پر دوزانوں بیٹھ گیا اور ایشور کو یاد کرنے لگا۔ وہ مڑ کر دروازے کے پاس آیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نوجوان نے دروازہ کھولا۔ کتنی شادابی تھی اس کے چہرے پر۔ کتنا سکون و اطمینان تھا۔ وہ اس سے ہر لحاظ سے بڑھ گیا تھا۔ مال و دولت میں بھی اور ایشور کے در میں بھی۔ رات کے اندھیروں میں جب انسان گھوڑے بیچ کے سو رہے تھے تو یہ نوجوان اپنے مالک سے گڑگڑا کر پرارتھنا کر رہا تھا۔ وہ واقعی سچا تھا۔ اسے

ایشور نے واقعی علم غیب عطا کیا تھا۔ ایسے ہی تو اس نے یہ پیش گوئی نہیں کردی تھی۔ اور پھر اس نے جھوٹ بھی تو نہیں بولا تھا۔ اس نے جو جو کہا تھا وہ سب حقیقت پر مبنی تھا۔ اس کی برسوں کی بھاگ دوڑ بے سود ثابت ہوئی تھی۔ مگر نوجوان کے منہ سے نکلے چند لفظوں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔

''آیئے ناں اندر کن خیالوں میں کھوئے ہوئے ہیں ٹھاکر صاحب۔۔۔۔۔؟'' اچانک اس نوجوان کی دل موہ لینے آواز سن کر وہ چونکا۔ اور بنا کچھ کہے اندر داخل ہوا۔ وہ ایک طرف دروازے کے ساتھ ہی صوفے پر براجمان ہوگیا۔ نوجوان کی نگاہیں بدستور اسی پر مرکوز تھیں۔

''آپ مجھے کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟ سب خیر تو ہے ناں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟''

نوجوان نے یکے بعد دیگرے دو سوال پوچھے۔ ٹھاکر نے نگاہیں اٹھائیں۔ نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبایا۔ شاید اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی سعی کر رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے سامنے ٹھاکر نوجوان کے قدموں میں پڑا وہ گڑگڑا رہا تھا اور نوجوان محو حیرت سے اسے تکے جا رہا تھا۔ نوجوان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے کہ اچانک ٹھاکر کو ہو کیا گیا تھا۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے اٹک گئی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے ٹھاکر کو دیکھے جا رہا تھا جو اس کی ٹانگوں کو پکڑے اپنا سر اس کے پیروں پر رکھے ہوئے تھا۔

''ایشور کے لیے میرے ہونے والے بچے کی حفاظت کیجیے۔۔۔۔۔ میرے بہن بھائی کہیں اس کی جان ہی نہ لے لیں۔۔۔۔۔ میں برسوں اس خوشی کی گھڑی کا انتظار کیا ہے اور اگر اب یہ امید دم توڑ گئی تو میں۔۔۔۔۔ میں کرچیاں کرچیاں ہو جاؤں گا۔۔۔۔۔ میرا سب کچھ آپ لے لیجیے۔۔۔۔۔ آپ ایشور کے بہت پہنچے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی کہ میں کیسے اپنی پتنی اور اپنے ہونے والے بچے کی حفاظت کروں نہ جانے کیوں۔۔۔۔۔ مجھے ہمہ وقت دھچکا سا لگا رہتا ہے۔۔۔۔۔ میری پتنی اور میرے بیٹے کو اپنی حفاظت میں لے لیجیے۔۔۔۔۔ ایشور کے بعد اب آپ ہی میرے لیے ایک مسیحا ہیں۔۔۔۔۔ میں دنیا میں سوائے آپ کے کسی پر اعتماد نہیں کرسکتا۔۔۔۔۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔۔۔۔۔'' ٹھاکر بلرام نے دوزانوں بیٹھتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر زار و قطار روتے ہوئے کہا۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہ لے رہے تھے۔ نوجوان کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ اس نے نیچے بیٹھ کر ٹھاکر کے ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما۔

میں آپ لوگوں کی عزت بہت زیادہ کرتا ہوں۔ میں نے آپ کے گھر کا نمک کھایا ہے۔ اور آپ چنتا کیوں کرتے ہیں۔ ایشور پر بھروسہ رکھئے۔ انسانوں پہ بھروسے رکھنے والے ہی تو دھوکہ کھاتے ہیں۔ آپ لوگ چنتا مت کریں آپ کے ہونے والے بچے کی دنیا کی کوئی طاقت بال تک بیکا نہ کر پائے گی۔ دل سے اس وہم کو نکال پھینکیے۔ آپ کا بیٹا بہت اونچے مقام کا مالک ہوگا۔ ایشور نے اسے ایسا مقام دے رکھا ہے کہ وہ خود اپنی اور آپ سب کی حفاظت کرسکتا ہے تو آپ اتنی فکر کیوں کرتے ہیں۔۔۔۔۔'' نوجوان نے ٹھاکر کو گلے لگایا۔ اور ٹھاکر بچوں کے جیسے بلک بلک کر نجانے کتنی دیر روتا رہا۔ جب اس کے دل کا غبار نکل گیا تو وہ فوراً وہاں سے چلا گیا۔

☆......☆......☆

ٹھاکر نے پہرے دار کو کہہ دیا تھا کہ ''میرا کوئی بھی عزیز مجھ سے ملنے آئے تو اسے گھر کے اندر نہ آنے دے۔'' وہ جتنا خوش تھا اس سے کئی گنا زیادہ پریشان بھی تھا۔ سارا دن گھر کے اندر ادھر سے ادھر چکر لگاتے گزر جاتا اور راتیں کروٹوں کی نظر ہو جاتی۔ وہ ہر وقت مستعد رہنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی پتنی اور بچے کی حفاظت کرنا چاہتا تھا چاہے اس کے عوض اس کی اپنی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

بچے کی پیدائش کے دن بہت قریب آچکے

تھے۔ اب بات مہینوں یا ہفتوں کی نہیں رہی تھی بلکہ بات دنوں پر آ گئی تھی۔ اور اس نے شہر سے ایک لیڈی ڈاکٹر اور اس کے ساتھ اس کے عملے کو ایک ایک ہفتے کے لیے اپنے گھر بلا لیا تھا۔ وہ لیڈی ڈاکٹر دور کہیں سے اس کی کوئی رشتے دار بھی لگتی تھی۔ مگر ٹھاکر کو اس پر اعتماد تھا۔ آج تک ٹھاکر اور اس کی پتنی نے جہاں سے بھی چیک اپ کروایا تھا وہ ان کے ساتھ ساتھ رہی تھی۔ اور وہ وقتاً فوقتاً ٹھاکر کو اس بات کا احساس دلاتی رہتی تھی کہ حریفوں کی للچائی ہوئی نظریں اس کے مال وزر پر لگی ہوئی ہیں۔ اے کاش!! ایشور تمہیں ایک بچہ دے دے تو دیکھنا فوراً سے بھی پیشتر یہ لوگ جل کر خاکستر ہو جائیں گے۔ اور واقعی حقیقت میں ایسا ہی ہوا تھا۔ ان جلے بھنے اپنوں میں سے آج تک کسی کو یہاں آنے کی توفیق نہ ہوئی تھی۔

اس وقت بھی ٹھاکر کی پتنی کی طبیعت چنداں ناساز تھی۔ ٹھاکر اور وہ نوجوان دونوں باہر صحن میں بیٹھے گفت و شنید کر رہے تھے جب پہرے دار انہیں اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ قریب آ کر نہایت ہی مودبانہ لہجے میں گویا ہوا۔

''ٹھاکر صاحب آپ کے بھائی اور بہنیں اپنے بچوں کے ہمراہ تشریف لائے ہیں۔ میرے لیے کیا حکم ہے؟''

پہرے دار کی بات سن کر ٹھاکر کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے گہری نظروں سے گیٹ کی طرف دیکھا۔

''انہیں وہیں سے چلتا کرو۔۔۔'' اس نے گیٹ پر ہی کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں آپ کے اپنے آپ کی خوشیوں میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔۔۔'' اس نوجوان نے ٹھاکر کی بات سن کر انگشت بدنداں ہو کر اس سے پوچھا۔

''مجھے کسی کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اپنی ان خوشیوں میں ان لوگوں کی شرکت پسند نہیں کرتا۔۔۔'' ٹھاکر نے دانت پیستے ہوئے کہا اور پھر پہرے دار کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تمہیں جو کہا ہے وہ کرو کھڑے کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔''

پہرے دار آناً فاناً وہاں سے چلتا بنا اور اس نے باہر سے ہی سب کو چلتا کیا۔ ان کے جانے کے بعد ٹھاکر نے سکھ کا سانس لیا۔

☆......☆......☆

ٹھاکر بلرام کے ہاں ایک خوبصورت بچے نے آنکھیں کیا کھولیں۔ پورے گاؤں میں نہ صرف مٹھائی تقسیم کی گئی بلکہ صدقے اتارے گئے۔ ٹھاکر اور اس کی پتنی خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھیں۔ ٹھاکر کے تو زمین پر پاؤں نہ پڑ رہے تھے۔ بار بار دونوں پتی، پتنی اپنے بچے کو بوسہ دیتے۔ بچہ تھا ہی اتنا خوبصورت کہ ایک نگاہ دیکھے تو بار بار دیکھنے کو من چاہے۔ تبھی ٹھاکر کو وہ نوجوان یاد آیا جس کے سر پر ان خوشیوں کا اصل سہرہ تھا۔

ٹھاکر نے ایک نوکر کو بھیج کر پتہ کروایا تو وہ اپنے روم میں ہی تھا۔ ٹھاکر اور اس کی پتنی کے علاوہ دو ملازمہ بھی ان کے ساتھ ہو لیں۔ نوجوان اس وقت بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں موندی ہوئی تھیں۔ سر کے نیچے تکیہ ہونے کے باوجود داہنا ہاتھ سر کے نیچے دے رکھا تھا۔ کھٹکے کی آواز سن کر اس نے فوراً آنکھیں کھولیں۔ سامنے ٹھاکر، اس کی پتنی اور اس کے ہاتھ میں ایک بلبلاتا بچہ دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ نوجوان نے ٹھاکر کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ جواباً ٹھاکر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا مسکرانا نوجوان سمجھ گیا اور فوراً اٹھ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

''ہم بہت خوش ہیں پتر۔ ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہیں کہ تم ہمارے لیے ایک مسیحا بن کے آئے اور دیکھو تو۔۔۔'' ٹھاکر کی پتنی اپنی گود میں اٹھائے بچے کی پیشانی چومتے ہوئے بولی۔ ''کتنا سندر پتر ہے میرا۔ ایشور اس کو کسی کی نظر نہ لگائے۔''

"ایشور کی دیا ہے۔ اب اس بچے سے مجھے دو چار باتیں کرنے دیں کیونکہ میں جس گھڑی کے انتظار میں تھا وہ یہی گھڑی تھی اب مجھے اپنی منزل پانی ہے۔ یہی معصوم میری منزل ہے۔۔۔" نوجوان نے لبوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ایک بے یقینی کے عالم میں دونوں نے اپنے بچے کو نوجوان کے سپرد کر دیا۔ اس نے اس معصوم بچے کو اپنے ہاتھوں کے جھولے میں تھام لیا۔ اس کی گہری نیلی آنکھیں بہت ہی حسین تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی جھیل میں فلک کی شبیہہ دکھائی دے رہی ہو۔

"اے معصوم بچہ۔۔۔ تو بدی سے پاک ہے۔۔۔ دنیا میں تیری آمد خوش آئند ثابت ہوگی۔۔۔ ایشور تیرا اقبال بلند کرے میں عرصہ دراز سے یہاں تیری آمد کا منتظر تھا۔ آج تو نے اس فانی دنیا میں آنکھیں کھولی ہیں۔ میں تجھ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں بس مجھے اس کا جواب چاہیے۔۔۔" نوجوان نے نہایت ہی ادب احترام سے اس بچے سے بات کی۔

اگلا منظر ناقابل یقین اور ناقابل فراموش تھا۔ سب حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے۔ جب اس بچے نے نوجوان کی بات سن کر بولنا شروع کر دیا۔ کسی کو بھی اپنی قوت سماعت پر وشواس نہیں ہو پا رہا تھا۔

اے ایشور کے پیارے بندے تمہیں سوال بتانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے دل کے اندر کی ہر بات سے آشنا ہوں بس تمہیں تھوڑی سی دقت اور برداشت کرنا پڑے گی۔ واپس اسی گاؤں میں لوٹ جاؤ جہاں شنکر کسان نے تمہیں میرے بارے میں بتایا تھا۔ اسی گاؤں میں ایک جگدیش نامی شخص رہتا ہے۔ جو پہلے بہت ہی غریب تھا۔ مگر اب اس پر ایشور کی بہت بہت کرپا ہے۔ اس کے پاس ایک کتیا ہے۔ وہ کتیا بہت ہی اعلیٰ قسم کی ہے۔ اس کا ایک بچہ لاکھوں میں فروخت ہوتا ہے۔ تم اس کتیا کے پاس چلے جاؤ وہی تمہاری منزل ہے۔ وہی تمہارے ہر سوال کا جواب ہے۔ وہیں پر تمہارے یہ بھاگ دوڑ ختم ہو جائے گی۔ میں پرارتھنا کروں گا کہ ایشور تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے۔"

"جاؤ اب چلے جاؤ یہاں سے اور کبھی خیال میں بھی میری چنتا مت کرنا میں اپنے اوپر یا اپنے ماتا پتا کے اوپر آنچ تک نہ آنے دوں گا۔ کسی کی جرأت نہیں کہ کوئی ہمارا بال تک بیکا کر پائے۔۔۔" اتنا کہہ کر اس چند گھنٹوں پہلے دنیا میں آئے بچے نے چپ اختیار کر لی۔

یہ ایک ایسا منظر تھا جس پر اعتبار کرنا ناممکن تھا مگر آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی بات سے کون مکر سکتا ہے۔ حیرت کے کتنے ہی بم کمرے میں ایستادہ ٹھاکر اور ٹھکرائن پر گرے۔ بچے کی بات ختم ہوتے ساتھ ہی نوجوان نے رخت سفر باندھنا شروع کر دیا۔ سب نے روکنے کی سعی کی مگر بے سود۔ وہ بضد رہا کہ جب تک اس کی منزل اسے نہیں جاتی اس کی زندگی میں ٹھہراؤ نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ سب نے بہت خوشی سے اسے روانہ کیا۔ خاص کر ٹھاکر بلرام اور اس کی پتنی تو اس کا شکر ادا کر کر کے اسے شرمسار کر رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے شرم کی وجہ سے وہ ابھی زمین میں دھنس جائے گا۔

☆......☆......☆

نوجوان نے پہلے سوچا کہ جا کر شنکر سے ملاقات کرے مگر پھر اس نے اپنا ارادہ ترک کیا اور بچے کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا۔ یہ ایک پختہ مکان تھا۔ اسے کوٹھی یا محل کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ مگر یہ بھی عیاں تھا کہ اس کی پختگی میں کسی قسم کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں چھوڑا گیا۔ نوجوان نے دروازے پر دستک دی تو ایک سانولے رنگ کے نوجوان نے دروازہ کھولا۔

"جی فرمائیں۔۔۔" نوجوان نے نہایت ہی ناگواری سے پوچھا۔

"مجھے جگدیش صاحب سے ملنا ہے۔۔۔" اس نے اس کے انداز کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔۔۔ ایک تو ان کتے کے شوقینوں نے جینا حرام کر رکھا ہے آرام سے بیٹھ کے دو نوالے نہیں لینے دیتے۔ انتظار کیجئے آپ کا پیغام پہنچاتا ہوں۔۔۔" اس نے نہایت ہی بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ مگر نوجوان کو اس کے کسی بھی قسم کے ردِعمل سے کوئی لینا دینا نہ تھا۔ اسے مطلب تھا تو اپنی منزل سے۔ جس کے لیے وہ نجانے کب سے ذلیل وخوار ہو رہا تھا۔ اسے تھوڑا ہی انتظار کرنا پڑا اسی نوجوان نے جلد ہی دروازے سے منہ نکالا۔

"تشریف لایئے۔۔۔"

نوجوان اندر داخل ہوا تو اسے سامنے ہی ایک ادھیڑ عمر آدمی دکھائی دیا۔ اس کے لبوں پہ معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ اسے اندر آتا دیکھ کر اس کی طرف لپکا۔

"آؤ آؤ نوجوان کیسے تشریف لائے آپ۔ ہم ایک دوسرے سے ملے نہیں ہیں اس لیے امید کرتا ہوں کہ تم اس اعلیٰ نسل کی کتیا کا کوئی بچہ خریدنے کے لیے آئے ہو؟ تمہارا آنا مجھے بالکل حیرت میں نہیں ڈال رہا اس کی وجہ جانتے ہو، کیونکہ میں ڈیلی نئے نئے چہرے دیکھنے کا عادی ہو چکا ہوں۔۔۔" قریب پہنچتے ساتھ ہی مصافحہ کرتے ہوئے اس شخص نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔

"آپ نے ٹھیک پہچانا مگر میں ایک بار اس کتیا کو دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔" نوجوان نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں تم آؤ میرے ساتھ۔۔۔" اس آدمی نے ایک طرف چلتے ہوئے کہا تو نوجوان اس کے پیچھے چل پڑا۔

ایک چھوٹا سا ٹرن لے کر مکان کے دوسری طرف وہ اسے لے گیا جہاں ایک مضبوط جنگلے کے اندر ایک کتیا مقید تھی۔ کتیا کیا تھی بلکہ دیکھنے پر یوں لگتا تھا جیسے کوئی شیر قید کر دیا گیا ہو۔ ایک بار تو دیکھ کے نوجوان کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی کہ یہ کتیا اس کے کسی سوال کا کیا جواب دے گی یہ تو الٹا اسے کچا چبا ڈالے گی۔ کتیا اسے دیکھتے ساتھ ہی اٹھ کر جنگلے کے دروازے کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"ادھر دیکھو یہ اس کے بچے ہیں۔"

اچانک اس کی قوت سماعت سے اس شخص کی دوبارہ بازگشت ٹکرائی تو نوجوان نے اس سمت دیکھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے کسی شیرنی کے بچوں سے کم نہ دکھائی پڑتے تھے۔

"مجھے اس کتیا سے کچھ پوچھنا ہے۔۔۔؟"

نوجوان نے سوالیہ نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ شخص اس کی بات سن کر انگشت بدنداں رہ گیا۔

وہ حیرت وتجسس سے اس نوجوان کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اسے نوجوان کی کہی بات کا وشواس نہ ہو پا رہا ہو۔

"شکل سے تو تو چنگا بھلا دکھتا ہے مگر اب پتہ چلا کہ تو پاگل ہے۔ کتیا سے کچھ پوچھنا ہے، یہ تیری موسی ہے کیا، پاگل کہیں کے کہ یہ تیری باتوں کے جواب دے گی۔۔۔" اس آدمی نے سیخ پا ہوتے ہوئے کہا۔ وہ خوش تھا کہ نوجوان کتیا کا کوئی بچہ خریدنے آیا ہے مگر سب اس کے الٹ ہو گیا تھا۔

"آپ خاطر فکر نہ کریں میں بالکل ٹھیک ہوں اور آپ کے سامنے سوال کروں گا تو وہ میرے سوال کا جواب دے گی۔۔۔" نوجوان نے اٹل لہجے میں کہا۔ اس کی بات سن کر ایک بار پھر اس شخص کا ماتھا ٹھنکا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ شخص اس نوجوان کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکالتا۔ کسی عورت کی آواز نے اس کی قوتِ سماعت پر دستک دی۔

"اسے آنے دو۔۔۔" آواز سنتے ساتھ ہی اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ خود نوجوان بھی حیرت کا بت بن کے رہ گیا۔ دونوں کی نگاہیں متواتر اس پنجرے پر ٹک گئیں۔ "آؤ نوجوان میں جانتی ہوں تم کیا پوچھنے

آئے ہو۔"

اب کی بار دونوں کی حیرت ہوئی جب انہوں نے کتیا کا منہ ہلتے دیکھا اور اس کے ہلتے منہ سے نکلنے والے الفاظ سنے۔

"جب تم سب جانتی ہی ہو تو پھر بتاؤ مجھے، میں تھک گیا، آخراب تم مجھے کہاں بھیجوگی۔۔۔؟" نوجوان نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جب کہ وہ شخص محوِ حیرت سے دونوں کو ٹکٹکی باندھے تکے جا رہا تھا۔ نوجوان پنجرے کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔

"اب تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ تمہارے سوال کا جواب میں خود ہی ہوں، کیا تم نے ابھی تک میری آواز نہیں پہچانی۔۔۔" اس کتیا نے غصے سے پیچ وتاب کھا کر کہا۔ تو نوجوان سوچوں کے بھنور میں گھر گیا۔ تبھی اسے یاد آیا کہ یہ آواز تو اس نے سنی ہے مگر کہاں یہ اس کو یاد نہیں آیا۔

"ہاں میں نے تمہاری آواز پہلے بھی سنی ہے مگر کہاں یہ بات یاد نہیں آ رہی۔۔۔" نوجوان نے سر میں کھجلی کرتے ہوئے کہا۔

"شنکر کسان کو جانتے ہو۔۔۔؟" اس کتیا نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔ دوسرے ہی لمحے جیسے نوجوان پر کوئی بہت بڑا بم آ گرا ہو۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ یہ آواز اس نے کہاں سنی تھی۔ یہ آواز تو شنکر کی پتنی کی تھی۔ نوجوان کی نگاہیں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کتیا پر تقریباً جم سی گئیں۔

"کاش اس دن تم نہ آتے۔۔۔" کتیا نے روہانسی آواز میں کہا مگر حیرت کا مجسمہ بنے نوجوان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

"شنکر بہت دیالو شریف اور دوسروں کا احساس کرنے والا انسان ہے مگر صد ہا افسوس کہ میں ہمیشہ اپنی زندگی میں ایک بری عورت ثابت ہوئی۔ شنکر نے مجھے سدھارنے کے لیے بہت پاپڑ بیلے مگر میں خود سدھرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ میں نے آج تک کسی مہمان تو درکنار کسی فقیر کو بھی کچھ نہ دیا تھا۔ شنکر مجھے بہت سمجھایا کرتا تھا کہ ایشور کی راہ میں دیا کرو۔ مگر مجال ہے میرے کانوں پر جوں تک رینگ جاتی۔

وہ بھی مجھے سمجھا سمجھا کر شاید تنگ آ گیا تھا۔ پڑوسیوں کے ساتھ میں بہت برے طریقے سے پیش آتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میرے گھر نہ کبھی کوئی برادری میں سے آتا تھا نہ آس پڑوس میں سے۔ لیکن ایک دن ایک پڑوسن میرے گھر آئی۔ اس کا پتی کسی فیکٹری میں ملازم تھا۔ ان کے ہاں ایک چاند سا بچہ بھی تھا۔ افسوس کہ ہماری شادی کو عرصہ ہو جانے کے باوجود ہم اولاد جیسی نعمت سے محروم تھے۔ اسی لیے اس بات سے بھی میں آشنا نہ تھی کہ اولاد کے لیے ماں کے دل میں کس حد تک محبت پنہاں ہوتی ہے۔

وہ عورت میرے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ اس کے بچے نے وہیں پڑا میرا شیشے کا ایک گلاس توڑ دیا۔ میں نے ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر رسید کیا۔ اور منہ میں جو آئی نکالتی چلی گئی جبکہ اس عورت کی آنکھوں سے آنسو کسی آبشار کی طرح بہتے رہے۔ میں نے اس عورت کو بھی خوب سنا ڈالیں۔ وہ چپ چاپ بچے کو اٹھا کے چلی گئی۔

اس کے دوسرے دن تم آ گئے۔ تمہارے ساتھ بھی میں نے بدتمیزی کرنے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ چھوڑا۔ میرا پتی بنا کچھ کھائے اٹھ کر کھیتوں میں کام کرنے لگ گیا اور میں نے اس کو دوبارہ کھانے کو کہنے کی زحمت تک گوارا نہ کی۔ حالانکہ میں نے اٹھتے وقت اس کی آنکھوں میں چمکتے آنسو کی چمک واضح طور پر دیکھ لی تھی۔ مگر مجھے اس کی رتی برابر چنتا نہ تھی۔

میں اس وقت گھر آئی تو یکبارگی مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں کتنی دیر سوئی اس بات کا مجھے کوئی پتہ نہ تھا۔ لیکن جب آنکھ کھلی تو میرے حواس باختہ ہو گئے کیونکہ میں چارپائی پر موجود نہ تھی۔ میری تو ہیئت ہی بدل چکی تھی۔ ایشور نے میری آتما کو نکال کے اس کتیا میں ڈال دیا تھا۔ یقین مانو شہری بابو مجھے موت نہیں

آئی تھی۔ بس میں تو چار پائی پہ سوئی تھی اور جب آنکھ کھلی تو خود کو ایک کتیا کے روپ میں پایا۔ میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

مگر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ میں یہاں بہت تکلیف میں ہوں۔ ایک تو میری زندگی اب ہمیشہ کے لیے اس پنجرے میں مقید ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ لوگ تو مجھ سے خوف کھاتے ہیں مگر حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے کبھی کسی کو ایذاء نہیں پہنچائی۔ میں اس پنجرے سے باہر نکلنا بھی نہیں چاہتی کیونکہ میں یہ گوارہ نہیں کرتی کہ کسی پر میرا راز افشاں ہوں۔

میں انسانی روپ میں تو ہمیشہ اولاد جیسی نعمت سے محروم رہی مگر یہاں ایک وقت میں ان گنت بچوں کی ماں بنتی ہوں۔ مگر انہیں دودھ تک پلانا نصیب نہیں ہوتا۔ میری ممتا تڑپتی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے میرے بچوں کو دوسروں کو بھاری دولت کے عوض میرا مالک فروخت کر دیتا ہے۔ مگر اس میں اس بے چارے کا کیا قصور ہے۔ یہ تو سارا کیا کرتا میرا ہے۔ مجھے تو یہ سزا اس ایشور کی طرف سے مل رہی ہے۔

میں دن رات اشرو بہاتی ہوں مگر شاید میری پرارتھنا سے قبولیت کا تاثر ختم کر دیا گیا ہے۔ شہری بابو میں نے کئی بار مرنے کی کوشش کی مگر نہیں مر سکی، میرے لیے یہ زندگی نہایت ہی ذلت آمیز ہے۔ مجھے ایک کتیا کا روپ مل گیا ہے۔ میں سب کچھ دیکھتی رہتی ہوں مگر کچھ نہیں کر پاتی۔ میں انسان ہو کر بھی ایک وقت میں کئی کئی اعلیٰ قسم کے کتوں کے سامنے لاچار ہو جاتی ہوں۔ ذہنی اور قلبی اذیتوں کے علاوہ جسمانی اذیتیں برداشت کر رہی ہوں مگر اف تک نہیں کرتی۔ کیونکہ مجھے میرے کیے کی سزا دنیا میں ہی مل رہی ہے۔ اب چلے جاؤ تم شہری بابو ایشور کے لیے چلے جاؤ۔"

اتنا کہہ کر کتیا جنگلے کے دروازے سے پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے گرتے اشکوں کو وہ بہت قریب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بیٹھی اپنی قسمت پہ اشک ریزی کر رہی تھی۔ اس کا مالک حیرت کا مجسمہ بنا وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے ابھی اٹیک ہو جائے گا اور سور گباش ہو جائے گا۔ خود اس نوجوان کی کیفیت اس سے کچھ کم نہ تھی۔ اس کے لیے قدم اٹھانا دشوار ہو گیا تھا۔ منوں وزنی قدم لگ رہے تھے۔ مگر وہ پھر بھی انہیں چار و ناچار اٹھا رہا تھا۔ اس نے اس شخص کو وہیں مبہوت کھڑے چھوڑا اور اس گھر سے باہر نکل آیا۔

باہر نکلا تو نگاہ آسمان کی طرف اٹھی۔ آسمان پر کالے بادل چھا چکے تھے۔ اور قبل اس کے کہ بادل برستے اس کی آنکھیں برس پڑیں۔

اے میرے مالک! مجھے معاف فرما دے۔ مجھے انسانی روپ میں ہی موت دینا۔ میں بہت گناہ گار ہوں تو میری خطاؤں کو پس پشت ڈالتے ہوئے بھی عطاؤں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ اے میرے مالک! تو یہ بھی جانتا ہے کہ میں کتنا گناہ گار ہوں۔۔۔ وہ دروازے کے پاس ایستادہ رو رہا تھا۔ بلک رہا تھا۔ سسک رہا تھا۔ آنکھوں سے اشرو جاری وساری تھے۔ جبکہ آسمان پر بادل گرج رہا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی اور پھر دوسرے سے موسلا دھار بارش شروع ہو چکی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ وہیں سجدے میں گر گیا۔ اس گھر کا چوکیدار اسے دیکھ رہا تھا۔ آنے جانے والے بھی اسے دیکھ رہے تھے۔ مگر آج اسے کسی کی کوئی چنتا نہ تھی۔ اسے تو بس اپنی چنتا کھائے جا رہی تھی کہ اگر اس کی کسی بھی خطا پر پکڑ ہو گئی تو کہیں اس کی بھی آتما۔۔۔

اس کے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکلی اور پھر وہ دھواں دھار رونے لگا۔ جب کہ اس کے ساتھ آج آسمان بھی دھواں دھار رو رہا تھا۔ شاید اسے بھی اس کی حالت پر رونا آ رہا تھا یا اس مضبوط سلاخوں والے پنجرے میں مقید کتیا پر۔
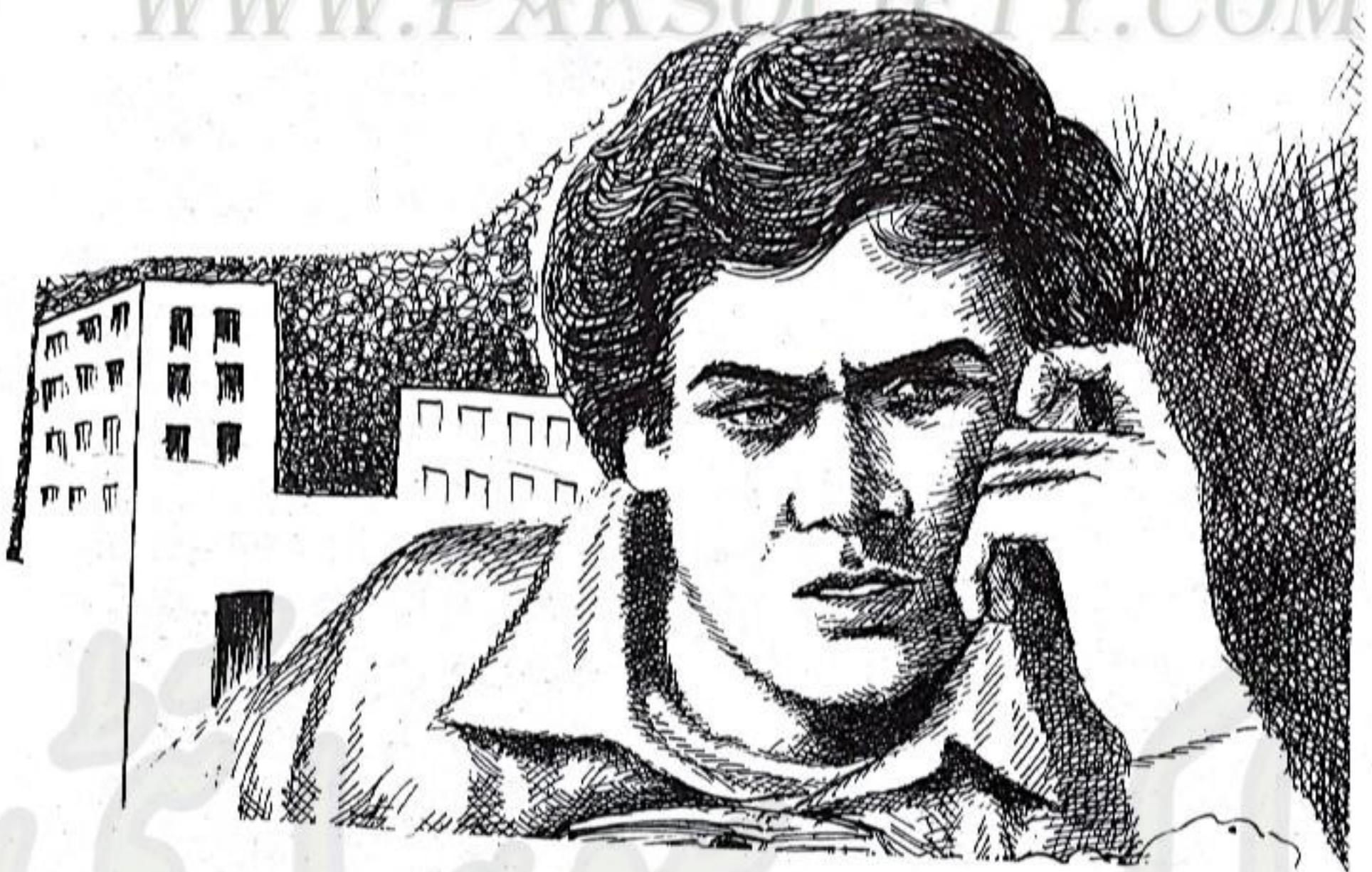
آسیب زدہ

مدثر بخاری۔شہر سلطان

اچانک کمرے میں شدید قسم کا زلزلہ آیا، وال کلاک نیچے گر کر چکنا چور ہوگئی، سنگھار میز کا شیشہ ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوگیا، جھازی الماری فرش بوس ہوگئی، مگر یہ کیا چند لمحے بعد ہی ہر چیز اپنی اپنی جگہ اصلی حالت میں……

طویل عرصہ سے خالی مکان اور غیر آباد علاقہ آسیب زدہ ہو جاتا ہے۔حقیقت کہانی میں ہے

اصفہان قریشی کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ ماتھے پر سے پسینہ کچھ زیادہ ہی بہہ رہا تھا، وہ کمبل سے باہر نکل کر کھڑکی کی جانب ٹھنڈی ہوا لینے کے لئے اٹھا مگر جیسے کسی مضبوط زنجیر میں اس کو جکڑ لیا گیا۔ حبس اور گرمی بڑھتی چلی جا رہی تھی اس کا سانس بحال رکھنا کافی مشکل ہوگیا تھا پھر پورا جسم پسینہ سے بھیگنے لگا۔

اس نے تمام تر ہمت جمع کی اگر وہ اٹھنے میں ناکام ہو جاتا تو یقینی موت واقع تھی۔

اچانک کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا جس نے گرمی کا تسلسل توڑ دیا۔

سخت گرم موسم میں سورج کی تمازت کو ختم کرنے کے لئے بادل آجاتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ابر رحمت برسنے لگی ہر طرف موسم برسات جیسا سہانا راج ہوگیا تو اصفہان نے سکون کا سانس لیا، اب

ہر چیز نارمل ہونے لگی تھی ایسے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

اصفہان کا خوف ابھی باقی تھا پچھلے دو ہفتے سے ہر رات کچھ عجیب طرز کا واقعہ رونما ہو جاتا تھا لیکن صرف تھوڑی دیر کے لئے ...... اس کے بعد حالات نارمل ہو جاتے تھے اور ایسے سارے واقعات صرف آدھی رات کے بعد ہی رونما ہوتے تھے۔

پچھلی رات اس کے کمرے میں شدید قسم کا زلزلہ آیا تھا۔ ہر چیز بکھر چکی تھی پنکھا ہلنے لگا تھا۔ وال کلاک زمین پر آ گری۔ سنگھار میز پر رکھے پرفیوم نیچے آن گرا تھا، سائیڈ میں دیوار سے لگی الماری دھڑام سے فرش نشین ہو گئی تھی اس شدید ترین زلزلے میں وہ خوف زدہ اور بدحواس ہو کر کمرے سے باہر آ گرا تھا۔ وہ نیند میں اول فول بک رہا تھا۔ اس کی دماغی کیفیت پر کافی برا اثر پڑا تھا۔ مگر پھر زلزلہ جیسے تھم گیا لیکن اس نے ساری رات باہر لان میں گزاری تھی۔

اگلی صبح اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ کمرے میں موجود ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر قائم تھی۔ مگر اس نے آنکھوں سے ہر چیز کو نیچے گرتے دیکھا تھا۔

وہ نیند سے بیدار ہوا تو ٹھنڈی گھاس نے اس کا استقبال کیا۔ وہ رات کو زلزلے کی وجہ سے باہر نکل آیا تھا اور لان میں ہی سو گیا تھا۔

لیکن پھر پتہ چلا کہ زلزلہ صرف اس کے کمرے تک محدود تھا۔ اگر زلزلہ آتا تو ہر کوئی محسوس کرتا۔ محلے میں کسی فرد واحد نے اس زلزلہ کی بات تک نہ کی۔

ماجرہ گھمبیر تھا۔

مگر پھر اسے دو رات پیچھے کا انوکھا واقعہ یاد آ گیا!

وہ رات کا آخری پہر تھا جب اسے شدید قسم کی سردی محسوس ہونے لگی تھی گو کہ واقعی سردی تھی مگر اتنی شدید ٹھنڈ کہ کمرہ میں موجود ہر چیز پر برف جمنی شروع ہو گئی۔ لیکن اس وقت شدید ترین سردی میں برف جمنے سے وہ ٹھٹھرتے ہوئے کانپ رہا تھا۔ سردی محسوس کرنے سے پہلے اسے جھٹکا لگا تھا جس سے اس کا بلڈ پریشر متاثر ہوا تھا اچانک جھٹکے نے اس کے دل کی دھڑکن کو مزید تیز کر دیا ایسے جیسے کہ دل سینے سے باہر نکل پڑے گا۔

سردی کا خوفناک راج پورے کمرے میں چھا رہا تھا۔ ہیٹر پر بھی برف جمنا حیران کن بات تھی۔ برف بڑھتی چلی جا رہی تھی اور اس کا جسم اس برف میں چھپتا چلا جا رہا تھا۔ مگر پھر منظر بدلا۔ ہر چیز نارمل ہونے لگی۔ برف سرے سے غائب تھی۔ جیسے برف تھی ہی نہیں......!

اس کا دماغ گھوم کر رہ گیا تھا۔ کیونکہ اس قسم کے واقعات خطرناک تھے۔ نجانے کون ایسا کر رہا تھا اور کیوں ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا؟

اسی طرح کی ایک اور خونی رات نے اسے پاگل کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ رات کا آخری پہر رہا ہو گا جب اچانک اسے شدید پیاس محسوس ہوئی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا فریج کچن میں تھا گو کہ اتنی سردی میں پیاس بہت کم محسوس ہوتی ہے۔ مگر انسانی فطرت کہ پیاس کا لگنا قدرتی ہے۔ وہ کچن کی جانب بھاگا۔ شدید ٹھنڈ نہ تھی البتہ محسوس ہوتا تھا جیسے فضا میں خنکی موجود ہے۔

کچن میں پہنچ کر اس نے فریج کھولا فریج کی مدھم لائٹ میں تمام چیزیں واضح ہو گئیں۔ واٹر سائیڈ میں پانی کی چار سے پانچ بوتلیں رکھی ہوئی تھیں اس نے ایک بوتل کو اٹھا کر فریج بند کیا مگر پھر لگا جیسے پانی میں خون شامل ہو گیا ہے یہ کیسے ممکن تھا کہ پانی سرخ رنگ کے خون میں بدل گیا تھا۔ وہ گاڑھا سرخ خون تھا یکا یک اس کے ہاتھ سے بوتل چھوٹ گئی اور بوتل کا ڈھکن کھل گیا، اور فرش سرخ خون سے سرخ ہو گیا تھا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے فرش کو دیکھے جا رہا تھا دماغ سائیں سائیں اور جسم پر پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ پیاس بڑھتی چلی جا رہی تھی جیسے وہ پیاس سے مر جائے گا۔

مگر پھر پیاس کا اثر ختم ہونے لگا اس کی ابتر حالت خاصی بہتر ہونے لگی۔

وہ خوف زدہ کچن سے باہر نکل آیا۔ آہستہ آہستہ سب بہتر ہو رہا تھا پیاس باقی نہ تھی جیسے سب کچھ ٹھیک تھا اگلی صبح فرش پر سرخ رنگ کا سیال نظر نہ آیا۔ اس نے حیرت سے فریج میں رکھی پانی کی تمام بوتلوں کو چیک

کیا مگر بوتلوں میں پانی موجود تھا سرخ رنگ کا کہیں وجود نہ تھا۔

اور پھر اس نے ایک عجیب منصوبہ بنایا، اس کا منصوبہ گھر سے باہر کسی ریسٹورنٹ میں رہنے کا تھا۔

اس نے اس آسیبی گھر سے کچھ دنوں تک چھٹکارہ پانے کا ایک ہی حل نکالا تھا کہ ریسٹورنٹ میں کچھ دنوں کے لئے رات گزاری جائے۔

کمرہ نمبر 272 میں کرکٹ میچ LCD پر دیکھا جارہا تھا اصفہان نے یہ کمرہ چند دنوں کے لئے کرائے پر لیا تھا۔ چند ایک سوٹ اپنے پاس رکھ لئے تھے۔ دن کو اس گھر میں جانا خطرناک نہ تھا مگر رات کو وہاں ٹھہرنا موت کو دعوت دینا تھا۔

گویا رات ریسٹورنٹ میں اور دن بھر آفس! مگر جونہی آخری اوور شروع ہوا لائٹ چلی گئی۔ اندھیرا چھا گیا میچ خاصا دلچسپ ہوگیا تھا۔ مگر اف لائٹ!

کمبخت نے ابھی جانا تھا! وہ غصے سے جھلا اٹھا۔ کرکٹ کا دیوانہ اصفہان قریشی دن بھر کی تھکن کے باوجود میچ دیکھنا چاہتا تھا مگر دلچسپ صورتحال کے دوران لائٹ کا چلے جانا غصہ دلاتا تھا!

اس نے ایف ایم آن کیا مگر وہاں سگنل نہ ہونے کے برابر۔

''شٹ! ایف ایم پر بھی کوئی سگنل نہیں!'' وہ جھلا اٹھا...... اس نے دوسرے ریڈیو اسٹیشن چیک کئے۔ قریب سب ہی بند تھے۔

اس نے دروازے کی دراز سے نیچے دیکھا وہاں روشنی تھی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے ہینڈل گھمایا باہر لائٹ موجود تھی راہداری کا بلب روشن تھا ساتھ والے روم سے میچ کی کنٹری سنائی دے رہی تھی۔

اس نے دروازہ کھٹکھٹایا روم 273 سے ایک بوڑھا باہر نکلا۔

''جناب میرے روم کی لائٹ نہیں۔ میچ کا کیا بنا؟''

''ہم جیت گئے بیٹا! انتظامیہ کو فون کرو کے لائٹ ٹھیک کرے۔''

''اوکے انکل! ویسے لائٹ بند ہوئی تھی؟''

''نہیں! آج لائٹ نہ جانے کا اعلان ہوا تھا!'' اور ویسے بھی یہاں ہیوی جنریٹر ہے، لمحہ بھر میں لائٹ آجاتی ہے۔

مطلب کہ اس کے روم کا لائٹ کنکشن منقطع ہوا تھا گزشتہ واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے وہم گزرا کے یہ ساری منحوسیت صرف اس گھر تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ خوفناک بلا جو ہر رات مختلف روپ میں آدھمکتی تھی اس ہوٹل میں بھی آدھمکی ہے۔

وہ دوبارہ اپنے روم میں آیا۔ اب لائٹ آچکی تھی۔ وہ پرامید تھا کہ کم از کم اس ہوٹل میں کچھ الٹا سیدھا نہ ہوگا۔ مگر وہ رات سب سے مہنگی پڑی۔

رات کا ایک کا عمل رہا ہوگا جب اس کا سانس پھولا ہوا تھا دل کی دھڑکن خاصی تیز تھی جیسے سینہ چیر کر باہر آجائے گا۔ اس کا جسم پسینہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ گڑبڑ ضرور تھی۔ سامنے ٹیڈی بیئر رکھا ہوا تھا ٹیڈی بیئر کی آنکھیں سرخ ہوکر چمک رہی تھیں۔

''ڈرومت! مگر تم جہاں بھی جاؤ گے میں تمہارے ساتھ ہوں!'' اسے آواز سنائی دی اس ٹیڈی بیئر کا منہ کھلا تھا آواز ٹیڈی بیئر سے آئی تھی۔

اسے وہم تھا یا واقعی کچھ ایسا ہوا تھا؟

اور پھر ڈوربیل بجتی سنائی دی۔ اس کا دل دھڑک گیا ہوٹل کا عملہ ہی اندر آسکتا تھا مگر کیا وجہ جو اتنی رات کو کوئی ادھر آٹپکا۔

ڈوربیل کچھ دیر بعد دوبارہ سنائی دی۔

وہ ڈرتا ہوا دروازے کے کی ہول کی طرف بڑھا باہر کوئی موجود نہ تھا۔ وہ مکمل چھان بین کے بعد بستر کی طرف بڑھا مگر بیل دوبارہ بجی تو وہ بھاگ کر ہول سے دیکھنے لگا مگر باہر کوئی موجود نہ تھا۔

''کیا مصیبت ہے! کس چکر میں پڑ گیا ہوں کون ہے جو تنگ کررہا ہے؟''

پھر وہ بیڈ پر بیٹھ گیا...... لیکن اگلے ہی لمحے وہ

تڑپ اٹھا بیڈ تانبے کی مانند گرم ہو رہا تھا اس کا جسم لرزنے لگا پھر آہستہ آہستہ پورا کمرہ گرم ہونے لگا پورا کمرہ گرم ہو رہا تھا درجہ حرارت بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا ہینڈل بھی شدید گرم ہو رہا تھا دوسرے لمحے وہ باہر تھا۔

اس نے راہداری کی طرف دوڑ لگا دی۔ سیڑھیوں سے وہ ہانپتا کانپتا کاؤنٹر تک جا پہنچا۔

نائٹ ڈیوٹی پر اسٹاف موجود تھا۔ وہ سب اچانک اس افتاد پر بوکھلا گئے۔

''بھوت، بھوت!'' وہ چلانے لگا۔ اسٹاف نے اسے زبردستی پکڑا۔

''سر! ہوش میں آئیں! کہاں ہے بھوت! کیسا ہے بھوت!'' سب ہی بوکھلا گئے تھے۔

''روم 272 میں...... تم لوگ میرے ساتھ چلو وہاں شدید گرمی ہے۔'' وہ بولتا چلا گیا۔

وہاں موجود لوگ ہڑبڑا گئے۔

''جناب ہمارے ریسٹورنٹ کا خیال کریں لوگ اپنے اپنے کمرے میں آرام کررہے ہیں اور یہاں کوئی بھوت پریت نہیں......!'' منیجر بولا۔

لیکن وہ اسٹاف کے لوگوں کو اپنے کمرے میں لے آیا مگر یہاں تو سب کچھ ٹھیک تھا۔ نہ گرمی اور نہ خوف کا احساس!

اسٹاف نے سوالیہ نظروں سے اسے گھورا!

''یہاں گرمی ہے نہ سردی! ایک دم فنٹاسٹک موسم ہے اسر! آپ نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہوگا۔ سو جایئے!'' منیجر بولا۔

وہ حیرت ناک نظروں سے انہیں جاتا دیکھتا رہا۔

''یہ کیسے ممکن تھا سب کچھ اس کی حقیقی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا اسٹاف کے لوگ گئے مگر باہر سے دروازہ بند کر گئے۔

☆......☆......☆

اگلی صبح ریسٹورنٹ انتظامیہ نے اسے ریسٹورنٹ چھوڑنے کا نوٹس جاری کر دیا، دھوبی کا کتا نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ وہ دوبارہ گھر لوٹ آیا......! تنہا آدمی اور اتنی خوف ناک اور دلخراش واقعات!

اگلی رات زیادہ خوف ناک ثابت ہوئی۔ وہ آفس سے واپس آیا فریش ہونے کے بعد ڈور بیل بجی وہ دروازہ کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولا تو سامنے ایک خوبصورت لڑکی پریشان صورت لئے کھڑی تھی۔

''جی فرمائیں؟'' اس نے دروازہ کھولتے ہی کہا مگر سامنے ایک نوجوان لڑکی کو دیکھ کر وہ نرم پڑ گیا۔ اس کے ذہن میں عورت سے ہمدردی موجود تھی لڑکی کی آنکھوں میں پراسرار کشش تھی۔

''جی آپ کون؟ اور اتنی رات کو یہاں کیسے؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا نام نگہت ہے۔ گاؤں سے یہاں اپنے ماموں کے گھر آئی ہوں! مگر ماموں کا گھر مل نہیں رہا۔

''چلیے ڈھونڈتے ہیں آپ کے ماموں کا گھر۔''

''میں ہر جگہ تلاش کر چکی مگر ان کا کچھ پتہ نہیں۔'' وہ بولی۔

''تو اس حالت میں تلاش کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے۔''

''مجھے آج کی رات آپ کے پاس......!''

اسے یہ غیر اخلاقی لگا۔ ایک جوان مرد اور لڑکی بھلا کس رو سے ایک چھت تلے رات گزار سکتے تھے۔

''دیکھئے میڈم! میں اکیلا رہتا ہوں! آپ کو میں ریسٹورنٹ چھوڑ آتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''مجھے آپ پر اعتماد ہے صرف ایک رات ہی کی تو بات ہے صبح ہوتے ہی میں اپنے گاؤں چلی جاؤں گی۔''

چارو ناچار! ہمدردی نے فتح کے جھنڈے گاڑ دیئے اور وہ لڑکی اصفہان کے دوسرے کمرے میں ایک رات کے لئے آباد ہوگئی۔

اس رات خوف نے ڈیرے جمائے رکھے۔

رات بارہ بجے کے بعد اچانک اس کے روم کا دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''دروازہ کھولو! دروازہ کھولو!'' باہر کوئی نسوانی آواز تھی۔ وہ دروازہ کھولنے کے لئے اٹھا دروازہ کھولتے ہی اس کا وجود لرز کر رہ گیا۔

''نگہت تھی سیاہ لمبے بال سرخ لمبی زبان سیاہ چہرہ......!'' وہ گرا اور بے ہوش ہوگیا۔

☆......☆......☆

اگلی صبح سورج کی تیز روشنی نے اسے جگایا تو اس کو بدروح نما نگہت کا خیال آیا۔

وہ جلدی سے اٹھا ہر کمرہ چھان مارا مگر رات والی چڑیل نظر نہ آئی۔

آج آفس کی چھٹی تھی صبح تقریباً گیارہ بجے اس سے ملنے کے لئے اس کا ایک دوست آیا اور ساری روداد سنانے کے بعد اس نے آئیڈیا دیا کہ ''کسی ماہر عامل سے رابطہ کرکے اس سارے معاملے کو حل کیا جائے۔''

چند لمحے بعد ہی وہ ایک عامل کا نمبر ڈائل کر رہا تھا مگر دوسری طرف سے پیغام ملا کہ شاہ صاحب کے گھر حاضر خدمت ہوں۔'' پیغام ملتے ہی وہ بائیک نکال کر روڈ پر آگیا اس کا رخ شاہ صاحب کی رہائش گاہ کی طرف تھا۔

وہ مناسب رفتار سے بائیک چلا رہا تھا روڈ پر گاڑیاں زیادہ نہ تھیں، ایک موڑ پر اس نے ٹرن لیا مگر سامنے کا منظر بدلا ہوا تھا وہ صحرا نما علاقہ تھا ریت ہی ریت ،لیکن یہ کیسے ممکن تھا؟ شہر کا وہ علاقہ بھلا صحرا میں کیسے تبدیل ہوگیا؟ وہ بریک لگانا چاہتا تھا مگر بریک نام کی کوئی چیز کام نہ کر رہی تھی۔

اسپیڈ ہلکی کرنے کی کوشش نے اسپیڈ مزید بڑھادی۔ صحرا کا سفر شروع ہوچکا تھا بائیک گرم ریت پر بڑی تیزی سے دوڑ رہی تھی۔

اچانک ایک جھٹکا لگا اور بائیک رک گئی۔ بائیک چھوڑ کر وہ صحرا کے گرم ریت پر چلنے لگا تا حد نگاہ ہر طرف صحرا کی ریت......

وہ شہر سے اس صحرا میں کیسے پہنچا تھا!'' یہ سوچ کر اس کا سر پھٹا جا رہا تھا، سورج کی تمازت بڑھتی

صنف نازک کی فریاد

ہم لڑکیاں اپنے گھر کا آنگن ہوتی ہیں، دنیا کی تلخ ہواؤں اور طوفانوں سے بے خبر ہم اپنی آنکھوں میں بہت سے خوبصورت خواب سجا لیتی ہیں۔ بنا یہ سوچے کہ خوابوں کے ٹوٹنے کی کرچیاں جب آنکھوں کو زخم دیں گی ان پر مرہم رکھنے والا بھی کوئی نہ ہوگا، ہم لڑکیاں اپنی محبت کو دل میں چھپائے، بغیر کسی سے کچھ کہے اپنے گھر سے رخصت ہوجاتی ہیں، لیکن اپنے جذبات کو زبان پر لانے سے صرف اس لئے ڈرتی ہیں کہ کہیں اس سے ہمارے والدین کی عزت رسوا نہ ہو، ہم لڑکیاں اپنے گھر اور گھر والوں کے لئے دعائیں مانگتی ہیں لیکن کبھی اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں مانگتیں، ہم یہ سوچتی ہیں کہ ہماری ذات کی خوشیاں اور تکمیل ہمارے گھر والوں کے دم سے ہیں۔ ہمارے آنسو، احساسات، جذبات اور تمنائیں کبھی ظاہر نہیں ہوتیں، ہم بہت کچھ کہنا چاہتے بھی کہہ نہیں پاتیں، ہمارے جذبات، تمنائیں ہماری مجبوریوں تلے دب کر دم توڑ دیتی ہیں اور ہم لڑکیاں ہمیشہ سے اپنی خوشیوں سے زیادہ اپنی اور اپنے والدین کی عزت کا بھرم رکھتی ہیں، بس ایسی ہی ہوتی ہیں ہم لڑکیاں۔

(انتخاب: شرف الدین جیلانی۔ٹنڈوالہ یار)

جارہی تھی اور گرمی کا اثر بھی بڑھتا جارہا تھا، ریت گرم ہورہی تھی اور پیاس بھی عروج پر تھی وہ دوڑنے لگا ،اونچے اونچے ٹیلوں نے اسے بے حال کردیا پیاس بڑھتی چلی جارہی تھی۔ حلق خشک ہوتا جارہا تھا تبھی اسے دور سے ایک چشمہ نظر آیا وہ سراب تھا یا حقیقی نخلستان۔ وہ امید بہاراں کے مصداق اس طرف دوڑنے لگا۔

بہت نزدیک جاکر اسے نخلستان نظر آگیا وہاں واقعی ٹھنڈے پانی کا چشمہ تھا اس نے خوب سیر ہوکر پانی پیا اور پھر اچانک اسے اللہ یاد آیا۔

وہ صدق دل سے اللہ کو یاد کرنے لگا۔ اور اللہ نے اس کی مدد کی۔

پانی پی کر وہ فریش ہوگیا تھا اسے وہ جگہ بہت پسند آئی، شہر کے ہنگاموں سے دور پرسکون جگہ کہ اتنے میں اسے ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی مگر جب اس نے غور کیا تو وہ کسی بہت بڑے پرندے کی آواز تھی وہ بڑی چونچ والا عجیب سا پرندہ تھا اس کا رخ سیدھا اسی کی طرف تھا اس کے پر اور مضبوط پنجوں نے اس کو گردن سے پکڑلیا اور وہ پرندہ پرواز کرنے لگا پھر جیسے صحرا ختم ہونے لگا وہ ایک پہاڑی سلسلے کی طرف آچکا تھا۔

وہاں ایک جھونپڑی تھی دامن کوہ میں خاصی چہل پہل تھی وہاں ایک جھیل موجود تھی پرندے نے اسے جھونپڑی کے سامنے چھوڑا اور دوسری جانب اڑ گیا۔

وہ حیران زدہ جھونپڑی کے سامنے کھڑا تھا کہ اسے خیال آیا کہ اس جھونپڑی کے اندر چیک کیا جائے۔ اندر کوئی ذی روح موجود نہ تھی مگر انسانی استعمالات کی اشیاء موجود تھیں شام کا دھندلکا پھیلنے والا تھا کہ اس وقت جھونپڑی میں ایک باریش بزرگ کی آمد ہوئی۔ بزرگ نے اس پر شفقت بھری نظر ڈالی اور بولے۔ ’’تم اصفہان قریشی ہو شکر کرو کہ شر کی قوتیں تباہ ہوگئیں ورنہ وہ آج تمہیں زندہ نہ چھوڑتیں۔‘‘

’’بابا جی! یہ شر کی قوتیں کون ہیں اور کیوں میرا جینا حرام کردیا ہے آخر میرا قصور کیا ہے؟ اور ان کا مقصد کیا ہے، یہ کیوں میرے پیچھے پڑگئی ہیں؟‘‘ اصفہان نے پوچھا۔

’’کبھی کبھی بے قصور آدمی بھی عتاب کی زد تلے آجاتا ہے۔ تم نے آسیبی گھر میں موجود مخلوق کو تنگ کیا۔ تمہیں محسوس تک نہ ہوا، جس گھر میں تم رہتے ہو وہ آسیب زدہ ہے، سالوں سے وہاں کوئی نہ گیا تبھی وہاں نظر نہ آنے والی مخلوق نے ڈیرہ جمالیا۔ وہ گھر ایک طویل عرصہ سے خالی پڑا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی مکان ایک طویل عرصہ تک خالی پڑا رہتا ہے تو اس میں نادیدہ مخلوق اپنا بسیرا کرلیتی ہیں، اس لئے کہا گیا ہے کہ ایسے کسی مکان کو طویل عرصہ تک خالی نہ چھوڑا جائے بلکہ اس کی کوئی نہ کوئی دیکھ بھال کرتا رہے اور مغرب کے وقت خالی مکان میں چراغ ضرور جلانا چاہئے۔ ایسی صورت میں نادیدہ قوتیں اس جگہ سے دور رہتی ہیں۔ یہ تو شکر ہے کہ انہوں نے تمہیں جان سے نہیں مارا۔‘‘ بزرگ نے کہا۔

’’بابا جی! مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں؟‘‘

’’اس آسیب زدہ گھر کو فوراً چھوڑ دو! اور پاک صاف رہو!‘‘ بزرگ نے کہا۔

’’ٹھیک ہے بابا جی! لیکن میں جہاں جاتا ہوں وہ میرے ساتھ آدھمکتی ہیں۔‘‘

’’اب ایسا نہ ہوگا ایک خاص عمل کے تحت یہ مخلوق تمہارا پیچھا چھوڑ دیں گی۔ وہ عمل میں کردوں گا، تم فکر نہ کرو، اللہ کو ہر وقت یاد رکھا کرو اور پابندی سے نماز پڑھا کرو۔‘‘ یہ بول کر بزرگ خاموش ہوگئے۔

’’آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ نماز کی پابندی ضرور کروں گا۔‘‘ اصفہان بولا۔

اور پھر منظر بدلا تو وہ اپنے گھر میں اپنے بستر پر موجود تھا پھر وہ چونک گیا، اور جلد از جلد اس نے اپنا سامان سمیٹا اور اس گھر کو چھوڑ دیا۔ وہ اپنے آپ میں بہت زیادہ قلبی سکون محسوس کررہا تھا۔

موت کا سامنا

ضرغام محمود۔کراچی

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا اور ویران قرب و جوار قدم قدم پر جان لیوا موت کا کھٹکا ایسی صورت اور تن تنہا ناتجربہ کار، زمانے کے اونچ نیچ سے مبرا نوجوان اور پھر واقعی موت اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تو......

جب حقیقت میں موت سامنے کھڑی ہو تو کیسا محسوس ہوگا۔لہٰذا یہ حقیقی کہانی پڑھنا نہ بھولئے گا

بجلی کی کڑک دل دہلا دینے والی تھی، بادل اس طرح گرج رہے تھے گویا جنگل میں شیر دھاڑ رہا ہو۔موسلا دھار بارش ہر چیز کو بہا لے جانے کو تیار تھی چاروں طرف مہیب سناٹا گلیاں، سڑکیں سنسان و ویران تھیں، اندھیری رات میں کبھی کبھی بجلی کی کڑک سے منظر روشن ہو جاتا تھا، ایسے میں وہ شخص ایک مکان کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اس نے لمبا سا کالا رین کوٹ پہنا ہوا تھا اس کے سر پر فلیٹ ہیٹ تھا جس نے اس کا آدھا چہرہ چھپایا ہوا تھا اس نے اپنے ہاتھ میں ٹارچ پکڑی ہوئی تھی ٹارچ کی روشنی میں اس نے اس کمرے کا جائزہ لیا جس میں وہ دروازہ کھول کر داخل ہوا تھا وہ کمرہ شاید ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا ٹارچ کی روشنی صوفے سے ہوتی ہوئی سیاہ آبنوسی میز پر رکی، پھر ایک لمحے بعد اس شخص نے ٹارچ کا رخ دیوار کی جانب کیا،

دیوار پر ایک پینٹنگ لگی ہوئی تھی، پینٹنگ ایک عورت کی تھی جس نے لمبا سا چغہ پہن رکھا تھا اس کے سر پر ایک زندہ سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا اس سانپ کی دوشاخہ زبان اندر باہر کو ہورہی تھی اور وہ اپنی گول گول آنکھوں میں زمانے بھر کی خونخواری سمیٹے سامنے دیکھ رہا تھا۔

عورت نے ہاتھ میں ایک عجیب سا ڈنڈا پکڑا ہوا تھا جس کے سرے پر بھی ایک سانپ پھن پھلائے بیٹھا تھا۔

عورت کے سامنے ایک تالاب تھا جس میں ایک آدمی ڈوب رہا تھا اور اس آدمی کی آنکھوں میں موت کا خوف واضح تھا، عورت کی نظریں اس آ دمی پر جمی ہوئی تھیں۔

پھر اس شخص نے ٹارچ کی روشنی دوسری دیوار پر ماری، دوسری دیوار پر بھی ایک پینٹنگ لگی ہوئی تھی ایک انسانی کھوپڑی کی پینٹنگ جو سیاہ پینسل سے بنائی گئی تھی اور اس کھوپڑی کے ماتھے سے سرخ رنگ کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اس شخص نے ٹارچ کی روشنی آگے بڑھائی، آگے ایک مرد اور عورت کی تصویر تھی، شاید ان کی شادی کی تصویر تھی کیونکہ آدمی اور عورت دولہا دلہن کے مخصوص لباس میں تھے، ٹارچ والے آدمی کے ہونٹوں پر اس تصویر کو دیکھ کر مسکراہٹ دوڑ گئی اس شخص کی مسکراہٹ بھی بہت بھیانک تھی اس کے پیلے پیلے دانت عجیب کراہیت کا منظر پیش کررہے تھے، اس شخص نے ٹارچ کی روشنی کی مدد سے آگے کی جانب پیش قدمی کی۔

آگے ایک اور کمرہ تھا اس نے اس کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا، کمرے میں زیرو پاور کا نائٹ بلب جل رہا تھا اس شخص نے اپنی ٹارچ بند کی، کمرے کے جہازی سائز کے بیڈ پر ایک مرد اور عورت سو رہے تھے مرد اور عورت وہی تھے جن کی تصویر ڈرائنگ روم کی دیوار پر لگی ہوئی تھی۔

ٹارچ والے آدمی نے ٹارچ اپنے رین کوٹ کی جیب میں رکھی اور دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا جب ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک لمبا سا خنجر تھا وہ شخص آہستہ آہستہ بیڈ کی جانب بڑھا جہاں تصویر والا مرد اور عورت سو رہے تھے۔ اس شخص نے اپنا خنجر والا ہاتھ بلند کیا اور ایک جھٹکے سے خنجر مرد کے سینے میں اتار دیا مرد کے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور اس کے سینے سے خون کا فوارا بلند ہوگیا، قاتل نے خنجر اس کے سینے سے نکال کر اس کے پیٹ میں گھسیڑ دیا۔

مرد کی چیخ سن کر عورت کی آنکھ کھل گئی اس نے ملگجی روشنی میں جو یہ بھیانک منظر دیکھا تو چیختے ہوئے بیڈ سے اٹھ کر بھاگی مگر قاتل نے اس کی ٹانگ پکڑ کر جھٹکا دیا تو وہ بیڈ سے نیچے کمرے کے فرش پر گر گئی مگر پھر پھرتی سے اٹھی اور کمرے کے دروازے کی جانب بھاگی، قاتل نے خنجر مرد کے پیٹ سے نکالا اور عورت کے پیچھے بھاگا، مرد بیڈ پر بری طرح تڑپ رہا تھا اس کے خون سے بیڈ اور کمرے کا فرش سرخ ہورہا تھا۔

قاتل عورت کے پیچھے بھاگا عورت کمرے کے کھلے دروازے سے باہر بھاگی مگر قاتل نے ڈرائنگ روم میں اسے گھیر لیا عورت نے ڈرائنگ روم میں رکھی چیزیں اس قاتل پر پھینکنی شروع کردیں، مگر قاتل نہایت چالاکی سے اس کے ہر وار سے بچتا رہا، عورت پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگی تو قاتل نے آگے بڑھ کر عورت کی گردن پکڑ لی اور ایک قہقہہ لگایا اس کا قہقہہ نہایت مکروہ تھا عورت اس کے ہاتھوں میں بن پانی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔

اچانک اس عورت نے اپنی دائیں ٹانگ کا گھٹنا قاتل کی دونوں ٹانگوں کے درمیان میں مارا، قاتل کے منہ سے ایک تکلیف دہ آواز نکلی اور اس کی گرفت نرم پڑ گئی، عورت فوراً اس قاتل کی گرفت سے نکل کر بھاگی مگر قاتل نے جھکتے ہوئے اس عورت کی ٹانگ پکڑ لی وہ عورت دھڑام سے فرش پر گر پڑی قاتل اس عورت کے اوپر چڑھ گیا اور خنجر والا ہاتھ اوپر کیا تاکہ خنجر اس عورت کے پیٹ میں اتار سکے۔

اسی وقت اس عورت کی نظر دروازے پر پڑی جہاں ایک پندرہ سولہ سال کی لڑکی کھڑی تھی جو اس

عورت کی بیٹی تھی، عورت نے قاتل کا خنجر والا ہاتھ کلائی کے پاس سے پکڑا اور زور سے چیخی۔ ''گو بے بی...... گو'' دروازے میں کھڑی لڑکی گم سم کھڑی تھی۔ عورت قاتل سے جدوجہد کرتے ہوئے پھر چیخی۔ ''گو...... بے بی...... گو گو......'' دروازے میں کھڑی لڑکی فوراً دروازے سے باہر کی جانب بھاگی۔

اسی وقت قاتل نے اپنا خنجر والا ہاتھ چھڑایا اور ایک جھٹکے سے خنجر عورت کے پیٹ میں اتار دیا۔ عورت کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور اس کے پیٹ سے خون ابل پڑا اور وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی قاتل نے اس عورت کو چھوڑا اور اٹھ کھڑا ہوا، اپنے سر پر ہیٹ جمایا اور خون آلود خنجر لے کر لڑکی کے تعاقب میں چل دیا۔

لڑکی گھر سے باہر کی جانب بھاگی تھی لہٰذا قاتل بھی گھر سے باہر آ گیا، باہر تیز بارش ہو رہی تھی گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا، مگر بجلی کی کڑک کبھی کبھی منظر کو بالکل واضح کر رہی تھی قاتل کے کپڑوں اور خنجر سے خون ٹپک ٹپک کر بارش کے پانی میں مل رہا تھا قاتل نے گھر سے باہر آ کر سڑک کے دونوں جانب دیکھا، سڑک مکمل سنسان تھی، اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ لڑکی کس جانب بھاگی ہو گی، اچانک اس کی نظر سڑک کے کنارے دلدلی زمین پر پڑی جہاں پیروں کے تازہ نشان تھے قاتل کے چہرے پر ایک بھیانک مسکراہٹ آئی اور وہ ان قدموں کے نشان کے سہارے آگے بڑھا وہ چوکنے انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ خنجر اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا بارش کے پانی نے اس کے کپڑوں اور خنجر پر سے خون دھو دیا تھا۔

قاتل سڑک کے اطراف جھاڑیوں کو بغور دیکھ رہا تھا اسے ایک طرف کی جھاڑیوں پر تھوڑا سا شک گزرا تو وہ اس جھاڑی کے قریب گیا اور جھک کر دیکھنے لگا، اچانک کوئی چیز اس کے سر سے بڑی زور سے ٹکرائی اور وہ منہ کے بل گر پڑا، خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اس نے گرتے ہی پلٹ کر دیکھا لڑکی اپنے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا لئے کھڑی تھی اس نے اس ڈنڈے سے قاتل

شکر

شکر ادا کرنا بھی ایک بیماری ہوتی ہے، ایسی بیماری جو ہمارے دلوں کو روز بروز کشادگی سے تنگی کی طرف لے جاتی ہے۔ جو ہماری زبان پر شکوہ کے علاوہ اور کچھ آنے ہی نہیں دیتی۔ ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنے کی عادت نہ ہو تو ہمیں انسانوں کا شکریہ ادا کرنے کی بھی عادت نہیں پڑتی...... اگر ہمیں خالق کے احسانوں کو یاد رکھنے کی عادت نہ ہو تو ہم کسی مخلوق کا احسان بھی یاد رکھنے کی عادت نہیں سیکھ سکتے۔

(عمیرہ احمد کی ''پیر کامل'' سے اقتباس)

(انتخاب: ذکا اللہ۔ کراچی)

کے سر پر زور سے ضرب لگائی، جس کی وجہ سے قاتل کا سر پھٹ گیا اور اس کا منہ اس کے اپنے ہی خون سے تر ہو گیا، لڑکی ڈنڈا مار کر بھاگنا چاہتی تھی کہ اس قاتل نے اپنی ٹانگ لڑکی کی ٹانگوں میں پھنسائی اور لڑکی دھڑام سے نیچے گر پڑی قاتل نے جلدی سے اس لڑکی کو دبوچ لیا اور اپنے مضبوط ہاتھوں سے لڑکی کا گلا دبانے لگا، لڑکی کی آنکھیں ابلنے لگیں، ایسا لگتا تھا کہ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر آ جائیں گی اس کی سانس رکنے لگی اور وہ بچاؤ کے لئے ہاتھ پیر مارنے لگی کہ...... کہ اچانک کھٹکے کی واز ہوئی اور کمرہ دودھیا روشنی میں نہا گیا۔

''ہفتے میں چھ دن دفتر میں رہتے اور چھٹی کے دن ہارر مووی دیکھتے گزارتے ہو......'' امی جان نے پہلے کمرے کا بلب جلایا پھر ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کر دیا۔

''امی جان بڑی اچھی مووی تھی......'' میں نے بستر پر لیٹے لیٹے کہا۔

”فوراً اٹھ جاؤ...... اور فریش ہو کر آؤ......
تمہارے ابا تمہیں یاد کر رہے ہیں۔“ امی جان بولیں۔
”ارے باپ رے...... آج ہٹلر کو میری یاد کیسے آ گئی۔“ میں بوکھلا گیا۔
”شرم نہیں آتی اپنے ابا کو ایسے کہتے ہوئے۔“ امی جان بولیں۔
”ہٹلر کو ہٹلر نہیں کہیں گے تو پھر کیا کہیں گے۔“ میں نے معصومیت سے کہا۔
”اس سے پہلے کے ہٹلر تمہیں گیس چیمبر کی سزا سنا دیں۔ تم فوراً ان کے حضور پیش ہو جاؤ......“ امی جان نے کہا تو میں نے جلدی سے بستر چھوڑا اور باتھ روم کی جانب بھاگا۔
”آج خیر نہیں ہے سجاد علی صدیقی۔“ میں بڑبڑاتے ہوئے باتھ روم میں داخل ہوا۔
میں سجاد علی صدیقی ٹیلی کمیونی کیشن انجینئر اور اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں مگر اس کے باوجود والد صاحب نے نہایت سختی سے میری تربیت کی ان کا مقولہ تھا اولاد کو کھلاؤ سونے کا نوالہ مگر دیکھو شیر کی نظر سے، لہٰذا میں جلدی سے فریش ہو کر ڈرائنگ روم میں جا پہنچا، جہاں ابا جان بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے اور امی جان اپنے کالج کا کوئی کام دیکھ رہی تھیں، میرے والد ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پر کام کرتے تھے جبکہ امی جان مقامی کالج میں لیکچرار تھیں۔
”السلام علیکم ابا جان۔“ میں نے سعادت مند بیٹے کی طرح سلام کیا۔
”وعلیکم السلام۔“ ابا جان نے عینک کے اوپر سے مجھے دیکھتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔ ”آؤ بیٹھو۔“ انہوں نے صوفے پر اپنے پاس جگہ بنائی۔
”آج کل تمہارے کیا مشاغل ہیں؟“ ابا جان نے میرے بیٹھنے کے بعد پوچھا۔
”کوئی خاص نہیں جاب اتنی ٹف ہے کہ وقت ہی نہیں ملتا......“ میں نے جواباً کہا۔
”کیا تم جاب سے ایک آدھ ہفتے کی چھٹی لے سکتے ہو؟“ ابا جان نے پھر پوچھا۔
”جی کوئی خاص کام......؟“ میں نے پوچھا۔
”میں نے جو سوال کیا اس کا جواب نہیں ملا......“ ابا جان نے خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
”جی...... مل جائے گی چھٹیاں...... جاب جوائن کرنے کے بعد سے میں نے چھٹی نہیں لی اس لئے میرا خیال ہے کمپنی کو میری چھٹیوں پر اعتراض نہیں ہوگا......“ میں نے تفصیلاً جواب دیا۔
”ہوں......“ ابا جان نے ایک ہنکارا ابھرا پھر گویا ہوئے...... ”سجاد! اب تم اٹھائیس سال کے ہو چکے ہو......“
”لیکن...... لیکن میری تو صرف سات ہی سالگرائیں آئی ہیں......“ میں نے ابا جان کا جملہ درمیان سے کاٹا۔
”اس کے لئے میں یا تمہاری ماں قصوار وار نہیں......“ ابا جان بولے۔
”تو پھر کون قصور وار ہے......“ میں نے انتہائی معصومیت سے پوچھا کیونکہ میں انتیس فروری کو پیدا ہوا تھا جو کہ چار سال میں ایک مرتبہ آتی ہے اس لحاظ سے اٹھائیس سال میں میری صرف سات سالگرائیں ہی آ سکی ہیں۔
”بدتمیز......“ امی جان زیر لب بولیں۔
”اس کے لئے تمہیں کلینڈر بنانے والے گریگوری کو گریبان سے پکڑنا چاہئے جس نے کلینڈر بناتے ہوئے انتیس فروری چار سال میں ایک مرتبہ رکھی ہے۔“ ابا جان بولے تو میں نے سعادت مندی سے گردن ہلا دی۔
”آپ بھی کیا فضول بحث لے کر بیٹھ گئے اصل بات کیجئے......“ امی جان نے بیچ میں لقمہ دیا۔
”ٹھیک ہے تم ہی کرو بات......“ ابا جان نے تیر کمان امی جان کے ہاتھ میں دے دیا۔
”سجاد...... میں اور تمہارے ابا سنجیدگی سے

تمہاری شادی کا سوچ رہے ہیں اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو ہمیں بتادو......'' امی جان نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

''مما...... جہاں تک میری پسند کا تعلق ہے تو مجھے ایک لڑکی پسند ہے......'' میں نے بھی جواباً سنجیدگی اختیار کی میری بات سن کر اخبار پڑھتے ابا جان بھی چونک اٹھے۔

''کون......لڑکی...... کس خاندان سے ہے؟''

''اچھے گھر اور خاندان کی ہے......''

''بات کہاں تک پہنچی ہے۔'' امی جان بھی گفتگو میں شامل ہوگئیں۔

''جی پچاس فیصد بات طے ہے......'' میں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

''غضب خدا کا ہمیں پتا نہیں اور بات پچاس فیصد طے بھی ہوگئی۔'' ابا جان بولے۔

''کون ہے وہ لڑکی......؟'' امی جان نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

''کترینہ کیف......'' میں نے انتہائی معصومیت سے جواب دیا۔

''انتہائی بھونڈا مذاق ہے......'' امی جان میری شرارت سمجھ کر مسکرادیں۔

''پچاس فیصد طے ہونے والی کیا بات ہے؟'' ابا جان بال کی کھال نکالنے پر تل گئے۔

''میں مکمل راضی ہوں، اس لئے پچاس فیصد بات طے ہے اس کی طرف سے ہاں کا انتظار ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''سلمان کے مسلز دیکھے ہیں مچھر کی طرح مسل دیئے جاؤ گے......'' امی جان نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

''مما...... آپ پہلے بھی کتنی مرتبہ مجھ سے پوچھ چکی ہیں اور میں بتاچکا ہوں کہ مجھے کوئی لڑکی پسند نہیں ہے جہاں آپ کا حکم ہوگا میں سر جھکادوں گا۔'' میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''دیکھو سجاد...... ہم نہیں چاہتے کہ تمہارے ساتھ کوئی زبردستی ہو، شادی زندگی بھر کا ساتھ ہے اس لئے اگر لڑکا لڑکی اپنی خوشی اور رضامندی سے ایک دوسرے کو پسند کرلیں تو زندگی نہایت خوشگوار اور پرسکون گزرتی ہے......'' ابا جان بولے۔

''اگر تم کہیں انٹرسٹڈ نہیں ہو تو ہم چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی خاندان ہی میں ہو...... اس لئے تم ایک ہفتے کی چھٹی لو اور گاؤں چلے جاؤ جہاں تمہارے تایازاد بھائی ایاز کی منگنی ہے تم منگنی میں شرکت بھی کرلو اور اگر وہاں کوئی لڑکی پسند آئے تو ہمیں مطلع بھی کردو......'' امی جان نے تفصیل میرے گوش گزار کی۔

''آپ لوگ نہیں جارہے منگنی میں......'' میں نے پوچھا۔

''تمہارے ابا کو چھٹی نہیں ملی اور ادھر کالج میں بھی امتحانات چل رہے ہیں لہٰذا میرا بھی چھٹی لینا ممکن نہیں ہے اس لئے تم تیاری کرو اگلے ہفتے منگنی میں شرکت کے لئے چلے جاؤ۔'' امی جان نے کہا تو میں نے سعادت مندی سے گردن جھکالی۔

☆......☆......☆

میں نے گاڑی بڑی سی حویلی کے سامنے روکی ڈسٹرکٹ امرکوٹ جو اب عمرکوٹ کہلاتا ہے کی تحصیل خانسہ سے دس منٹ کی مسافت پر گوٹھ قائم صدیقی میں واقع یہ عظیم الشان حویلی میرے پردادا قائم علی صدیقی نے بنوائی تھی یہ پورا علاقہ ان کے نام پر گوٹھ قائم علی صدیقی کہلاتا ہے۔ اس حویلی کو میرے پردادا نے انگریزوں کے دور میں بڑی محنت اور محبت سے تعمیر کروایا، جے پور کے پنک پتھر سے تعمیر یہ حویلی جس کی نفاست اور فن تعمیر بنوانے والے کی محبت کی مظہر تھی، گوٹھ قائم صدیقی میں یہ حویلی سر اٹھائے بڑے شان و وقار سے کھڑی تھی، میں نے حویلی کے منقش گیٹ کے سامنے اپنی گاڑی روکی اور نیچے اتر کر بیگ کندھے پر ڈالا اور حویلی کی جانب قدم بڑھادیئے۔ سب کو چونکانے کے خیال سے میں نے اپنی آمد کا تذکرہ نہیں کیا تھا حتیٰ کہ امی جان اور ابا جان کو بھی منع کردیا تھا کہ وہ اس بات کا تذکرہ

کسی سے نہ کریں میں خود بھی تقریباً دس سال بعد یہاں آیا تھا پہلے تو ہر سال آنا ہوتا تھا مگر پھر ہائیر اسٹڈیز کے لئے ملک سے باہر چلا گیا اور واپسی پر فوراً ہی جاب مل گئی لہٰذا کئی سال سے ممکن نہیں ہوا کہ میں حویلی آسکتا۔ میں بیگ اٹھائے حویلی کے بڑے سے خوب صورت نقش و نگار سے مزین گیٹ کی جانب بڑھا گیٹ کھلا ہوا تھا میں نے سوچا دستک دوں یا اندر چلا جاؤں۔

ایک لمحے کو سوچنے کے بعد میں نے قدم آگے بڑھا دیئے اور کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوگیا اندر داخل ہوتے ہی میری نظر سرخ فرش سے ہوتی ہوئی ڈیوڑھی پر پڑی جہاں سناٹا تھا۔ ''یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے تقریب کے گھر اتنا سناٹا......'' میں نے چاروں طرف نظریں گھمائیں ڈیوڑھی سے آگے نیم دائرے کی صورت میں کمرے بنے ہوئے تھے میں مزید آگے بڑھا اور کمروں سے ملحق بالکونی میں پہنچا۔

''ہنڈز اپ......'' اچانک ایک سرد نال میری گردن سے آ لگی...... میں بوکھلا کر پیچھے مڑنا چاہتا تھا کہ پھر حکم ملا......'' گھومنا نہیں...... بیگ ہاتھ سے چھوڑ دو......'' میں نے حکم کی تعمیل کی اور بیگ کندھے سے اتار کر فرش پر رکھ دیا۔

''کوئی ہتھیار ہے تو نکال دو......'' پھر حکم ملا میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا لائسنس والا پستول نکالا اور زمین پر رکھ دیا اور کہا۔ ''اس کا لائسنس ہے میرے پاس......''

''بہت خوب...... اب ڈاکو بھی قانون کی پاسداری کرنے لگے ہیں اور لائسنس والا اسلحہ رکھتے ہیں......'' پیچھے سے طنزیہ آواز آئی۔

''ڈاکو......'' میں بے ساختہ پلٹ گیا مجھے پلٹتے دیکھ کر پیچھے کھڑے آدمی نے رائفل پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ ''میں ڈاکو نہیں......''

''ڈاکو نہیں ہو تو کیا مہمان ہو......''

''میں...... ارے چچا جان......'' میں رائفل والے شخص کو پہچان گیا وہ میرے چچا جان تھے۔

''چچا...... میں تمہارا چچا نہیں ہوں۔''

''آپ میرے چچا ہیں میں سجاد علی صدیقی آپ کے بڑے بھائی دائم علی صدیقی کا اکلوتا بیٹا......'' میں نے جلدی جلدی کہا۔

''سجاد......'' اب چچا جان کی سمجھ میں پوری بات آئی اور انہوں نے رائفل میری گردن سے ہٹا کر مجھے گلے لگالیا۔

''آنے سے پہلے اطلاع دے دیتے۔''

''میں نے سوچا سرپرائز رہے گا...... مگر یہاں تو مجھے ہی سرپرائز مل گیا......'' میں نے مسکراتے ہوئے اپنا سامان اٹھایا۔

''ہاہاہا۔'' چچا جان نے قہقہہ لگایا اور مجھے گلے لگایا اور اسی حالت میں لے کر حویلی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئے...... ''دیکھو کون آیا ہے......''

''کون ہے......'' کئی آوازیں ابھریں۔

''میرا سجاد آیا ہے۔'' دادی جان نے جلدی سے مجھے خود سے چمٹالیا اور چٹ چٹ میرا ماتھا چومنے لگیں وہ خوشی سے نہال ہورہی تھیں، سب پرجوش انداز میں آگے بڑھ بڑھ کر مجھ سے مل رہے تھے۔

سچ ہے گاؤں کی مٹی میں ابھی تک پرانی تہذیب کے اثرات باقی ہیں، جتنی محبت سے گاؤں میں سب مجھ سے مل رہے تھے اور اپنی لگاوٹ کا اظہار کررہے تھے بڑے شہروں میں اس طرح کی محبت کے مناظر مفقود ہیں۔

رات دو بجے تک وہاں محفل جمی رہی، کل میرے تایا زاد بھائی ایاز کی منگنی اس کی خالہ زاد سے ہورہی تھی لہٰذا آج وہ نوجوان پارٹی کا خاص ہدف بنا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کی سرخی بتارہی تھی اس نوک جھوک میں اسے بھی مزا آرہا ہے، رات دو بجے سب بڑی تائی کی ڈانٹ کھا کر محفل سے اٹھے اور سونے کے لئے لیٹے مجھے خاص طور پر الگ کمرہ دیا گیا، شاید میں شہری بابو تھا اس لئے مجھ پر خاص عنایت کی گئی تھی۔ رات کو میں بستر پر لیٹا تو مجھے وہ خاص کام یاد آیا جس کے لئے مما نے مجھے یہاں بھیجا تھا تقریباً سارا خاندان اکٹھا

تھا۔ میں نے خاندان کی تمام لڑکیوں کو غور سے دیکھا۔ مہوش ایاز کی بہن اور بڑے تایا کی اکلوتی بیٹی تھی انابیہ چھوٹے تایا کی بیٹی تھی مگر میں نے اس کی آنکھوں میں چچا جان کے بیٹے فیاض کے لئے پسندیدگی دیکھی تھی لہٰذا وہ میری فہرست سے خارج ہوگئی۔ اس کے علاوہ بڑی پھوپھو کی دو بیٹیاں زرینہ اور فہمینہ تھیں۔ ''دیکھتے ہیں قسمت کہاں یاوری کرتی ہے......'' میں نے سوچا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی۔ ایک تو دس گھنٹے کا سفر پھر رات بھی بہت ہو چکی تھی لہٰذا میں تھوڑی دیر میں بے سدھ ہوگیا۔

☆......☆......☆

آج ایاز کی منگنی تھی چونکہ دادی جان اپنی گھٹنوں کی بیماری کے باعث کہیں آ جا نہیں سکتی تھیں لہٰذا منگنی کا سارا فنکشن حویلی ہی میں رکھا گیا تھا ایاز کی منگیتر حنا بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح سے حویلی میں آگئی تھی کئی لڑکیاں اسے گھیرے بیٹھی تھیں اور ایاز کا نام لے لے کر اسے چھیڑ رہی تھیں اور حنا گلنار چہرے کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔ یقیناً من کا میت مل جائے تو دنیا جنت بن جاتی ہے اور ان دونوں کو دنیا ہی میں جیسے جنت مل گئی تھی۔

منگنی کی رسم شروع ہوئی تو ایاز اور حنا نے ایک دوسرے کو انگوٹھی پہنائی پھر سب حنا کا منہ میٹھا کر کے اسے نیگ دینے لگے، میں بھی پوری طرح تیار ہو کر اس تقریب میں شریک تھا بلکہ یہ کہنا چاہئے تھا کہ دولہا دولہن کے بعد میں ہی اس تقریب کا مہمان خصوصی تھا ہر شخص بطور خاص مجھ سے ملنے آ رہا تھا وہ سب مجھ سے اپنی محبت کا اظہار اس والہانہ طریقے سے کر رہے تھے کہ مجھے شرمندگی ہو رہی تھی۔ ایاز کی بہن مہوش اپنی بھابھی کو مٹھائی کھلا کر پیچھے ہٹی تو ایک لڑکی آگے بڑھی اور مٹھائی کے ڈبے سے مٹھائی اٹھا کر حنا کو کھلانی چاہی کہ اماں کی کراری آواز گونجی۔

''ارے یہ کیا کر رہی ہو پیچھے ہٹو تم مٹھائی مت کھلاؤ۔''

آواز اتنی تیز اور کراری تھی کہ وہ لڑکی بوکھلا کر

مہمان

ایک کنجوس نے اپنے مہمان سے پوچھا۔

''اور سناؤ، ٹھنڈا پیو گے یا گرم؟''

مہمان۔ ''دونوں۔''

کنجوس: ''بیگم ایک گلاس فریج سے لے آؤ پانی کا اور ایک گلاس گیزر سے لے آؤ پانی کا۔''

(انوری رمضان۔پنڈ دادن خان)

پیچھے ہٹ گئی، مٹھائی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

''یہاں کیا کر رہی ہو جاؤ......'' تائی اماں کی آواز پھر گونجی اور وہ لڑکی تیزی سے بھیڑ چیرتی ہوئی واپس چلی گئی، لڑکی کے جاتے ہی ہنگامہ اور شور پھر محفل کا حصہ بن گئے سب محفل میں اس طرح مگن ہو گئے جیسے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے حیرانگی سے اس لڑکی کو دور جاتے دیکھا اس لڑکی کی آنکھوں میں بے بسی کا وہ عالم تھا کہ مجھے لگا جیسے کسی نے تیز دھار خنجر میرے سینے میں اتار دیا ہو میں نے اتنی بے بسی کبھی کسی آنکھ میں نہیں دیکھی تھی۔

''کون ہے یہ لڑکی۔'' عام سے مٹیالے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس کسی میک اپ کے بغیر یہ کوئی عام لڑکی نہ تھی۔ تھوڑی دیر میں تقریب ختم ہوگئی تو میں دادی جان سے ملنے ان کے کمرے کی جانب چل دیا ان کے کمرے کے پاس پہنچا تو اندر سے مجھے کسی کے رونے کی آواز آئی، میں ٹھٹک گیا۔ ''اندر کون رو رہا ہے......'' میں نے سوچا اور دروازے سے کان لگا دیئے، حالانکہ یہ ایک غیر اخلاقی حرکت تھی لیکن میں تجسس کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اندر سے کسی لڑکی کی آواز آ رہی تھی۔

''میرا کیا قصور تائی......کیا میں نے اپنی قسمت خود بنائی ہے، اللہ میرے ساتھ ہی کیوں ناانصافی کر رہا ہے۔''

''نہیں بیٹا......ایسی باتیں نہیں کرتے اللہ غفور الرحیم ہے......'' دادی جان کی آواز آئی۔

''نانی...... '' لڑکی کے سسکنے کی آواز باہر تک آرہی تھی، میں نے دروازے پر دستک دی اور پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اندر وہی نیالے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس لڑکی دادی جان کی مسہری پر بیٹھی تھی اور اس کا سر دادی جان کی گود میں تھا، مجھے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ جلدی سے کھڑی ہوگئی اور دوپٹہ سر پر جمانے لگی۔

''......آؤ سجاد بیٹا'' دادی جان مجھے ہچکچاتے دیکھ کر بولیں۔ ''اس سے تو تم نہیں ملے ہوگے یہ اپنے کمرے سے کم ہی باہر نکلتی ہے...... یہ تمہاری چھوٹی پھوپھو کی بیٹی زینب ہے۔'' دادی جان نے اس لڑکی کا تعارف کروایا۔

''السلام علیکم......'' میں نے سلام کیا تو وہ سلام کا جواب دیتے ہوئے کمرے سے چلی گئی اس کی ہرنی جیسی آنکھوں میں آنسو تھے اس کے گلابی چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں تھیں۔

''آخر یہ ماجرا کیا ہے؟...... یہ لڑکی اتنی غمزدہ کیوں ہے؟'' میں نے دل میں سوچا اور آخر میرے دل کا مدعا زبان پر آ گیا۔ دادی جان میرا سوال سن کر تھوڑی دیر خاموش ہوگئیں، پھر بولیں۔

''میری چھوٹی بیٹی قدسیہ زینب کی ماں اس کی پیدائش والے دن ہی اللہ کو پیاری ہوگئی تھی میں نے جب چھوٹی سی زینب کو اپنے ساتھ لانا چاہا تو اس کے باپ نے منع کردیا کہ وہ اپنی بیٹی کو خود پالے گا مگر چند سال بعد جب اس نے دوسری شادی کرلی تو سوتیلی ماں کے ظلم کا شکار یہ معصوم زینب بنی جب مجھے پتا چلا تو میں نے زینب کو اپنے پاس بلالیا۔ دس سال پہلے آئی، زینب ڈری سہمی رہتی تھی، مگر میں نے نہایت پیار سے اسے اس ڈروخوف سے باہر نکالا۔

پچھلے سال اس کے تایا نے اپنے بیٹے کے ساتھ اس کا نکاح کردیا، لڑکا بہت اچھا تھا لہٰذا میں بھی راضی ہوگئی مگر ہائے رے نصیب!! وہ اپنے دفتر کے کسی کام سے اسلام آباد گیا اور ایک حادثہ میں جاں بحق ہوگیا۔ اس واقعے کے بعد زینب کو چپ لگ گئی اور خاندان بھر میں بے چاری سبز قدم، منحوس اور کالی قسمت والی مشہور ہوگئی۔

آج بھی تم نے دیکھا بڑی بہو کا اس کے ساتھ کیا رویہ تھا۔ میں رو رو کر اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ یا اللہ کسی طرح میری زینب کو اس جہنم سے نکال اور اسے خوشی کی زندگی عطا فرما......'' دادی جان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''دادی...... اللہ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے، یقیناً زینب کے لئے یہ آزمائش کے دن ہیں جو گزر جائیں گے......''

''انشا اللہ......'' میری بات سن کر دادی جان نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھادیئے۔

اس دن کے بعد میں نے زینب کو آبزرو کرنا شروع کیا وہ زیادہ تر کچن میں پائی جاتی تھی حویلی میں پکنے والے رنگ رنگ کے لذت بھرے کھانے اس کے ہاتھوں کا کرشمہ تھے۔ میں اپنی منزل کے قریب تھا مگر مجھے مما کا ڈر تھا کہیں وہ بھی زمانے کی فرسودہ توہمات میں نہ جکڑی ہوں، لہٰذا حویلی سے جانے سے ایک دن پہلے میں نے مما کو فون کیا۔

''ہیلو بیٹا کیسے ہو......''

''ٹھیک ہوں......''

''کب آرہے ہو''

''انشاءاللہ کل یہاں سے نکلوں گا۔''

''اور اس کام کا کیا بنا جس کے لئے تم وہاں گئے تھے......''

''مما میں نے اسی لئے آپ کو فون کیا ہے......''

''بولو......''

''مما آپ توہمات پر یقین رکھتی ہیں۔''

''کیا مطلب......؟''

''مطلب جیسے کوئی منحوس ہے یا کالی قسمت والا یا سبز قدم وغیرہ...... آپ ان باتوں کو مانتی ہیں۔'' میں نے تمہید باندھی۔

''دماغ خراب ہے تمہارا سجاد...... میں تمہیں ایسی جاہلانہ باتوں پر یقین رکھنے والی لگتی ہوں۔'' مما نے ناراضگی سے جواب دیا۔

''نہیں مما...... یہ بات نہیں ہے اصل میں...... میں زینب علی سے شادی کرنا چاہتا ہوں......''

میں نے اصل مدعا بیان کیا تو دوسری طرف سے خاموشی چھا گئی۔

''مما...... مما کیا ہوا۔ کیا آپ کو یہ بات پسند نہیں آئی۔''

''نہیں بیٹا...... یہ بات نہیں ہے...... آج میرا سر فخر سے بلند ہوگیا آج مجھے یقین ہوگیا کہ میری تربیت میں کوئی جھول نہیں ہے میں اور تمہارے ابا بھی یہی چاہتے تھے کہ زینب اس گھر کی بہو بنے مگر تمہاری وجہ سے خاموش تھے کہ تمہیں زینب پسند آتی بھی ہے کہ نہیں......''

''تھینک یو مما......'' میں نے اطمینان کی سانس لی۔ ''پھر آپ کہیں تو لے آؤں آپ کی بہو کو......''

''ایسے نہیں ملے گی وہ لڑکی...... لاکھوں میں ایک ہے ہیرا ہے ہیرا...... ذرا ناک گھسو کان پکڑو پھر سوچا جائے گا۔'' مما میری شرارت سمجھ گئیں۔

''مما...... میں کسی ہیرو سے کم ہوں......''

''اچھا فون بند کرو میں تمہاری دادی کو فون کرتی ہوں......'' مما نے کہا اور ساتھ ہی فون آف ہوگیا میرے منہ سے ایک گہری سانس نکل گئی۔ جس مرحلے کو میں مشکل ترین سمجھ رہا تھا وہ نہایت آسان نکلا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی، میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو باہر حویلی کی نوکرانی کھڑی تھی۔ ''آپ کو بڑی دادی نے بلایا ہے......'' دادی جان کو حویلی میں سارے نوکر بڑی دادی کہتے تھے۔

''اچھا آتا ہوں......'' میں نے جلدی سے اپنا حلیہ صحیح کیا اور دادی جان کے کمرے میں پہنچا۔

''دادی جان...... میں آسکتا ہوں......'' میں نے دروازے میں کھڑے ہو کر پوچھا، زینب دادی جان کی مسہری کے پاس کھڑی تھی۔

''آؤ...... آؤ سجاد......'' دادی جان بولیں۔

''دادی جان آپ نے بلوایا......''

''ادھر آؤ میرے پاس......'' دادی نے مسہری پر اپنے پاس جگہ بنائی تو میں مسہری پر ان کے قریب بیٹھ گیا انہوں نے میرا سر اپنی گود میں رکھا تو میں نے بھی مسہری پر پیر پھیلا دیئے میرا سر اپنی گود میں لے کر دادی جان بولیں۔ ''تمہاری ماں کا فون آیا تھا...... وہ مجھ سے میری سب سے قیمتی چیز مانگ رہی ہے......''

''آپ نے انکار تو نہیں کردیا؟'' میں دادی جان کا اشارہ سمجھ گیا اس لئے بے چینی سے اٹھ بیٹھا۔

''سجاد تم نے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی دی ہے، میری زینب بہت معصوم ہے اس نے بہت دکھ اٹھائے ہیں......'' دادی جان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''دادی جان پلیز! نہ روئیں، دکھوں کے دن بیت گئے اب ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہیں...... میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ زینب کی آنکھ میں آج کے بعد کبھی آنسو نہیں آئیں گے......''

''جیتے رہو تم دونوں میری جان ہو......'' دادی جان نے کہا پھر اپنے ہاتھ میں پہنا بھاری سا سونے کا کنگن اتارا اور زینب کے ہاتھ میں پہناتے ہوئے کہا۔

''یہ کنگن میں نے سجاد کی دلہن کے لئے ہی رکھا تھا، اب اس کی حقدار تم ہو......'' زینب جلدی سے منہ چھپا کر بھاگ گئی اور میرے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''تیری ماں اگلے مہینے شادی کا کہہ رہی ہے۔'' دادی جان پھر گویا ہوئیں۔

''اگلے مہینے...... اتنے دن......'' میں نے مصنوعی دکھ کے ساتھ کہا۔

''شریر......'' دادی جان میری شرارت سمجھ کر مسکرادیں۔

''دادی جان دعا دیجئے کہ میں زینب کو خوش رکھ سکوں۔'' میں نے کہا۔

☆......☆......☆

میں اپنی گاڑی میں بیٹھا کراچی کی جانب رواں دواں تھا۔ میں صبح نکلنا چاہتا تھا مگر جب حویلی میں سب کو معلوم ہوا کہ میری اور زینب کی بات پکی ہوگئی ہے تو سب نے مجھے گھیر لیا خاص طور پر نوجوان پارٹی نے تو وہ

ہلا گلا کیا کہ بس...... مجھے حویلی کے مکینوں کی آنکھوں میں اپنے اور زینب کے لئے خوشیاں اور نیک خواہشات نظر آئیں۔ سب نے مل کر مجھے اور زینب کو بیٹھا کر ایک چھوٹی سی تقریب کر ڈالی۔ اس وجہ سے دیر ہوگئی اور مجھے واپسی کے لئے نکلتے نکلتے رات ہوگئی۔

رات کی سیاہی پھیلتی جارہی تھی میں نے گھڑی میں وقت دیکھا رات کے گیارہ بج رہے تھے میں نے گاڑی سڑک کے کنارے روکی، میں تین گھنٹے سے مسلسل گاڑی چلا رہا تھا اور ابھی سات آٹھ گھنٹے کا سفر باقی تھا، میں نے گاڑی کا انجن بند کیا اور گاڑی سے باہر نکلا چاند کی آج شاید بارہ تیرہ تاریخ تھی اس لئے اتنا اجالا تھا کہ ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ میں ڈسٹرکٹ عمرکوٹ سے نکل کر تھرپارکر کے عظیم صحرا کو پار کررہا تھا، دور دور تک ہولناک سناٹا تھا کہیں آبادی کا نشان نہیں تھا کہیں کہیں کوئی ٹنڈ منڈ سا درخت سڑک کنارے نظر آتا، ہوا ٹھنڈی اور فرحت بخش لگ رہی تھی، یہی ہوا دن کے وقت گرم اور جان لیوا ہوتی ہے ریگستان کا یہ فائدہ ہے کہ وہ جلدی ٹھنڈا ہوجاتا ہے تیز ہوا ریت پر کیسے کیسے نقش ونگار بنا رہی تھی بنا بنا کر مٹا رہی تھی، مٹا مٹا کر بنا رہی تھی ریگستان کی یہ خوبی ہے کہ جہاں آج ریت کا بڑا سا ٹیلا ہے کہ وہاں کل چٹیل میدان ہوگا ساری رات ریت دوسری جانب منتقل کردے گی۔

میں نے سڑک کے کنارے بیٹھ کر اپنی انگلیاں ریت میں ڈالیں، ٹھنڈک کی ایک لہر میرے جسم میں سرایت کرگئی۔ میں بے شک کراچی میں رہتا ہوں مگر ہوں تو اس عظیم ریت مہا ساگر کا بیٹا، میرے خون میں یہاں کی خوشبو رچی بسی ہے۔

تھر میں آج بھی ایسے جہاندیدہ لوگ پائے جاتے ہیں جو رات کو ریت میں انگلیاں ڈال کر بتادیں کہ کل صبح پو چھانڈو (سورج کی پہلی کرن) کہاں پڑے گی۔ قدرت نے ہمیں ہریالی پھول اور رنگ دیتے سے ہاتھ کھینچ لیا تو اس علاقے کے لوگوں نے دھنک کے سارے چنچل رنگ اپنی اجرکوں، رلیوں، اڑھنیوں، شلوکوں اور چولیوں میں ٹانک دیئے۔

میں نے گاڑی سے پانی کی بوتل نکالی اور منہ سے لگالی، پانی پی کر میں دوبارہ گاڑی میں بیٹھا ابھی میں نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کے لئے چابی گھمانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ میری نظر سامنے سڑک پر پڑی، میری گاڑی سے کوئی تیس بتیس گز کے فاصلے پر ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

میں سانپ کو غور سے دیکھنے لگا وہ چتر ہاری سانپ تھا اس کی کھال چاند کی روشنی میں چمک رہی تھی اور سنہری مائل ٹیالی جلد پر پڑے سیاہ دھبے اور خوفناک بنا رہے تھے۔

چتر ہاری سانپ کو دیکھ کر میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی، میں اپنی گاڑی میں ساکت بیٹھا رہ گیا۔ چتر ہاری سناپ سندھ کے ریگستان کا خطرناک ترین سانپ ہے، یہ سانپ انتہائی زہریلا ہوتا ہے، اس کی نسل تقریباً معدوم ہوچکی ہے۔

چتر ہاری سانپ کو دیکھتے ہی مجھے اپنے عزیز دوست رضا کا خیال آیا، رضا میرا سب سے اچھا دوست ہے بلکہ میرا اور اس کا بھائیوں والا معاملہ ہے، رضا کراچی کی ایک لیبارٹری میں کام کرتا ہے اور سانپ اور سانپ کے زہر پر تحقیق کررہا ہے۔ بے اختیار میرا دل چاہا کہ میں اس سانپ کو پکڑلوں، یقیناً رضا کے لئے بہترین تحفہ ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے حواس بحال کئے اور ڈیش بورڈ سے اپنا بتیس بور کا ریوالور نکالا اور آہستہ سے کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

سانپ اسی طرح کنڈلی مارے بیٹھا تھا اس کی دوشاخہ زبان بار بار منہ سے باہر آرہی تھی، وہ شاید شکار پر حملہ کرنے والا تھا، میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا سامنے دو موٹے تازے چوہے بیٹھے تھے، سانپ انہیں شکار کرنا چاہتا تھا، یہ غنیمت تھا کہ سانپ نے اب تک مجھے نہیں دیکھا تھا میں نے اپنا ریوالور سیدھا کیا اور سانپ کے سر کا نشانہ لیا اور فائر کردیا، اسی و قت سانپ نے چوہوں پر چھلانگ لگائی مگر ریوالور سے نکلی گولی کی رفتار سانپ کی رفتار سے بہت تیز تھی سانپ

گولی کھا کر زمین پر گر پڑا اور بے سدھ ہوگیا۔

میں دوڑ کر اس کے قریب گیا۔ گولی کی آواز سناٹے میں دور تک گئی، مجھے ڈر تھا کہ کہیں گولی کی آواز سن کر کوئی پولیس کی گاڑی ادھر نہ آجائے کیونکہ چتر ہاری سانپ کا شکار قانوناً ممنوع ہے۔ لہٰذا میں نے ایک لکڑی کی مدد سے سانپ کو اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈالا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے روانہ ہوگیا۔ گاڑی کے اندر مدھم روشنی میں سانپ کا چمکدار جسم بہت خوفناک دکھائی دے رہا تھا، میں نے اپنا دھیان بٹانے کے لئے دھیمے سروں میں گنگنانا شروع کردیا۔

میں تصور کی آنکھ سے زینب کو دیکھ رہا تھا جو ہاتھوں میں مہندی لگائے اور سرخ جوڑا پہنے میرا انتظار کررہی ہے، زینب کا خیال آتے ہی مسکراہٹ میرے لبوں پر خود بخود آگئی، اسی وقت گاڑی کو ایک زوردار جھٹکا لگا، شاید سڑک پر کوئی گڑھا تھا جس میں گاڑی کا ٹائر چلا گیا تھا، گاڑی کے جھٹکے کے ساتھ ہی نہ جانے کیسے پچھلی سیٹ پر رکھا سانپ اچھل کر میری گردن سے لپٹ گیا۔

میرے منہ سے ایک تیز چیخ نکل گئی اور میں نے بے اختیار اپنے دونوں ہاتھوں سے سانپ کو پکڑ کر اپنی گردن سے الگ کیا اور پچھلی سیٹ پر پھینکا اسٹیئرنگ چھوٹنے کی وجہ سے گاڑی سڑک پر لہرا گئی اور ریت میں اتر گئی، پھر ایک جھٹکا کھا کر گاڑی بند ہوگئی۔ میں جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اترا اور اپنی سانس بحال کی پھر میں نے پچھلی سیٹ پر نظر دوڑائی سانپ مردہ حالت میں پڑا تھا شاید گاڑی کو لگنے والے جھٹکے کی وجہ سے وہ اچھل کر میرے اوپر آگیا تھا۔

میں نے گاڑی میں سے پانی کی بوتل نکالی اور پانی پیا تاکہ میرے حواس بحال ہوسکیں تھوڑی دیر میں میں نے اپنے خوف پر قابو پالیا، پھر میں نے سانپ کو ہلا جلا کر دیکھا مگر وہ ساکت پڑا تھا۔ میں دوبارہ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی کو سڑک پر لے کر آیا اور اپنا سفر شروع کیا مگر اب میرے اندر اس اعتماد کا کہیں پتا نہیں تھا جو سفر شروع کرتے وقت تھا۔ گاڑی اپنا سفر طے کررہی تھی، رات بیتی جارہی تھی، میں

دشمن......!

دشمن ایک ایسا لفظ ہے، جس میں انسان کے چار دشمن چھپے ہوئے ہیں۔

☆ ''د'' سے دنیا۔

☆ ''ش'' سے شیطان۔

☆ ''م'' سے مال۔

☆ ''ن'' سے نفس۔

(مرتب: ایس امتیاز احمد۔کراچی)

نے ایک پیٹرول پمپ پر رک کر پیٹرول بھروایا اور گھڑی میں وقت دیکھا رات کے تین بج رہے تھے۔

بدین ڈسٹرکٹ سے نکل کر اب میرا سفر ٹھٹھہ ڈسٹرکٹ میں جاری تھا، ٹھٹھہ کے بعد کراچی تھا، میں گنگناتے ہوئے اپنا سفر طے کررہا تھا۔ سانپ کا خوف میرے ذہن سے نکل چکا تھا، میں اپنے اور زینب کے بارے میں سوچ رہا تھا واقعی اباصحیح کہتے ہیں۔ ''من چاہا میت مل جائے تو زندگی کا سفر انتہائی خوشگوار انداز میں گزرتا ہے۔'' مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر رقصاں تھی۔

اسی وقت میری نظر بیک مرر پر پڑی، بیک مرر میں جو منظر مجھے نظر آیا وہ مجھے دہشت زدہ کرنے کے لئے کافی تھا، خون میری رگوں میں جمنے لگا، میرے ہونٹ نیم وا انداز میں کھل گئے، میری آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئیں، بیک مرر میں منظر ہی اتنا خوفناک تھا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیسے ہوگیا۔

میں نے گاڑی کی رفتار کم کی اور آہستہ آہستہ گردن گھما کر پیچھے دیکھا سانپ پچھلی سیٹ پر گردن اٹھائے بیٹھا تھا اس کی دوشاخہ زبان بار بار باہر نکل رہی تھی اس کا منہ اس کے اپنے خون سے سرخ ہو رہا تھا جس پر جابجا ریت لگی ہوئی تھی اس کی آنکھوں میں بجلیاں کوندرہی تھیں۔

خوف سے میرا برا حال تھا، میں نے گاڑی روکنی چاہی مگر اسی وقت سانپ نے تیزی سے اپنی جگہ تبدیل کی اور میرے سامنے اسٹیئرنگ سے ذرا اوپر آ کر بیٹھ گیا، گویا حکم دے رہا ہو کہ گاڑی چلاتے رہو، خوف اور ڈر کیا ہوتا ہے مجھے آج احساس ہو رہا تھا۔

موت میرے سامنے سانپ کی صورت میں بیٹھی تھی اور اس کی زبان بار بار منہ سے باہر آ کر مجھے مزید خوفزدہ کر رہی تھی۔

چترہاری سانپ کا کاٹا تو پانی بھی نہیں مانگتا۔ میں دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہا تھا۔ جب میں نے اس سانپ کے شکار کا سوچا تھا میرا ذہن تیزی سے اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچ رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اسی وقت گاڑی کسی ابھری ہوئی جگہ سے گزری اور اسے ایک جھٹکا لگا۔

جھٹکا سانپ کو انتہائی ناگوار گزرا اس نے غصیلی نظروں سے مجھے گھورا اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا میں نے دل ہی دل میں کلمہ پڑھنا شروع کر دیا اس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ آہستہ آہستہ ڈیش بورڈ کی جانب بڑھنے لگا جہاں میرا ریوالور رکھا تھا۔

مگر شاید سانپ نے بھی میرا ارادہ بھانپ لیا اس نے اپنی جگہ تبدیل کی اور ڈیش بورڈ پر جا کر بیٹھ گیا۔ میرے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکلی اور میں نے سارا دھیان گاڑی چلانے پر لگا دیا مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ آخر سانپ نے مجھے اب تک ڈسا کیوں نہیں، کیونکہ چترہاری سانپ کی فطرت ہے کہ وہ اپنے شکار کو زیادہ مہلت نہیں دیتا۔

''یا اللہ تو ہی کوئی سبب بنا...... اور مجھے اس مصیبت سے نجات دلا......'' میں نے دل ہی دل میں دعا کی اور اپنے بازو پر بندھے امام ضامن کو محسوس کیا جو سفر شروع کرنے سے پہلے دادی جان نے دعائیں پڑھتے ہوئے باندھا تھا۔

میری کار آہستہ آہستہ ٹھٹھہ شہر میں داخل ہو رہی تھی۔ ٹھٹھہ کے باسی اپنے گھروں میں سکون سے سو رہے تھے مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سانپ میری برابر والی سیٹ پر آ چکا تھا اور مجھے گھور رہا تھا اس کی زبان بار بار باہر کو نکل رہی تھی۔ شاید وہ مجھے خوفزدہ کر کے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسی وقت میری گاڑی کے قریب سے ایک ٹرک گزرا جس نے تیز ہارن بجایا۔ ہارن کی آواز سن کر سانپ کے جسم میں لرزہ سا پیدا ہوا اور اس کے غصے میں اضافہ ہو گیا۔ وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگا گویا یہ قصور بھی میں نے کیا ہو۔

اچانک سانپ کے دل میں کیا سمائی کہ وہ اپنی دم کے بل پر کھڑا ہو گیا اس کا منہ میرے چہرے کے برابر آ گیا اس کی گرم گرم سانسیں میرے چہرے کو جھلسانے لگیں میرا خون رگوں میں خشک ہونے لگا خوف اور ڈر کیا ہوتا ہے مجھے آج اندازہ ہوا، میرا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا آج کی رات میری اخری رات ہو سکتی ہے مجھے مما۔ ابا جان، دادی جان اور زینب کا خیال آ رہا تھا اگر......

اگر مجھے کچھ ہو گیا تو دنیا والے زینب کا جینا حرام کر دیں گے مما اور ابا جان کا کیا ہوگا، میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔ ابا جان بے شک سخت گیر ہیں مگر وہ مجھ سے پیار بھی بے انتہا کرتے ہیں۔

''یا اللہ تو رحمٰن ہے رحیم ہے، مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دے۔'' میں نے صدق دل سے دعا کی۔ میرے حلق میں کچھ پھنسنے لگا اور پھر خود بخود میرے آنسو بہہ نکلے۔

سانپ میرے چہرے کے بالکل قریب تھا اس کی دوشاخہ زبان میرے گالوں کو چھو رہی تھی۔

اچانک سانپ کے دل میں کیا بات آئی کہ وہ دوبارہ اپنی پرانی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا اور وہیں سے مجھے گھورنے لگا۔ ٹھٹھہ شہر پیچھے رہ گیا اب میں گھارو شہر سے گزر رہا تھا بس کراچی آنے والا ہی تھا۔

اسی وقت میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی مجھے معلوم تھا کہ رضا صبح جلدی اٹھنے کا عادی ہے۔ لہٰذا کراچی میں داخل ہوتے ہی میں نے گاڑی کا رخ ماڈل کالونی کی جانب موڑ دیا جہاں رضا کا بنگلہ تھا۔ مساجد سے فجر کی اذانوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، اجالا اتنا ہو گیا تھا کہ اب ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔

سانپ میری برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا اس کی نظریں میرے اوپر جمی تھیں۔ میں نے گاڑی رضا کے بنگلے کے سامنے روکی اور دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر اسی وقت سانپ نے ایک پھنکار ماری اور میرا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا پھر میں نے دوسرا ہاتھ اسٹیئرنگ سے ہٹا کر ہارن تک لایا اور ہارن بجادیا۔ ہارن کی تیز آواز چاروں طرف گونج اٹھی۔

سانپ نے نہایت ناگواری سے میری جانب دیکھا مگر میں نے پروانہ کی اور دوسری بار ہارن بجادیا۔ تھوڑی دیر میں رضا آنکھیں ملتا ہوا بالکونی میں آیا۔ میری کار دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے چیخ کر کچھ کہا جو میں نہ سن سکا تھوڑی دیر بعد رضا بنگلے سے نکلتا نظر آیا۔ وہ گاڑی کے پاس آتے ہوئے بولا۔ ''کیا پیروں میں مہندی لگی ہوئی ہے جو کار سے نہیں اتر رہے ہو......؟'' جملہ مکمل کرتے ہی رضا کی نظر سانپ پر پڑی۔ وہ فوراً صورتحال کی سنگینی کو سمجھ گیا اور بڑی تیزی سے الٹے قدموں واپس اپنے بنگلے کے اندر دوڑ گیا۔ میں نے کن انکھیوں سے سانپ کی طرف دیکھا وہ بار بار پھنکار کر مجھے ڈرا رہا تھا۔

اسی وقت رضا اپنے بنگلے سے باہر آتا نظر آیا اس کے ہاتھ میں اسپرے کرنے والی مشین تھی وہ کار کی دوسری جانب کی کھڑکی پر آیا جہاں سانپ بیٹھا تھا پھر اس نے اپنی ناک پکڑ کر مجھے اشارہ کیا میں اس کا اشارہ سمجھ گیا وہ مجھے سانس روکنے کا کہہ رہا ہے۔ میں نے ایک لمبی سانس اپنے پھیپھڑوں میں بھری اور سانس روک لی۔ میرے سانس روکنے کے بعد رضا نے اسپرے مشین کا رخ سانپ کی جانب کیا اور مشین کا بٹن دبادیا اسپرے مشین میں شاید بے ہوشی کی دوا تھی۔ سانپ پر جیسے ہی اسپرے کی پھوار پڑی وہ اچھلا اور اس نے مجھے ڈسنے کی کوشش کی مگر میں نے چیختے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر چھلانگ لگادی۔ سانپ میرے پیروں سے لپٹتا ہوا باہر آ گرا۔ میں نے اسے اپنے پیروں سے جھٹکا اور دور جا کھڑا ہوا۔

''ارے...... ارے گھبراؤ نہیں...... یہ بے ہوش ہو چکا ہے۔'' رضا بولا اور اس نے سانپ کو اپنے ہاتھوں میں ایسے اٹھالیا جیسے وہ ربڑ کا بنا ہوا ہو۔ میں نے گاڑی کو لاک کیا اور رضا کے ساتھ اس کے گھر میں داخل ہوا، ڈرائنگ روم تک پہنچتے پہنچتے میں نے مختصراً رضا کو رات بھر کی روداد سنائی، رضا سانپ کو لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا جسے وہ لیبارٹری کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ ملازم میرے سامنے چائے رکھ گیا، میں چائے کی شدید طلب محسوس کررہا تھا لہٰذا چائے پینے لگا۔

تھوڑی دیر میں رضا کمرے میں داخل ہوا اس کے ہاتھ میں وہی سانپ تھا اب سانپ ہوش میں تھا۔ رضا نے سانپ میرے اوپر اچھالتے ہوئے کہا۔ ''یہ بالکل بے ضرر سانپ ہے......''

''کیا مطلب......'' میں نے سانپ سے بچتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ تم نے اسے جو گولی ماری تھی اس نے اس کے زہریلے دانت ہی اڑا دیئے تھے۔'' رضا نے جواب دیا۔

''یہ کیسے ممکن ہے......'' میں حیرت زدہ رہ گیا۔

''وہ ایسے ممکن ہے کہ شکار کے وقت چتر ہاری سانپ اپنے دونوں زہریلے دانت باہر کی سمت لاتا ہے، جب تم نے اسے گولی ماری تو یہ شکار کررہا تھا، جیسے ہی شکار کرنے کے لئے اس نے اپنے زہریلے دانت باہر کئے تم نے گولی چلادی اور گولی نے اس کے دونوں زہریلے دانت ختم کردیئے اسی لئے یہ تمہیں ڈس نہیں سکا اور تم رات بھر ایک بے ضرر سانپ سے ڈرتے رہے جو کسی کو ڈسنے کے قابل نہیں تھا۔'' رضا نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور میرے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکل گئی، میں نے پلٹ کر سانپ کو دیکھا، وہ قالین پر اپنا دھڑ اوپر کئے مجھے گھور رہا تھا اور بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

اپنے قاتل کی ذہانت سے پریشان ہوں میں
روز اک موت نئے طرز کی ایجاد کرے
بلا کی بدگمانی تھی، میرے ''صیاد'' کو مجھ سے
''ذبح'' کے بعد بھی اس نے میرے کس کس کے پر باندھے
(انتخاب: ساحل دعا بخاری..... بصیر پور)

ہر بات میں اس کی ہیں کئی سو سو مطلب
وہ تو بات کرتا ہے، وضاحت نہیں کرتا
میں اس کیلئے سارے زمانے سے لڑی ہوں
وہ شخص جو خود سے بھی بغاوت نہیں کرتا
(راحل بخاری..... محبوب شاہ)

ملاقاتیں مسلسل ہوں تو دلداری نہیں ہوتی
بڑے دلچسپ ہوتے ہیں یہ بے ترتیب یارانے
(بلقیس خان..... پشاور)

بہت حفاظت سے رکھا ہے ان چراغوں کو
بجھتے بجھتے بھی ہواؤں سے الجھ جاتے ہیں
دیکھ فرعون کے لہجے میں مجھ سے بات نہ کر
ہم تو پاگل ہیں خداؤں سے الجھ جاتے ہیں
(عثمان غنی..... پشاور)

جو عشق کرنا ثواب ہوتا.....!
یقین کرلو!!
نہ تم سے ہوتا نہ ہم سے ہوتا.....!
(قاضی حماد سرور..... اوکاڑہ)

کاش میں تم سے ملا نہ ہوتا
تو یہ حال میرا ہو یا نہ ہوتا
میں بھی اوروں کی طرح سے خوش ہوتا
یہ درد جو تم سے عابد مجھے ملا نہ ہوتا
(عابد علی جعفری..... کندیاں)

زندہ رہنا ہے تو حالات سے ڈرنا کیسا؟
جنگ ''لازم'' ہو، تو لشکر نہیں دیکھا جاتا
زندگی کے میدان میں ''معجزے'' نہیں ہوتے
جنگ جیتنا چاہو، تو کشتیاں جلادینا!
(انتخاب: دعا عالم بخاری..... محبوب شاہ)

فاصلے تو قریب کی پہچان ہوا کرتے ہیں
بے بس لوگ اکثر پریشان ہوا کرتے ہیں
یہ سچ ہے جہاں ٹوٹ کر چاہا جائے
وہاں بچھڑنے کے امکان بھی بہت زیادہ ہوا کرتے ہیں
(محمد قاسم رحمان..... ہری پور)

صبح کو چہرے پر تھے دو زخم آنکھوں کی جگہ
رات رونے کی خواہش تھی مگر رویا نہیں
خواب دیکھا تھا کوئی بچپن کی کچی نیند میں
دوستو پھر چین سے میں آج تک سویا نہیں
(شرف الدین جیلانی..... ٹنڈوالہ یار)

ہزاروں شوق و ارمان لے کے رہے چٹکیاں دل میں
حیا ان کی اجازت دے تو کچھ بے باکیاں کرلوں
(انتخاب: حافظ سبحان..... کراچی)

لب پر سجالئے تھے یونہی اجنبی سے نام
دل میں تمام زخم کسی آشنا کے تھے
(انتخاب: سونیا بلال..... نوابشاہ)

مجھے کوئی گلہ نہیں ہے تمہارے یاد کرنے کا اے دوست
اجڑے ہوئے چمن کو تو پرندے بھی چھوڑ جاتے ہیں
(طاہر اسلم مٹھو خان بلوچ..... سرگودھا)

بارش کی طرح تجھ پر برستی رہیں خوشیاں
ہر بوند تیرے دل سے ہر غم کو مٹادے
(انتخاب: محمد ارمان..... کراچی)

میری نظر نے تو اسے دل تک راستہ دیا تھا
میری روح میں سما جانے کا ہنر اس کا اپنا تھا
(انتخاب: منیر احمد ملک..... شاہ پور چاکر کھڈرو)

اے خط خطا نہ کرنا قدموں میں جا گرنا
پوچھیں جو حال میرا جھک کر سلام کرنا
(محمد سلیم میو..... کوٹھ کلاں)

دل کو تیری ہی تمنا اور تجھی سے پیار ہے
چاہے تو آئے نہ آئے تیرا ہی انتظار ہے
(محمد اسحاق انجم..... کنگن پور)

☆☆

خواب کے باہر کچھ بھی نہیں ہے خواب کے اندر سب کچھ ہے
اجلا اجلا چہرہ تیرا چاند، سمندر سب کچھ ہے
تجھ کو خدا سے مانگ لیا ہے اور خدا سے کیا مانگوں
جب تک میرے ساتھ ہے تو مجھے میسر سب کچھ ہے
مرضی ہے انسان کی اپنی جس کو چاہے اپنائے
پیار محبت، نفرت دھوکہ من کے اندر سب کچھ ہے
مانگنے والو مانگو اس سے دے گا وہ اوقات سے بڑھ کر
کھلا ہوا ہے جب اس کی رحمت کا در سب کچھ ہے
کلمہ زبان سے پڑھ لینے کا نام نہیں ایمان
خوف ہو رب کا جس کے اندر اس کے اندر سب کچھ ہے
چاہوں اگر میں کرسکتا ہوں سب کے دلوں پر راج حکیم
علم و ہنر اخلاص کی دولت بخت سکندر سب کچھ ہے
(حکیم خان حکیم......کامل پور موسیٰ)

پنچھی آزاد اچھے لگتے ہیں
پھول شاخوں پہ روز کھلتے ہیں
جو پہاڑوں سے چشمے بہتے ہیں
پھر ندی سے گلے وہ ملتے ہیں
پیڑ سارے اداس ہیں لیکن
بارشوں میں نکھر کے ڈھلتے ہیں
جب ہواؤں کا ساز بجتا ہے
مور جنگل میں رقص کرتے ہیں
پھول اور بچوں میں نہیں کوئی فرق
جب بھی دیکھو وہ ہنستے رہتے ہیں
دنیا میں زندہ دل رہو ہمدم!
مستقل کب ٹھکانے رہتے ہیں
رزق ملتا ہے پتھروں میں جنہیں
میرے رب کے یہ سب کرشمے ہیں
جو خدائی سے پھر گیا خانم!
اس کو فطرت کے راز ڈستے ہیں
(فریدہ خانم......لاہور)

گندے انڈے اور کچھ پتھر چلے
شعر جب محفل میں ہم پڑھ کر چلے
پیار سے انکار اس نے کردیا
واپسی پر اپنا پکڑے سر چلے
تیری خاطر ہاتھ بھی جوڑے گئے
ہم سے جو بھی کچھ ہوا وہ کرچلے
روٹھنا اچھا نہیں ہے آجایئے
تم ہی بتلاؤ کہ کیسے گھر چلے
فیس تو عامل کو جا کے دے چکا
کاش تیرے نام پر منتر چلے
(قدیر رانا......راولپنڈی)

تجھ سے تجھ کو مانگنے ایک جذبہ محکم لئے
ہم تیری محفل میں آئے دیدہ پرنم لئے
جو ملاقات فراق انجام پر تھا منحصر
آج تک ہیں ہم نگاہوں میں وہی عالم لئے
بحر غم حد نظر تک، ناتواں کشتی زیست
پھر بھی احساس ناخدا کے ہم نے کم سے کم لئے
میں مجسم درد غم ہوں، کرب کی تصویر ہوں
دل کے ویرانے میں صدہا غم داستان لئے
اب مسرت کی طلب ایک بھول ہے
ساری دنیا جب ہے دامن میں قضائے غم لئے
کررہا ہے ابن آدم ابن آدم کا شکار
اب کلاشنکوف ہاتھوں میں لئے بم لئے
ہورہی تھی واجد داغی تقسیم جب روز اجل
ہم نے واجد شادمانی کے بجائے غم لئے
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

جہاں میں جس سے تھی زندگانی میری
بھولے سے اس نے قدر نہ جانی میری
جل کے راکھ ہوگئے ہم آخر
آکے گزر گئی پھر شام سہانی میری
کسی نے توڑ دیئے پیار کے بندھن سارے
واپس کردی تو نے پھر نشانی میری
گزرے دنوں کی بات نہ کر ہمسفر

...
اداس دل کی تھی پھر یہ کہانی میری
جا کے کوئی پلٹ کے آتا نہیں کبھی
اندھیروں میں لٹ گئی جیسے جوانی میری
بیت گیا جیون تو احساس ہوا جاوید
دل سے میرے اب جاتی نہیں پریشانی میری
(محمد اسلم جاوید……فیصل آباد)

ایک شخص میری آنکھوں کا نور ہونا چاہتا ہے
اس بے چین دل کا سرور ہونا چاہتا ہے
میری محبت کی پناہوں میں چھپا ہے وہی
پہلے اجنبی مگر اب کی بار دل کا حضور ہونا چاہتا ہے
میں بھی ہوں اسی کی چاہت میں اتنا پاگل کہ
ہر خواب آنکھوں سے عبور ہونا چاہتا ہے
اسے دیکھ کر ہر خوشی ہے خوشی میری
لگتا ہے کہ ہر غم مجھ سے دور ہونا چاہتا ہے
اس قدر حسین ہے وہ چاند صنم میرا
دل اس کی چاہت میں چور چور ہونا چاہتا ہے
وہ چاند صنم میرا چرالے گا نور تیرا ناز
اے چاند چھپ جا کیوں بے نور ہونا چاہتا ہے
(شرف الدین جیلانی……ٹنڈو الہ یار)

آجائے سامنے اگر تو کچھ بات ہے
چمکے ہتھیلی پہ قمر تو کچھ بات ہے
یادوں کا ہجوم، نغمات کی صدا ہو
جذبات کا ہو اثر تو کچھ بات ہے
دل گیر ہو جاناں بغل گیر بھی ہو جاناں
دونوں کی ہو دیدہ تر تو کچھ بات ہے
سب چھوڑ کے اشکوں کو کریں اک وعدہ
نہ ہو ہماری زیست میں ہجر تو کچھ بات ہے
آرزوؤں، تمناؤں کا سفر کاٹے نہ کٹے
جلیں جو دیپک سحر تو کچھ بات ہے
(دلکش امیر پوری……کہروڑ پکا)

خوف کی اک وادی کا سفر
کررہے ہیں ہر ماہ کے تیسوں پہر
اس سفر میں حادثے پیش آئیں گے
ہر قدم پہ آپ کو لگے گا ڈر
آپ کے پلنگ پہ سوئے گی چڑیل
دیکھ لینا کسی روز کر کے ڈر کا سفر
آپ کی مردوں سے ہوگی دوستی
آ چڑھے گا جن کا بچہ آپ پہ
ایک سایہ آئے گا پیچھے سے اور
کاٹ کر لے جائے گا تم سب کے سر
خون کے پیالے پیو گے تم سب
اور ناگن کھاؤ گے تم بھون کر
دیکھتے ہی دیکھتے کھوپڑیوں کا پہاڑ
بھربھرا کر گر پڑے گا آپ پہ
گفتگو فرمائے گی قبرستان کی قبر
اور مردہ جائے گا زندوں کے گھر
مختصر یوں ہے کہ یہ پورا سفر
لمحہ لمحہ خوف میں ہوگا بسر
ہاں مگر ان حادثوں کے باوجود
آپ سب لوٹیں گے زندہ اپنے گھر
(ایس امتیاز احمد……کراچی)

جس کی آنکھیں ہیں اتنی نشیلی، وہ خود کتنی حسین ہوگی
اسے دیکھتے ہی میں اس میں کھوگیا تھا
جب اپنی خبر نہ تھی، مجھے تو دوسروں کی کیا خبر ہوگی
چین پایا نہیں ہے میں نے، میرے دل پہ اب قابو نہیں ہے
میری آنکھیں اب منتظر اسی کی ہیں، لگی بے چینی مجھ کو بڑی ہے
میری سمجھ سے بالا تر ہے یہ، کہ وہ انسان ہوگی
مجھے تو لگا ہے ایسے، جیسے آسمان سے اتری ہوئی
وہ کوئی پری ہوگی
(پری……لاہور)

سونا چاہتا ہوں پر نیند آنکھوں سے دور ہے
دل بھی اب تو بوجھل سا اور مجبور ہے
محبت سے دیکھنا اور پھر منہ موڑ لینا
کیا یہی سنگدل زمانے کا دستور ہے
کس سے کہوں کون سنے گا داستان میری

یہاں تو ہر کوئی اپنے آپ میں ہی مشغول ہے
چھاننا ریت صحرا کی ٹھہرا عاشق کا کام
ہاں اسی لئے تو عشق بہت مشہور ہے
وہاں فرہاد نے اس کیلئے نکالی نہر دودھ کی
یہاں انارکلی کو دیوار میں چنوانے کو کوئی معمور ہے
(طارق محمود......کامرہ کلاں)

نشہ کرنے کی جب سے عادت ہوئی ہے
کیا دنیا کیا خوشی اپنی باقی رہی ہے
جب سے یہ موسم بدلا ہے پیار کا صنم
کہاں تم آئی ہو کہاں سے چاہت آئی ہے
یاد کرتے ہوئے تم کو میں شراب کی بوتل پی گیا
ہوش کہاں باقی رہا کہاں سے صدا آئی ہے
میں تو میرے انتظار میں سب کچھ بھولا بیٹھا
نہ ہنسی راس آئی نہ کوئی خوشی آئی ہے
ہمارے ہاتھوں سے لگا وہ پیار کا پودا خزاں رسیدہ
نہ اس کے پتے باقی رہے نہ اس پر کبھی بہار آئی ہے
(عابد علی جعفری......کندیاں)

آشفتگی کے تو میری وفا بھی نہیں
میرا سلسلہ کوئی تجھ سے جدا بھی نہیں
چلیں تو کس سفر سے تجھے پانے
ہم تیرے نگر سے آشنا بھی نہیں
عداوتیں بے سبب لوگوں کا ہنر ہے
تیرے بن میرا زمانے سے گلہ بھی نہیں
زندگی کا ہر سفر طے کرنا ہے مجھے
تیرا بچھڑنا میرے غم کی ابتدا بھی نہیں
ہر قافلہ پرنم گزرتا ہے میری بستی سے
مضطرب لمحوں سے میں جدا بھی نہیں
مرا مراسم تجھ سے ساحل تک نہ تھا احمد
اب کے میں موجوں میں تنہا بھی نہیں
(احمد فراز احمد...... ہری پور)

اڑ جائیں گے تصویر کے رنگوں کی طرح ہم!!!
ہم وقت کی ہنسی پر پرندوں کی طرح ہیں

تم ساحل پر کھڑے ہوئے پھولوں کی طرح ہو
ہم ریت پر لکھے ہوئے لفظوں کی طرح ہیں
تم آج آئندہ بھی زمانے کی جھلک ہو
ہم آج بھی گزرے ہوئے لمحوں کی طرح ہیں
ایک عمر ترستے ہیں کسی ایک خوشی کو
ہم لوگ بھی بنجر زمینوں کی طرح ہیں
دنیا کے لئے خوش ہی سہی تیرے لئے ہم
مخلص کسی ماں کی دعاؤں کی طرح ہیں
(سید عبادت راج......ڈیرہ اسماعیل خان)

حسرت و یاس کی تصویر بنا ہے یہ سال
میری ناکامی کی تفسیر بنا ہے یہ سال
ایک ایک کرکے یہاں آتے رہے ہیں کچھ غم
رنج و آلام کی جاگیر بنا ہے یہ سال
اس نے خوشیوں کا گلا کاٹا ہے بے دردی سے
کیوں میرے واسطے شمشیر بنا ہے یہ سال
میرے گلشن میں بہار آئی نہیں حلیم
ایک افسردہ سی تصویر بنا ہے یہ سال
مجھ پر دیوانگی سی چھائی رہی حلیم
بارہا رنج و غم کا وزیر بنا ہے یہ سال
(محسن عزیز حلیم......کوٹھا کلاں)

محبت اک ادا ہے اس کو سب نے مانا ہے
چاہتوں کے سلسلے کو کب اس نے جانا ہے
وہ جدائی مجھ سے مانگتی ہے بہت معصوم بن کر
وہ میری منزل نہیں ہے یہ دل کو سمجھانا ہے
سوچا تھا تجھے دل میں بسا کے رکھیں گے جان وفا
لیکن اب تیری یاد کو مجھے دل سے مٹانا ہے
کاش زندگی کے اس سفر میں تم میری ہوتیں فقط میری
اب اس خواہش کو دل کے کسی کونے میں سلانا ہے
(مونا شاہ قریشی......کبیر والا)

دسمبر کی سرد شاموں میں
جب بھی!
کھلتے ہیں یادوں کے گل

عرصے تک مہکتی رہتی ہے فضا
ان خوش رنگ لمحات کو یاد کر کے
نقش پا بھی نہیں جن کے اب دور تک
لیکن پھر بھی یاد تو آتی ہے
دیکھو...... دسمبر پھر لوٹ آیا ہے
یخ بستہ لمبی راتیں ہیں، خاموشی ہے
ان ٹھٹھرتی، بھیگتی سرد شاموں میں
کچھ پرانے درد جاگ اٹھتے ہیں
گل داؤدی کی پر کیف خوشبو سے فضا معطر ہے
میں چلتا جا رہا ہوں...... بس
قدموں تلے چرچراتے پتے احساس دلا رہے زندگی کا
کبھی رقص کرتی تھی زندگی اس موسم میں
فضائیں گیت گاتی تھیں اور دور افق میں اڑتے پرندے
محبتوں کے پیامبر ہوا کرتے تھے
موسم آج بھی وہی ہے، ساون اب بھی برستا ہے
ہاں شاید! گردش ایام نے حالات بدل دیئے ہیں
اب تم بھی وہ نہیں رہیں، شاید میں بھی......
لیکن اک بات مشترک ہے
دسمبر آج بھی بھاتا ہے
برستی بوندوں سے دوستی آج بھی ہے
گل داؤدی آج بھی سانسوں کو معطر کرتا ہے
اور یاد کے دریچوں سے کوئی چہرہ جھانکتا ہے
دل تمہیں کل بھی یاد کرتا تھا آج بھی یاد کرتا ہے
اگر ممکن ہو تو لوٹ آؤ کہ......
دسمبر پھر لوٹ آیا ہے۔

(نوید قمر...... کراچی)

دونوں کو آ سکیں نہ نبھانی محبتیں
اب پڑ رہی ہیں ہم کو بھلانی محبتیں
سب سربز فریب ہیں کیا انکار اعتبار
یہ پیار حسین عشق جوانی محبتیں
گن گن رفاقتوں کے دیئے واسطے مگر
اس کو نہ یاد آئیں پرانی محبتیں
گزری راتوں کے غم ہی اب تک بھرے نہیں
پھر اور کیا کسی سے بڑھائی محبتیں

جانے وہ آج کون سے رستے سے آئے گھر
ہر موڑ ہر گلی میں بچھائی محبتیں
دل کی حالت کا بیان سب کے سامنے
اپنے آپ سے بھی چھپائی محبتیں
نفرت کے واسطے کبھی فرصت نہیں ملی
ہے اپنی مختصر سی کہانی محبتیں

(انتخاب: آوشیہ نیازی...... بٹہ موڑی بگرام)

سیراب دید ہوں گے یقیناً یہیں سے ہم
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ تری اس یقیں سے ہم
پوچھے نہ کوئی معجزہ سجدہ جنوں
ہر سنگ راہ توڑ دیں اپنی جبیں سے ہم
ترک خیال وصل پہ آمادہ ہوگئے
مجبور ہو کے تیری مسلسل نہیں سے ہم
یہ رعب حسن آنکھ ملانا محال ہے
کس طرح ہمکلام ہوں اس مہ جبیں سے ہم
کیا خوب ہے ہماری ملاقات کا یہ کھیل
تم آسماں سے دیکھ رہے ہو زمیں سے ہم
ملتا ہے جس سے درس محبت زمانے کو
رکھتے ہیں پیار ایسے مکاں کے مکیں سے ہم
پوشیدہ طور پلتے ہیں جس آستیں میں سانپ
کرتے ہیں اجتناب اسی آستیں سے ہم
آنکھوں میں اس کی تیر گئے اشک غم کاشف
کر دیں اب اختتام فسانہ یہیں سے ہم

(کاشف عبید کاوش...... بٹہ موڑی۔ بگرام)

خون مسلم کا رائیگاں نہیں جائے گا
کوئی ہمیں یوں مار کر پچھتائے گا
ہم تو مر کر بھی پائیں گے اک زندگی
تو ہماری زندگی نہ پائے گا
ہم سے مہکے گا یہ سارا گلستاں
تو کہاں گلشن مرا مہکائے گا
وقت پہلے سا نہیں تو کیا ہوا
وقت اچھا بھی تو عزیز آئے گا

(احسن عزیز...... کوٹھا کلاں)

تمہیں کس نے کہا تھا؟
دوپہر کے گرم سورج کی طرف دیکھو
اور اتنی دیر تک دیکھو کہ بینائی پگھل جائے؟
تمہیں کس نے کہا تھا؟
آسمان سے ٹوٹتی، اندھی بجلیوں سے دوستی کرلو
اور اتنی دوستی کرلو......
کہ گھر کا گھر ہی جل جائے......
تمہیں کس نے کہا تھا؟
ایک انجانے سفر میں
اجنبی راہرو کے ہمراہ دور تک جاؤ
اور اتنی دور تک جاؤ......
کہ وہ رستہ بدل جائے......؟
(ساحل دعا بخاری......بصیر پور)

یادوں کے گلاب کھلتے ہیں
بچھڑے ہوئے لوگ ملتے ہیں
ٹکڑے ہوئے دل کے ہزاروں
غم آنسوؤں میں ڈھلتے ہیں
دوست بھی بدل گئے نظریں
پھر آنسو میرے سلگتے ہیں
بجھتے ہیں چراغ روشنی کوئی نہیں
دکھ اپنا کسی کو سناتے ہیں
ہوگئی سحر کسی کے انتظار میں
پاس رہ کے بھی وہ ستاتے ہیں
روز ذکر ہوتا ہے کسی کی وفا کا
پہلو یوں بھی لوگ بدلتے ہیں
چھوڑ گزرے دنوں کی یادوں کو جاوید
جانے والے کب لوٹ کے آتے ہیں
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

ردا حیا کی اتر گئی ہے
حوا کی بیٹی بکھر گئی ہے
جو بس رہی تھی دلوں میں غیرت
میں سوچتا ہوں کدھر گئی ہے
تجھی کو معجز نما ہے پایا
جہاں جہاں پہ نظر گئی ہے
جو معتبر تھی جہاں میں ہستی
مثال رقص شرر گئی ہے
ستم گروں کی ستم گری سے
حیات اپنی سنور گئی ہے
امید فصل بہار فائق
خزاں رتوں میں ہی مرگئی ہے
(عمران فائق......اٹک)

دل کا نگر سونا کروں
جذبوں کو ان ہونا کروں
پہچان اپنی
میں اپنا چہرہ
بیچ دوں
اور
اس کے بدلے
حصول ہو مجھے سیم وزر
مجھے سیم وزر
سے کیا غرض
میرا فن میرے پاس ہو
میرا خواب میری اساس ہو
مجھے تنگ دستی قبول ہے
تری آرزو تری بھول ہے
تو گلاب ہے میں ببول ہوں
تو ہے کارواں تو میں دھول ہوں
(چوہدری قمر جہاں علی پوری......ملتان)

”عشق“ کچھ سوچ کے خاموش رہا تھا ورنہ
حسن تو بکتا ہوا بازار تلک آگیا تھا
میرے اندر کے کسی ”ہجر“ نے روکا ہے مجھے
ورنہ میں ”عشق“ کے انکار تلک آگیا تھا
پھر ایک رات اذیت سے مرگیا تھا کہیں
تمہارے عشق کو اندر سے مارتا ہوا میں
پہلے تو زندگی کی تمنا تھی ”عشق“ میں
اب ڈھونڈتا ہوں، کہ میرا قاتل کدھر گیا؟
”عشق“ معیار وفا کو کرتا نہیں بدنام......!
اور نہ ”ادراک“ نے دکھلائے تھے رستے کیا کیا؟
مخصوص دلوں کو ”عشق“ کے الہام ہوتے ہیں
محبت معجزہ ہے، معجزے کب عام ہوتے ہیں
زمانہ دیکھے گا، جب میرے ”عشق“ کا سورج
تیری جبیں پہ نمودار ہو رہا ہوگا......؟
تونے دیکھی ہی نہیں ”عشق“ کے قلندر کی دھمال
پاؤں اگر پتھر پہ بھی پڑے تو دھول اڑا کرتی ہے
”عشق“ ازل سے اپنی روایتوں پہ قائم
امتحان جس کا بھی لیتا ہے رعایت نہیں کرتا
بھوکا اور پیاسا رکھنا، کمسن دیوانوں کو
اے ”عشق“ تیرا انداز ستم ہے یزیدوں جیسا
بہت مشکل زمانوں میں بھی ہم اہل محبت
”وفا“ پر ”عشق“ کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں
لے کر زنجیریں ہاتھوں میں
کچھ لوگ تمہاری تاک میں ہیں
”اے عشق“ ہماری گلیوں میں، نہ اور پھر تو اچھا ہے
(انتخاب: دعا عالم بخاری......بصیر پور)

یہ جو دور ہے آزمائش کا
مجھے اس سے کوئی گلا نہیں
یہ تو زندگی کا اصول ہے
کبھی اپنا کوئی ہوا نہیں
یہ جو سلسلہ ہے اک درد کا
یہ تحفہ یونہی ملا نہیں
تو جیسے جان کر بھی انجان ہے
وہ راز میں نے کہا نہیں
مجھے اپنی خبر تو ہے مگر
تیری سوچ کا کوئی پتہ نہیں
یہ تنہا ہے میری زندگی

بے سبب یہ بنی نہیں اے دسمبر
یہ صدا سی ہے جو گونجتی
وہ لفظ تو نے کہا نہیں
میرا جرم ہے میری سادگی
میری اور کوئی خطا نہیں
(عثمان غنی.....پشاور)

کچھ عمر کی پہلی منزل تھی
کچھ رشتے تھے انجان بہت
کچھ ہم بھی پاگل تھے لیکن
کچھ وہ بھی تھے نادان بہت
کچھ اس نے بھی نہ سمجھایا
یہ پیار نہیں آسان بہت
اکثر ہم نے بھی کھیل لیا
جس کھیل میں تھے نقصان بہت
جب بکھیر گئے تو یہ جانا
ایسے آتے ہیں یہ طوفان بہت
اب کوئی نہیں جو اپنا ہو
ملنے کو تو ہیں انسان بہت
اے کاش وہ واپس آجائے
یہ دل ہے اب سنسان بہت
(طاہر اسلم عرف مٹھو بلوچ.....سرگودھا)

گریز شب سے، سحر سے کلام رکھتے تھے
کبھی وہ دن تھے کہ زلفوں میں شام رکھتے تھے
تمہارے ہاتھ لگے ہیں، تو جو کرو سو کرو......
وگرنہ تم سے تو ہم سو غلام رکھتے تھے
یہ اور بات، ہمیں دوستی نہ راس آئی
ہوا تھی ساتھ، تو خوشبو مقام رکھتے تھے
نجانے کونسی رت میں بچھڑ گئے وہ لوگ
جو اپنے دل میں بہت احترام رکھتے تھے
وہ آتو جاتا کبھی ہم تو اس کے رستے پر
دیئے جلائے ہوئے صبح و شام رکھتے تھے
(راحل بخاری.....محبوب شاہ)

مجھے اتنا تو بتا
میری جان جاناں کیسا ہے
میرا یار پرانا کیسا ہے
نئے سال کا سورج چڑھ جائے
مجھے یاد جو اس کی آجائے
تب آنکھ سے بہتے اشکوں کو
کس کرب سے میں روکوں گا
میری سانسیں تھوڑی باقی ہیں
اسے کہو کہ آکر مل جائے
اے دسمبر اسے کہنا مل جائے
وہ آئے تو میرے دل کی سب
بند گلیاں بھی کھل جائیں
اے دسمبر......
(سید عبادت راج.....ڈیرہ اسماعیل خان)

میں جب کسی کو دعا کرتے دیکھوں
دعا کرنے والے عقیدت سے سجتے
پھولوں میں بستے، رستے، مہکتے
شام کے آتے جگنو چمکتے
منت کی چادر سر پہ اٹھائے
محبت کا تعویذ دل سے لگائے
آنکھیں چرائے، نظریں بچائے
چاہت کے موتی چنتے ہی جائے
عشق کی مالا جپتے ہی جائے
صرف ایک گلی کے چکر لگائے
خوابوں کا شاہ زادہ
محبتوں کا دل دادہ
دعا کرنے والے آنکھوں کو جچتے
میں جب کسی کو دغا کرتے دیکھوں
دغا کرنے والے کے دل میں
کدورت
عداوت کا مادہ
رنجش کی بساط بچھائے
نفرت بھرے کچھ پیادے
بغاوت آمادہ
دغا کرنے والے ہر آنکھ کھٹکتے
میں جب کسی کو دعا کرتے دیکھوں
ظریف احسن دعا کرنے والے
میری طرح ہی یہ انسان ہیں سارے
جوگی، ملنگ، درویش، صوفی
بزرگ، قلندر، یار، سجن، مجذوب،
سالک، کامل
سائیں، ولی، ڈھولا، محبوب، پیا
آپ، جناب دعا کرنے والے
شب و روز چاند سورج
روشن صورت یہ سارے انسان
ظریف احسن، محبت کے محسن
یہ انسان سارے، انسان کے محسن
(ظریف احسن.....کراچی)

تیرے نام کہانی لکھوں
تجھ کو رات کی رانی لکھوں
جھیلتا جاؤں دن کی وحشت
پھر بھی شام سہانی لکھوں
اول اول تیری صورت
خال و خد لاثانی لاکھوں
اپنے لہو سے میں تو سجنی
تیرے نام جوانی لاکھوں
ایسے تجھ پہ واری جاؤں
یعنی خون کو پانی لاکھوں
اپنے پیار کو سب لکھتے ہیں
میں بھی یار کو جانی لاکھوں
من برکھا میں تجھ کو بھگوؤں
پیار کا آنچل دھانی لکھوں
(ڈاکٹر ثوبیہ قادر.....کوئٹہ)

☆☆

ذہنی اذیت

صبا محمد اسلم۔ گوجرانوالہ

حسن سلوک اور نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی، اسی حقیقت کو احاطہ کرتی یہ کہانی پڑھنے والوں کو ورطہ حیرت کے ساتھ ساتھ اچنبھے میں ڈال دے گی کہ نیکی کبھی بھی چھپائے نہیں چھپتی اور پھر......

نیکی، بدی پر مبنی خوف کے سمندر میں غوطہ زن دل گرفتہ دل فگار اور دل فریب کہانی

''شادی'' کچھ لوگوں کے لئے خوشیوں کا پیغام لاتی ہے تو کچھ لوگوں کے لئے سراپا ''غم'' بن جاتی ہے۔ میرا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جو شادی کے بڑے خوبصورت خواب آنکھوں میں سجا لیتے ہیں مگر وقت کی دھوپ سارے خوش رنگ ارمان جھلسا دیتی ہے۔ جیسے گرمی کی دھوپ کپڑوں کے رنگ پھیکے کر دیتی ہے۔

ابھی میری شادی کا دوسرا دن تھا جب میری ''ساس اماں'' کمرے میں تشریف لائیں۔ میں احتراماً ادب سے کھڑی ہوگئی۔ انہوں نے ناقدانہ نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا اور صفائی پر اچھا خاصا لیکچر سنا دیا، میں سر جھکائے سنتی رہی۔ جانے لگیں تو مخاطب ہوئیں۔

''بہو یاد آیا، میں تو کچھ اور کہنے آئی تھی صبح

ریحان آفس اور سویٹی کالج چلی جاتی ہے اور گھٹنوں میں درد کی وجہ سے مجھ سے کچھ ہوتا نہیں پہلے تو کام والی تھی مگر اب تم آ گئی ہو اس لئے صبح سات بجے ناشتہ بن جائے ہر صورت۔ اب تم گھر بار کی مالک ہو۔ یہ سب تمہاری ذمہ داری ہے۔'' یہ کہہ کر ساس کمرے سے چلی گئیں۔

اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ''لو ماہا بی بی، تمہاری والدہ نے تو ناہید بھابھی کو پندرہ دن بعد کام پر لگایا تھا۔ تمہاری ساس نے تو آتے ہی کام سونپ دیا۔''

میں نے جلدی سے کپڑے تبدیل کئے، ریحان کمرے میں آئے تو انہیں شاک لگا مجھے دیکھ کر، حیرت سے بولے۔

''ماہا! تم نے اتنی جلدی ڈریس چینج کرلیا؟ مہمانوں کی وجہ سے تو میں نے جی بھر کر تمہیں دیکھا بھی نہیں تھا؟''

میں نے ایک شکوہ کناں نظر ان پر ڈالی اور بیڈ کی طرف آ گئی۔ موبائل پر 5 بجے کا آلارم سیٹ کیا، ساتھ ہی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں اپنے گھر میں تو میں اپنی مرضی سے اٹھنے کی عادی تھی۔

الارم لگایا اور سر سے لے کر پاؤں تک چادر تان لی تاکہ ریحان کو اندازہ ہو جائے کہ مجھے کوئی بات نہیں کرنی ان سے۔

بڑی مشکل سے سو پائی تو الارم کی آواز نے جگا دیا۔ دل چاہا پھر سو جاؤں ابھی تو سوئی تھی مگر ساس کے خوف نے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ الارم بند کر کے ریحان کو دیکھا جو خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔

دل چاہا انہیں اٹھا دوں کہ مجھے بتا دیں کچن کہاں ہے مگر پھر خود ہی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ سارا گھر سائیں سائیں کر رہا تھا سوائے میرے، سب مزے سے سو رہے تھے۔

کچن ڈھونڈ کر فریج کا جائزہ لیا آٹا نکال کر باہر رکھا۔ کل کا کافی سالن پڑا تھا۔ پھر کمرے میں آ کر وضو کیا نماز سے فارغ ہو کر کچن کی راہ لی۔

پراٹھے بنا رہی تھی کہ ریحان کچن میں آ گئے میرا خیال تھا وہ اتنی جلدی کچن کا کام کرتے دیکھ کر حیران ضرور ہوں گے مگر وہ آرام سے مجھے سب گھر والوں کی پسند، ناپسند کے بارے میں بتانے لگے۔ ''سویٹی ناشتے میں پراٹھے کے ساتھ مکھن لیتی ہے۔ امی کو سالن پسند ہے مجھے پراٹھا آملیٹ کے ساتھ اچھا لگتا ہے۔''

ان سب باتوں میں بس ایک بات نہیں تھی کہ ''ماہا! تمہیں کیا پسند ہے ناشتے میں۔'' اہم تھا تو بس اپنی پسند اور ناپسند کا تذکرہ۔

پونے سات تک میں نے ناشتہ ریڈی کر کے ٹیبل پر سیٹ کر دیا، اسی وقت میری ساس اور میری نند سویٹی پہنچ گئیں اور سب نے یوں ناشتہ کیا جیسے یہ معمول کی روٹین ہو۔

دو دن بعد میری امی مجھ سے ملنے آئیں اور مجھے کچن میں کام کرتا دیکھ کر کافی افسردہ ہوئیں کہ ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں، امی نے مجھے ساتھ لے جانے کی بات کی تو میری ساس نے صاف جواب دے دیا کہ انہیں بہو کا روز روز میکے جانا پسند نہیں امی میری ساس کے اس انداز سے غمزدہ واپس چلی گئیں۔

یہ اس کے دو دن بعد کا واقعہ ہے میں نے آٹا گوندنے کے لئے کنستر کا ڈھکن اٹھایا تو میری چیخ نکل گئی اس میں ایک مردہ چڑیا خون میں لت پت پڑی تھی۔

میری چیخ سن کر سب آ گئے۔ میری ساس نے غصے سے کہا ''کیا موت پڑ گئی چیخنا شروع کر دیا؟''

میں نے کنستر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''اس میں مردہ چڑیا پڑی ہے۔''

میری سار اور ریحان نے دیکھا پھر ایک دم ساس سیدھی ہوئی اور بولیں۔ ''بہو! اندھی ہو گئی ہو کیا؟ یہاں کچھ بھی نہیں۔''

میں نے گھبرا کر دیکھا اس میں واقعی کچھ نہیں تھا۔

میری ساس نے اتنی زور سے میرے منہ

پرتھپڑ مارا کہ آنکھوں کے آگے تارے ناچنا کسے کہتے ہیں، اس دن مجھے معلوم ہوا کے ساس کیسی ہوتی ہے۔

ساس کے جانے کے بعد ریحان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی اور کہا۔ ”کام سے فارغ ہوجاؤ پھر آج ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔“ مجھے پتہ تھا کہ ان باتوں کا نہ میرے پاس وقت ہوگا نہ ریحان کے پاس۔

ان دنوں عجیب عجیب باتیں ہونے لگیں۔ میں اگر کمرے میں ہوتی تو مجھے آواز آتی ”بہو!“ مجھے لگتا ساس نے پکارا۔ بھاگ کر ساس کے کمرے میں جاتی تو وہ سورہی ہوتیں۔

”میں سونے لگتی تو لگتا جیسے کوئی پاؤں میں گدگدی کررہا ہے جو چیز جہاں رکھتی ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک جاتی مگر نہ ملتی۔ ساس سے ڈانٹ الگ کھاتی۔“

ایک دن میرے بھیا مجھے کچھ دنوں کے لئے لینے آگئے۔ میرے لئے تو جیسے عید ہوگئی۔ کتنی منت ساجت کے بعد میری ساس نے مجھے جانے کی اجازت دی، یہ تو میں ہی جانتی ہوں۔

میکے آکر مجھے وہ بات نظر آئی جو پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ جو میرے ساتھ میری ساس وہاں سلوک کررہی تھیں۔ وہ میرے اپنے گھر میں میری بھابھی کے ساتھ میری امی کررہی تھیں۔

میں نے سوچ لیا کہ میرے ساتھ میری ساس کا سلوک چاہے جتنا بھی خراب رہے مگر اپنی امی کا برین واش کرکے جاؤں گی۔ میں نے آہستہ آہستہ امی کے دماغ میں بٹھانا شروع کردیا کہ ”جیسا سلوک آپ یہاں بھابھی کے ساتھ کرتی ہیں ویسا میری ساس میرے ساتھ کرتی ہے۔“

امی نے بھابھی سے اپنے رویے کی معذرت کی اس پر بھابھی نے آبدیدہ ہوکر کہا کہ ”آئندہ میں بھی ماہا کی طرح ہی آپ کا خیال رکھوں گی۔“

ہمارا گھر ایک مثالی گھر نظر آنے لگا کہ ریحان

مجھے لینے آ گئے۔ میں اس سکون سے واپس آ گئی کہ اب میرا گھر بھی سکون کا گہوارہ بن جائے گا۔ مگر میرے لئے تو وہ گھر پہلے سے بھی زیادہ جہنم کدہ بن گیا۔

میری ساس نے اپنی بیٹی کے لئے کچھ زیور رکھا تھا کہ اس میں سے جھمکے غائب ہو گئے۔

ریحان کے آتے ہی گھر میں طوفان آ گیا۔ میرے کمرے کی تلاشی لی گئی تو وہ جھمکے نجانے کہاں سے میری ڈریسنگ کی دراز میں آ گئے جھمکوں کا ملنا تھا کہ میری ساس نے میری پٹائی شروع کر دی اور نجانے مجھے اور میرے خاندان کو کیا کچھ سنا ڈالا۔

ریحان کی آنکھوں میں اپنے لئے شک دیکھ کر میں بالکل ٹوٹ گئی۔ میں روتے روتے یونہی سو گئی۔ اچانک میری آنکھ کھلی تو میرے پاس ''معذرت'' کا کارڈ پڑا تھا۔ میں خوش ہو گئی کہ ریحان کو مجھ پر اعتبار آ گیا۔ مگر وہ کمرے میں موجود نہیں تھے میں انہیں دیکھنے کے لئے باہر آئی تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی کہ میری ساس ریحان سے مجھے چھوڑنے کا کہہ رہی تھیں۔

میں آبدیدہ نم پلکوں کے ساتھ واپس پلٹ آئی۔ بیڈ پر ایک اور کارڈ پڑا تھا جس پر لکھا تھا۔

''میرا نام شالدہ ہے اور میرا تعلق قوم جنات سے ہے۔ آپ فکر نہ کریں اور ایسا مزہ چکھاؤں گی کہ یہ بڑھیا تاحیات ذہنی اذیت کو بھلا نہ پائے گی میں شروع دن سے آپ کے ساتھ ہوتی زیادتی کو دیکھ رہی ہوں اور اب آپ کے ساتھ ہونے والی زیادتی میرے بس سے باہر ہو گئی ہے بس آپ تھوڑے وقت کا انتظار کرے۔ اپنی والدہ کو آپ نے درست راستہ دکھایا آپ کی ساس کو میں سیدھا کر دوں گی۔''

میں حیران رہ گئی کہ یہ کون ہے کیسے جانتی ہے؟ اور اب یہ کیا کر سکتی ہے، جب میرا شوہر ہی میرے خلاف ہے، یہ کیسی دھمکی ہے اور ساس کے خلاف کیا کیا جائے گا۔ اچانک پہلا کارڈ غائب ہو گیا اور ایک اور کارڈ وہاں نمودار ہوا اس پر لکھا تھا۔

''آپ کے گھر کے لان میں جو آم کا درخت ہے ہمارا اس پر بسیرا ہے، جب آپ کی شادی ہوئی تو آپ مجھے اتنی پسند آئیں کہ میں زیادہ وقت یہاں گزارنے لگی میرا کوئی بھائی بہن نہیں اس لئے آپ مجھے اپنی بہن سمجھیں۔ آپ نے کھانا نہیں کھایا میں کھانا لائی ہوں۔''

جب میری نظر سامنے میز پر پڑی تو وہاں گرم بریانی اور رائتہ پڑا تھا۔ میں کھانے لگی۔

جب کھا کر فارغ ہوئی تو سب برتن اور کھانا غائب ہو گیا میں بستر پر لیٹ گئی اور ساتھ ہی مجھے نیند آ گئی۔

صبح حسب عادت 5 بجے اٹھی نماز پڑھنے کے بعد سب کی پسند کا ناشتہ بنایا اور ٹیبل پر لگا کر کمرے میں واپس آ گئی۔ کس نے کھایا کس نے نہیں مجھے نہیں معلوم۔ نہ کسی نے مجھ سے کہا کہ تم بھی کچھ کھا لو۔

اور پھر اسی دن ریحان مجھے میری امیر کے گھر چھوڑ گئے۔

میرے پیچھے میری ساس نے میری نند کی منگنی کر دی۔

میری نند کے سسرال والوں نے اسے منگنی پر گولڈ کا سیٹ دیا مگر اگلے دن ہی وہ سیٹ نجانے کہاں غائب ہو گیا اور سویٹی کے سسرال والوں کو نجانے کیسے اس کی خبر ہو گئی۔ وہ لوگ بھی عجیب وغریب باتیں بنانے لگے۔

ایک دن اچانک سویٹی نے کسی کام سے اپنی امی کی الماری کھولی تو اس میں کپڑوں کے درمیان سیٹ پڑا دیکھ کر حیران رہ گئی اس نے زور سے اپنی ماں کو آواز دی ریحان اور اس کی ماں دونوں کمرے میں آ گئے۔

ماں اپنی الماری میں پڑا سیٹ دیکھ کر حیران رہ گئی سویٹی اپنی ماں پر چلانے لگی کہ ''آپ کو سیٹ اتنا پسند تھا تو مجھ سے کہہ دیتیں۔ میں خود دے دیتی آپ کو اس طرح چرانے کی کیا ضرورت تھی؟''

ریحان گہری سوچ میں ڈوب گئے اب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا اور ان زیادتیوں کا بھی

جوان کے گھر والوں نے میرے ساتھ کیں اور میں نے خون کے آنسو روتے ہوئے ہر ظلم کو چپ چاپ سہا اور کسی بات کا شکوہ نہیں کیا۔ سویٹی کے سسرال والوں نے رشتہ ختم کردیا چوری کی بات کو بنیاد بنا کر۔ سب سے اچھنبے اور غصہ کرنے کی بات یہ تھی کہ ان لوگوں کو ان ساری باتوں کا علم کیسے ہوگیا تھا کہ ماں نے اپنی بیٹی کا سیٹ جان بوجھ کر چرایا تھا۔

اب میری ساس کو اپنا ہر ظلم یاد آنے لگا تھا جو انہوں نے مجھ پر کیا تھا۔

اگلے دن میری ساس اور میرے شوہر گھر آگئے۔ دونوں کافی نادم دکھائی دے رہے تھے۔ میری ساس، مجھ سے اپنے رویے کی معذرت کرنے لگیں اور شوہر سر جھکائے بیٹھے رہے۔ میں نے بھی کھلے دل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے ناروا اور ناقابل برداشت سلوک کو معاف کردیا کہ اللہ کو معاف کرنے اور احسان کرنے والے لوگ پسند ہیں۔

میں نے بھی اللہ کی رضا کے لئے معافی دی کہ یوم حشر مجھے بھی اللہ سے معافی کی ضرورت ہے اگر میں لوگوں کو معاف کرنا نہیں سیکھوں گی تو اللہ کی ذات بھی مجھے معاف کیسے کرے گی پھر احسان کا بدلہ تو احسان ہی ہے۔ اور معاف کرنے والے لوگ اچھے ہوتے ہیں۔"

میں سسرال آگئی ریحان کسی کام سے باہر گئے تو ساس کمرے میں آئیں اور میرے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے گویا ہوئیں۔ "بہو میں اپنی ساری غلطیوں اور زیادتیوں کی معافی مانگتی ہوں، میں نے کافی غور کیا اور یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی کہ واقعی میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی تھی۔ بہو مجھے معاف کردو۔"

یہ سن کر میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور بولی۔ "آپ بڑی ہیں میری ماں کی جگہ ہیں، آپ مجھ سے معافی نہ مانگیں اور میں نے دلی طور پر ساری باتیں بھول گئی ہوں۔ جو ہونا تھا وہ ہوگیا اور اگر کوئی بات ہے تو میں نے قلبی لگاؤ کے ساتھ معاف کردیا، میرا اللہ بھی معاف کردے۔"

یہ سن کر ساس نے میرے ماتھے کا بوسہ لیا اور بولیں۔ "بہو کل صبح سے میں صبح سویرے اٹھ کر ناشتہ بناؤں گی تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم سے ریحان کوئی روکھی سوکھی بات کرے تو مجھے بتانا میں اس کے کان کھینچوں گی۔ بیٹا یہ گھر اب تمہارا ہے، سویٹی بھی چلی جائے گی اور میری زندگی کا کیا بھروسہ۔"

یہ سن کر میں بولی۔ "اللہ آپ کو صحت دے آپ فکر نہ کریں گھر کے تمام کام ہم مل کر کرلیا کریں گے، یہ گھر ہم سب کا ہے۔ جب سب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو اللہ بھی خوش ہوتا ہے۔"

ساس نے پھر میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور ڈھیر ساری دعائیں دیتی ہوئی کمرے سے چلی گئیں۔

ساس کے جانے کے بعد میرے سامنے میز پر ایک کارڈ نمودار ہوا اس پر لکھا تھا۔ "میری بات غور سے سنیں۔ میں نے جو کچھ کیا وہ آپ کی ساس کو سبق سکھانے کے لئے، آپ کی ساس کے دماغ سے آپ کی برائی اور بدسلوکی کو کھرچ کر نکال دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایسا سبق دیا ہے کہ آپ کی ساس تاحیات آپ کی طرف انگلی بھی نہیں اٹھا سکتی۔ میں نے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا ہے۔

جھمکوں والا ڈرامہ بھی میں نے ہی کیا تھا اور سویٹی کے سسرالیوں کے دماغ میں ساری باتیں میں نے ڈالی تھیں تاکہ آپ کی ساس زیادہ سے زیادہ ذلیل ہو۔

میں نے آپ کو بہن کہا ہے تو آپ میری بہن ہی رہیں گی۔ میں ہر طرح آپ کی حفاظت کرتی رہوں گی۔ ہمارا بسیرا آم کے درخت پر قائم رہے گا اگر کبھی کسی بات کی ضرورت پیش آئے تو میرا نام "شالدہ...... شالدہ" لے کر تین مرتبہ پکارنا، میں فوراً حاضر ہوجاؤں گی۔ اچھا اب میں چلتی ہوں آپ آرام کریں۔"

اور اس کے ساتھ ہی آواز آنا بند ہوگئی۔

پراسرار سایہ

چاند زیب عباسی-کراچی

خود غرضی مطلب پرستی اور لالچ نے اسے اندھا کردیا تھا، فرض شناسی کو وہ فراموش کرکے ملک دشمنوں سے جاملا مگر وقت کا آھنی پنجہ آھستہ آھستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا کہ پھر اچانک اس کی گردن پھنس گئی۔

دل ودماغ سے محو نہ ہونے والی عبرتناک، حیرتناک، خوفناک اور دل گرفتہ کہانی

50 سالہ باریش سلامت خان اپنی آٹھ سالہ بیٹی شہناز کے ساتھ دریا کے کنارے کھڑا تھا۔ صبح صادق کا وقت تھا دریا کے کنارے ان دونوں کے علاوہ کوئی اور ذی نفس موجود نہ تھا۔ سخت سردی کے اس موسم میں ان دونوں باپ بیٹی کا اس دریا کے کنارے موجود ہونا حیران کن تھا۔ سلامت خان کے چہرے پر پھانسی گھاٹ کے اس قیدی کی طرح گہرے رنج وغم کے تاثرات تھے جس کے گلے میں پھانسی کا پھندا پڑا ہوا ہو اور کسی بھی لمحے جلاد لیور کھینچنے والا ہو۔

شمالی علاقہ جات میں واقع دور دراز کا وہ گاؤں لالی تھا۔ جہاں جہانگیر خان اس علاقے کا بلا شرکت وغیرے مالک تھا۔ یہاں حکومت کا کوئی خاص کنٹرول نہ تھا۔ علاقے کے تمام فیصلے جہانگیر خان خود ہی کرتا تھا۔ اس علاقے میں صوبائی اسمبلی کی سیٹ اس کی خاندانی سیٹ تھی۔ اسلحہ اس علاقے کا زیور تھا۔ جہانگیر خان تعلیم کا سخت مخالف تھا۔ اس علاقے میں کوئی بھی اسکول یا تعلیمی ادارہ نہیں تھا۔ دو چار بار یہاں حکومت نے سرکاری اسکول بنوائے بھی لیکن جہانگیر خان کے حکم پر ان اسکولوں کی عمارت ڈھادی گئی۔

سلامت خان کی شہناز اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ جہانگیر خان کا منشی تھا۔ شادی کے دس سال بعد شہناز نے جنم لیا۔ تو سلامت خان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس کے دوسرے سال اس کے گھر بیٹا ہوا جس کا نام سلیم خان رکھا گیا۔ بیٹا ہونے کے باوجود سلامت خان اپنی بیٹی کو جان سے زیادہ چاہتا تھا۔ اس کی ہر خواہش پوری کرتا تھا۔

اپنی عمر کے پانچویں سال شہناز نے اپنے باپ سے خواہش ظاہر کی کہ وہ پڑھنا چاہتی ہے اس کی خواہش جان کر سلامت خان بھونچکا رہ گیا وہ جانتا تھا کہ اس علاقے میں تعلیم کی بات کرنا ہی جرم ہے اور پھر جہانگیر خان لڑکیوں کی تعلیم کا تو انتہائی سخت مخالف تھا۔ ایک طرف جہانگیر خان کی دہشت اعصاب پر حاوی تھی تو دوسری طرف بیٹی کی خواہش کو بھی نظرانداز کرنا اس کے لئے ناممکن تھا وہ خود ہی بمشکل میٹرک تک پڑھ پایا تھا۔ لیکن یہ تعلیم بھی اس نے شہر میں اس دور میں حاصل کی تھی جب اس کے والد روزگار کے سلسلے میں شہر گئے تھے اور وہیں قیام کرکے انہوں نے سلامت خان اور اس کی ماں کو بھی شہر بلوالیا تھا۔

سلامت خان کے جوان ہوتے ہی وہ واپس گاؤں لوٹ آئے۔ سلامت خان کی شادی کے دوسرے سال اس کے والد اور چوتھے سال اس کی والدہ وفات پاگئیں۔

سلامت خان نے شہر سے کتابیں لاکر بیٹی کو پڑھانا شروع کیا۔ وہ انتہائی ذہین بچی تھی اس کا حافظہ بہترین تھا۔ وہ اپنا سبق اس طرح یاد کرتی کہ گویا اسے سبق کو گھول کر پلا دیا گیا ہو۔ آٹھ سال کی عمر تک وہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر اس مقام پر پہنچ چکی تھی کہ سلامت خان کو خود بھی حیرت ہوتی تھی۔

سلامت خان جب شہر جاتا اس کے پڑھنے کے لئے بچوں کے رسالے اور اخبارات لے آتا۔ ایک روز وہ ایک کاپی باپ کے پاس لائی اور بولی۔ ''بابا میں نے کہانی لکھی ہے۔''

سلامت خان نے جب اس کی لکھی ہوئی کہانی پڑھی تو ششدر رہ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ کہانی کسی بچی نے نہیں بلکہ کسی رائٹر نے لکھی ہو۔ سلامت خان نے وہ کہانی شہر جاکر پوسٹ کردی۔ جو اگلے ہی ماہ رسالے میں شائع ہوگئی۔

شہناز اپنی کہانی شامل اشاعت دیکھ کر بڑی خوش ہوئی پھر وہ اکثر اس رسالے کے لئے لکھنے لگی۔ ایک روز اس نے اپنے علاقے کی کہانی لکھی کہ اس کے علاقے میں بچوں اور بچیوں کے تعلیم حاصل کرنے پر پابندی لگادی گئی ہے اور صنف نازک کو کمتر مخلوق سمجھا جاتا ہے اور پھر اس نے اپنے ساتھ کھیلنے والی بچیوں کو اپنی درسی کتابوں سے پڑھانا شروع کردیا۔

علم کی روشنی پھیلانا اس کا ناقابل معافی جرم ٹھہرا۔ اس جرم کی اطلاع سنتے ہی جہانگیر خان آگ بگولا ہوگیا۔ سلامت خان کو ڈیرے پر طلب کرلیا گیا۔ ''سلامت خان تمہاری بیٹی نے وہ حرکت کی ہے جو آج تک ہمارے علاقے میں کسی لڑکی نے نہیں کی۔ ہمیں لگتا ہے کہ یہ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کو بھی خراب کرے گی اور گاؤں کی بدنامی کا باعث بنے گی۔ اس لئے میرا حکم ہے کہ صبح ہونے سے پہلے اسے تم خود اپنے ہاتھوں سے اس دنیا سے رخصت کردو۔''

جہانگیر خان نے بے رحمی سے حکم دیا۔

''سردار میں کیسے اپنی پھول جیسی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے مار سکتا ہوں۔'' سلامت خان تڑپ اٹھا۔

''تو پھر ہمارے حکم پر تمہارے بیٹے اور بیٹی کو تم سمیت ماردیا جائے گا۔'' جہانگیر خان سانپ کی طرح پھنکارہ اس کے حکم پر اس کے کارندے سلامت خان کے بیٹے سلیم خان کو اسی وقت اس کے گھر سے اٹھالائے۔ وہ معصوم بچہ ڈر کے مارے رو دیا تھا۔

''سلامت خان سورج نکلنے سے پہلے میرے حکم پر عملدرآمد ہونا چاہئے ورنہ تم بیٹی کے ساتھ بیٹے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔'' جہانگیر خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور سلامت خان خاموشی سے اس کے ڈیرے سے باہر نکل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ احتجاج فضول ہے اب اسے بیٹے کی زندگی بچانے کے لئے بیٹی کی قربانی دینی تھی۔ اس کی بیوی ساری رات روتی رہی۔ صبح پانچ بجے کے قریب اس نے بیٹی کو جگایا اور دریا کے کنارے لے آیا۔ اس کے گھر کی نگرانی پر معمور جہانگیر خان کا ایک کارندہ بھی اس سے کچھ فاصلے پر رائفل تھامے کھڑا تھا۔

''بابا جانی آپ مجھے ماردو گے؟'' وہ معصومانہ انداز میں بولی اور سلامت خان کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں دبوچ کر مسل ڈالا ہو۔ وہ بے اختیار بیٹی سے لپٹ کر رونے لگا۔

''بابا جانی آپ ہی تو کہتے تھے کہ غم اور خوشی انسان کے ساتھ ساتھ ہیں۔ بڑے سے بڑے دکھ کو صبر وتحمل سے سہنا چاہئے۔ اگر میری موت سے آپ کی اور بھائی کی زندگی بچتی ہے تو مجھے کوئی غم نہیں۔'' وہ معصوم بچی اپنی عمر سے بڑھ کر بڑی باتیں کررہی تھی۔

اور سلامت خان کا دل غم سے پھٹا جارہا تھا یہ بے بسی کی انتہا تھی وہ اپنے جگر کے گوشے کو خود ہی موت کے منہ میں دھکیلنے کے لئے مجبور تھا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو جہانگیر خان اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ ساتھ شہناز کو بھی جان سے مار ڈالتا۔ لیکن بیٹی کو بھی خود اپنے ہاتھوں سے موت کے منہ میں دھکیلنا آسان نہیں تھا۔

بپھرا ہوا دریا اس کے سامنے تھا قریب ہی جہانگیر خان کا کارندہ رائفل اٹھائے کھڑا تھا۔ ''سلامت خان

جلدی کرو سورج نکلنے والا ہے۔'' کارندے نے چلا کر کہا اور اسے وارننگ دینے کے لئے ہوائی فائر کیا، وہ دریا کے کنارے کھڑی شہناز کی طرف بڑھا جو اس کی طرف دیکھ رہی تھی، شہناز کی نظروں میں حسرت ویاس، بے یقینی، موت کا خوف اور بہت کچھ تھا اس کی سوالیہ نگاہیں گویا اپنے باپ سے پوچھ رہی تھیں کہ ''کیا ایک باپ اپنی بیٹی کو خود اپنے ہاتھوں سے موت کے منہ میں دھکیل سکتا ہے۔''

پھر سلامت خان نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں بھینچیں اور بیٹی کو دریا میں دھکیل دیا، وہ دریا کی سرکش لہروں میں جا گری اور نگاہوں سے اوجھل ہوگئی، اسی کا نام زندگی ہے جو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے۔ اس کا ہر لمحہ مختلف ہوتا ہے ایک ہی وقت میں کسی کے گھر سے میت اٹھ رہی ہوتی ہے اور کسی دوسرے گھر میں خوشیوں کا رقص ہوتا ہے شہناز سلامت خان کی صرف بیٹی ہی نہیں جگر کا گوشہ تھی۔ ''اے لوگو! کیا تم اس باپ کا دکھ جان سکتے ہو جس نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹی کو موت کے گھاٹ اتارا ہو۔''

☆......☆......☆

آنکھ کھلتے ہی اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ مگر اسے مایوسی ہوئی اس دبیز اندھیرے میں اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ ہر طرف گرد وغبار اور دھول سی جمی ہوئی تھی وہ دیواروں کے ساتھ چلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ ایک وسیع وعریض کمرہ ہے۔ کافی دیر تک ادھر ادھر ٹہلنے کے بعد وہ ایک جگہ ٹک کر بیٹھ گیا۔ اور یکسوئی سے سوچنے لگا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا لیکن اسے کچھ یاد نہیں آیا وہ یہ تک بھول چکا تھا کہ وہ کون ہے؟ اور یہاں کیسے پہنچا؟ اس کے ذہن میں ماضی کی یادداشت کی رمق تک موجود نہ تھی کچھ دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد اس نے دیواریں دوبارہ ٹٹولنی شروع کردیں۔ اس کی آنکھیں اتنی دیر میں اندھیرے سے مانوس ہوچکی تھیں اور کچھ دھندلے دھندلے دیواروں کے نقوش دکھائی دینے لگے تھے۔

کافی دیر تک ٹہلنے کے بعد وہ دوبارہ تھک ہار کر ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا۔ ''وہ کون ہے اور اسے یہاں کس نے قید کیا؟ شاید یہاں کوئی ہو جو مجھے اس قید تنہائی سے باہر نکالے۔'' یہ سوچتے ہی وہ زور زور سے چیخنے لگا۔ ''کوئی ہے؟'' لیکن اس کی یہ آواز کمرے کے در ودیوار سے ٹکرا کر دوبارہ اس کے کانوں سے ٹکرائی، اس نے وحشت کے عالم میں اپنے سر کا عقبی حصہ دیوار سے ٹکرایا اور درد کی ایک شدید لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کرگئی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اس کے سر پر ایک بڑا سا گومڑ بنا ہوا تھا اور اس کے بال خون سے لج بج ہورہے تھے جو خشک ہوکر بالوں میں جم گیا تھا۔ گویا بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے سر پر چوٹ لگی تھی وہ وحشت کے عالم میں کافی دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔

اندھیرے میں صبح وشام کا اندازہ کون کرسکتا ہے اچانک اسے پنڈلی میں تکلیف کی شدید ترین احساس ہوا۔ ایسا لگا جیسے کسی جانور نے اس کی پنڈلی میں اپنے نوکیلے دانت گاڑ دیئے ہوں اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں یہ ایک بلی کی جسامت کا خونخوار چوہا تھا۔ جو اس کی پنڈلی میں دانت گاڑے ہوئے تھا۔ اسی قسم کے تین چار اور چوہے اس کے قریب ہی موجود تھے، گھپ اندھیرے کے باوجود اسے ان چوہوں کی چمکتی آنکھیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ بلی کی جسامت کے خوف ناک چوہے اس کے اردگرد جمع ہونا شروع ہوچکے تھے۔ ''ہش ہش بھاگو'' اس نے چلا کر چوہوں کو ہشکارہ اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ چوہے بدک کر پیچھے ہٹے۔

ابھی اسے کھڑے ہوئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ پاؤں کے انگوٹھے میں تکلیف کا شدید ترین احساس ہوا اس نے چیختے ہوئے اپنا پاؤں جھٹکا چوہوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی جارہی تھی، ان کے دانت اس قدر تیز اور نوکیلے تھے کہ اسے اپنے پاؤں میں سوئیاں سی اترتی محسوس ہورہی تھیں اس کے لئے یہ احساس ہی خوف ناک تھا کہ وہ اس اندھیرے کمرے میں ان خونخوار چوہوں کی خوراک بن جائے گا۔

وہ زندگی بچانے کے لئے اس کمرے میں ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ جہاں جہاں وہ بھاگتا چوہے تیز رفتاری سے اس کا پیچھا کرتے اور جہاں وہ رکتا چوہے اسے گھیر کر اپنے دانت اس کے پاؤں میں گاڑنے کی کوشش کرتے...... مسلسل بھاگتے رہنے سے اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا اور اعصاب جواب دینے لگے تھے، آخر کب تک وہ تنہا ان چوہوں سے لڑتا۔ یہ وسیع و عریض کمرہ اس کی قبر بننے والا تھا۔ بھاگتے بھاگتے بالآخر وہ تھک ہار کر گر پڑا اس کے گرتے ہی چوہوں نے اس پر یلغار کردی اور جگہ جگہ سے اس کے جسم میں چھید کرنے لگے۔ وہ جان بچانے کے لئے اٹھتا بھاگتا اور تھک ہار کر دوبارہ گر جاتا۔ چوہے اس کے پورے وجود پر احاطہ کر چکے تھے۔

موت اور زندگی کے درمیان لمحوں کا فاصلہ تھا۔ سینکڑوں خونخوار چوہوں سے جان بچانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا اس نے کئی چوہوں کو اپنے پاؤں سے کچلا اس کے باوجود چوہے اس کے جسم میں سوراخ کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے، خون کی بوندیں جگہ جگہ سے کھال سے نکل رہی تھیں۔ انسانی خون کی بو چوہوں کو مشتعل کر چکی تھی زندگی کی خواہش نے اس کے بے حس و بے حرکت جسم میں ارتعاش پیدا کیا اور وہ دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اسی وقت چرچراہٹ کی آواز سنائی دی جیسے کہ دروازہ کھلا ہو اور کمرے میں روشنی در آئی اس نے سر اٹھا کر دیکھا کچھ فاصلے پر سیڑھیوں پر ایک خوبصورت لڑکی کھڑی تھی جس نے میکسی نما لباس پہن رکھا تھا اس کے عقب میں دروازہ کھلا تھا دروازہ کھلنے سے روشنی اندر در آئی تھی۔

روشنی ہوتے ہی چوہوں میں ہل چل مچنے لگی اور وہ فرش میں بنے سوراخوں میں گھسنے لگے۔

تم کون ہو؟ اور میں کہاں ہوں؟'' اس نے نحیف آواز میں پوچھا۔

''یہ وقت ان باتوں کا نہیں جلدی سے باہر نکلو۔'' لڑکی مترنم آواز میں بولی۔ اس کی آواز بھی اسی کی طرح خوبصورت تھی وہ آگے بڑھا اور کانپتی ٹانگوں سے سیڑھیاں چڑھ کر لڑکی کے قریب جا پہنچا۔ دروازے سے باہر نکلتے ہی وہ ایک دوسرے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ یہ کمرہ سائنسی آلات اور مختلف قسم کے جاروں سے بھرا ہوا تھا۔ جن میں محلول بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف بڑی سی لکڑی کی الماری تھی۔ سامنے ٹرالی پر کمپیوٹر رکھا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر کوریڈور میں داخل ہوئے، لڑکی نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور بولی۔ ''اس کمرے میں چلے جاؤ اندر الماری میں سے کپڑے نکال کر پہنو اور جلدی باہر آؤ جب تک میں یہیں کھڑی ہوں۔''

وہ کمرے میں داخل ہوا ساز و سامان سے آراستہ اس کمرے میں واقعی ایک الماری موجود تھی جس کے ہینگر میں مختلف قسم کے لباس رکھے تھے الماری کے نچلے خانے میں نئے جوتے بھی موجود تھے اس نے الماری میں لگے ہینگر سے ایک کرتا شلوار نکال کر پہنا جوتوں کا جوڑا پہننے کے بعد اپنے لباس کی تلاشی لی وہاں قمیض کی سائیڈ کی جیب میں پھولا ہوا پرس موجود تھا پرس میں اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ اس نے پرس جیب میں رکھا اور کمرے سے باہر نکلا۔ ''کیا یہ تمہارا گھر ہے؟'' اس نے چلتے ہوئے لڑکی سے پوچھا مگر لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کے ساتھ چلتی ہوئی اس گھر سے باہر نکل گئی۔

یہ پہاڑی علاقہ تھا جو شاید ہزاروں فٹ بلند تھا اطراف میں سینکڑوں فٹ گہری کھائیاں تھیں جنہیں دیکھ کر خوف آتا تھا۔ انسانی آبادی کا دور دور تک نام ونشان نہ تھا۔ گویا اس علاقے میں یہ واحد مکان تھا ایک طرف کچی سڑک تھی وہ اس سڑک پر چلنے لگے۔ ''تم کون ہو اور مجھے یہاں کس نے قید کیا تھا مجھے اپنے بارے میں کچھ یاد کیوں نہیں؟'' وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے بولا۔

''میں کرن ہوں یہاں سے گزر رہی تھی کہ چیخوں کی آواز سن کر تم تک جا پہنچی۔'' لڑکی نے جواب دیا لیکن وہ لڑکی کے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا بھلا اس ویران علاقے میں کسی تنہا خوبصورت لڑکی کا کیا کام اور پھر اس لڑکی کو کیسے پتہ چلا کہ کون سے کمرے میں الماری میں کپڑے موجود ہیں وہ بے خیالی میں سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ

راستے میں آنے والے پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرا اور کراہتے ہوئے جیسے ہی اٹھا تو ششدر رہ گیا۔

لڑکی غائب تھی یہ ایک ویران پہاڑی علاقہ تھا چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی تھی دور دور تک کسی انسانی آبادی کا نام ونشان نہ تھا چیڑ اور دیار کے درخت دلکش مناظر پیش کررہے تھے لیکن وہ ان سب سے بے نیاز سوچ رہا تھا کہ ''لڑکی کہاں گئی؟ کہیں اس عمارت میں دوبارہ تو نہیں چلی گئی؟ لیکن وہ تھی کون؟ اور وہ خود کہاں ہے اور کون ہے؟ اور اس عمارت کے تہہ خانے میں کیسے پہنچا؟ جہاں خون خوار چوہے موجود تھے۔'' لاتعداد سوالات اس کے ذہن میں ابھر رہے تھے۔

کچھ دیر چلنے کے بعد وہ تھک کر ایک چیڑ کے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اپنا جائزہ لیا، سر کی چوٹ کے علاوہ جسم میں جگہ جگہ چوہوں کے کاٹنے سے زخم پڑ چکے تھے اور شدید تکلیف ہورہی تھی اس نے سوچتے سوچتے بے خیالی میں اپنے گلے پر ہاتھ پھیرا تو اس کے ہاتھ میں ایک عجیب ساخت کا لاکٹ آ گیا جو ایک سنہری چین سے منسلک تھا۔ اس نے چین کا ہک کھول کر لاکٹ نکالا یہ عام لاکٹ سے مختلف عجیب ساخت کا قدرے ابھار والا لاکٹ تھا۔ جس کے عقب میں گھڑی کی سوئی سے مشابہ ننھا سا بٹن تھا۔ اس نے الجھے ہوئے ذہن سے لاکٹ کو دیکھا اور پھر دوبارہ لاکٹ گلے میں پہن لیا اور کرتے کی سائیڈ کی جیب سے پرس نکالا ایک خانے میں تو ہزاروں کی رقم تھی جبکہ دوسرے خانے میں ایک تصویر تھی۔ اس نے تصویر پرس سے نکالی اسے تصویر دیکھ کر حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا تصویر میں وہ ایک لڑکی کے ساتھ موجود تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ وہی لڑکی تھی جس نے اسے تہہ خانے سے آزاد کروایا تھا اور اپنا نام کرن بتایا تھا۔ گویا اس کا اس لڑکی سے کوئی نہ کوئی گہرا تعلق تھا، وہی اسے اس کے ماضی کے بارے میں بتاسکتی تھی۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ اٹھا اور کچی سڑک پر چلنے لگا کافی دیر بعد وہ پکی سڑک پر پہنچا تو کافی تھک چکا تھا۔ اس لئے وہ ایک طرف ستانے کے لئے بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد اسے دور سے ایک مسافر وین آتی دکھائی دی وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اس وقت اس کی نظر سڑک کنارے نصب ایک چھوٹے سے بورڈ پر پڑی جس پر علاقے کا نام لکھا ہوا تھا۔ وین کے قریب آتے ہی اس نے اشارے سے وین کو اشارے سے روکا۔ خوش قسمتی سے وین میں ایک سیٹ خالی تھی جو کھڑکی کے ساتھ تھی۔ کچھ دیر بعد کنڈیکٹر اس کے قریب آیا اس نے خاموشی سے سو کا نوٹ نکال کر کنڈیکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ ''کہاں جانا ہے؟'' کنڈیکٹر نے پوچھا اور وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اب اسے کیا بتائے کہ اسے کہاں جانا ہے اسے تو اپنا نام تک یاد نہ تھا۔

''میں نے پوچھا ہے کہاں جانا ہے؟'' کنڈیکٹر نے جھنجھلا کر تیز لہجے میں پوچھا۔

''گاڑی کہاں تک جائے گی؟'' اس نے پوچھا۔

''فیض آباد اڈے تک۔'' کنڈیکٹر نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھی وہیں جانا ہے۔'' وہ جواب دے کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

''لگتا ہے کھسکا ہوا ہے؟'' کنڈیکٹر بڑبڑایا۔

فیض آباد ایک پررونق علاقہ تھا۔ ایک ہیئر ڈریسر کی شاپ پر نہانے کے بعد شیو کروا کر باہر نکلا اور ایک اوسط درجے کے ہوٹل پر کھانا کھایا، پرس میں رقم موجود ہونے کی وجہ سے اسے اب تک کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ لیکن چوہوں کے کاٹنے سے جسم میں سخت تکلیف ہورہی تھی، ہوٹل سے کھانا کھا کر باہر نکلا تو کچھ ہی فاصلے پر اس کی نظر ایک عمارت پر پڑی۔ یہ ایک پرائیویٹ اسپتال تھا۔ اس کے قدم بے اختیار اسپتال کی عمارت کی طرف اٹھنے لگے پارکنگ ایریا کے قریب پہنچتے ہی وہ بے اختیار رک گیا۔ کار میں ڈاکٹروں والا گاؤن پہنے ایک لڑکی سوار ہورہی تھی، یہ وہی لڑکی تھی جس نے اسے چوہوں والے تہہ خانے سے بچایا تھا اور اپنا نام کرن بتایا تھا اور کرن کی تصویر بھی اس کے پرس میں موجود تھی جس میں اس نے کرن کا ہاتھ تھام رکھا تھا گویا کرن اور اس کا

کوئی نہ کوئی رشتہ تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھنے ہی والی تھی کہ اس نے پکارا ''کرن'' اور اس کی طرف دوڑا تو وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ ''تم مجھے اس عمارت سے باہر نکالنے کے بعد کہاں غائب ہوگئی تھیں۔۔؟''

''مسٹر تمہارا دماغ تو درست ہے۔ اس سے پہلے میں نے تمہیں کبھی دیکھا نہیں اور ہاں میرا نام کرن نہیں۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تم کرن ہی ہو۔ میں تمہارا چہرہ کیسے بھول سکتا ہوں تم ہی نے تو میری جان بچائی تھی۔''

''مسٹر لگتا ہے تمہارا ذہنی توازن درست نہیں بہتر یہی ہے کہ تم اس اسپتال میں ذہنی امراض کے ماہر ڈاکٹر سہیل سے ملو وہ بہترین سائیکلوجسٹ ہیں۔'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔

''اگر تم کرن نہیں تو، جب میں نے تمہیں کرن کہہ کر پکارا تو تم کیوں رکیں اور مجھے مڑ کر کیوں دیکھا؟'' اس نے اپنی طرف سے دلیل پیش کی۔

''تم اگر پاگلوں کی طرح کسی لڑکی کی طرف دوڑو اور اسے مادھوری کہہ کر پکارو گے تو وہ رک کر حیرت سے تمہیں دیکھے گی، اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ مادھوری ہے۔ اب میرا راستہ چھوڑو مجھے ویسے ہی دیر ہورہی ہے۔'' اس نے تند لہجے میں کہا اور گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا، ریورس کرکے پارکنگ سے باہر نکالی اور تیز رفتاری سے اسپتال کے مین گیٹ سے باہر نکل گئی۔

وہ اسے حیرت سے جاتا دیکھتا رہا اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کرن اسے پہچاننے سے کیوں انکار کررہی ہے جبکہ اس نے اس کی جان بچائی تھی اور پھر وہ اتنی جلدی فیض آباد کے اس اسپتال میں کیسے آپہنچی۔ کچھ دیر وہاں کھڑا رہنے کے بعد وہ اسپتال میں داخل ہوا۔ OPD میں موجود ڈاکٹر نے حیرت سے اس کے زخموں کا معائنہ کیا اور ایک انجکشن لگانے کے بعد کچھ میڈیسن لکھ کر پرچی اسے تھمادی۔

وہ میڈیکل اسٹور سے ادویات خرید کر سڑک پر مٹر گشت کرنے لگا دن تو اسی طرح گزر گیا رات کو نئی پریشانی لاحق ہوگئی اسے رات بسر کرنے کے لئے جگہ درکار تھی اس نے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کمرہ لیا اپنا نام تو یاد نہیں تھا اسے جو نام ذہن میں آیا کاؤنٹر پر وہی بتادیا۔ اس نے تین چار روز ہوٹل کے اسی کمرے میں گزار دیئے۔ وہ دن بھر ادھر ادھر گھومتا رہتا اور رات کو آکر ہوٹل کے کمرے میں سوجاتا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے؟ اور اس پر کیا گزری؟ وہ اس تہہ خانے میں کیسے پہنچا اور کرن سے اس کا کیا رشتہ ہے؟

پانچویں روز جب وہ ایک فٹ پاتھ پر سے گزر رہا تھا کہ اسے عقب سے جانی پہچانی نسوانی آواز سنائی دی۔ ''آصف۔'' وہ مڑا اس کی پشت پر کرن موجود تھی۔ اس نے میکسی نما خوبصورت لباس پہن رکھا تھا۔ ''تم؟'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''ہاں میں اب یہیں کھڑے دیکھتے رہو گے یا ہوٹل چلو گے یاد ہے۔ ہم نے ایک بار اس ہوٹل میں ناشتہ کیا تھا۔'' وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے شوخ لہجے میں بولی۔

''اس روز تو تم نے اسپتال کے پارکنگ ایریا میں مجھے پہچاننے سے انکار کردیا تھا۔''

''میں مذاق کررہی تھی۔'' وہ ہنس پڑی وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوا اور ایک خالی میز کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرن اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ''دو کپ اچھی سی چائے لے آؤ۔'' ویٹر کے قریب آتے ہی اس نے کہا اور دبلا پتلا ویٹر اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

''اب بتاؤ میں کون ہوں؟ اور میرا تم سے کیا رشتہ ہے تمہاری تصویر بھی میرے پاس موجود ہے۔'' اس نے کرن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرا نام کرن ہے۔ اور تم آصف ہو۔ آصف حسین اور ہم دونوں کا دل کا رشتہ ہے۔''

''گویا میرا نام آصف حسین ہے۔'' اس نے سوچا اسی وقت اسے محسوس ہوا کہ دبلا پتلا ویٹر اب تک کھڑا اسے حیرت سے دیکھ رہا ہے۔ آصف غصے سے دھاڑا۔ ''اے مسٹر کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں جو اس

قدر حیرت سے مجھے دیکھ رہے ہو، کہانا کہ ہم دونوں کے لئے اچھی سی دو کپ چائے لے آؤ۔" ویٹر اس طرح تیزی سے وہاں سے پلٹا جیسے اس نے آصف کے روپ میں کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ کچھ دیر بعد اس نے ٹرے میں دو کپ چائے لا کے ڈرتے ڈرتے ٹرے آصف کے سامنے رکھ کر واپس لوٹ گیا۔

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ ہم دونوں کا دل کا رشتہ ہے حادثاتی طور پر ہماری ملاقات ہوئی تھی اور ہم ایک دوسرے کو چاہنے لگے اور پھر ایک حادثے میں تم یادداشت کھو بیٹھے۔"

"یہ سب کیسے ہوا مجھے تفصیل سے بتاؤ۔" "اور ہاں تم چائے تو پیو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" آصف نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"پی لوں گی اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ ایک منٹ تم یہیں بیٹھو مجھے گھر ضروری کال کرنی ہے۔ اپنا موبائل فون میں گھر پر بھول آئی ہوں۔" وہ بولی اور کرسی سے اٹھ کر ایک طرف بڑھ گئی جبکہ آصف اپنے بارے میں سوچتے ہوئے چائے پینے لگا۔ اسے گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اور وہ اب تک نہیں لوٹی تھی۔

آصف اپنی چائے پی چکا تھا جبکہ کرن کے لئے موجود دوسرے کپ میں چائے ہنوز موجود تھی۔ چند منٹ مزید انتظار کرنے کے بعد اس نے اشارے سے ویٹر کو بلایا۔ "جی سر۔" وہ قریب آ کر مودبانہ لہجہ میں بولا۔

"میری خاتون ساتھی فون کرنے کاؤنٹر پر گئی تھیں اب تک نہیں لوٹیں کیا تم نے انہیں کاؤنٹر پر دیکھا ہے۔"

"سر آپ اکیلے ہی اس ہوٹل میں داخل ہوئے تھے اور اس میز پر تنہا ہی بیٹھے تھے۔ جب آپ نے مجھے دو کپ چائے کا آرڈر دیا تب بھی میں حیران تھا اس دوران آپ اکیلے ہی باتیں کئے جا رہے تھے۔" ویٹر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"تم کیا بکواس کر رہے ہو کیا تم نے مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے میں کرن کے ساتھ اس ہوٹل میں داخل ہوا تھا اور تم سے چائے لانے کو کہا تھا وہ اب تک میرے ساتھ تھی اور تم کہہ رہے ہو کہ میں اکیلا خود سے باتیں کر رہا تھا۔" اس کی آواز بتدریج بلند ہوتی جا رہی تھی اردگرد بیٹھے دوسرے لوگوں نے چونک کر آصف کو دیکھا جبکہ ویٹر اسے تاسف بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

آصف نے بل پے کیا اور ہوٹل سے باہر نکلا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، کرن نے اس کا نام آصف حسین بتایا تھا پھر وہ کاؤنٹر سے کال کرنے کا کہہ کر گئی اور واپس نہیں لوٹی۔ جبکہ ویٹر کا کہنا تھا کہ آصف ہوٹل میں تنہا ہی داخل ہوا تھا اس کے ساتھ کوئی خاتون موجود نہیں تھی۔ وہ جتنا سوچتا اتنا ہی الجھتا پھر اس نے سوچا اس الجھی ہوئی ڈور کا سرا سلجھانے کے لئے اسے اسی اسپتال میں جانا ہوگا۔ جہاں اس نے کرن کو دیکھا تھا۔

وہ وہاں سے سیدھا اسپتال جا پہنچا استقبالیہ پر ایک اسمارٹ سی لڑکی موجود تھی۔ "میں ڈاکٹر کرن سے ملنا چاہتا ہوں۔" اس نے استقبالیہ پر موجود لڑکی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

"یہاں ڈاکٹر کرن نہیں ہیں۔" لڑکی نے جواب دیا۔

اچانک اس کی نظر کوریڈور سے آتی کرن پر پڑی اس وقت وہ ڈاکٹروں والے گاؤن میں ملبوس تھی۔ "آپ تو کہہ رہی تھیں اس اسپتال میں کوئی ڈاکٹر کرن نہیں۔ وہ دیکھیں، سامنے سے ڈاکٹر کرن آ رہی ہیں۔" آصف نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کرن نہیں ڈاکٹر نرگس ہیں۔" لڑکی ہنسی۔ اس اثناء میں وہ استقبالیہ تک پہنچ چکی تھی۔

آصف اس کی راہ میں حائل ہو گیا اور وہ اسے غصے سے دیکھنے لگی۔ "اس روز تم ہوٹل سے کہاں غائب ہو گئی تھیں اور تم نے مجھے اپنا نام غلط کیوں بتایا تھا۔" آصف خفگی آمیز لہجے میں بولا۔

"مسٹر لگتا ہے واقعی تم پاگل ہو، اس روز بھی جب تم نے میرا راستہ روکا تھا تب بھی میں نے یہی کہا تھا کہ میں تمہیں نہیں جانتی اور اب پھر تم میرا راستہ روک کے کھڑے

ہو۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟" وہ چراغ پا ہوگئی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تمہارا رویہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ کبھی خود ہی ملتی ہو اور کبھی پہچاننے سے انکار کردیتی ہو۔" وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی کرن یا نرگس کے رویے پر حیران تھا۔

"مسٹر اب اگر تم دوبارہ میرے راستے میں آئے تو اچھا نہیں ہوگا۔" کرن کا رویہ جارحانہ ہوگیا تھا۔ ان کی گفتگو کے دوران چند وارڈ بوائے اور ڈاکٹرز بھی آچکے تھے۔ جو خشمگین نگاہوں سے آصف کو گھور رہے تھے اس سے پہلے کہ صورتحال کوئی سنگین رخ اختیار کرتی۔ آصف تیزی سے چلتا ہوا اسپتال سے باہر نکل گیا۔ اپنی بےعزتی پر اس کا دل اور دماغ دونوں سلگ رہے تھے کرن یا نرگس اس کے ساتھ تصویر اور پیش آنے والے واقعات اس بات کا اشارہ کررہے تھے کہ اس کا اور اس لڑکی کا کوئی نہ کوئی گہرا تعلق ہے لیکن کیا یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

وہ کرن کے رویئے سے دل برداشتہ سڑک کے کنارے سر جھکائے سوچوں میں مستغرق جارہا تھا کہ بریکوں کی چرچراہٹ سے اس کے قدم رک گئے، اس کے قریب ہی ایک سوزوکی کار کے بریک چرچرائے تھے ڈرائیونگ سیٹ پر ایک اسمارٹ سا نوجوان بیٹھا تھا کار رکتے ہی وہ باہر نکلا اور اس سے لپٹ گیا۔ "آصف تم کہاں غائب ہوگئے تھے، ہم اور چچا جان تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈتے رہے۔" وہ بولے جارہا تھا۔

"پر تم ہو کون؟" آصف نے اسے خود سے بمشکل علیحدہ کرتے ہوئے کہا اور وہ نوجوان اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"آصف تمہارا دماغ تو درست ہے تم مجھے پہچاننے سے انکاری ہو میں راحیل ہوں۔"

"دیکھو تم راحیل ہو یا کوئی اور اصل بات یہ ہے کہ میں اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہوں۔" آصف نے کہا۔

"چلو گاڑی میں بیٹھو گھر چلتے ہیں راستے میں باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔" راحیل ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا اور آصف کے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے گاڑی آگے بڑھادی اس کے استفسار پر آصف نے ہوش میں آنے کے بعد کے تمام واقعات سناڈالے پھر راحیل نے اسے اس کے ماضی کے بارے میں بتایا۔

راحیل اس کا تایازاد بھائی تھا ان کی رہائش اسلام آباد میں تھی آصف کے والد واصف حسین ایک ٹیکسٹائل مل میں منیجر کے پوسٹ پر فائز تھے آصف ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور میڈیکل کا اسٹوڈنٹ تھا۔ کچھ روز پہلے آصف نے اپنے والد سے مری گھومنے کی اجازت چاہی اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے کلاس فیلوز دوستوں کے ساتھ کوہ مری گھومنے جارہا ہے۔ ان کا موبائل فون پر آصف سے رابطہ تھا۔

پھر اچانک آصف لاپتہ ہوگیا۔ ڈھونڈنے کے باوجود آصف کا کوئی سراغ نہیں ملا اس کا موبائل فون بھی آف تھا۔ اس کے والد اس کی تلاش میں یہاں بھی آچکے تھے اور پھر مایوس ہوکر واپس لوٹ گئے تھے۔ راحیل کے کہنے کے مطابق آصف کی کہیں انگیج منٹ بھی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کسی افیئر کے بارے میں سنا تھا تو پھر نرگس یا کرن کی اس کے ساتھ تصویر کیوں موجود تھی، آصف نے اسے کرن کی تصویر بھی دکھائی اور راحیل چونک گیا۔ "یار یہ تو واقعی ڈاکٹر نرگس ہیں ہمارے ہی اسپتال میں ہیں۔ بلکہ یہ اسپتال ان ہی کی ملکیت ہے۔ ان کے والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہوچکا ہے۔"

"وہ بھی یہی کہہ رہی تھی لیکن اس سنسان عمارت کے تہہ خانے سے اسی نے مجھے آزاد کروایا تھا اور پھر اس فائیو اسٹار ہوٹل کے باہر بھی مجھے وہی ملی تھی۔" آصف بولا۔

"آصف ہوسکتا ہے تمہیں وہم ہوا ہو ویسے بھی تم اپنی یادداشت کھو بیٹھے ہو شاید تمہاری ذہنی حالت کی وجہ سے تم اس دوسری لڑکی کو ڈاکٹر نرگس سمجھ بیٹھے ہو۔"

باتوں کے دوران وہ گھر پہنچ چکے تھے۔ راحیل کے والد حفیظ صاحب بھی گھر پر تھے۔ آصف کو راحیل کے ساتھ دیکھ کر وہ بھی حیران ہوگئے۔ راحیل کی بہن جمیلہ بھی اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھی راحیل نے گھر پر آصف کی موجودہ ذہنی حالت کے بارے میں نہیں بتایا، واصف صاحب کو آصف کے ملنے کی اطلاع کردی گئی تھی انہوں نے پہلی

دستیاب فلائٹ سے اسلام آباد آنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مگر راحیل نے منع کر دیا اور کہا کہ وہ خود ہی ایک دو روز میں آصف کو لے کر ان کے گھر آ جائے گا۔

پھر واصف صاحب نے آصف سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو راحیل نے موبائل فون آصف کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ''کیسے ہو بیٹا اور کہاں رہ گئے تھے تم جانتے نہیں کہ تمہاری گمشدگی سے ہم پر کیا گزری، تمہاری ماں تو دن رات روتی رہتی ہے۔'' ان کے لہجے سے بھی یہی لگ رہا تھا کہ وہ بھی بات کرتے ہوئے رو رہے ہیں۔

آصف تڑپ اٹھا۔ ''ابو...... اب میں آ گیا ہوں آپ فکر نہ کریں ایک دو روز میں گھر آ جاؤں گا بس چند ضروری کام نمٹانے ہیں۔'' اس کے بعد اس کی ماں نے اس کے ساتھ بات کی راحیل ڈاکٹر تھا اور اس اسپتال میں ڈیوٹی کر رہا تھا جہاں آصف ڈاکٹر نرگس سے ملا تھا۔ اس کی رات کی ڈیوٹی تھی وہ رات کو اسپتال چلا گیا۔

صبح ناشتہ کرتے ہی آصف ٹہلنے کے لئے گھر سے باہر نکلا۔ ٹہلتے ٹہلتے اس نے سوچا راحیل کی موجودگی میں دوبارہ ڈاکٹر نرگس سے ملوں۔ اس کا ذہن اب تک یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ کرن اور نرگس دو الگ الگ شخصیتیں ہیں۔

سامنے سے ایک ٹیکسی کو آتا دیکھ کر اس نے ٹیکسی کو ہاتھ کے اشارے سے روکا وہ اسپتال کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر اترا۔ اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ راحیل کی ڈیوٹی آف ہونے میں کچھ ہی دیر تھی۔ شاید ابھی نرگس بھی ڈیوٹی پر نہیں آئی تھی۔ اس کا ارادہ یہاں آتے ہی بدل گیا تھا اس نے سوچا جیسے ہی نرگس آئے گی وہ اسے روکے گا اگر وہ اپنی بات اڑی رہی تو وہ اسے وہ تصویر دکھائے گا جس میں وہ آصف کے ساتھ موجود تھی۔

آصف وہیں کھڑے کھڑے جب اکتا گیا تو اردگرد کا جائزہ لینے لگا اسپتال کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر ایک بغیر چھت والی جیپ کھڑی تھی جس میں تین اوباش صورت افراد بیٹھے تھے اسی وقت ایک طرف سے مہران کار آتی دکھائی دی وہ اسپتال کے گیٹ پر لمحہ بھر کے لئے

آہستہ ہوئی ہی تھی کہ اچانک جیپ سے تینوں اوباش صورت افراد اترے اور چشم زدن میں کار کے قریب پہنچ گئے۔ اب ان میں سے دو کے ہاتھوں میں پسٹل بھی نظر آ رہے تھے جو انہوں نے شاید لباس میں چھپا رکھے تھے اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھتا وہ کار کا دروازہ کھول کر نرگس کو باہر گھسیٹ کر جیپ میں ڈال چکے تھے۔

نرگس مدد کے لئے چیخ اور چلا رہی تھی ان کے ہاتھوں میں موجود پسٹل کی وجہ سے وہاں موجود افراد میں سے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ نرگس کو بچانے کی کوشش کرتا ادھر موقع پر موجود آصف حرکت میں آیا۔ اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھنے والی جیپ کے پیچھے دوڑا۔ اور بھاگ کر لمحوں میں جیپ میں سوار ہو گیا جیپ کے اندر زبردست کش مکش شروع ہو چکی تھی وہ اگرچہ اپنی یادداشت کھو چکا تھا لیکن شاید ماضی میں مارشل آرٹ کا کھلاڑی رہ چکا تھا اس لئے اس کے لاشعور میں دبے مارشل آرٹ کے داؤ پیچ خود بخود سامنے آنے لگے اور اس کے ہاتھ پاؤں چلنے لگے اس نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ ڈال کر مزاحمت کی ایک پسٹل بردار نے پسٹل کا دستہ اس کے سر پر مارنے کی کوشش کی آصف کی زوردار بیک کک اس کے سینے پر پڑی اور وہ چیختا ہوا چلتی جیپ سے گر پڑا۔

یہ دیکھ کر دوسرے نے آصف کی طرف پسٹل سیدھا کیا ہی تھا کہ آصف نے اس کے پسٹل والے ہاتھ پر ہاتھ ڈال دیا ٹریگر دبا گولی چلی جو آصف کے کان کی لو کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ آصف کا زوردار گھونسہ اس شخص کے جبڑے پر پڑا پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

فائر کے ہولناک دھماکے نے آصف کے حافظے کو ہلا دیا اسے ایسا لگا جیسے یہ فائر کی آواز وہ پہلے بھی کہیں سن چکا ہے۔ ماضی کا کچھ حصہ اسے یاد آنے لگا ادھر حملہ آور نے اس کی لمحاتی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اس کے گلے پر دونوں ہاتھ جما دیئے اور پوری قوت سے اس کا گلا دبانے لگا جیپ اب تک سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

ڈاکٹر نرگس خوف زدہ ہراساں سی ایک طرف پڑی تھی۔ جبکہ آصف کا دم گھٹنے لگا اور آنکھوں کے آگے

دھندی چھانے لگی بھاری بھرکم شخص اس پر سوار اس کا گلا دبا رہا تھا آصف نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائیاں تھامیں اور دایاں پاؤں اس کے سینے پر جما کر اوپر کی طرف زوردار جھٹکا دیا۔ وہ شخص آصف کے اوپر سے اڑتا ہوا سا جیپ سے باہر سڑک پر جا گرا، اب آصف نے چلتی ہوئی جیپ کے ڈرائیور کو پیچھے سے دبوچ لیا، ڈرائیور نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی اس کشمکش میں جیپ اس کے کنٹرول سے باہر ہوئی اور سڑک کنارے نصب پول سے جا ٹکرائی اور ایک زوردار جھٹکے سے الٹ گئی۔

نرگس جیپ الٹنے سے پہلے ہی اچھل کر جیپ سے باہر جا گری، تھی خوش قسمتی سے وہ فٹ پاتھ کے قریب قطار میں لگے ہوئے پودوں پر گری اس لئے اسے کوئی خاص چوٹ نہیں لگی جبکہ ڈرائیور کا سر پوری قوت سے اسٹیئرنگ سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہو گیا جبکہ آصف کے سر پر بھی چوٹ لگی اور وہ ہوش و حواس سے عاری ہو گیا۔

☆......☆......☆

''ڈاکٹر مریض کسمسا رہا ہے۔'' اس کی سماعت سے ایک جانی پہچانی آواز ٹکرائی اور آصف نے آنکھیں کھول دیں یہ کسی اسپتال کا کمرہ تھا وہ بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اس کے سامنے راحیل اور نرگس موجود تھے جبکہ قریب ہی ایک ینگ ڈاکٹر کھڑا تھا۔ اسٹینڈ سے ڈرپ لگی ہوئی تھی جس کا محلول آصف کی رگوں میں اتر رہا تھا اس نے بڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی بے اختیار حرکت کرنے سے اسکے سر میں درد کی ایک شدید لہر اٹھی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ ''خیریت تو ہے۔'' راحیل نے متوش لہجے میں پوچھا۔

''ہاں سر میں درد سا ہو رہا ہے۔'' آصف نے جواب دیا۔

ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اس کا معائنہ کیا۔ ''اب یہ نارمل ہیں کوئی خطرے والی بات نہیں، صرف سر پر چوٹ لگنے سے بے ہوش ہوئے تھے۔'' ڈاکٹر نے کہا اور اسے پین کلر انجکشن لگا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

''شکر ہے کرن تم خیریت سے ہو ان نقاب پوشوں نے اچانک ہم پر حملہ کر دیا تھا اور پھر میں نے بے ہوش ہوتے ہوئے تمہاری چیخ سنی تھی۔'' آصف بولا۔

''میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ میں کرن نہیں ڈاکٹر نرگس ہوں۔'' وہ منمناتے ہوئے بولی اور آصف اسے بے یقینی سے گھورنے لگا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' وہ سوچنے لگا کہ سر پر لگنے والی دوبارہ چوٹ سے اس کی یادداشت لوٹ چکی تھی۔

آصف کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا اکلوتا ہونے کے باعث اس کے والدین اسے بے انتہا چاہتے تھے وہ ایک ایڈوانچر پسند نوجوان تھا مارشل آرٹس سے اسے جنون کی حد تک لگاؤ تھا اس نے گھر میں سینڈ بیگ اور اس قسم کی دوسری چیزیں رکھ چھوڑی تھیں اس کا سارا دن مصروفیت میں گزرتا۔ کالج سے گھر آ کر سارا دن سینڈ بیگ سے مصروف رہتا اور شام کو کراٹے کلب چلا جاتا اس روز وہ شام کے وقت کلب جانے کے لئے اپنی بائیک پر نکلا شادمان کے قریب ایک نسبتاً سنسان سڑک پر بائیک جھٹکا کھا کر بند ہو گئی کئی کِکس لگانے کے باوجود بھی جب بائیک اسٹارٹ نہ ہوئی تو وہ جھنجلا اٹھا۔

اسی وقت ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ''ہیلپ ہیلپ۔'' اس نے آواز کی سمت دیکھا۔ دائیں طرف فٹ پاتھ کے قریب ایک ہنڈا اکارڈ کھڑی تھی ہنڈا اکارڈ کے سامنے ایک ہائی روف اس طرح آڑی ترچھی کھڑی تھی کہ ہنڈا اکارڈ کا راستہ مسدود ہو چکا تھا۔ دو تنومند شخص ایک خوبصورت لڑکی کو گھسیٹ کر ہائی روف میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پسٹل موجود تھا شاید اسی لئے سڑک پر موجود چند افراد کی مداخلت کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی مذموم کوشش میں کامیاب ہوتے۔ آصف نے موٹر سائیکل ایک طرف پھینکی سڑک پر پڑا ایک پتھر اٹھایا اور پوری قوت سے پسٹل بردار کی طرف پھینک دیا نوکیلا پتھر پسٹل بردار کے سر میں لگا اور وہ چیخ کر ایک طرف گر پڑا۔

لڑکی ان کی گرفت سے نکل چکی تھی بساط کا رخ پلٹتے دیکھ کر اس کے ساتھی نے اپنے بے ہوش ساتھی کو چشم

زدن میں ہائی روف میں ڈالا اس سے پہلے کہ آصف ان تک پہنچتا ہائی روف تیز رفتاری سے ایک طرف نکل گئی۔

لڑکی ایک طرف کھڑی خوف سے کپکپا رہی تھی۔ ''یہ لوگ کون تھے؟ اور آپ کو کیوں اغوا کرنا چاہتے تھے؟'' آصف نے پوچھا۔

''آپ مم...... مجھے گھر تک چھوڑ دیں۔'' لڑکی نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر ہکلاتے ہوئے کہا۔ وہ اب تک خوف زدہ تھی۔ آصف کو اپنی غلطی کا احساس ہوا سڑک پر موجود چند افراد عجیب نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آصف نے موٹر سائیکل ایک اسپیئر پارٹس کی دکان کے سامنے پارک کی اور اس کا خیال رکھنے کی تاکید کر کے دوبارہ لڑکی کے قریب پہنچا۔

ہنڈا اکارڈ اسی لڑکی کی تھی۔ لیکن اس حادثے سے اس کے اعصاب پر برا اثر پڑا تھا۔ اس وقت لڑکی کا ڈرائیونگ کرنا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ آصف نے ہنڈا اکارڈ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ لڑکی کا گھر ایک پوش علاقے میں تھا اس نے لڑکی کی ہدایت کے مطابق گاڑی ایک شاندار قسم کے بنگلے کے سامنے جا رکی اور اتر کر ڈور بیل بجائی۔ دروازہ ادھیڑ عمر خاتون نے کھولا۔ ''اچھا اب میں چلتا ہوں۔'' آصف مڑا۔

پلیز! ''اندر آئیں، آپ نے میری جان بچائی ہے۔''

''وہ میرا فرض تھا۔'' آصف نے جواب دیا۔

''پلیز! آئیں ناں میں آپ کو اس طرح نہیں جانے دوں گی۔'' لڑکی بولی اور وہ انکار نہ کرسکا۔

دو سو چالیس گز پر بنے ہوئے اس بنگلے میں خوب صورتی کے ساتھ ساتھ مضبوطی کا بھی خیال رکھا گیا تھا۔ لڑکی نے اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھایا کچھ دیر بعد ادھیڑ عمر خاتون چائے اور بسکٹ لائی اور اس کے سامنے میز پر رکھ کر چلی گئی۔ لڑکی کا نام کرن تھا اور ادھیڑ عمر خاتون اس کی ملازمہ تھی۔

''وہ کون لوگ تھے اور آپ کو کیوں اغوا کرنا چاہتے تھے؟'' آصف نے چائے پیتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

کرن نے اپنی روداد بیان کر ڈالی۔ اس کے والد پروفیسر داؤد ایک سائنسدان تھے وہ دارالحکومت سے دور ایک بلند و بالا پہاڑی علاقے میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی رہائش کے لئے جو عمارت بنا رکھی تھی وہ آبادی سے الگ تھلگ تھی۔ اسی عمارت میں انہوں نے تجربہ گاہ بنا رکھی تھی جہاں وہ تجربے کرتے تھے پروفیسر داؤد تنہائی پسند اور آدم بیزار شخص تھے۔ بیوی کا انتقال ہوچکا تھا کرن ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ان کے خاندان میں ان کا صرف ایک بھائی سجاول تھا۔ جو نوعمر میں ہی اوباش فطرت دوستوں کے ساتھ گھومنے لگا اور پھر ایک روز برسوں پہلے اچانک لاپتہ ہوگیا۔

پروفیسر داؤد ان دنوں کسی نئی ایجاد کے چکر میں تھے پورا دن صرف چار گھنٹے سوتے اور بیس گھنٹے تجربہ گاہ میں مصروف رہتے ان کی ایجاد تکمیل کے آخری مراحل میں تھی کہ کسی نے فون پر بھاری رقم کے عوض اس ایجاد اور فارمولے کو خریدنے کی پیش کش کی، اسے نہ جانے کیسے اس ایجاد کی بھنک پڑ گئی تھی انکار پر اس نامعلوم شخص نے پروفیسر داؤد کو دھمکیاں دیں، اس بارے میں پروفیسر داؤد نے کرن کو بھی آگاہ کیا اور ایک عجیب ساخت کا لاکٹ اسے پہننے کے لئے دیا اور کہا کہ اس لاکٹ کا خاص خیال رکھے۔ دھمکیاں ملنے کے بعد انہوں نے پولیس کو بھی اطلاع دی۔

ایک روز جب کہ کرن کالج سے گھر پہنچی تو گھر کا دروازہ خلاف معمول کھلا ہوا ملا وہ دھڑکتے دل سے اندر داخل ہوئی کوریڈور میں چوکیدار کی لاش پڑی تھی۔ اس کی گردن میں گولی ماری گئی تھی اور تجربہ گاہ کے فرش پر پروفیسر داؤد کی لاش پڑی تھی۔ گولی ان کے عین دل کے مقام پر پیوست تھی تجربہ گاہ سمیت گھر کے ہر کمرے میں چیزیں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں گویا قاتل کو کسی خاص چیز کی تلاش تھی۔

نامعلوم افراد کے خلاف FIR درج کرلی گئی جس نمبر سے پروفیسر داؤد کو فون کیا گیا تھا وہ بوگس موبائل نمبر تھا۔ دوسرے روز کرن کو ایک نئے نمبر سے فون کیا گیا۔

''مس کرن سپر شیڈو کا فارمولا کہاں ہے تم یقیناً جانتی ہوگی کیونکہ تم ان کی بیٹی ہو۔''

''میں کسی فارمولے کے بارے میں نہیں جانتی۔'' کرن نے جواب دیا اور رابطہ منقطع کردیا۔

پولیس کو اس فون کال کی بھی اطلاع کردی گئی مگر یہ سم بھی کسی کے نام پر نہیں تھی اور استعمال کے بعد فوراً ضائع کردی گئی تھی۔ وہ جان بچانے کے لئے دوسرے شہر آ گئی یہاں بھی پوش علاقے میں پروفیسر داؤد کا بنگلہ تھا۔ اس نے ایک ادھیڑ عمر خاتون کو اپنی تنہائی دور کرنے کے لئے ملازمہ رکھ لیا تھا۔ پروفیسر داؤد کے قتل کو تیس روز گزر چکے تھے۔ اس نے یہیں ایک کالج میں ایڈمیشن لے لیا تھا اور شام کو کوچنگ پڑھنے جاتی تھی آج جبکہ وہ کوچنگ سینٹر سے لوٹ رہی تھی ان نامعلوم افراد نے اسے اغوا کرنے کی کوشش کی جو شاید ان کے ساتھی تھے۔ جنہوں نے پروفیسر داؤد کا قتل کیا تھا۔ ''وہ لاکٹ تو دکھاؤ جو تمہارے پاپا نے تمہیں دیا تھا۔'' آصف نے کہا۔

اور کرن نے اپنے گلے سے چین سمیت لاکٹ نکال کر اسے تھمادیا یہ قدرے ابھرا ہوا عجیب ساخت کا لاکٹ تھا غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا لاکٹ کی پشت پر گھڑی کی سوئی سے مشابہ ایک ننھا سا بٹن تھا اس کے علاوہ اس لاکٹ میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس نے لاکٹ دوبارہ کرن کی طرف بڑھایا اسے میری طرف سے گفٹ سمجھ کر رکھ لو۔'' کرن مسکرائی اور آصف نے اس کے اصرار پر لاکٹ گلے میں پہن لیا۔

''تم پولیس سے مدد کیوں نہیں لیتی۔''

پولیس کیا کرے گی وہ آج تک میرے پاپا کے قاتلوں کا سراغ نہیں لگا سکے۔ آج دن دھاڑے مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی اب اگر پولیس کو اطلاع دوں گی تو وہ رسمی تفتیش کے بعد فائل داخل دفتر کردیں گے اور پھر کسی روز پاپا کی طرح مجھے بھی مار دیا جائے گا۔'' کرن کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

آصف جانتا تھا کہ یہ سچ ہے، پاکستانی پولیس کی تفتیش صرف کاغذات کا پیٹ بھرنے تک محدود رہتی ہے۔ آصف کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''میرے خیال میں اس معمے کو حل کرنے کے لئے ہمیں تمہارے پاپا کی تجربہ گاہ میں جانا ہوگا۔ آخر وہ کس چیز کا فارمولا تھا جس کی خاطر دو انسانوں کی جان لی گئی اور اب وہ خطرناک مجرم اس فارمولے کے حصول کے لئے تمہارے پیچھے پڑے ہیں۔ میں اس سلسلے میں اپنے دوست شعیب کے ڈیڈی ممتاز سے رابطہ کروں گا وہ ڈی ایس پی رینک کے ایک ایماندار اور بہادر پولیس آفیسر ہیں۔'' ان کے درمیان یہی طے پایا کہ وہ اگلے ہفتے پروفیسر داؤد کی تجربہ گاہ میں جائیں گے اور وہاں سے کوئی ثبوت یا فارمولا ہاتھ لگتے ہی DSP چوہدری ممتاز سے رابطہ کریں گے۔

اس ہفتے کے دوران آصف DSP چوہدری ممتاز سے بھی ملا اور اسے تمام حالات اور واقعات بتا کر مدد کی درخواست کی۔ چوہدری ممتاز نے اسے اپنا موبائل فون نمبر دے کر کہا کہ ''فارمولا یا مجرموں کے خلاف کوئی ثبوت ملتے ہی وہ اس سے رابطہ کرے۔'' باقی سب وہ خود سنبھال لے گا۔

اپنے والد واصف صاحب کو بھی آصف نے یہی بتایا کہ وہ اپنے کلاس فیلوز دوستوں کے ساتھ کوہ مری گھومنے جارہا ہے۔ ان چند دنوں میں آصف اور کرن ایک دوسرے کے قریب آتے جارہے تھے۔ چھٹے روز وہ کرن کے ساتھ اسلام آباد جا پہنچا۔

پروفیسر داؤد کی تجربہ گاہ کالاباغ کے پہاڑی علاقے میں تھی۔ اسلام آباد میں انہوں نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانا کھایا اور پھر روانہ ہوگئے۔ اس سنسان پہاڑی علاقے میں پروفیسر داؤد کا گھر واقعی شاندار تھا۔ پکی سڑک سے عمارت تک کا راستہ کچا اور ناہموار تھا۔ عمارت سے باہر سینکڑوں فٹ گہری کھائیاں تھیں جنہیں دیکھتے ہی خوف آتا تھا۔ کچھ دیر ریلیکس ہونے کے بعد کرن کہیں سے پولو رائڈ کیمرہ اٹھا لائی یہ جدید ہائی میگا پکسل کیمرہ تھا اسنے نمایاں جگہ کیمرہ سیٹ کیا اور آصف کا ہاتھ تھام کر کھڑی ہوگئی۔ تصویر خاصی خوب صورت آئی تھی۔ جسے آصف نے اصرار کر کے اپنے پاس رکھ لیا۔ اس نے اب تک بدستور

آصف کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

کرن کے گداز ہاتھوں کے لمس سے آصف کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اس نے دوسرا ہاتھ کرن کی کمر میں ڈالا اور اسے خود سے قریب کرلیا اس کے بدن سے اٹھنے والی مسحور کن خوشبو آصف کو سحر زدہ کر چکی تھی۔ وہ کرن کو لئے ہوئے بیڈ تک گیا اور اسے بانہوں میں اٹھا کر بیڈ پر لٹا کر خود اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ کرن خود سپردگی کی کیفیت میں لیٹی تھی اور اس نے اپنی آنکھیں موند رکھی تھیں۔ آصف نے جیسے ہی اس کے رخساروں پر اپنے ہونٹ رکھے تو اس کا دل تیزی سے یوں دھڑکنے لگا جیسے پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

وہ حسن کی سلطنت پر قدم بڑھتا ہوا لب جاں تک آیا اور اس کے جلتے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور اپنے لبوں سے اس کے لبوں کو جکڑ لیا۔ ''م مجھے...... چھوڑو، کک کوئی آجائے گا۔'' وہ تیز و تند طوفان کے لپیٹ میں آتے ہوئے تنکے کی طرح ڈول رہی تھی۔

''آنے دو۔'' وہ بے خودی میں بولا۔

''کوئی دیکھ لے گا۔'' کرن سرگوشی میں بولی۔

''دیکھنے دو۔'' بکھری ہوئی سانسوں سے جواب دیا گیا اور پھر جب طوفان تھما تو دونوں آسودہ اور شرسار ہو چکے تھے۔

کچھ دیر بعد انہوں نے گھر کی تلاشی لی۔ کمروں کی تلاشی کے بعد وہ تجربہ گاہ میں جا گھسے وہاں بھی انہیں کوئی خاص چیز نہ ملی مایوس ہو کر مڑے اور تجربہ گاہ سے باہر نکلنے لگے۔ اچانک آصف ایک جگہ کسی چیز سے ٹھوکر لگتے ہی گرا، اس نے گرتے گرتے بے اختیار دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آگے کرلیا تھا۔ اس لئے چہرے پر کوئی چوٹ نہ لگی البتہ اس کے گرنے سے جو دھمک پیدا ہوئی اس نے اسے چونکا دیا ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے قالین کے نیچے کوئی لکڑی کا تختہ ہو۔

اس نے کرن کے ساتھ مل کر وہاں سے قالین ہٹایا وہاں چار ضرب چار کا فرش سے ہم آہنگ لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوا تھا گویا وہ کوئی تہہ خانہ تھا۔ آصف نے تختہ ایک طرف ہٹایا اور کرن کے ہمراہ سیڑھیاں اترنے لگا سیڑھیوں کے اختتام پر دروازہ تھا جو خوش قسمتی سے لاک نہیں تھا وہ دروازہ کھول کر اس ہال نما کمرے میں داخل ہوگئے۔ اندر دو انرجی سیور نصب تھے جنہوں نے اس وقت کمرے کو روشن کر رکھا تھا۔

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کمرے میں کسی بھی قسم کا ساز و سامان نہیں تھا اور کمرے کے فرش میں درجنوں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ جیسے یہ سانپ یا چوہوں کے بل ہوں۔ وہ دوبارہ تجربہ گاہ میں لوٹ آئے اور تختہ اپنی جگہ رکھ کر اوپر پہلے کی طرح قالین رکھ دیا۔

اچانک نہ جانے کس خیال کے تحت آصف دوبارہ تجربہ گاہ میں رکھی الماری کی طرف بڑھا اور بالآخر وہ الماری کا ایک خفیہ دراز تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا اس دراز میں ایک فائل رکھی تھی جس میں بہت سے کاغذات تھے ان کاغذات میں سائنسی اصلاحات میں فارمولے لکھے تھے جو ان دونوں کی سمجھ میں نہیں آئے۔

البتہ صرف ایک کاغذ پر اردو میں تحریر تھا۔ سپر شیڈو ایک ایسی ایجاد ہے جو دنیا بھر میں تہلکہ مچا دے گی یہ ایک لاکٹ نما آلے کی شکل میں ہے جو عجیب ساخت کا ہے۔ اس لاکٹ کے پیچھے ایک انتہائی مختصر ترین بٹن ہے اگر کوئی انسان اس لاکٹ کو گلے میں پہن کر اس بٹن کو دبائے گا تو وہ سائے میں تبدیل ہوجائے گا بالکل حقیقی سائے کی مانند جو روشنی میں تو دکھائی دیتا ہے مگر تاریکی میں نظر نہیں آتا۔ سائے میں تبدیل ہونے کے بعد اس پر نہ ہی کوئی گولی اثر کرے گی اور نہ ہی کوئی دوسرا ہتھیار اسے نقصان پہنچا سکے گا۔ ہاں البتہ خود لاکٹ پہننے والا مخالف کو ہر قسم کا نقصان پہنچا سکتا ہے اس لاکٹ نما آلے کے متحرک ہوتے ہی انسانی جسم اربوں ذرات میں تقسیم ہو کر سائے میں تبدیل ہوجاتا ہے اور دوبارہ انسانی جسم میں آنے کے لئے لاکٹ کا بٹن دوبارہ دبانا ضروری ہے۔ ابھی ابتدائی طور پر صرف ایک لاکٹ تیار کیا گیا ہے جسے میں نے کرن کے گلے میں پہنا دیا ہے

سیلن اصل بات اسے بھی نہیں بتائی اس فارمولے کو مزید بہتر بنانے کے بعد میں اسے حکومت کے حوالے کردوں گا تاکہ ہمارا ملک اس فارمولے سے مستفید ہوسکے، میں نے برسوں پرانی یہ عمارت اسی تجربے کو کامیاب بنانے کی غرض سے خریدی تھی۔

اس عمارت میں تجربہ گاہ کے نیچے ایک تہہ خانہ بھی ہے جس میں درجنوں کی تعداد میں بلی سے مشابہ خونخوار چوہے ہیں جو تاریکی ہوتے ہی انسانوں کو چٹ کرجاتے ہیں۔'' کاغذ پر لکھی تحریر پڑھتے ہی آصف ششدر رہ گیا خود کرن کا منہ بھی حیرت سے کھل گیا تھا۔''امپاسبل یہ کیسے ممکن ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔

''کرن اس جدید دور میں کچھ بھی مشکل نہیں سینکڑوں سال پہلے کسی کے وہم گمان میں بھی نہ ہوگا کہ انسان چاند پر پہنچ سکتا ہے۔ دیکھو آج پہنچ چکا ہے ویسے بھی تجربہ سچائی کی کسوٹی ہے۔'' آصف نے کہا اور فائل دوبارہ الماری کے خفیہ خانے میں رکھ کر الماری بند کی اور لاکٹ کی پشت پر موجود بٹن دبادیا۔

کرن حیرت سے اچھل پڑی آصف غائب ہوچکا تھا اب وہاں سایہ نظر آرہا تھا۔''تت تم تو سچ مچ سائے میں تبدیل ہوچکے ہو۔'' کرن ہکلائی۔

آصف نے اپنی اور کرن کی تسلی کے لئے تین چار بار اس عمل کو دہرایا اور پھر سائے سے انسان بن گیا۔

''ناقابل یقین سچائی سامنے آنے کے بعد مجھے اب تک یقین نہیں آرہا۔'' وہ تجربہ گاہ سے اٹھ کر کمرے میں آچکے تھے جس میں انہوں نے نشاط انگیز لمحات گزارے تھے۔

آصف نے DSP چوہدری ممتاز کا نمبر ڈائل کیا اور دوسری طرف سے کال ریسو ہوتے ہی بولا۔''انکل ہم سپر شیڈو کا فارمولا تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔''

''ایجاد اور فارمولے کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔'' چوہدری ممتاز نے بے تابی سے کہا۔

''سر رات کا وقت ہے ہم دونوں صبح سویرے اس جگہ سے روانہ ہوجائیں گے اور وہاں آکر آپ کو تفصیل سے آگاہ کروں گا۔'' آصف نے اتنا ہی کہا تھا کہ کال ڈراپ ہوگئی آصف نے دوبارہ نمبر ملانا چاہا مگر ناکامی ہوئی۔ اس پہاڑی مقام پر سگنل پرابلم تھا۔

وہ رات دیر تک مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ پھر نصف شب کے بعد سوگئے رات کا آخری پہر تھا وہ گہری نیند میں تھے کہ ایک کھٹکے سے آصف کی آنکھ کھل گئی وہ پھرتی سے اٹھا اور کرن کو جگادیا۔''کیا ہوا خیریت تو ہے۔'' وہ گھبرا گئی۔

''خاموشی سے اٹھو ایسا محسوس ہورہا ہے جیسے کوئی گھر میں کودا ہو۔'' آصف نے احاطے میں کھلنے والی کھڑکی کا پٹ کھولا تو اس کے اندیشوں کی تصدیق ہوگئی، احاطے میں نصف درجن مسلح نقاب پوش موجود تھے۔

''اس سے پہلے کہ یہ ہمیں گھیرلیں ہمارا یہاں سے نکلنا ضروری ہے۔'' آصف نے کہا اور پھر قدرے توقف سے پوچھا۔''کیا اس عمارت سے باہر نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ بھی ہے؟''

''ہاں تجربہ گاہ سے عمارت کی عقبی سمت بھی راستہ ہے۔'' کرن نے جواب دیا۔ وہ کرن کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے تجربہ گاہ کی طرف دوڑا۔ اور تجربہ گاہ کے عقبی دروازے سے باہر نکل گیا۔ نقاب پوش عمارت میں داخل ہوچکے تھے اس سے پہلے کہ وہ صورتحال کو سمجھتے آصف اور کرن باہر نکل چکے تھے باہر ایک پراڈو اور ایک بڑے ٹائروں والی جیپ موجود تھی انہوں نے دونوں گاڑیوں میں جھانکا خوش قسمتی سے چابی پراڈو کے اگنیشن میں لگی ہوئی تھی دونوں پراڈو میں سوار ہوگئے آصف نے گاڑی اسٹارٹ کی اور تیز رفتاری سے اس ناہموار اور کچے راستے پر دوڑادی۔ ایک تو رات کا اندھیرا اور کچی سڑک ناہموار تھی اور پھر دائیں بائیں سینکڑوں فٹ گہری کھائیاں تھیں وہ ایک حد سے زیادہ رفتار نہیں بڑھا سکتا تھا۔ پھر اسے دور سے اپنے تعاقب میں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی دکھائی دی جو رفتہ رفتہ قریب آتی جارہی تھی۔ وہ سپر شیڈو نامی کرشماتی لاکٹ کی خصوصیات کو بھول چکا تھا۔ اگرچہ ایسا گھبراہٹ میں ہوا تھا لیکن اسی کو مقدر کا کھیل کہتے ہیں ان کی گاڑی فائرنگ رینج میں آچکی تھی۔

ایک نقاب پوش نے رائفل جیپ کی کھڑکی سے باہر نکالی اور گولی چلادی گولی پراڈو کے پچھلے ٹائر میں لگی اور پراڈو آصف کے کنٹرول سے باہر ہوکر ایک درخت سے جاٹکرائی آصف کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا اور اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے کرن کی چیخ سنی۔

پھر اسے جب ہوش آیا تو وہ چوہوں والے تہہ خانے میں قید تھا۔ اس کے بعد دوبارہ چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت لوٹ آئی تھی اس کے ذہن میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ اگر یہ لڑکی کرن نہیں اس کی کوئی ہم شکل ڈاکٹر نرگس ہے تو پھر کرن کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ لیکن آصف کا دل یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ وہ کرن نہیں۔ ہو بہو وہی شکل وصورت وہی قد وقامت وہی لب ولہجہ کہیں یہ بھی تو میری طرح یادداشت نہیں کھو بیٹھی۔

''اگر ایسا ہے تو مجھے اس کے سر پر بھی ڈانڈا مار کر اسے دوبارہ بے ہوش کرنا ہوگا تاکہ دوبارہ ہوش آتے ہی اس کی یادداشت بھی بحال ہوجائے۔'' اس نے سوچا اور پھر اپنی اس بچکانہ سوچ پر خود ہی ہنس پڑا۔

''کیا دماغ کا کوئی دوسرا اسکرو ڈھیلا ہوگیا ہے جو آنکھیں موندے خود بخود بلاوجہ ہنس رہے ہو۔'' راحیل کی ہنستی ہوئی آواز سنائی دی اور اس نے آنکھیں کھول دیں چوٹیں معمولی تھیں اسے شام سے پہلے ہی ڈسچارج کردیا گیا۔

وہ نرگس سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا اس لئے راحیل کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا جہاں وہ اپنی فرینڈ زلیڈی ڈاکٹر کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔

آصف نے چائے پینے کے دوران اپنی روداد نرگس کو سنائی اس روداد میں اس نے سپرشیڈ یعنی کرشماتی لاکٹ کا ذکر نہیں کیا پھر اپنی اور کرن کی مشترکہ تصویر اسے دکھائی جسے دیکھ کر نرگس حیران ہوگئی۔ ''یہ تو ہو بہو میری ہم شکل ہے۔''

آصف بولا۔ ''اب میری آپ سے گزارش ہے کہ سب سے پہلے تو مجھے اپنے بارے میں بتائیں آپ کون ہیں؟''

نرگس بولی۔ ''پہلے تو میں آپ کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہوگئی تھی لیکن اب جب کہ میں جان چکی ہوں کہ آپ ایک مخلص انسان ہیں اس روز اگر آپ نہ ہوتے تو نہ جانے وہ غنڈے اغوا کرنے کے بعد میرے ساتھ کیا سلوک کرتے جو دن دھاڑے نہ جانے کیوں مجھے اغوا کرنا چاہتے تھے۔

میرا نام نرگس ہے اور تعلق ایک دور دراز کے پہاڑی علاقے سے ہے۔ میرا باپ لالی گاؤں کے سردار جہانگیر خان کا منشی تھا۔ تعلیم حاصل کرنا اور علم کی شمع کو جلانا میرا جرم ٹھہرا سردار جہانگیر نے میرے چھوٹے بھائی کو گن پوائنٹ پر رکھ کر میرے باپ کو حکم دیا کہ شہناز کو دریا میں پھینک دو مجبوراً میرے باپ کو ایسا کرنا پڑا۔

ان دنوں میری عمر دس سال تھی لیکن کسی نے سچ کہا ہے جس کا کوئی نہیں اس کا خدا ہوتا ہے۔ اور مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ دریا میں گرتے ہی میں لمحوں میں بہتی ہوئی نہ جانے کہاں جا پہنچی دریا کی سرکش لہروں نے مجھے گھنی جھاڑیوں میں اچھال دیا۔ وہاں ڈاکٹر خاور اپنی اہلیہ شبانہ کے ساتھ تفریح کی غرض سے آئے ہوئے تھے ان کا خیمہ دریا سے کچھ فاصلے پر نصب تھا ڈاکٹر خاور صبح سویرے اٹھ کر ایکسائز کرنے کے عادی تھے۔ اس روز بھی وہ صبح سویرے دوڑتے ہوئے دریا کے کنارے پہنچے تو ان کی نظر جھاڑیوں میں پڑی بے ہوش دس سالہ بچی پر پڑی۔ وہ لڑکی شہناز تھی ان کی فوری طبی امداد سے میری زندگی بچ گئی وہ بے اولاد تھے میری سرگزشت سن کر مجھے اسلام آباد لے آئے۔ میرا نام شہناز سے تبدیل کرکے نرگس رکھ دیا گیا انہوں نے حقیقی اولاد کی طرح میری پرورش کی۔ ابھی میں نے میڈیکل کی تعلیم مکمل کی ہی تھی کہ ٹریفک حادثے میں ڈاکٹر خاور اور شبانہ کا انتقال ہوگیا ان کی کروڑوں کی جائیداد اور بینک بیلنس میرے حق میں کی گئی وصیت کی وجہ سے مجھے ملا۔

میں نے ڈاکٹر خاور کے نام سے اسپتال قائم کیا جہاں غریبوں اور مستحق افراد کا مفت علاج کیا جاتا ہے۔ ہمارے اسپتال کی ذاتی ایمبولینس سروس شہر بھر سے حادثے کے افراد کو فوری طور پر اسپتال پہنچاتی ہے کچھ

دیہی علاقوں میں سماجی تنظیموں کے تعاون سے میں نے اسکول بھی قائم کئے ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ ایک اچھے اور مخلص انسان ہیں اگر اس کارخیر میں ہمارا ساتھ دیں تو یہ انسانیت کی خدمت ہوگی۔"

"مس نرگس سچی بات تو یہ ہے کہ میں آپ کے خیالات سے بہت متاثر ہوا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اس مشن میں آپ کا ساتھ ضرور دوں گا اور یہ بھی امید کرتا ہوں کہ آپ انسانیت کے ناطے میری مدد ضرور کریں گی۔"

نرگس نے اسے استفساریہ نگاہوں سے دیکھا۔

"کرن کی کہانی کراچی سے شروع ہوئی تھی مجھے امید ہے اس ڈور کا کوئی نہ کوئی سرا ہمیں وہاں ملے گا۔ آپ میں اور کرن میں رتی برابر بھی فرق نہیں آپ کرن بن کر میرے ساتھ چلیں ہوسکتا ہے آپ کو دیکھ کر کرن کے دشمن بوکھلا کر سامنے آجائیں اور ہم انہیں ٹریس کرلیں اور کرن کو ڈھونڈ نکالیں گے۔" کچھ دیر سوچنے کے بعد نرگس نے حامی بھرلی۔

دوسرے روز ڈاکٹر نرگس خاصی مصروف رہی اس نے اسپتال کی ذمہ داری راحیل کے سپرد کی تیسرے روز وہ ٹرین پر سوار ہوگئے، جہلم چھاؤنی پر ٹرین چند منٹ کے لئے رکی اور کسی کالج کے سات آٹھ لڑکے ان کی بوگی میں سوار ہوئے یہ نہایت ہی شریر اور شوخ لڑکے تھے وہ ویسے بھی کم عمر تھے یہ عمر ہوتی ہی لاابالی ہے۔ وہ بوگی کے تقریباً ہر مسافر کو تنگ کررہے تھے۔ ویسے بھی اس بوگی میں مسافروں کی تعداد کم تھی۔

یکا یک ان کی نظر آمنے سامنے بیٹھے آصف اور نرگس پر پڑی، اب شیطانوں کی اس ٹولی کا رخ ان کی طرف ہوگیا۔ ایک منچلا لڑکا نرگس کے سامنے فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور گانے لگا۔

چاند میرا دل، چاندنی ہو تم، چاند سے ہے دور چاندنی کہاں۔

دوسرا اصف کے قریب آیا۔ "بابوجی آپ کی داڑھی میں تنکا۔"

"ابے اس کی داڑھی نہیں۔" تیسرے نے کہا اور بوگی ان کے قہقہوں سے گونج اٹھی۔

آصف کا خون کھول اٹھا ان کی بے ہودگیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ آصف ان پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہتا تھا لیکن اب معاملہ اس کی برداشت سے باہر ہوتا جارہا تھا وہ انہیں چھوٹا سا سبق سکھانا چاہتا تھا۔ "میں ذرا ٹوائلٹ سے ہوکر آتا ہوں۔" اس نے نرگس سے کہا اور اپنی سیٹ پر سے اٹھا۔

"ابھی سے ہی سوسوآرہی ہے۔" ان میں سے ایک نے طنز کیا آصف ان کی بات کا جواب دیئے بغیر ٹوائلٹ میں گیا اور گلے میں پڑے لاکٹ کا بٹن دبادیا۔ اگلے ہی لمحے وہ سائے میں تبدیل ہوگیا۔

ادھر شیطانوں کی ٹولی مسلسل نرگس پر فقرے کس رہی تھی۔ جبکہ نرگس خوف زدہ۔ وہ اس سائے سے بے خبر تھے جوان کے پیچھے کھڑا تھا۔ پھر ایک لڑکے کی پشت پر زوردار لات پڑی۔ وہ چیختا ہوا ایک طرف جاگرا۔ دن کے وقت تو انسان کا سایہ ویسے بھی گھٹ جاتا ہے اور اس وقت تو وہ سایہ ان کے اپنے سایوں کے ساتھ گڈمڈ ہوچکا تھا اس لئے وہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ ان کے ساتھ کیا ہورہا ہے، اس نے بے ہودگیاں کرنے والے ایک دوسرے لڑکے کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا شیطانوں کی ٹولی خوف زدہ ہوچکی تھی ان کی پٹائی کرنے والا نظر نہیں آرہا تھا، وہ سب بری طرح سہم چکے تھے اور "بھوت بھوت" کہہ کر چلارہے تھے۔

آصف نے ان لڑکوں کی اچھی خاصی ٹھکائی کرنے کے بعد ہاتھ روک دیئے۔ اب شیطانوں کی ٹولی سہمی ہوئی خوف زدہ ادھر ادھر بیٹھی تھی۔ اس نے واش روم جاکر دوبارہ لاکٹ کی پشت پر موجود بٹن دبایا اور حاضر ہوتے ہی واش روم سے نکل کر اپنی سیٹ پر آبیٹھا شرارتی اسٹوڈنٹ اگلے جنکشن پر اتر گئے۔

"آپ کے جانے کے بعد یہاں عجیب تماشہ ہوا کوئی نادیدہ ہستی جو شاید جن یا بھوت تھی اس نے ان شرارتی لڑکوں کی پٹائی شروع کردی تھی تو یہ خاموش ہوکر بیٹھے ہیں سچ تو یہ ہے کہ میں خود خوف زدہ ہوگئی تھی۔" حیران و پریشان نرگس نے اسے بتایا۔

"سب سے پہلی بات تو یہ کہ اب تم مجھے آپ نہیں

تم کہو گی کیوں کہ دوستوں میں آپ کا تکلف نہیں کیا جاتا۔'' آصف نے اسے مصنوعی غصے سے گھورا اور وہ مسکرا اٹھی۔

آگے کا سفر خوشگوار گزرا دوسرے روز وہ شام کے قریب کراچی پہنچے، پلیٹ فارم پر اس وقت آنے اور جانے والے مسافروں کا کافی رش تھا۔ اس لئے ان دونوں نے اپنے چلنے کی رفتار سست کرلی تاکہ رش ختم ہوتے ہی پلیٹ فارم سے باہر نکلیں لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ ایک تنومند شخص انہیں غور سے دیکھ رہا تھا اس شخص کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اس کی نظریں خاص طور پر نرگس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ جیسے ہی اس کے قریب سے گزر کر چند قدم آگے گئے۔

تنومند شخص نے موبائل فون نکالا اور کسی کا نمبر ڈائل کیا اور دوسری طرف سے کال ریسیو ہوتے ہی بولا۔ ''سر میں اسٹیشن پر موجود ہوں میری آنکھوں کے سامنے کرن اور آصف ہیں''

پرویز تم ہوش میں تو ہو لگتا ہے آج تم نے زیادہ پی لی ہے۔'' دوسری طرف موجود شخص نے اسے ڈانٹا۔

''سر میں سچ کہہ رہا ہوں اگر آپ کو یقین نہیں تو آپ خود آکر دیکھ لیں۔'' پرویز نامی شخص بولا۔ ''ٹھیک ہے اس لڑکی کو اڑا دو۔'' دوسری طرف موجود شخص نے حکم دیا۔ اس کے انداز میں لاپرواہی تھی گویا وہ کسی انسان کو نہیں کیڑے مکوڑے کو مارنے کی بات کر رہا تھا۔ پرویز نے موبائل فون ہپ پاکٹ میں ڈالا اور اپنی بیلٹ میں اڑسا پسٹل نکال کر نرگس کا نشانہ لینے لگا۔

ادھر اچانک آصف چلتے چلتے جب بے اختیار مڑا تو اس کی نظر پرویز پڑی جو پسٹل بیلٹ سے نکال کر نرگس کا نشانہ لے رہا تھا۔ آصف نے نرگس کو اپنی بانہوں کے حصار میں لیا اور پلیٹ فارم کے فرش پر گر گیا۔

فائر کی ہولناک آواز سے پلیٹ فارم پر افراتفری پھیل گئی لوگ جان بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ نرگس پر چلائی جانے والی گولی ایک مسافر کے سر میں پیوست ہوگئی اور وہ لاش میں تبدیل ہو کر گر پڑا۔

ادھر نرگس آصف کے نیچے تھے اس کے گداز جسم کی حرارت آصف کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر رہی تھی لیکن اس سچویشن میں وہ اپنے جذبات کو نظر انداز کر کے اس کے اوپر سے اٹھا حملہ آور بھگدڑ سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف بھاگا۔ آصف کسی بھوت کی طرح اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا، پرویز نے مڑ کر پے در پے دو فائر کئے مگر بھاگتے ہوئے فائر کرنے سے اس کا نشانہ خطا ہوگیا۔ پرویز پلیٹ فارم نمبر 3 پر پہنچا اور وہاں کھڑی ایک خالی ٹرین میں سوار ہوگیا آصف بھی اس کے پیچھے اس بوگی میں جا گھسا جس پر پرویز چڑھا تھا۔ ایک طرف سے اس پر فائر ہوا اس بار بھی آصف کی قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور پرویز کا نشانہ خطا ہوگیا۔

آصف نے چھلانگ لگائی اور پرویز کو لئے ہوئے نیچے گرا وہ پرویز کے ہاتھ میں موجود پسٹل پر ہاتھ ڈال چکا تھا۔ دونوں میں پسٹل کے حصول کے لئے کشمکش جاری تھی کبھی پسٹل کی نال کا رخ پرویز کی طرف ہو جاتا اور کبھی آصف کی طرف اور پھر ٹریگر دب گیا گولی چلنے کے ہولناک دھماکے سے پرویز کے جسم کو جھٹکا لگا۔ گولی اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ وہ بنا چیخے جہنم رسید ہوگیا۔

آصف ابھی اس کے اوپر سے اٹھا ہی تھا کہ تین چار پولیس اہلکار بوگی میں داخل ہوئے اور اس پر رائفلیں تان لیں۔ ''خبردار ہلنے کی کوشش مت کرنا ورنہ گولی ماردوں گا۔'' ان میں سے ایک غرایا۔

''اس نے ہم پر گولی چلائی تھی اس کی گولی سے ایک مسافر بھی مارا گیا۔ میں اس کے پیچھے بھاگا۔ راستے میں بھی اس نے مجھ پر گولیاں چلائیں مگر میں بچ نکلا اور یہاں جب ہم دونوں گتھم گتھا تھے تو چھینا جھپٹی میں گولی چلی اور یہ مارا گیا۔'' آصف نے وضاحت کی۔

''بکواس بند کرو تم کوئی سپر ہیرو نہیں جو اس نے تم پر اتنی گولیاں چلائیں اور تمہیں ایک بھی نہیں لگی۔'' سب انسپکٹر رینک کا آفیسر بولا اور مقتول کا معائنہ کرنے لگا۔ مقتول کی جیب سے کارڈ نکالتے ہی وہ چونک پڑا۔ ''اوہ یہ تو پولیس ڈپارٹمنٹ کا بندہ ہے۔''

آصف سناٹے میں آ گیا مرنے والا پولیس اہلکار تھا۔

صورتحال گھمبیر ہو چکی تھی وہ جانتا تھا کہ پولیس اپنے بیٹی بھائی کے قتل کے جرم میں اس کا حشر نشر کر دے گی وہ اسے گن پوائنٹ پر لیئے ہوئے ٹرین سے باہر نکلے۔ کرن پلیٹ فارم پر پریشان کھڑی تھی، آصف کو پولیس کے گھیرے میں دیکھ کر اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ ''آپ انہیں کہاں لے جا رہے ہیں۔'' وہ ان کے قریب آ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اوہ تو تمہارے ساتھ پھولن دیوی بھی ہے۔ چلو دیوی جی تم بھی آ گے لگو آج پولیس اسٹیشن میں تم دونوں کی خوب خاطر تواضع ہو گی۔'' سب انسپکٹر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ وہ ان دونوں کو لئے ہوئے اسٹیشن سے باہر نکلے اور انہیں ایک پولیس موبائل میں دھکیل دیا۔

تین سپاہی ان کے قریب بیٹھ گئے جبکہ سب انسپکٹر ڈرائیور کے ساتھ کھڑا کسی سے موبائل فون پر بات کر رہا تھا اب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اگر وہ پولیس اسٹیشن تک پہنچ جاتے تو معاملہ مزید سنگین ہو جاتا اور پھر نرگس بھی ساتھ تھی۔ جو آصف کی وجہ سے اس گرداب میں پھنسی تھی اسے حیرت اس بات پر بھی تھی کہ مقتول پولیس اہلکار نے نرگس پر گولی کیوں چلائی تھی۔

آصف نے بیٹھے بیٹھے غیر محسوس انداز میں لاکٹ کا بٹن دبایا اور دیدہ سے نادیدہ ہو گیا اب سیٹ پر اس کا سایہ دکھائی دے رہا تھا سپاہیوں سمیت نرگس بھی خوف زدہ ہو گئی۔

''یہ یہ کہاں غائب ہو گیا؟'' ایک سپاہی بولا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سائے نے چشم زدن میں اس کے ہاتھ سے رائفل چھین کر اس کے سر پر ماری وہ چیختا ہوا گرا اور آناً فاناً غفیل ہو گیا دوسرا بھوت بھوت چلاتا ہوا پولیس موبائل سے اترنے لگا سائے نے رائفل کے دستے سے اس کا بھی سر بجا دیا وہ بھی ہوش وحواس سے عادی ہو گیا۔ تیسرا ڈر کے مارے لہرا کر گرا اور خود بخود بے ہوش ہو گیا۔

ڈرائیور یہ منظر دیکھتے ہی بھاگ اٹھا سب انسپکٹر حیرت سے یہ ناقابل یقین منظر دیکھ رہا تھا اس کی نظروں کے سامنے ملزم کسی بھوت کی طرح غائب ہو کر سائے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ خوف کے باعث موبائل فون اس کے ہاتھ سے گرا اور اس کی ٹانگیں ڈر سے کپکپانے لگیں۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے سایہ پولیس موبائل سے کودا اور اس کی کنپٹی پر ایرو کٹ پنچ رسید کیا وہ بھی ہوش وحواس سے عاری ہو گیا۔ وہاں بہت سے افراد کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان میں بھگدڑ مچ گئی اور لوگ بھوت بھوت کہہ کر ادھر ادھر بھاگ گئے۔

آصف موبائل کی طرف لپکا۔ ''نرگس جلدی سے یہاں سے نکلو۔''

''تت تم غائب کیسے ہو گئے؟''

''یہ وقت ان باتوں کا نہیں وہ نرگس کا ہاتھ تھام کر دوڑا۔''

اور مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا ایک دوسری سڑک پر جا پہنچا پھر ایک ٹیکسی کے ذریعے دوسرے علاقے میں پہنچ کر ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں کمرہ حاصل کیا۔

رات کے نو بج چکے تھے کھانا آنے تک وہ خوف زدہ نرگس کو سپر شیڈو کے فارمولے اور ایجاد کے بارے میں تفصیل سے بتا چکا تھا۔

''یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن ریلوے اسٹیشن پر پولیس اہلکار نے ہم پر گولی کیوں چلائی تھی؟'' نرگس نے پوچھا۔

''میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا یہ کیا چکر ہے۔ میں اور کرن کوئی کرمنل ریکارڈ نہیں رکھتے جرائم پیشہ افراد کی تو سمجھ آتی ہے کہ وہ اس فارمولے کی وجہ سے ہمارے دشمن ہیں۔'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا پھر قدرے توقف سے کہا۔

میں DSP چوہدری ممتاز کو کال کر کے اصل بات بتاتا ہوں وہ ضرور ہماری مدد کریں گے، نرگس ٹی وی کی طرف بڑھی اور TV آن کیا۔ یہ کوئی پرائیویٹ نجی نیوز چینل تھا جس پر بریکنگ نیوز چل رہی تھیں۔

اچانک آصف چونک پڑا نیوز کاسٹر کی چیختی چلاتی

آواز سنائی دے رہی تھی۔ خبر سے متعلق سلائیڈنگ نیوز بیلٹ بھی چل رہی تھی۔ ”ریلوے اسٹیشن پر پولیس اہلکار قتل۔ اے ایس آئی پرویز کے قاتل کی ویڈیو کلپ آشکارہ ہوگئی۔ اس ویڈیو کلپ میں آپ قاتل کا چہرہ صاف دیکھ سکتے ہیں جو اپنی ساتھی خاتون کے ساتھ ریلوے اسٹیشن کے باہر پولیس موبائل میں بیٹھا ہے۔“ TV چینل نے آصف اور نرگس کا چہرہ بالکل واضح کر رکھا تھا۔ مزید تفصیلات بتائی جانے لگیں۔

پولیس موبائل میں بیٹھا پولیس اہلکار کا قاتل اچانک سائے میں تبدیل ہوگیا۔ ”آصف آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے خبریں دیکھ رہا تھا گویا وہ آنکھوں سے نہیں منہ سے TV دیکھ رہا ہو۔ ”نرگس جلدی سے یہاں سے نکلو اب ہمارے لئے اس شہر میں مشکلات بڑھ گئی ہیں، TV میں ہماری ویڈیو کلپ آنے سے ہم بہت سے لوگوں کی نظروں میں آچکے ہیں اب ہمیں یہ ہوٹل چھوڑنا ہوگا۔“

صورتحال ان کے لئے مخدوش ترین ہوچکی تھی وہ عجلت میں اس ہوٹل سے نکلے خیریت گزری کہ کسی نے انہیں پہچانا نہیں۔ نرگس کا مسئلہ تو آسانی سے حل ہوگیا انہیں صرف ایک دکان سے برقع خریدنا پڑا سب سے بڑا مسئلہ آصف کا تھا وہ بے چارا برقع تو نہیں پہن سکتا تھا اس مسئلے کا حل اس نے اس طرح نکالا کہ ایک اجرک اور سندھی ٹوپی خرید لی ٹوپی پہن کر اس نے اجرک چہرے کے گرد لپیٹ لیا ویسے بھی دسمبر کا مہینہ تھا ان دنوں شہر سردی کی لپیٹ میں تھا۔ سرد ہواؤں سے بچنے کے لئے بہت سے لوگ چہرے کے گرد چادر یا رومال لپیٹ لیتے تھے وہ ایک سی این جی رکشہ پر بیٹھ کر سلطان آباد کی مین سڑک پر اترے آصف ابھی اپنے گھر سے بیس پچیس قدم دور تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر تین چار پولیس اہلکار کھڑے تھے۔ صاف نظر آرہا تھا وہ اس کے گھر کی نگرانی کر رہے تھے گویا پورے شہر کی پولیس اس کی تلاش میں فعال ہوچکی تھی گویا اب ان کے دو حریف ہوچکے تھے کرن کے باپ کے قاتلوں کے علاوہ شہر بھر کی پولیس انہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہی تھی وہ نرگس کو ساتھ لاکر حقیقی معنوں میں پچھتا رہا تھا۔ وہ بے چاری آصف کی وجہ سے مصیبت میں پھنس چکی تھی۔

”نرگس بہتر یہی ہے کہ تم واپس فیض آباد لوٹ جاؤ، ورنہ میری وجہ سے کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤں گی۔“ ایک پارک کے ایک گوشے میں بیٹھ کر آصف نے کہا، انہیں یہاں پہنچے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔

”میں نے ایک نیک مقصد کے لئے تمہارا ساتھ دینے کی حامی بھری ہے اور تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں اس مشکل کی گھڑی میں تمہارا ساتھ چھوڑ دوں گی۔“ نرگس نے جواب دیا۔

”اب ہم کسی ہوٹل میں بھی کمرہ نہیں لے سکتے رات بھی ہوچکی ہے کسی نہ کسی ٹھکانے کا بندوبست کرنا ہوگا ایسا کرتا ہوں پہلے ڈی ایس پی چوہدری ممتاز سے رابطہ کرتا ہوں۔“ آصف نے DSP کا نمبر ڈائل کیا یہ موبائل فون اس نے فیض آباد سے روانہ ہوتے ہوئے خرید لیا تھا۔

”آصف کہاں ہو بھئی یہ کیا تہلکہ مچا رکھا ہے۔ شہر بھر کی پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔“ چوہدری ممتاز نے کال ریسیو کرتے ہی کہا۔

”سر میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ وہ پولیس اہلکار سادہ لباس میں تھا۔ اور پھر ریلوے اسٹیشن پر اس نے خود ہی ہم پر فائرنگ کی تھی اور ہاتھا پائی میں اپنے ہی پسٹل سے چلنے والی گولی سے مارا گیا۔ آپ میرا یقین کریں، میں بے گناہ ہوں میں خود ہی کرن کے ساتھ قاتلوں سے بچتا پھر رہا ہوں اور اب تو پولیس بھی میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔“

”اور یہ تم بیٹھے بیٹھے پولیس موبائل سے غائب ہوکر سائے میں کیسے تبدیل ہوگئے؟“ چوہدری ممتاز نے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔

”سر یہ پروفیسر داؤد کی ایجاد سپر شیڈو ایک عجیب ساخت کا لاکٹ میرے پاس ہے یہی تو وہ ایجاد ہے جس کی وجہ سے پروفیسر داؤد کا قتل ہوا، نامعلوم جرائم پیشہ افراد اس کی تلاش میں ہیں جبکہ میں یہ فارمولا اور ایجاد حکومت کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔“

''اس وقت تم اور کرن کہاں ہو؟''

''سر ہم فلاں پارک میں ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں اعلیٰ حکام سے بات کرتا ہوں۔''

چوہدری ممتاز نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنے ایک دوسرے کلاس فیلو دوست امجد کا نمبر ڈائل کیا۔''امجد میں اس وقت فلاں پارک میں ہوں اور مجھے رہنے کے لئے کوئی محفوظ جگہ چاہئے۔'' امجد نے دوسری طرف سے کال ریسو ہوتے ہی کہا۔

''یار یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو ہر چینل پر تمہاری ہی خبر ہے اور پورے شہر کی پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔'' امجد نے ہذیانی انداز میں کہا۔

''یار یہ میں تمہیں ملنے پر تفصیل سے بتاؤں گا فی الحال اتنا سمجھ لو کہ یہ میرے خلاف سازش ہے۔''

''اچھا تو ایسا کرو تم فلاں چورنگی پر آ جاؤ میں تمہیں وہیں ملوں گا۔'' امجد بولا اور آصف نے رابطہ منقطع کیا اور نرگس کے ساتھ پارک سے باہر نکلا۔

اچانک اس کی نگاہ مخالف سمت سے آتی پولیس موبائل پر پڑی جو ہوٹر بجاتی ہوئی آ رہی تھی۔ پولیس موبائل میں نصف درجن سے زائد پولیس اہلکار تھے۔ شاید انہیں دیکھ لیا گیا تھا اور آصف کو پہچان لیا گیا تھا کیونکہ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے پولیس انسپکٹر نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ نرگس کا ہاتھ تھام کر فٹ پاتھ پر بھاگنے لگا۔ سڑک پر ٹریفک زیادہ تھا۔ پولیس موبائل کی رفتار کم تھی پھر پولیس موبائل رکی اور پولیس اہلکار نیچے اتر کر ان کے پیچھے دوڑے۔ اگر آصف اکیلا ہوتا تو لاکٹ کا بٹن دبا کر سائے میں تبدیل ہو جاتا لیکن پھر مسئلہ نرگس کا تھا۔ فٹ پاتھ پر چلنے والے لوگ حیرت واستعجاب سے ایک نوجوان کو برقع پوش خاتون کا ہاتھ تھامے بھاگتا دیکھ رہے تھے جن کے پیچھے پولیس اہلکار رائفلیں اٹھائے دوڑ رہے تھے وہ خوانچوں کو الٹتے لوگوں کو دھکیلتے ہوئے ایک گلی میں جا گھسے یہ طویل گلی تھی جس کا اختتام ایک وسیع وعریض گراؤنڈ میں ہوا جہاں سینکڑوں لوگ جمع تھے۔

اس گراؤنڈ میں چاروں طرف لگے پولز پر اسٹریٹ لائٹ روشن تھیں کچھ فاصلے پر اسٹیج پر ایک شخص کھڑا مائیک میں تقریر کر رہا تھا۔ اس مجمع میں عورتیں بچے بوڑھے جوان سبھی تھے جو وقتاً فوقتاً جئے جئے کے نعرے لگا رہے تھے۔ آصف بھی نعرے لگاتا ہوا نرگس کا ہاتھ تھام کر اس جلسے میں جا گھسا۔

پولیس اہلکار بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ اور اب دور ہی سے اس جلسے کو دیکھ رہے تھے۔ سینکڑوں لوگوں کے مجمع میں جانا ان کے بس میں نہیں تھا۔ ان کو مطلوب ملزم اپنی ساتھی خاتون سمیت اس مجمع میں گھس چکا تھا۔ اور وہ بے بسی سے دیکھنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اپوزیشن سے تعلق رکھنے والے اس لیڈر کے جیالے پولیس اہلکاروں کو اندر نہیں گھسنے دیں گے۔

پولیس اہلکار اب آہستہ آہستہ اس جلسے کے چاروں طرف پھیل رہے تھے تا کہ آصف اور نرگس کہیں سے نکل کر بھاگ نہ جائیں۔ آصف پہلے تو اس صورتحال پر گھبرایا کہ جلسے کے اختتام پر پولیس انہیں دھر لے گی پھر ایک خیال کے تحت اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور اس نے لاکٹ کی پشت پر موجود بٹن دبا دیا وہ سائے میں تبدیل ہوتے ہی زور سے چلایا۔''یہ پولیس والے اس جلسہ گاہ کو گھیرے میں لے کر ہمارے لیڈر کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔'' اس کی بلند آواز نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

جلسہ گاہ میں موجود لوگوں نے خطرناک تیوروں سے ان پولیس اہلکاروں کو دیکھا اور ان پر ٹوٹ پڑے۔ آصف اس موقع پر لاکٹ کا بٹن دبا کر دوبارہ حاضر ہو چکا تھا نرگس کا ہاتھ تھام کر جلسہ گاہ سے نکل گیا۔

امجد مطلوبہ جگہ پر اپنی گاڑی میں بیٹھا اونگھ رہا تھا آصف نرگس کو پچھلی نشست پر بیٹھا کر خود فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھا۔''بڑی دیر لگا دی۔'' امجد نے اسے گھورا۔

''بس یار ایک ٹریجڈی ہو گئی تھی۔'' آصف نے کہا اور مختصر الفاظ میں اپنی روداد سنا ڈالی، اس نے بہت سی باتیں چھپالی تھیں۔ جیسا کہ لاکٹ کا راز نرگس کی اصلیت۔

''ویسے تم نے پولیس اہلکاروں کے ساتھ اچھا

نہیں کیا۔ بچے چڑھ گئے تو پولیس خاطر خواہ دھلائی کرے
گی۔'' امجد ہنس پڑا۔ وہ انہیں ایک جگہ لے گیا وہاں اس کا
سازوسامان سے یہ راستہ بنگلہ خالی پڑا تھا۔ امجد کا تعلق
امیر وکبیر گھرانے سے تھا۔ والد امپورٹ ایکسپورٹ کا کام
کرتے تھے۔ بڑا بھائی اصغر ایک نجی ٹی وی چینل میں اینکر
پرسن اور رپورٹر تھا۔ یہ کام وہ شوقیہ کرتا تھا کچھ دیر گپ شپ
لگانے کے بعد امجد چلا گیا۔ فریج کھانے پینے کی اشیاء
سے بھرا پڑا تھا۔ نرگس نے چائے بنائی چائے پینے کے بعد
کچھ دیر گپ شپ لگانے کے بعد وہ سو گئے۔ صبح ابھی
آصف جاگا ہی تھا کہ اس کے موبائل فون کی بیل بجی اس
نے اسکرین پر نمبر دیکھا۔ D S P کالنگ لکھا
ہوا نظر آ رہا تھا۔

''ہیلو سر السلام علیکم۔''

''تم لوگ کہاں غائب ہو گئے تھے، میں رات
بھر تمہیں پارک میں ڈھونڈتا رہا اور پھر کال کی تو تمہارا
نمبر آف تھا۔'' دوسری طرف سے چودہدری ممتاز خفگی
آمیز لہجے میں مخاطب تھے۔

''سر ہم جیسے ہی پارک سے نکلے وہاں پولیس آن
پہنچی بڑی مشکل سے پیچھا چھڑا کر محفوظ مقام تک پہنچے
ہیں۔''

''بے وقوف لڑکے تمہیں پارک سے نکلنے کی کیا
ضرورت تھی وہیں میرا انتظار کرتے۔ میرے خیال میں وہ
کوئی گشتی پولیس موبائل ہو گی جو تم پر نظر پڑتے ہی
تمہارے پیچھے پڑ گئے۔ میں نے ڈی آئی جی صاحب
سے بات کر لی ہے تم کسی بھی وقت مجھ سے ملو۔''

''او کے سر میں شام کو دوبارہ کال کر کے آپ سے
ملاقات کی جگہ طے کر لوں گا۔ اللہ حافظ!'' آصف نے
رابطہ منقطع کر دیا۔

وہ ناشتہ کر کے گھر سے نکلا اس کا ارادہ اس پوش
علاقے میں جانا تھا جہاں پروفیسر داؤد کا گھر تھا، وہی گھر
جہاں کرن اسے پہلی بار لے کر گئی تھی اس کا خیال تھا کہ
شاید کرن وہیں ہو مگر اسے ناکامی ہوئی کرن کے گھر پر تالا
تھا۔ وہ واپس گھر آ گیا مین گیٹ کھلا دیکھ کر اس کا ماتھا
ٹھنکا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوا گھر میں ہر چیز ادھر ادھر
بکھری پڑی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے گھر کی تلاشی
لی ہو اور پھر نرگس بھی نظر نہیں آ رہی تھی، اس نے نرگس کا
موبائل نمبر ڈائل کیا مگر اسے مایوسی ہوئی۔ نرگس کا نمبر آف
تھا۔ ''کہیں اسے بھی تو اغوا نہیں کر لیا گیا۔'' یہ سوچتے ہی
اس کا دل ڈوبنے لگا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ نرگس کہاں گئی
اسے پولیس نے گرفتار کر لیا تھا یا پھر پروفیسر داؤد کے قاتل
یہاں تک پہنچ گئے۔

''کہیں امجد نے اسکی مخبری تو نہیں کی۔'' لیکن اس
کا دل یہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا تھا امجد اس کا گہرا
دوست تھا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے امجد کا نمبر ڈائل
کیا اور دوسری طرف سے کال ریسور ہوتے ہی
بولا۔ ''یار میں گھر سے کسی کام کے سلسلے میں نکلا تھا۔ واپس
آیا تو نرگس گھر پر نہیں ہے اور گھر کا سامان ادھر ادھر بکھرا پڑا
ہے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے کسی نے گھر کی تلاشی لی ہو۔''

دوسری طرف سے امجد نے گھبرائے ہوئے لہجے
میں کہا۔ ''تم فوری طور پر وہ جگہ چھوڑ دو ہو سکتا ہے کہ دشمن
تمہاری تاک میں ہو اور ہاں یہاں میرے گھر پر آ جاؤ میں
اکیلا ہوں گھر والے ایک پارٹی میں گئے ہوئے ہیں۔''

آصف ابھی گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ اس کے
موبائل فون کی بیل بجی اس نے اسکرین پر دیکھا کوئی نیا
نمبر تھا۔ ''ہیلو آصف اگر لڑکی کی زندگی چاہتے ہو تو وہ
فارمولا اور لاکٹ میرے حوالے کر دو۔'' دوسری طرف
سے گھمبیر اور سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''تم کون بول رہے ہو؟'' آصف نے پوچھا۔

''تمہارے لئے یہ جاننا ضروری نہیں البتہ اتنا
جان لو کہ اس لڑکی کی زندگی کی ضمانت اسی میں ہے کہ تم
میری ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کرو۔'' دوسری طرف
سے کہا گیا۔

''تم مجھے کہاں ملو گے؟'' آصف نے پوچھا۔

''تمہیں کالا باغ میں جس عمارت کے تہہ خانے
میں قید کیا گیا تھا وہ عمارت تو تمہیں یاد ہو گی یہ وہی عمارت

ہے جو بھی پروفیسر داؤد کی ملکیت تھی جتنی جلدی ہو سکے تم وہ فارمولا اور لاکٹ لے کر وہیں آجاؤ اور ہاں یہ یاد رہے اگر تم دونوں چیزیں لے کر نہیں پہنچے تو تمہیں اس لڑکی کی لاش ملے گی۔" اجنبی شخص نے کہا اور رابطہ منقطع ہوگیا۔

آصف نے موبائل فون جیب میں رکھا اور لاکٹ کا بٹن دبا کر سائے میں تبدیل ہوگیا، پولیس اس کے پیچھے تھی وہ نرگس کی بازیابی سے پہلے پولیس کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا تھا۔ ایک مسافر بس میں سوار ہو کر وہ امجد کے گھر کے دروازے پر پہنچا اور دوبارہ لاکٹ کا بٹن دبا کر اپنی اصل حالت میں لوٹ آیا اور ڈور بیل بجادی، دروازہ امجد نے کھولا وہ اسے لئے ہوئے ایک کمرے میں پہنچا جہاں صوفے پر امجد کا بھائی اصغر بیٹھا تھا۔ "تم بھائی کے ساتھ گپ شپ لگاؤ میں چائے بناتا ہوں۔" امجد نے کہا اور اس کے منع کرنے کے باوجود کمرے سے باہر نکل گیا۔

"آصف مجھے امجد نے تمہارے بارے میں کافی کچھ بتایا ہے۔ اب تم بھی تفصیل سے مجھے بتاؤ، ہوسکتا ہے کہ میں تمہارے کام آسکوں میرا ایک دوست وقاص حساس ادارے کا اعلیٰ افسر ہے ویسے ایک بات بتاؤں اس حساس معاملے میں کچھ چھپانا تمہارے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے شہر بھر کے قانون نافذ کرنے والے ادارے تمہارے پیچھے ہیں تم کب تک چھپو گے۔" اصغر نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد آصف نے اسے تفصیل سے واقعات سے آگاہ کیا اس نے یہ بھی بتادیا کہ ڈاکٹر نرگس کرن کی ہم شکل ہے۔

"اس کا مطلب ہے تمہیں وہاں ضرور جانا ہوگا۔ ہم دونوں علیحدہ علیحدہ روانہ ہوں گے تاکہ بوقت ضرورت تمہاری مدد کرسکوں۔" امجد چائے بنا کر لا چکا تھا، ان کے درمیان طے پایا کہ اصغر اور آصف دونوں آگے پیچھے کالا باغ جائیں گے تاکہ بوقت ضرورت ایک دوسرے کی مدد کرسکیں۔

اصغر کا تعلق میڈیا سے تھا اسے بعض اوقات اکثر اپنا حلیہ تبدیل کرنا پڑتا تھا میک اپ کے جملہ لوازمات اس کے پاس موجود تھے اس نے گھنٹہ بھر کی محنت سے آصف کا حلیہ یکسر تبدیل کرڈالا اب اسے شناخت کرنا آسان نہیں تھا۔

دوسرے روز وہ صبح صبح اصغر کے ساتھ حساس ادارے کے افسر اعلیٰ سے ملا۔ اس نے تفصیل سے آصف سے سب کچھ پوچھا اور آصف نے افسر اعلیٰ کو سچ بتایا ان کے درمیان کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی پھر وہ وہاں سے روانہ ہوگئے، آصف فلائٹ سے اسلام آباد پہنچا اور کالا باغ کے لئے ایک ٹیکسی کرائے پر بک کروائی سڑک پر اس وقت اچھا خاصا ہجوم تھا۔

اچانک مخالف سمت سے ایک نئے ماڈل کی پراڈو تیز رفتاری سے آئی ٹیکسی ڈرائیور نے بروقت بریک لگا کر اسٹیئرنگ کو بائیں سمت گھمایا ادھر پراڈو کا ڈرائیور بھی بریک لگا چکا تھا۔ اس کے باوجود بھی رکتے رکتے دونوں گاڑیاں ہلکے سے ٹکرا گئیں۔ غلطی سراسر پراڈو کے ڈرائیور کی تھی۔ پراڈو پر کسی سیاسی پارٹی کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ رائفل بردار شخص اور ڈرائیور پراڈو سے اتر کر ٹیکسی کے قریب آئے اور ٹیکسی ڈرائیور کو گریبان سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ "اندھے تمہیں نظر نہیں آتا بہت جلدی ہے تمہیں اور اس جلدی میں تم نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ ایم پی اے سردار جہانگیر خان کی گاڑی سامنے سے آرہی ہے۔" رائفل بردار کے الفاظ سن کر آصف چونک پڑا، نرگس نے اپنی روداد سنائی تھی اس کے مطابق اسے جان سے مارنے کا حکم سردار جہانگیر خان نے دیا تھا۔

آصف تیزی سے باہر نکلا، اے مسٹر غلطی تمہارے ڈرائیور کی ہے جو رانگ سائیڈ سے تیز رفتاری سے اچانک سامنے آیا تھا۔

"اچھا تو تم مجھے بتاؤ گے کہ غلطی کس کی ہے۔" رائفل بردار تند لہجے میں بولا۔

ان کی بحث کے دوران سردار جہانگیر خان اور تنومند نوجوان بھی اتر کر ان کے قریب آچکے تھے۔ پچھلی دو گاڑیوں سے بھی مسلح افراد نے انہیں گھیر لیا۔ یہ چار پانچ افراد تھے جو یقیناً جہانگیر خان کے کارندے تھے۔ "کیا بات ہے جوان زیادہ اچھلنا اچھا نہیں۔" جہانگیر خان نے

بھاری بھرکم لہجے میں اس سے مخاطب تھا، اسی لمحے تنومند نوجوان نے آصف کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ آصف کا ہاتھ بے اختیار حرکت میں آیا اور تنومند نوجوان کے چہرے پر زوردار گھونسہ لگا۔ وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑایا اور رائفل بردار نے گن کی نال کا رخ آصف کی طرف کرکے ٹریگر دبادیا۔

آصف کی موت یقینی تھی لاکٹ کا بٹن دبانے کا اسے موقع ہی نہیں ملا اور فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔

☆......☆......☆

آصف کے گھر سے نکلتے ہی نرگس اپنے موبائل فون پر Game کھیل رہی تھی کہ اچانک اسے ایسا لگا جیسے احاطے میں کوئی کودا ہو وہ ہڑبڑا کر اٹھی اسی وقت دونقاب پوش کمرے میں داخل ہوئے اس نے چیخنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک نقاب پوش کا ہاتھ سختی سے اس کے منہ پر جم گیا ایک ناگوار بو اس کے دماغ میں حاوی ہوگئی اور وہ بے ہوش ہوکر اس کے بازوؤں میں جھول گئی نرگس کو ہوش آیا تو خود کو ایک کمرے کے فرش پر پڑے پایا، کمرے میں کسی بھی قسم کا سازوسامان نہیں تھا۔ وہ اٹھی ہی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر شخص کمرے میں داخل ہوا۔ ”تو تمہیں ہوش آہی گیا، اب بتاؤ تم کون ہو؟“ ادھیڑ عمر شخص نے پوچھا۔

”میں کرن ہوں؟“

”پر تم کون ہو؟“ اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”اگر تم کرن ہوتی تو مجھے پہچان لیتی تم کرن نہیں اس کی کوئی ہم شکل ہو۔“ اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

”میں کرن ہی ہوں۔“ وہ اپنی بات پر قائم رہی۔

”سوچ لو اگر سچ نہیں بولوگی تو جان کے ساتھ ساتھ اپنی عزت سے بھی محروم ہوجاؤ گی۔“

اگر وہ جان سے ماردینے کی دھمکی دیتا تو شاید وہ نہ ڈرتی۔ لیکن عزت بچانے کے لئے وہ بولتی چلی گئی۔ ”تم نے ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے۔ اس لئے تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا لیکن جب تک فارمولا اور لاکٹ ہمارے ہاتھ نہیں آتا تم ہماری قید میں رہوگی اور ہاں کسی قسم کی چالاکی یا ہوشیاری دکھانے کی کوشش مت کرنا اور نہ ہی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرنا یہاں جگہ جگہ میرے مسلح کارندے موجود ہیں۔“

وہ اسے تنبیہ کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

رائفل بردار نے جیسے ہی ٹریگر دبایا سردار جہانگیر خان نے برقی سرعت سے اس کی رائفل کا رخ اوپر کردیا اور فضا تڑتڑاہٹ کی آوازوں سے گونج اٹھی، اور اسی لمحہ بھر کی تاخیر ہوجاتی تو آصف اپنی زندگی سے محروم ہوجاتا۔ ادھر وہ تنومند نوجوان بھی پسٹل نکال چکا تھا۔ ”نہیں شیر خان رک جاؤ“ جہانگیر خان اس کی راہ میں مزاحم ہوگیا۔

”بابا جان میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ شیر خان بپھر چکا تھا گویا وہ جہانگیر خان کا بیٹا تھا اس سے پہلے کہ صورتحال مزید گمبھیر ہوتی پولیس موبائل ہوٹر بجاتی ہوئی وہاں پہنچ گئی اور وہ اسے دھمکیاں دیتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

چند گھنٹوں بعد ٹیکسی کالاباغ کی حدود میں داخل ہوچکی تھی ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دے کر رخصت کرنے کے بعد آصف نے لاکٹ کی پشت پر موجود بٹن دبایا اور سائے میں تبدیل ہوگیا، وقت سے دس منٹ پہلے ہی وہ پروفیسر داؤد کے گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ عمارت کے اندر اور باہر ہر طرف انرجی سیور روشن تھے اور سرچ لائٹس روشن تھیں۔ غرض کہ وہاں اتنی روشنی تھی کہ دن سا نکلا ہوا تھا، اس غیر معمولی روشنی میں معمولی سے معمولی چیز باآسانی نظر آسکتی تھی۔ آصف اس شاطر مجرم کی ہوشیاری سے متاثر ہوچکا تھا۔ وہ جیسے ہی آگے بڑھتا اس کا سایہ نظر آجاتا اور یہی ہوا، وہ جیسے ہی چند قدم آگے بڑھا تیز روشنی میں سایہ بخوبی نظر آنے لگا۔

چند قدم کے فاصلے پر ایک ادھیڑ عمر شخص چار رائفل بردار افراد کے ساتھ چوکنا کھڑا تھا وہ جس جگہ کھڑے تھے اس کے دونوں اطراف سینکڑوں فٹ گہری خوف ناک کھائیاں تھیں۔ ”آصف وہیں کھڑے رہو

آگے بڑھنے اور ہلنے جلنے کی کوشش مت کرنا ورنہ نرگس کے جسم کے پرخچے اڑ جائیں گے وہ اسی عمارت کے ایک کمرے میں قید ہے اور عمارت میں طاقتور ریموٹ کنٹرول بم نصب ہے۔ جیسے ہی تم نے میری مرضی کے خلاف حرکت کی، میں ریموٹ کا بٹن دبادوں گا۔'' وہ اپنا ریموٹ والا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' آصف نے پوچھا۔

''سب سے پہلے تو تم جسمانی طور پر میرے سامنے حاضر ہو جاؤ۔'' ادھیڑ عمر شخص نے حکم دیا۔

اور آصف نے لاکٹ کی پشت پر موجود بٹن دبادیا اگلے ہی لمحے وہ سائے سے اپنے اصل روپ میں حاضر ہو چکا تھا۔

''بہت خوب واقعی پروفیسر داؤد نے کمال کی چیز ایجاد کی ہے۔ اب یہ لاکٹ مجھے دے دو اور فارمولا بھی میرے حوالے کردو۔'' ادھیڑ عمر شخص تیزی سے بولا۔

''تم کون ہو؟ اور کرن کہاں ہے؟'' آصف نے پوچھا۔

''ان باتوں کو چھوڑو اور لاکٹ میرے حوالے کردو ورنہ میں ریموٹ کا بٹن دبادو گا۔'' ادھیڑ عمر شخص سانپ کی طرح پھنکارا اور آصف نے اپنے گلے سے لاکٹ نکال لیا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی قسم کی مزاحمت بیکار ہے۔ اگر وہ ادھیڑ عمر شخص کی بات نہیں مانتا تو وہ سفاک شخص ریموٹ کا بٹن دبادیتا اور نرگس جیسی مخلص لڑکی زندگی سے محروم ہو جاتی۔

اس نے لاکٹ گلے سے اتار کر ادھیڑ عمر شخص کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ ایک نسوانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''ٹھہرو میں بتاتی ہوں یہ کون ہے؟'' یہ نرگس کی آواز تھی سب نے مڑ کر دیکھا ان سے کچھ فاصلے پر نرگس کھڑی تھی سب اسی کی طرف متوجہ تھے۔

ادھیڑ عمر شخص اور اس کے کارندے حیران تھے کہ عمارت کے کمرے میں قید نرگس کیسے آزاد ہوگئی اور پھر آزاد ہو کر اس طرح عمارت سے باہر آئی کہ انہیں کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔

آصف نے ان کی توجہ نرگس کی طرف ہوتی دیکھ کر چھلانگ لگائی اور چشم زدن میں ادھیڑ عمر شخص کو دبوچ لیا۔ اس کا بازو سانپ کی طرح ادھیڑ عمر شخص کی گردن سے لپٹا ہوا تھا اور وہ اپنی پینٹ کی بیلٹ میں اڑسا ہوا پسٹل نکال کر ادھیڑ عمر شخص کی کنپٹی سے لگا چکا تھا۔ یہ پسٹل اسے حفاظت کی غرض سے روانہ ہوتے وقت اصغر نے دیا تھا۔

''اس کمینے کی زندگی چاہتے ہو تو اپنے اپنے ہتھیار پھینک دو۔'' آصف چلایا تو ادھیڑ عمر شخص کے چاروں ساتھی سوچ میں پڑ گئے۔ ''جلدی کرو ورنہ گولی چلادوں گا، انہیں کہو ہتھیار پھینک دیں۔'' اس نے ادھیڑ عمر شخص کی گردن پر دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہتھیار پھینک دو۔'' ادھیڑ عمر شخص بھنچی بھنچی آواز میں بولا۔

ان چاروں نے رائفلیں پھینک دیں آصف نے ان کے ہتھیار پھینکتے ہی پے درپے ان کا نشانہ لے کر ٹریگر دبایا گولیاں ان کی ٹانگوں میں لگی تھیں وہ چیختے ہوئے گر پڑے، آصف نے ادھیڑ عمر شخص کو ایک طرف دھکیلا۔

''اب بولو تم کون ہو ورنہ تم بھی اپنے ساتھیوں کی طرح اپاہج ہو جاؤ گے میرا نشانہ تو تم دیکھ ہی چکے'' وہ بولتا ہوا رائفلوں کے قریب گیا اور رائفلیں اٹھا کر کھائی میں پھینک دیں اس دوران وہ ادھیڑ عمر شخص کی طرف سے محتاط تھا۔

ادھیڑ عمر شخص کا چہرہ تاریک پڑ چکا تھا۔ اچانک ایک طرف سے کسی نے فائر کیا اور پسٹل آصف کے ہاتھ سے نکل گیا۔ گولی اس کے ہاتھ پر لگی تھی اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے ان سے کچھ فاصلے پر ڈی ایس پی ممتاز کھڑا تھا۔

جس کے ہاتھ میں موجود پسٹل کی نال کا رخ اس کی طرف تھا۔ ''سر آپ ان کے ساتھی ہیں۔'' آصف کے لہجے میں اب تک بے یقینی تھی۔

''ہاں میں ڈی ایس پی چوہدری ممتاز اس کا پارٹنر ہوں ریلوے اسٹیشن پر نرگس پر گولی چلانے والا بھی میرا ہی ساتھی تھا۔ مگر وہ تمہارے ہاتھوں مارا گیا میں نے ہوشیاری

سے تم پر پولیس کیس بنادیا تا کہ تم مدد کے لئے پولیس کے پاس نہ جاسکو اور امجد کے بنگلے پر میں نے ہی تمہاری کال ٹریس کر کے نرگس کو اغوا کروایا اور اسے یہاں منتقل کر دیا اور پھر تمہیں فون کیا تا کہ تم اسے بچانے آؤ اور میں تم سے سپر شیڈو کی ایجاد اور فارمولا حاصل کرسکوں۔“

”پر، تم نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟“ آصف نے پوچھا۔

DSP کے بجائے ادھیڑ عمر شخص بولا۔ اس کا جواب میں دیتا ہوں، میں پروفیسر داؤد کا سگا بھائی سجاول ہوں، مجھے پڑھائی سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی نوجوانی سے جرائم کی راہ پر چل نکلا۔ والد صاحب سخت گیر طبیعت کے مالک تھے انہوں نے مجھے گھر سے بے دخل کر دیا۔ میں جرائم کی دنیا میں بڑھتا چلا گیا۔ ٹارگٹ کلنگ سے لے کر منشیات کی اسمگلنگ تک میں نے ہر جرم کیا۔ پر مجھے پتہ چلا کہ پروفیسر داؤد سائنسی میدان میں بہت بڑی کامیابی حاصل کر چکا ہے۔

ایک اخباری رپورٹر کو انٹرویو دیتے وقت داؤد نے سرسری انداز میں سپر شیڈو نامی ایجاد کا ذکر کیا ان ہی دنوں ایک پڑوسی دشمن ملک کے ایجنٹ شیکھر نے مجھے اس فارمولے اور ایجاد کے عوض کروڑوں ڈالر کی پیش کش کی۔ ہم نے اپنا ہی ایک کارندہ چوکیدار کے بھیس میں پروفیسر داؤد کے گھر میں بھیج دیا۔ فارمولے کے بارے میں مکمل سن گن ملتے ہی اسے فون بھی کیا مگر پروفیسر داؤد نہیں مانا پھر ایک روز میں خود اس سے ملا اور اسے ان کروڑوں ڈالر میں سے نصف کی پیش کش کی مگر اس پر حب الوطنی کا بھوت سوار تھا۔ میں نے اسے دھمکانے کے لئے پسٹل نکالا وہ مجھ سے گتھم گتھا ہو گیا اسی دوران گولی چلی، اور پروفیسر داؤد کے مرتے ہی تلاشی کے باوجود فارمولا اور ایجاد نہ ملا تو میں نے چوکیدار کو بھی قتل کر دیا۔

میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا، وہ ویسے بھی عام سا کارندہ تھا اس کی اتنی اہمیت نہ تھی۔“ ڈی ایس پی ممتاز چوہدری میرا پرانا دوست تھا، میں اس سے ملا اور ہم دونوں نے پلاننگ بنائی کہ کرن کو اغوا کیا جائے ہوسکتا ہے اسے اس فارمولے کے بارے میں علم ہو پھر تم ڈی ایس پی سے ملے اور کرن کے ساتھ پروفیسر کے گھر پہنچے تم نے فارمولا ملتے ہی ڈی ایس پی کو فون کیا یوں میں اور DSP عجلت میں کالا باغ کی اس عمارت میں آپہنچے۔“ سجاول روانی سے بولتا چلا جارہا تھا کہ ڈی ایس پی نے مداخلت کی۔ ”وقت ضائع مت کرو یہاں گولیاں چل چکی ہیں اس سے فارمولا لے کر یہاں سے نکلو۔ شیکھر ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔“

نرگس چند قدم آگے بڑھی۔ ”تم کیا سمجھتے ہو میں تمہیں اتنی آسانی سے یہاں سے جانے دوں گی۔“

”تم ہمیں روکو گی۔“ ڈی ایس پی ہنسا۔

”ہاں میں روکوں گی اب اس سے آگے کی داستان مجھے مکمل کرنے دو تا کہ آصف حقیقت جان سکے۔

اس روز جب میں اور آصف لاکٹ لے کر جان بچانے کے لئے بھاگے۔ تم دونوں اپنے مسلح کارندوں کے ساتھ ہمارے تعاقب میں تھے گولی لگنے سے ہماری گاڑی کا ٹائر برسٹ ہوا اور پراڈو بے قابو ہو کر درخت سے جا ٹکرائی میں اور آصف دونوں بے ہوش ہو چکے تھے تم ہمیں اٹھا کر اسی عمارت میں لے آئے آصف کو تہہ خانے میں قید کرنے کے بعد تم دونوں مجھے ایک کمرے میں لے گئے جہاں میں ہوش میں آگئی تم دونوں نے تشدد کر کے مجھ سے فارمولے اور ایجاد کے بارے میں جاننا چاہا مگر میں تمہارا تشدد سہتی رہی اور کچھ نہیں بتایا کیوں کہ میں جانتی تھی کہ فارمولا اور ایجاد حاصل کرنے کے باوجود تم دونوں مجھے مار ڈالو گے اور آصف بھی نہیں بچے گا۔

اس دوران اس کمینے DSP چوہدری ممتاز کی نیت مجھ پر خراب ہو گئی اس نے شراب پی رکھی تھی اور نشے میں تھا۔

اور تم سجاول میرے بے غیرت چچا میری بے بسی کا تماشہ دیکھتے رہے اسی دوران میں نے میز پر پڑی چھری اٹھالی اور دھمکی دی ”اگر DSP نے مجھے ہاتھ بھی لگانے کی کوشش کی تو میں خودکشی کرلوں گی۔“ مگر DSP خباثت سے ہنستا ہوا میری طرف بڑھتا رہا۔

ادھر سجاول دروازے پر پسٹل تانے کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ چوہدری ممتاز مجھے دبوچتا میں نے اپنی عزت بچانے کے لئے اپنے سینے میں چھری گھونپ دی اور چند لمحے تڑپنے کے بعد جب میں بے حس وحرکت ہوگئی تو تم دونوں نے مل کر میری لاش اٹھائی اور گھر سے باہر اس گہری کھائی میں پھینک دی۔"

وہ ایک طرف واقع کھائی کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بولی اور قدرے توقف سے پھر بولی۔ "میرے قتل کے بعد یہ دونوں وہاں سے بھاگ گئے۔ تمہارے بھاگنے کے بعد میں نے تہہ خانے کا دروازہ کھولا اور آصف آزاد ہو کر یہاں سے نکل گیا اس روز فائیو اسٹار ہوٹل کے باہر بھی میں ہی اس سے ملی تھی۔"

چوہدری ممتاز نے کہا۔ "واہ واہ نرگس تمہیں تو ہالی ووڈ کی کسی فلم میں مرکزی کردار ملنا چاہئے کیا زبردست پرفارمنس دی ہے۔ لیکن تم یہ سب کیسے جان گئی؟"

"میں نرگس نہیں بلکہ کرن کی روح ہوں۔" اس نے کہا۔

چوہدری ممتاز برہم ہوگیا۔ "بند کرو یہ ڈرامہ میں تمہاری اس نوٹنکی سے ڈرنے والا نہیں، اور آصف لاکٹ میری طرف پھینکو ورنہ میں تم دونوں کو ماردوں گا۔"

ادھر وہ بدستور چوہدری ممتاز کی طرف بڑھتی رہی۔ "اسے روکو ورنہ گولی چلادوں گا۔" وہ چلایا۔

مگر وہ رکے بغیر اس پر نظریں جمائے بدستور آگے بڑھتی رہی، چوہدری ممتاز نے اس کا نشانہ لے کر پے درپے دو فائر کئے مگر دونوں گولیاں اس کے جسم پر بے اثر ہیں وہ بدستور اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

چوہدری ممتاز بوکھلا کر ٹریگر دبائے جارہا تھا گولیاں اس کے جسم پر بے اثر تھیں بالآخر DSP کے پسٹل میں گولیاں ختم ہوگئیں، ادھر ششدر کھڑے آصف نے چوہدری ممتاز پر چھلانگ لگائی اور اسے لئے ہوئے نیچے گرا اور پے درپے کئی گھونسے DSP کے چہرے پر رسید کئے اس مار اماری کے دوران آصف کا لاکٹ گر گیا۔

سجاول کی نظر لاکٹ پر پڑی تو وہ لاکٹ کی طرف لپکا اور لاکٹ اٹھا کر ایک طرف دوڑا اسے لاکٹ اٹھاتا دیکھ کر وہ بھی اس کے پیچھے دوڑی وہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے کھائی کے قریب پہنچ چکے تھے۔

"سجاول رک جاؤ۔" وہ اس کے پیچھے دوڑتی ہوئی چلائی، سجاول نے بھاگتے بھاگتے مڑ کر دیکھا۔ اسی وقت ایک پتھر سے ٹھوکر لگنے کے باعث چیختا ہوا سپر شیڈو کے کرشماتی لاکٹ سمیت سینکڑوں فٹ گہری کھائی میں گرتا چلا گیا۔ یہ وہی کھائی تھی جس میں ان دونوں شیطانوں نے کرن کی لاش پھینکی تھی۔

ادھر آصف نے چوہدری ممتاز کے چہرے پر گھونسے مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا اسی وقت اس کی نظر عمارت کے داخلی دروازے پر پڑی وہاں نرگس کھڑی تھی وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے عمارت کے دروازے پر کھڑی نرگس اور کبھی اپنے قریب کھڑی کرن کو دیکھ رہا تھا۔ گویا وہ واقعی کرن کی روح تھی۔

ادھر اسے غافل ہوتا دیکھ کر چوہدری ممتاز کے جسم میں تحریک پیدا ہوئی اس نے قریب ہی پڑا ریموٹ اٹھالیا آصف اس پر نظر پڑتے ہی چلایا۔ "نرگس بھاگو۔" نرگس اس کی طرف دوڑی۔

چوہدری ممتاز نے ریموٹ کا بٹن دبادیا ایک سماعت شکن دھماکہ ہوا اور عمارت کے پرخچے اڑ گئے۔ دھماکے سے ارد گرد کی زمین لرز اٹھی دھماکے کی شاک ویو سے آصف، نرگس اور ڈی ایس پی دوبارہ زمین پر گر پڑے۔

DSP جہاں گرا وہاں آصف کا پسٹل پڑا تھا۔ اس نے پسٹل اٹھالیا اور اس کا رخ آصف کی طرف کر کے بولا۔ "سیدھی طرح فارمولا میرے حوالے کردو ورنہ گولی چلادوں گا۔"

آصف ہنسا اور بولا۔ "چوہدری ممتاز پاگل کے بچے میں یہاں باقاعدہ پلاننگ کے تحت آیا تھا میرے لباس میں ایک انتہائی حساس ڈیوائس موجود ہے ہمارے درمیان اب تک ہونے والی تمام گفتگو حساس ادارے کے اعلیٰ حکام سن رہے ہیں اور قریبی ایک درخت کی گھنی

شاخوں میں روپوش نجی چینل کا رپورٹر جدید ترین اور حساس کیمرے سے ریکارڈنگ کر رہا ہے۔ بے وقوف جب سے میں یہاں آیا ہوں تمہیں اور مجھے لاکھوں لوگ اپنے اپنے ٹیلی ویژن سیٹس پر دیکھ اور سن رہے ہیں سب تمہاری اصلیت جان چکے ہیں۔

اب رہا سوال پروفیسر کی ایجاد کا تو سپر شیڈو کا لاکٹ تمہارے ساتھی کی لاش سمیت سینکڑوں فٹ گہری کھائی میں جا گرا ہے جواب شاید ہی کسی کو ملے اگر ملا بھی تو اتنی بلندی سے گرنے سے ناکارہ ہو چکا ہوگا۔ رہا فارمولا تو وہ اسی عمارت کی تجربہ گاہ کے کمرے کی اماری میں خفیہ خانے میں پڑا تھا جسے تم نے بم سے اڑا دیا ہے اب تم خالی ہاتھ ہو اور ساری زندگی جیل میں سڑتے رہو گے۔'' آصف ہنسا۔

''چوہدری ممتاز ہتھیار پھینک دو تم کمانڈوز کے گھیرے میں ہو۔'' ایک آواز گونجی اس نے آواز کی سمت دیکھا، چاروں طرف درجنوں کمانڈوز اور پولیس اہلکار موجود تھے، ان کی مہیب گنوں کا رخ اس کی طرف تھا۔

دوسری طرف آصف نرگس اور کرن کی روح موجود تھی، اب بچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا اگر وہ آصف کو گولی مار دیتا تب بھی گرفتار ہو کر ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزار دیتا، یا پھانسی چڑھا دیا جاتا اس کا مستقبل تاریک ہو چکا تھا۔ بدنامی اور رسوائیاں اس کا مقدر تھیں۔ فارمولا اور ایجاد دونوں ہی اس کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے۔

اس سے پہلے کہ کوئی سمجھتا چوہدری ممتاز نے پسٹل کی نال اپنی کنپٹی سے لگائی اور ٹریگر دبا دیا، فائر کی ہولناک آواز فضا میں گونجی یوں ملک اور قوم کا ایک اور غدار جہنم رسید ہو گیا۔

کرن کی روح آصف کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور غائب ہو گئی۔ درجنوں کمانڈوز، نرگس آصف سمیت لاکھوں افراد اپنے اپنے TV سیٹوں پر یہ ناقابل یقین منظر دیکھ رہے تھے۔

☆......☆......☆

کوہ پیمائی کے ماہر ترین افراد کی مدد سے بڑی مشکل سے کرن کی لاش اس کھائی سے نکال کر نماز جنازہ پڑھانے کے بعد دفنا دی گئی البتہ سپر شیڈو لاکٹ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ لائیو ٹیلی کاسٹ وڈیو کلپ اور ریکارڈنگ سے آصف کی بے گناہی ثابت ہو چکی تھی زخمی کارندوں کی نشاندہی پر دشمن ملک کے ایجنٹ شیکھر اور اس گروہ کے دیگر کارندوں کو گرفتار کر لیا گیا البتہ اس ایجاد اور فارمولے کے ضائع ہونے کا دکھ تھا۔

نرگس نے بتایا۔ ''جب وہ کمرے میں قید تھی اس کی ہمشکل لڑکی نے اسے آزاد کیا اور تاکید کی کہ وہ کچھ دیر عمارت کے دروازے کے پیچھے چھپی رہے پھر باہر آ جائے جب ممتاز کے چہرے پر آصف گھونسے مار رہا تھا تبھی وہ باہر آ گئی تھی پھر DSP نے ریموٹ اٹھایا اور نرگس آصف کے پکارنے پر وہاں سے بھاگ گی۔

نرگس فیض آباد لوٹ گئی۔ آصف اور اصغر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے مگر کہانی یہیں پر ختم نہیں ہوتی کچھ دنوں بعد آصف کے والدین اصغر کے ساتھ فیض آباد گئے۔ نرگس کا کوئی سرپرست نہیں تھا اس لئے اصغر نے نرگس سے بات کی اور اس کا بھائی بن کر آصف کا رشتہ منظور کیا مگر اس کے لئے آصف کو ازدواجی زنجیر میں جکڑتے اس کی کئی شرائط ماننا پڑیں۔

آصف شادی کے بعد نرگس کے ساتھ اسپتال میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔

اس روز بھی وہ اسپتال میں ہی تھے اور شام کو گھر جانے کے لئے اسپتال کی سیڑھیاں اترنے لگے کہ ایک ایمبولینس ہوٹر بجاتی ہوئی اسپتال کے گیٹ پر رکی ایمبولینس کے پیچھے ایک پراڈو بھی تھی پراڈو سے نکلنے والے شخص کو دیکھ کر آصف چونک پڑا۔ وہ سردار جہانگیر خان تھا اس کے ساتھ موجود دوسرے بوڑھے کو دیکھ کر نرگس ششدر رہ گئی وہ اس کا باپ سلامت خان تھا جس نے اسے مجبور اً دریا میں دھکیلا تھا اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا بھی تھا۔ ''ڈاکٹر خدا کے لئے میرے شیر خان

کو بچالو یہ میرا اکلوتا وارث ہے۔"

اپنے علاقے کا ایم پی اے غرور اور تکبر کا پیکر اس وقت اس معمولی ڈاکٹر کے سامنے گڑگڑا رہا تھا جس کی موت کا حکم اس نے کئی برس پہلے صادر کیا تھا۔

شیر خان کو آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا تیز رفتاری کے باعث شیر خان کی کار لوڈنگ ٹرک سے جا ٹکرائی تھی اس حادثے میں ڈرائیور اور گارڈ موقع پر ہی جاں بحق ہو چکے تھے جب کہ شیر خان شدید زخمی تھا۔ اس کے جسم سے کافی مقدار میں خون بہہ چکا تھا سر میں شدید چوٹیں آئی تھیں۔ پسلیاں بھی ٹوٹ چکی تھیں اس کی نبض ڈوبتی جا رہی تھی اسے فوری طور پر خون کی ضرورت تھی۔

شیر خان کا بلڈ گروپ چیک کرنے پر پتہ چلا کہ اس کے خون کا گروپ نایاب ہے، یہ گروپ ہزاروں افراد میں سے ایک کا ہوتا ہے شیر خان کی زندگی بچانے کے لئے اس نایاب خون کی ضرورت تھی۔

وقت مٹھی سے ریت کی مانند سرک رہا تھا اور شیر خان کی نبض ڈوبتی جا رہی تھی۔ اتفاق سے نرگس کے خون کا بھی یہی گروپ تھا اس نے شیر خان کو خون کا عطیہ دینے کا فیصلہ کیا تو آصف تڑپ اٹھا۔ "تمہیں کیا ہو گیا یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے تمہیں جان سے مارنا چاہا۔"

"لیکن میں مری تو نہیں ناں آصف، موت اور زندگی اللہ کے اختیار میں ہے اور پھر میں ایک ڈاکٹر ہوں ایک ڈاکٹر کا فرض ہے کہ وہ اپنے مریض کی جان بچائے، چاہے وہ اس کا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی اور آصف بے بس ہو گیا۔

شیر خان نرگس کے دیئے گئے خون کے عطیہ کے بدولت بچ گیا اور روبہ صحت ہونے لگا۔

کچھ دنوں بعد جب آصف اور ڈاکٹر راحیل اس کمرے میں داخل ہوئے جس میں شیر خان ایڈمٹ تھا، شیر خان بیڈ پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا، اس کے قریب جہانگیر خان سلامت خان اور نرگس کا بھائی سلیم موجود تھے۔ "ڈاکٹر تم لوگوں کا مہربانی جو آپ نے میرے بیٹے کا جان بچایا۔" جہانگیر خان بولا۔

"خان صاحب شکریہ ہمارا نہیں ڈاکٹر نرگس عرف شہناز بن سلامت خان کا ادا کریں جنہوں نے شیر خان کو خون دیا ورنہ اس گروپ کا خون ڈھونڈتے ڈھونڈتے شیر خان عالم بالا میں جا چکا ہوتا۔" آصف بولا۔

اور جہانگیر خان سمیت سب چونک پڑے۔

"تم کس کی بات کر رہے ہو۔" جہانگیر خان نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میں اسی شہناز کی بات کر رہا ہوں جسے تم نے کئی سال پہلے علم کی شمع جلانے کے جرم میں دریا برد کرنے کا حکم دیا تھا، وہ شہناز جو آج ڈاکٹر نرگس ہے ذرا سوچو اگر آج وہ زندہ نہ ہوتی تو تمہارے بیٹے کی زندگی کون بچاتا، تم اس نایاب خون کا گروپ کہاں سے ڈھونڈتے۔" آصف جذباتی انداز میں بولا۔

اور جہانگیر خان نے شرمندگی سے سر جھکا کر کہا۔ "میں اپنی بیٹی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

آصف کے اصرار پر جب نرگس اس کمرے میں داخل ہوئی تو جہانگیر خان کے آنسو بہہ رہے تھے اس نے نرگس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور گلوگیر لہجے میں بولا۔

"بیٹی ہم کو معاف کر دو، میں غلط تھا تعلیم لڑکا اور لڑکی دونوں کے لئے ضروری ہے۔"

دو سال بعد ہی شیر خان اور جہانگیر خان کے گاؤں میں ان کی زمینوں پر بچوں اور بچیوں کے لئے دو اسکول تعمیر کر لئے گئے جہاں بچوں کو مفت یکساں تعلیم دی جاتی ہے۔ اس لالی گاؤں میں نرگس نے ایک اسپتال بھی قائم کر رکھا ہے، ہر روز صبح گاؤں کے بچے دعا پڑھتے ہیں۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری